اورحان پاموک
سرخ
میرا نام
MY
NAME
IS
RED
پیش لفظ
مستنصر حسین تارڑ

سرخ میرا نام

اورحان پاموک

مترجم: ہما انور

جمہوری پبلیکیشنز

Orhan Pamuk

"My Name is Red"

(Benim Adım Kırmızı)

Urdu Translation "Surkh Mera Naam"
By Huma Anwar
Published by Jumhoori Publications - Pakistan
2017

Publisher : Farrukh Sohail Goindi
Foreword by Mustansar Hussain Tarar (Novelist)

اورحان پاموک

اورحان پاموک (Orhan Pamuk) استنبول میں 1952ء میں پیدا ہوئے۔ اپنی سوانح ''استنبول'' میں وہ لکھتے ہیں کہ 22 سال کی عمر تک وہ مصور بننا چاہتے تھے۔ استنبول کے امریکن رابرٹ کالج سے گریجویشن کے بعد، انہوں نے تین برس استنبول ٹیکنیکل یونیورسٹی سے آرکیٹکچر کی تعلیم حاصل کی لیکن بعدازاں اس شعبے کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے استنبول یونیورسٹی سے صحافت کی تعلیم حاصل کی۔ 23 سال کی عمر میں اورحان پاموک نے ناول نگار بننے کا فیصلہ کیا اور لکھنے کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا ناول Cevdet Bey and His Sons، 1982ء میں شائع ہوا۔ 1990ء میں شائع شدہ The Black Book کے باعث انہیں بین الاقوامی سطح پر پذیرائی ملنے کا آغاز ہوا۔ وہ اب تک سات ناول تحریر کر چکے ہیں۔ ان کا شمار یورپ کے ممتاز ترین ناول نگاروں میں ہوتا ہے اور انہیں کئی ملکی اور بین الاقوامی ادبی اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ ناول نگاری کے علاوہ اورحان پاموک، ادب وثقافت کے موضوعات پر ترکی اور بیرونِ ملک اخبارات اور جرائد میں مضامین بھی تحریر کرتے ہیں۔ وہ امریکن اکیڈمی آف آرٹس اینڈ لیٹرز اور چائنیز اکیڈمی آف سوشل سائنسز کے اعزازی رکن ہیں۔ وہ کولمبیا یونیورسٹی میں تقابلی ادب پر لیکچر بھی دیتے ہیں۔ 2006ء میں انہیں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا، وہ یہ اعزاز حاصل کرنے والے دوسرے کم عمر ترین شخص ہیں۔ 2005ء میں اورحان پاموک کو سلطنتِ عثمانیہ کے زمانے میں آرمینی اور کُرد قتل عام پر اپنے بیان کے باعث مقدمات کا سامنا کرنا پڑا، جس پر گبریل گارسیا مارکیز اور سرے ماگو سمیت دنیا کے معروف ادیبوں نے اُن کے حق میں مشترکہ بیان جاری کیا۔

زیرِ نظر ناول Benim Adim Kirmizi (My Name is Red) کا اردو ترجمہ ہے، جو پہلی بار 2000ء میں شائع ہوا۔ اس ناول نے اورحان پاموک کے نوبل انعام جیتنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ناول کا دور سولہویں صدی عیسوی میں عثمانی سلطان مراد سوم کا ہے جس میں اس زمانے میں مشرقی یا مغربی اندازِ مصوری اپنانے کے تنازع کو موضوع بنایا گیا ہے۔

پڑھا تو اس کا گرویدہ ہو گیا —— برادر فرخ سہیل گوئندی بھی اقرار کرتے ہیں کہ اس نے یشار کے اس ناول کا تذکرہ پہلی بار میری نیلوں کی دکان پر بیٹھے مجھ سے سنا تھا اور بالآخر اب جب کہ وہ پاکستان کا ایک انوکھا اور نظریاتی ناشر ہو چکا ہے، اس نے یشار کے اس ناول کا اردو ترجمہ "بوئے گل" کے عنوان سے شائع کر دیا ہے۔

بعد ازاں، میں نے یشار کی تمام میسر تحریروں کو دیمک کی مانند چاٹ ڈالا —— "Memet, My Hawk" سے لے کر "Legend of a Thousand Bulls" تک —— اور میں نے اسے ناول نگاری میں ایک اور مرشد مان لیا۔

میرا کراؤن پرنس یعنی بڑا بیٹا سلجوق، ایک مرتبہ پھر ترکی کے ساتھ میری وابستگی کا ثبوت، اپنے کالج کے ہمراہ ترکی گیا اور خاص طور پر سلجوق نام کے شہر گیا، وہاں سے اس نے ایک تصویری کارڈ روانہ کیا تھا جس پر صرف اتنا لکھا تھا، "سلجوق فرام سلجوق۔" تب میں نے اس کے رک سیک میں ان زمانوں کے سفرنامے "خانہ بدوش" کو رکھ دیا کہ بیٹے جب استنبول پہنچو تو وہاں اس بوڑھے ناول نگار کو مچھیروں کی کسی بستی کے قہوہ خانہ میں تلاش کرنا، جہاں وہ ایک آنکھ سے معذور ادیب اپنی یہودی بیوی کے ہمراہ ایک شب غم گزار رہا، عمر رفتہ کو آواز دیتا، شاید تمہیں مل ہی جائے اور یہ اس کی بیوی ہے جس نے اس کے بیشتر ناول ترکی سے انگریزی میں ترجمہ کیے۔ اسے تلاش کرنا، یہ سفرنامہ جس میں ترکی کے تذکرے بھی ہیں، اس کے چرنوں میں رکھ کر کہنا کہ یشار، میرا باپ ایک ایسا ادیب ہے جو اپنے وطن میں تو جانا جاتا ہے، لیکن اس کی سرحدوں کے باہر اسے کوئی نہیں جانتا اور وہ آپ کا چاہنے والا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ یہ کتاب جو آپ ہی کی لشکری زبان اردو میں لکھی گئی ہے، آپ کے کتب خانے کے کسی شیلف میں رکھ دی جائے تو وہ اپنے آپ کو ایک کامل خوش بخت تصور کرے گا —— سلجوق ترکی سے واپس آیا تو ایک خفا حالت میں آیا "ابو آپ مجھے مروانے لگے تھے۔ استنبول پہنچ کر یشار کمال کے ٹھکانے کی کھوج کرنے کی خاطر میں وہاں کے پریس کلب میں جا پہنچا اور وہاں ترکش کافی پیتے، تمباکو نوش کرتے صحافی حضرات سے جب میں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں یشار کمال سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں، تو ہر سو سناٹا چھا گیا —— پریس کلب میں یک دم خاموشی چھا گئی اور تمام آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ تب ایک نوجوان صحافی مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے گیا اور کہنے لگا، "لڑکے، کیا تم نہیں جانتے کہ ترکی میں یشار کمال ایک ممنوعہ نام ہے، ایک Taboo ہے۔ بے شک وہ ترکی کا سب سے بڑا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کے ناول کسی بھی ترک وزیر اعظم کے سرہانے پائے جا سکتے ہیں لیکن —— وہ ایک کرد ہے اور ہم ترک، یونانیوں کے ساتھ تو ہاتھ ملا سکتے ہیں، لیکن کرد —— ہم تو تمہارے ہیرو صلاح الدین ایوبی کو بھی ناپسند کرتے ہیں کہ وہ بھی ایک کرد تھا —— اور تم یہاں آ کر کھلے عام یشار کمال کی بات کرتے ہو۔ خفیہ اداروں کو اپنے پیچھے لگانا چاہتے ہو۔ اگر تمہیں جان عزیز ہے تو اس کرد کا نام لیے بغیر ترکی سے رخصت ہو جاؤ۔"

یشار کمال کو متعدد بار نوبل انعام کے لیے نامزد کیا گیا لیکن میری معلومات کے مطابق، ترک حکومت نے اسے منظور نہ کیا، انہیں ایک کرد منظور نہ تھا۔ چنانچہ جب میں نے ادب کے نوبل انعام کے حق دار کا نام پڑھا اور وہ یشار نہیں، اورحان تھا، تب اسی لمحے سے میرے اندر اس کے لیے نفرت کا جنم ہوا۔ یہ کیسے

ہو سکتا ہے کہ میری محبوبہ کے سر پر حسینۂ عالم کا تاج نہ ہے اور کوئی پاموک، پیرموک، شیتوک وغیرہ نوبل انعام کی
کس یونیورس ہو جائے۔ تب میں نے ایک تاریخی فیصلہ کیا کہ اپنے بدن میں مکمل کینہ بھر کے، بغض کے سیاہ وزہر
کو اپنی شریانوں میں انجکٹ کر کے میں اس پاموک شاموک نام کے ناول نگار کی تمام تحریریں پڑھ کر ایک
اخباری مہم کا آغاز کروں گا کہ کیا نوبل انعام کمیٹی کے بھی اراکین اندھے تھے، ان کی آنکھوں میں دھول پڑ گئی
تھی کہ انہوں نے یشار کی بجائے اورحان پاموک کو انعام کا حقدار قرار دے دیا۔ میں جو بچپن سے ہی ایک
عدد کیڑا تھا، کتابوں کا کیڑا تھا، میں نے نہایت نخوت سے، تیوری چڑھائے، یہ فیصلہ کر کے کہ میں نے اس شخص
کے ناولوں کو پسند نہیں کرنا۔ میں نے "The White Castle" کا مطالعہ کیا، پھر "Silent House" کی ورق
گردانی کی —— جب میں اس کی "The Black Book" تک پہنچا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اورحان کی نفرت میں
کمی ہونے لگی۔ وہ ایک مکڑی کی مانند اپنی تحریروں سے میرے وجود کے گرد جالے بن رہا تھا۔ مجھے پھانس رہا
تھا۔ میں ایک مکھی کی مانند تگ و دو کرنے لگا کہ ان جالوں کا شکار نہ ہو جاؤں اور تب "Snow" میری آنکھوں
میں اتری تو میری ناپسندیدگی اور نفرت کی برف پگھلنے لگی ... اور تب میں پھڑپھڑاتا تھا، اس کے بنے ہوئے
جالے بانے سے آزاد ہونے کی سعی کرتا، شکار نہ ہونا چاہتا تھا اور پھر "My Name is Red" ایک مصیبت ایک
لاچاری کے طور پر مجھ پر نازل ہو گیا۔ اس ناول کی پیچیدگی، ندرت، دستکاری اور تخلیقی مشاقی ایسی کمال کی تھی کہ
میں ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اس عظیم ناول کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، نفرت کی تلوار اور ناپسندیدگی کی ڈھال اس
کے قدموں میں رکھ کر شکست کا اعتراف کر دیا —— میں مسحور ہو گیا، شرمندہ ہو گیا —— "My Name is Red"
مجھے ایسے جہانوں میں لے گیا جن کے وجود سے میں واقف نہ تھا۔ اورحان نے ایک ایسی قدیم دنیا کے نقشے
تخلیق کیے تھے جو ابھی وجود میں ہی نہ آئی تھی۔

سرخ رنگ نہ صرف انقلاب کا بلکہ ملامتی صوفیوں کا بھی رنگ ہے اور میر شاہ حسین کہتا ہے کہ ——
دھواں دُھکے میرے مرشد والا، جاں پھولاں تاں لال نیں۔ سانوں مرشد نال پیار نیں —— اُدھر لال میری پت
رکھیو بھی لالو لال ہے —— ہر جانب جہاں بھی کریدتا ہوں، سرخ چنگاریاں برآمد ہوتی ہیں اور ان میں مجھے
اورحان پاموک کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔

مجھے منی ایچر پینٹنگ یا مختصر مصوری کے بارے میں اتنا ہی علم ہے جتنا کہ اورحان پاموک کو میری
تحریروں کے بارے میں علم ہے لیکن میں نے ہرات کے مصور بہزاد کے "تیمور نامہ" کے کچھ مصور اوراق
دیکھ رکھے ہیں جن میں تصویر شدہ ہر گھوڑا سانس لیتا ہے تو اس کے نتھنوں سے خارج ہونے والی بھاپ تصویر کو
زندہ کر دیتی ہے —— جنگ کے مناظر میں تلواروں کی لشک آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے اور وہ تصویر سے باہر
آ کر آپ کے بدن پر وار کرتی ہیں، شیر گرجتے ہیں اور ہاتھی چنگھاڑتے ہیں، شہزادے اور بادشاہ اپنی کنیزوں
کے ساتھ ندیوں کے کنارے استراحت فرماتے غیر شرعی افعال میں مشغول ہوتے ہیں —— بہزاد ایک ایسا
ساحر ہے جو کاغذ پر مصور کیے گئے مناظر پر جب اپنا سانس لیتا ہے تو وہ زندہ ہو جاتے ہیں —— لیکن یہ

itsurdu.blogspot.com

سرسری علم تھا..... "My Name is Red" مجھے مختصر مصوری کے ایسے جہانوں میں لے گئی جہاں اس فن کے استاد آخری عمر میں بہر طور اندھے ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھیں عمر بھر کاغذ پر مرکوز رہ کر پتھرا جاتی ہیں اور بالآخر وہ کسی اندھے کنویں میں پھینک دیے جاتے ہیں۔

ناول نگاری میں کوئی پیغمبر آخر الزماں نہیں ہوتا..... تخلیق کے معجزے مسلسل رونما ہوتے رہتے ہیں، ان پر آسمانی صحیفے اترتے رہتے ہیں۔ موسیٰ کے بعد عیسیٰ کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ ٹالسٹائی اور دوستوئفسکی کے بعد جیمز جوائس، مارکیز یا سراماگو کا ظہور ہوتا ہے تو اسی طور یشار کمال کے بعد اورحان پاموک بھی خلق خدا کے دکھ سکھ اور محبتوں میں شریک ہونے کے لیے ہمارے درمیان ایک اور تخلیقی پیغمبر کے طور پر "My Name is Red" ایسے صحیفے تھامے ہم پر اترتا ہے۔

بے شک میں اورحان کے کلاسیک ناول "My Name is Red" کا ابتدائیہ لکھ رہا ہوں لیکن میں یہ ظلم کیسے کروں کہ اس کے آخری ناول "The Museum of Innocence" کا تذکرہ نہ کروں جو میرے نزدیک "Anna Karenina" کے بعد محبت کی سب سے بڑی کہانی ہے۔ اس ناول نے محبت کی شدت سے مجھے مسمار کر ڈالا..... میں ہمیشہ سے اس یقین کا اسیر رہا ہوں جو محبت کی دیوانگی ہے، اسے صرف وارث شاہ، حافظ برخوردار، شیو کمار بٹالوی ایسے نابغہ روزگار شاعر ہی بیان کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

عشق بولدا اندر ہی دے تھاؤں تھائیں.....

حافظ ہاتھی عشق دا پوش کریندا پوش.....

مٹھے واساں پلنگ نیواڑی دے اساں چاننیاں وچ ڈاہیا

لیکن یہ کیا ہے کہ پاموک نے محبت کے آسمانی صحیفے کی ایک اور تفسیر لکھ ڈالی ہے..... وہ اپنی بچھڑ چکی محبوبہ.....

"یہ میری زندگی کا سب سے پرمسرت لمحہ تھا، اگرچہ میں اس لمحے آگاہ نہ تھا..... فسون کے کندھے پر بوسہ دیتے ہوئے جو محبت کے کرشمے سے غم آلود ہو چکی تھی، میں نے نہایت نرمی سے اس کے کان کو کاٹا، اس کا جھمکا آزاد ہو گیا اور شاید ایک لمحے کے لیے فضا میں معلق رہنے کے بعد گر گیا۔"

وہ اپنی بچھڑ چکی محبوبہ فسون کے آثار جمع کرتا ہے۔ لباس، خوشبوئی کی بوتلیں، سگریٹ کے ٹکڑے..... بستر اور چادریں، غرض کہ ہر وہ شے جس نے فسون کے بدن نے چھوا ہو، جمع کرتا ہے اور پھر ان آثار کو ایک عجائب گھر "The Museum of Innocence" کی شکل دیتا ہے۔

مارکیز نے کہا تھا کہ ہر شخص کی زندگی میں، اگر وہ خوش بخت ہو تو، ایک ایسی عورت آتی ہے جو اسے مردہ ناول کی طرح پڑھتی ہے۔ ایک فسون آتی ہے..... پاموک کا ناول پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ میری فسون کون سی ہے..... میں بھی تو اس کے آثار تلاش کروں..... کوئی زرد رو پیراہن، پرانی انگلیوں سے کھینچی ایک زرد پھولوں والی شال..... مدھم ہو چکی آنسوؤں میں بھیگی تحریریں..... کوئی رومال جس میں وصال کی مہک محفوظ ہو۔ ریل کا ایک

تک..... بارش میں بھیگ کر اپنے رنگ کھو دینے والی کوئی پینٹنگ یا آصف جاہ کے مقبرے کی کوئی محراب جس کی اینٹوں میں اس کی سسکیاں جذب ہو گئی ہوں..... لیکن میں پاموک نہ تھا، روایتوں، بوسیدہ اخلاقیات اور معاشرے کی زنجیر میں بندھا ایک غلام تھا، میں اگر ذرہ بھر روگردانی کروں تو میری پیٹھ پر کوڑے برسنے لگتے تھے..... میں کیسے ایک اپنا "The Museum of Innocence" قائم کر سکتا تھا۔

مجھے بہر طور "My Name is Red" کی جانب لوٹ آنا ہے۔

اور میں یہ ظلم بھی نہیں کر سکتا کہ اس ناول کی چپ چاپ، دھان پان، نازک ملوک لڑکی ہما انور کو کھڑے ہو کر سلام نہ کروں کہ اس نے اس مشکل ناول کا اُردو ترجمہ جانے کیسے کر دیا ہے اور ایسے کر لیا ہے کہ یہ انگریزی کی نسبت کہیں بڑھ کر موثر اور تخلیقی ہو گیا ہے، ترجمے کے بارے میں کسی نہ کسی نے تو کہا تھا کہ ایک بوتل میں بند خوشبو کو ایک دوسری بوتل میں انڈیلنا ترجمہ ہے اور اس انڈیلنے کے دوران بہت سی خوشبو زائل ہو جاتی ہے۔ ہما انور خوشبو انڈیلنے کی ایسی ماہر ہیں کہ وہ ہو بہو بغیر کسی ضیاع کے اُردو کی بوتل میں منتقل ہو گئی ہے۔

جیسے رباعیات عمر خیام کے فٹز جیرلڈ کے ترجمے کے بعد جب ادریس شاہ اور ایڈ گرسنو نے مل کر ایک پرانے مخطوطے کی مدد سے عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ کیا تو ''ٹائم'' میگزین نے ایک ادبی جائزے میں لکھا کہ ''ادریس شاہ اور ایڈ گرسنو ایسے شاعر کا یہ تازہ ترین ترجمہ ایک عقاب کی مانند ہے جب کہ فٹز جیرلڈ کا ترجمہ اس کے مقابلے میں محض ایک چڑیا ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ یہ عقاب حنوط شدہ حالت میں کارنس پر سجا ہے جب کہ چڑیا فضائے بسیط میں پرواز کر رہی ہے۔''

ہما انور کی چڑیا بھی آسمانوں پر اُڑان کرتی ہے۔

کیا میں اب بھی اورحان پاموک سے نفرت کرتا ہوں؟ ہاں ـــ جب تک کہ وہ میری حیات کو بامعنی اور پُر تاثیر بنانے کے لیے کم از کم دس ناول مزید نہ لکھے۔ میں اس سے نفرت کرتا رہوں گا۔

اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا تو اس میں باہم

جھگڑنے لگے۔

سورۃ البقرۃ آیۃ72

اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں۔

سورۃ فاطر آیۃ19

اور مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کا ہے۔

سورۃ البقرۃ آیۃ115

میں مر چکا ہوں

میں اب ایک لاش کے سوا کچھ نہیں، کنوئیں کی تہ میں پڑا ایک مُردہ وجود..... اگرچہ آخری سانس لیے اور میرے دل کی دھڑکن بند ہوئے خاصی دیر گزر چکی ہے، لیکن سوائے اُس بدبخت قاتل کے کسی کو نہیں معلوم کہ مجھے ہوا کیا تھا۔ جہاں تک اُس ملعون کا تعلق ہے، اُس نے یہ یقین کرنے کو کہ میں مر چکا تھا، میری سانسیں محسوس کیں اور میری نبض ٹٹولی، اس نے میری پیٹھ پر لات ماری، مجھے اٹھا کر کنوئیں تک لایا، سر سے بلند کیا اور پھر نیچے پھینک دیا۔ جونہی میں نیچے گرا، میرا سر، جس پر اس نے پتھر سے ضربیں لگائی تھیں، پاش پاش ہو گیا، میرا چہرہ، پیشانی اور رخسار پس گئے، میری ہڈیاں سرمہ بن گئیں اور میرا چہرہ خون سے لتھڑ گیا۔

مجھے لاپتا ہوئے تقریباً چار روز ہو چکے ہیں۔ میری بیوی بچے میری تلاش میں ہوں گے، میری پریشان بیٹی روتے روتے بے حال ہو کر صحن کا دروازہ تک رہی ہوگی۔ ہاں، وہ سب میری واپسی کی اُمید لیے دریچے سے لگے کھڑے ہوں گے۔

کیا وہ واقعی میرے منتظر ہیں؟ میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاید وہ میری عدم موجودگی کے عادی ہو گئے ہیں..... کس قدر مایوسی کی بات ہے۔ یہاں، دوسری طرف یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمارے پیچھے زندگی اُسی بندھی ڈگر پر ہوگی۔ میری پیدائش سے پہلے بے کراں وقت تھا اور میری موت کے بعد لاانتہائی وقت۔ میں نے پہلے کبھی یہ سوچا ہی نہ تھا۔ میں دو ابد تک پھیلی تاریکیوں کے درمیان تابناکی کے ساتھ رہتا چلا آیا ہوں۔

میں اپنی زندگی میں خوش تھا! اب میں جانتا ہوں کہ میں خوش تھا۔ میں ہمارے سلطان کے کتاب خانے میں سب سے بہترین مصوری کرتا تھا، میرے فن میں میرا ہمسر کوئی نہ تھا۔ اس کام سے جو میں انفرادی حیثیت میں کرتا تھا، مہینے بھر میں چاندی کی نو سو سکے تو کما ہی لیتا تھا، اسی سبب یہ سب برداشت کرنا قدرتی طور پر دشوار ہے۔

میری ذمے داری تھی، کتابوں میں مصوری اور منی ایچر فنکاری کرنا۔ میں صفحوں کے حاشیوں کی تزئین کرتا، انہیں پتوں، شاخوں، گلابوں، پھولوں اور پرندوں کے زندگی بھرے نمونوں کے رنگ دیتا۔

میں نے مختلف انداز میں بادلوں، انگوری بیلوں کے جھرمٹ، ایسے رنگ برنگے گھنے جنگل جو غزال چھپا لیتے تھے، بادبانی اور چپوؤں سے چلنے والی کشتیوں، سلطانوں، درختوں، محلوں، گھوڑوں اور شکاریوں کی تصویریں بنائیں۔ نوعمری میں میں طشتریوں، آئینے کی پشت، چوبی صندوق یا بعض اوقات کسی محل سرا کی چھت، یا سنورس کی کسی حویلی یا لکڑی کے چمچ تک پر نقاشی کیا کرتا تھا۔ بہر حال بعد کے برسوں میں میں نے صرف کتابوں کے اوراق پر ہی کام کیا کیوں کہ ہمارے سلطان سے اس کام کا بھاری معاوضہ ملتا تھا۔ میں قطعی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سب اب مجھے غیر اہم لگ رہا ہے۔ دولت کی قدر تو آپ کو موت کے بعد بھی یاد رہتی ہے۔

یہ معجزہ ہے کہ آپ میری آواز سن رہے ہیں، اس کے بعد آپ سوچ سکتے ہیں: "یہ پرواہ کسے ہے کہ تم نے زندگی میں کیا کمایا؟ ہمیں وہ سب بتاؤ جو کچھ تم موت کے بعد دیکھ رہے ہو۔ کیا موت کے بعد کوئی حیات ہے؟ تمہاری روح کہاں ہے؟ جنت اور دوزخ کیا ہیں؟ موت کیسی ہوتی ہے؟ تم تکلیف میں ہو؟"

آپ ٹھیک کہتے ہیں، زندوں کو حیات بعد از موت کے بارے میں بہت تجسس ہوتا ہے۔ آپ نے شاید وہ قصہ سنا ہی ہوگا جس میں اسی تجسس کا مارا ایک آدمی میدان جنگ میں سپاہیوں کے بیچ گھوما کیا۔ خون کے تالابوں میں زندگی کی جدوجہد کرتے زخمی سپاہیوں میں اسے کسی ایسے کی تلاش تھی جو موت کے بعد زندہ ہوگیا ہو، ایسا سپاہی جو اسے دوسری دنیا کے راز بتا سکے۔ امیر تیمور کی سپاہ نے اس متجسس آدمی کو دشمن سمجھا اور شمشیر کے ایک ہی وار سے دو ٹکڑے کر دیا اور اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کر دیا کہ دوسری دنیا میں آدمی کے دو حصے ہو جاتے ہیں۔

کیا بکواس ہے! میں تو یہ کہوں گا کہ اس دنیا میں منتشر روحیں دوسری دنیا میں باہم مل جاتی ہیں۔ شیطان کے بہکائے کافروں کے دعووں کے برعکس، دوسری دنیا کا وجود ہے، خدا کا شکر، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں وہاں سے آپ سے مخاطب ہوں۔ آپ دیکھ ہی سکتے ہیں کہ میں مر چکا ہوں لیکن میرا ہونا، میری ہستی ختم نہیں ہوئی۔ یہ درست ہے، مجھے لازمی اعتراف کرنا ہوگا کہ ابھی تک بہتے دریاؤں کے کناروں پر مجھے سونے چاندی سے بنے جنت کے کوشک نظر نہیں آئے نہ ہی پکے ہوئے نرم رسیلے پھلوں سے لدے چوڑے پتوں والے درخت اور نہ ہی حسین و جمیل حوریں جن کا قرآن کریم میں ذکر ہے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے سورۃ الواقعہ میں مذکور بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں کی کتنے شوق سے تصویر کشی کی تھی۔ دودھ، شراب، تازہ پانی اور شہد کی وہ نہریں بھی نہیں جن کا فصاحت و بلاغت کے ساتھ ذکر ملتا ہے، قرآن پاک میں نہیں بلکہ ابن عربی جیسے خیال پرست خواب دیکھنے والوں کے ہاں۔ لیکن میرا ان لوگوں کو جو امیدوں اور دوسری دنیا کے تصور میں یہ دنیاوی زندگی گزارتے ہیں، اُن کے ایمان سے بہکانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس لیے مجھے یہ اعلان کرنے دیں کہ میں نے جو دیکھا اُس کا خصوصی واسطہ میرے ذاتی حالات سے ہی ہے۔ دوسری زندگی میں ذرا سا بھی یقین رکھنے والا ہر صاحب ایمان شخص جانتا ہوگا کہ میری جیسی بیزاری کی حالت میں شاید ہی کسی کو جنت کی نہریں دیکھنے کی جلدی ہوگی۔

مختصر یہ کہ میں جسے نفیس آفندی کہا جاتا ہے، مر چکا ہوں، لیکن چوں کہ مجھے ابھی دفن نہیں کیا گیا، میری روح نے ابھی میرے وجود کو پوری طرح نہیں چھوڑا۔ میں ایسا پہلا انسان نہیں ہوں کہ جس کی یہ کیفیت ہے لیکن اس غیر معمولی حالت نے میرے اافانی حصے کو شدید تکلیف پہنچائی ہے۔ اگر چہ میں اپنی کچلی ہوئی کھوپڑی یا اس زخم زخم گلتے سڑتے جسم کو محسوس نہیں کر سکتا جس کی ہڈیاں سرمہ بن چکی ہیں اور جو برفیلے پانی میں آدھا ڈوبا پڑا ہے۔ میں اپنی روح کا کرب والم محسوس کر سکتا ہوں جو اپنے اس فانی بدن سے نکلنے کی تگ ودو میں ہے۔ یوں لگ رہا ہے کہ جیسے میرے وجود سمیت سارا جہان مل کھا کر درد واذیت کا کوئی اگلا ہوا لقمہ بن رہے ہوں۔

اس اضطراب کا موازنہ میں رہائی یا نجات کے اس اچانک احساس سے کر سکتا ہوں جو مجھے اپنی موت کے نامنصفانہ لمحے محسوس ہوا تھا۔ جی ہاں، جوں ہی اس نے مجھے اچانک پتھر دے مارا اور میری کھوپڑی تڑخ گئی، میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ بدبخت میری جان لینا چاہتا ہے لیکن مجھے یقین نہ تھا کہ وہ واقعی ایسا کرے گا۔ مجھے اچانک اور اک ہوا کہ میں ایک امید سے معمور آدمی تھا، اپنے کتاب خانے (وضاحت: مصوری خانہ جہاں مسودوں کی تزئین کاری اور ان پر منی ایچر مصوری کی جاتی تھی) اور گھر گرہستی میں مگن زندگی گزارتے میں اس سے واقف نہ تھا۔ میں اس کرب کمال میں کڑے اپنے ناخنوں، انگلیوں اور دانتوں کے ساتھ زندگی سے چمٹا رہا۔ بعد میں مجھے جو ضربیں لگیں ان کی تکلیف بھری تفصیل سے میں آپ کو بیزار نہیں کروں گا۔

اس کرب واذیت سے گزرتے مجھے معلوم تھا کہ میں مر رہا ہوں گا، تبھی ایک حیران کن احساس رہائی مجھ پر چھا گیا۔ مجھے دنیا سے رخصتی کے لیے اس رہائی کا احساس ہوا۔ اس طرف میری آمد کے ساتھ میری اذیت کم ہو گئی، خود کو خواب میں خوابیدہ دیکھنے کی طرح۔ قاتل کے برف اور کیچڑ سے لتھڑے جوتے دنیا کی آخری چیز تھے جو میں نے دیکھیں۔ میں نے اپنی آنکھیں یوں موند لیں جیسے سونے لگا ہوں اور میں آہستگی اور نرمی سے دنیا سے گزر گیا۔

میری شکایت اب یہ نہیں کہ میرے دانت خون سے بھرے منہ میں ٹوٹ کر گر گئے ہیں یا میرا چہرہ ناقابل شناخت حد تک مسخ ہو گیا ہے یا یہ کہ مجھے کنوئیں کی تہ میں تنہا چھوڑ دیا گیا ہے۔۔۔۔ اور یوں بھی ہے کہ ہر کسی کا خیال ہے کہ میں ابھی تک زندہ ہوں۔ میری پریشان روح اس کرب میں مبتلا ہے کہ میرے گھر والوں اور دوست احباب، مجھے استنبول میں کسی جگہ گھٹیا قسم کے لین دین میں مصروف یا یہاں تک سوچ رہے ہیں کہ میں کسی دوسری عورت کے چکر میں ہوں، خیر وہ اکثر میرے بارے میں ایسا ہی سوچتے ہیں۔ بس بہت ہو گیا! میری لاش فوراً ڈھونڈو، میری نماز جنازہ پڑھاؤ اور میری تدفین کرو۔ سب سے بڑھ کر میرے قاتل کو ڈھونڈو! مجھے آپ بے شک کسی عالیشان مقبرے میں دفن نہ کریں، لیکن جب تک وہ ملعون آزاد ہے، میں اپنی قبر میں بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہوں گا اور اپنی بدعہدی اور بے وفائی پر تم سب کو پریشان کیے

رکھوں گا۔ کسی حرافہ کی اولاد اس قاتل کو تلاش کریں اور تب ہی میں آپ کو دوسری دنیا کی تفصیل بتاؤں گا۔ یہ جان لیں کہ جب وہ پکڑا جائے تو تشدد کے شکنجے سے اس کی آہستہ آہستہ آٹھ دس ہڈیاں ترجیحاً ٹانگ کی ہڈیاں توڑی جائیں۔ پھر تشدد کرنے والوں کی خاص طور پر بنائی گئی سلاخوں سے اس کی کھوپڑی چھیدی جائے اور اس کے تیل چپڑے کراہت زدہ بالوں کو ایک ایک کر کے جڑ سے کھینچ کر اس طرح اکھیڑا جائے کہ وہ ہر مرتبہ بلبلا ہی اٹھے۔

مجھے اس قدر تکلیف پہنچانے والا یہ قاتل کون ہے؟ اس نے اس حیران کن انداز میں میری جان کیوں لی؟ متجسس اور ان باتوں سے ہوشیار رہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ دنیا کمینے اور بیکار مجرموں سے بھری پڑی ہے؟ ایسا شاید اس نے کیا ہو، شاید اس نے؟ اس صورت میں مجھے خود کو خبردار کرنے دیں: میری موت ہمارے مذہب، ہماری اقدار و روایات اور جس انداز میں ہم دنیا کو دیکھتے ہیں، ان کے خلاف ایک بھیانک سازش پر پردہ ڈالتی ہے۔ اپنی آنکھیں کھولیں، معلوم کریں کہ مجھے انہوں نے برباد کیا جو جس طرح زندگی جینے پر آپ یقین رکھتے ہیں اور زندگی آپ جی رہے ہیں اور اسلام کے دشمن ہیں۔ معلوم کریں کہ کیوں کسی روز وہ آپ کے ساتھ بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ ارض روم کے عظیم مبلغ نصرت خوجا، جنہیں میں اشک بار آنکھیں لیے سنا کرتا تھا، ان کی ہر پیش گوئی ایک ایک کر کے سچ ہو رہی ہے۔ مجھے یہ بھی کہنے دیں کہ جس صورت حال میں ہم گرفتار ہو چکے ہیں، اگر اسے کسی کتاب میں بیان کیا جائے تو ماہر ترین منی ایچر فنکار بھی اس کی تصویر کشی نہ کر سکے گا۔ جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے ..... اگر میں غلط ہوں تو خدا مجھے معاف فرمائے ..... ایسی کتاب کی حیران کن طاقت اس ناممکنیت سے ابھرتی ہے کہ اس کی تصویر کشی نہیں کی جا سکتی۔ مجھے شبہ ہے، شاید آپ میری اس دلیل کو مکمل طور پر سمجھ نہیں سکے۔

میری بات ذرا غور سے سنیں۔ جب میں نو آموز شاگرد تھا تو میں بھی ڈرتا تھا، اس لیے میں در پردہ سچائیوں اور دور سے آتی آوازوں کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ میں ایسی باتوں کو ہنسی میں اڑا دیتا تھا۔ لیکن میرا انجام اس گھٹیا کنوئیں کی تہ میں ہوا ہے۔ ایسا آپ کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا، ہوشیار رہیں۔ میرے پاس اب کرنے کو کچھ نہیں، ماسوائے اس کے کہ میں پوری طرح گل سڑ جاؤں تاکہ اس تعفن کی وجہ سے مجھے ڈھونڈا جا سکے۔ میرے پاس سوائے امید کے کرنے کو کچھ نہیں ..... ذرا تصور کریں اس تشدد کا جو کوئی مہربان جلاد میرے وحشی قاتل پر کرے گا، ایک بار بس وہ پکڑا گیا تو۔

میرا نام ہے قرہ

بارہ سال کی غیر حاضری کے بعد میں استنبول میں یوں داخل ہوا جیسے نیند میں چل رہا ہوں۔ "قبر اسے پکارتی ہے۔" لوگ لب مرگ انسانوں کے متعلق کہتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، یہ موت ہی تھی جو مجھے اس شہر میں دوبارہ لے آئی جہاں میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔ جب میں پہلی بار واپس آیا، میں سمجھا کہ وہاں صرف موت تھی، البتہ بعد میں محبت سے بھی میرا سامنا ہوتا تھا۔ محبت، تاہم اس شہر میں گزری میری زندگی کی یادوں کی طرح دور پرے کی بھولی بسری بات تھی۔ یہ بارہ برس پہلے استنبول ہی تھا جہاں میں اپنی نوخیز خالہ زاد کی محبت میں بے بسی سے گرفتار ہوا۔

اپنی آمد کے چار برس بعد میں نے پہلی بار استنبول چھوڑا اور خطوط لیے اور محصول وصول کرتے، ایران کے سبزہ زاروں، برف پوش پہاڑوں اور افسردہ شہروں میں سفر کرتے، خود سے اعتراف کرنے لگا کہ میں اپنے بچپن کی اس محبوبہ کا چہرہ آہستہ آہستہ بھولنے لگا ہوں، جسے میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ بڑھتے ہوئے خوف کے ساتھ، میں نے اُسے یاد رکھنے کی مضطرب کوشش کی تو مجھے احساس ہوا کہ ایک ایسا چہرہ جسے ایک عرصے سے نہ دیکھا ہو، آخرکار ذہن سے اترنے ہی لگتا ہے۔ مشرق میں گزارے چھٹے برس میں سفر کرتے یا پاشاؤں کے نائب کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے، میں جان گیا کہ میرے تخیل میں جو چہرہ تھا، وہ میری محبوبہ کا نہ تھا۔ آٹھویں برس، جو چہرہ میں غلطی سے چھٹے برس میں ذہن میں لایا تھا، دوبارہ بالکل ایک مختلف چہرے کا روپ لگا۔ بارھویں برس، جب میری عمر چھتیس برس ہو چکی تھی، میں اپنے شہر واپس آیا اور مجھے تکلیف دہ آگاہی ہوئی کہ عرصہ ہوا میں اپنی محبوبہ کا چہرہ فراموش کر چکا تھا۔

میری بارہ سالہ جلاوطنی کے عرصے میں میرے کئی دوست اور رشتے دار دنیا سے گزر چکے تھے۔ میں نے شاخ زریں سے بلندی پر دکھائی دیتے قبرستان جا کر اپنی ماں اور عدم موجودگی میں فوت ہونے والے چچاؤں اور ماموؤں کے لیے فاتحہ پڑھی۔ مٹی کی خوشبو میری یادوں میں گھل مل رہی تھی۔ کسی نے میری ماں کی قبر کے ساتھ پڑا مٹی کا برتن توڑ دیا تھا۔ میں ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھ کر بلا سبب رو دیا۔ کیا میں جانے والوں کے لیے رو رہا تھا یا کیوں کہ میں شہر میں اتنے برس بعد اپنی زندگی کا آغاز نو کر رہا تھا؟ یا اس

لیے کہ میں اپنی زندگی کے سفر کے اختتام پر تھا؟ ہلکی ہلکی برف گرنے لگی۔ میں برف کے گالوں کے نظارے میں مگن اپنی زندگی کے الٹ پھیر میں اتنا گم تھا کہ قبرستان کے اندھیرے گوشے سے کالے کتے کو اپنی طرف گھورتے ہوئے بھی نہ دیکھا۔

میرے آنسو تھم گئے۔ میں نے اپنی ناک پونچھی۔ قبرستان سے نکلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ کالا کتا دوستی میں اپنی دُم ہلا رہا تھا۔ کچھ عرصے بعد میں نے اسی علاقے میں ایک گھر کرائے پر لے لیا جہاں کبھی میرے بابا کے ایک رشتے دار رہا کرتے تھے۔ مالک مکان کو مجھے دیکھ کر اپنا بیٹا یاد آتا تھا جسے ایرانی صفوی سپاہیوں نے محاذ پر قتل کر دیا تھا اور یوں وہ گھر کی صفائی اور میرے لیے کھانا پکانے لگی۔

میں اطمینان سے لمبی ہوا خوری کو نکلا، یوں جیسے میں استنبول میں نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے سرے پر کسی عرب شہر میں آن بسا تھا۔ گلیاں تنگ ہو چکی تھیں یا مجھے ہی ایسا لگا۔ بعض علاقوں میں تو گھروں کے بیچ سکڑی ہوئی تنگ گزرگاہوں پر گھوڑا گاڑیوں سے بچنے کے لیے مجھے دیواروں اور دروازوں کے ساتھ لگ کر گزرنا پڑا۔ وہاں زیادہ امیر لوگ تھے یا پھر مجھے ہی ایسا محسوس ہوا۔ میں نے کسی قلعے جیسی بنی سجائی گھوڑا گاڑی دیکھی، جسے ایسے مغرور گھوڑے کھینچ رہے تھے، جو ایران یا عرب میں نہیں مل سکتے۔ قسطنطین کے ستون کے قریب مجھے چیتھڑوں میں لپٹے بیٹھے کچھ بھکاری دکھائی دیے جن کے سروں پر مرغ فروشوں کی طرف سے اٹھتی بدبو منڈلا رہی تھی۔ ان میں سے ایک نابینا بھکاری گرتی برف دیکھ کر مسکرا دیا۔

اگر کوئی مجھے بتاتا کہ استنبول ایک غریب تر، چھوٹا اور زیادہ خوش شہر ہوا کرتا تھا تو میں شاید یقین نہ کرتا لیکن میرے دل نے یہی کہا۔ میری محبوبہ کا گھر لیموں کے پیڑوں اور شاہ بلوط کے درختوں کے درمیان وہیں تھا جہاں ہمیشہ ہوا کرتا تھا، لیکن دستک دینے پر پتا چلا کہ اب وہاں اور لوگ بس گئے تھے۔ مجھے اُن اجنبیوں سے پتا چلا جنہوں نے دستک کا جواب دیا تھا اور جو بھی ایسی باتیں بتاتے نہیں جھجکتے، قطع نظر کہ اس سے کسی کا دل ٹوٹ جائے یا خواب چکنا چور ہوں، کہ باپ بیٹی کسی بدنصیبی کا شکار رہے تھے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ میری محبوبہ کی ماں، جو میری خالہ تھیں، فوت ہو چکی ہیں اور اُن کے شوہر، میرے خالو، اپنی بیٹی کے ساتھ کہیں اور منتقل ہو گئے تھے۔ میں ابھی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بس اتنا بتانے کی اجازت دیں کہ اُس پرانے باغ نے مجھے روشن دنوں کی حدت یاد دلائی اور اس وقت وہاں مجھے اپنی چنگلی جتنی برف کی قلمیں لیموں کے پیڑوں سے لٹکتی نظر آئیں، وہ جگہ جس کی خنکی، برف باری اور عدم توجہی صرف موت کی یاد دلاتی تھی۔

مجھے اپنے رشتے داروں پر آنے والی مشکلوں کے بارے میں انشتے (خالو) کے اُس خط کے ذریعے معلوم ہوا جو انہوں نے مجھے تبریز بھیجا۔ اس خط میں انہوں نے مجھے استنبول واپس آنے کی دعوت دی اور بتایا تھا کہ وہ ہمارے سلطان کے لیے ایک خفیہ کتاب تیار کر رہے ہیں جس کے لیے انہیں میری مدد درکار تھی۔ انہوں نے کسی سے سنا تھا کہ میں تبریز میں قیام کے دوران عثمانی پاشاؤں، صوبائی گورنروں اور استنبول

کے لوگوں کے لیے کتابیں تیار کرتا رہا تھا۔ جب میں نے یہ کیا تھا کہ استنبول کے جن گاہکوں نے مسودوں کے لیے پیشگی رقم کی ادائیگی کی تھی، ان منی ایچر فنکاروں اور خطاطوں کا پتا چلانے کے لیے خرچ کی جو عثمانی پاشیوں کی موجودگی اور جنگ سے تنگ آ چکے تھے، جنھوں نے ابھی تک قزوین یا ایران کے کسی دوسرے شہر کی طرف نقل مکانی نہ کی تھی۔ غربت اور عدم توجہی سے شاکی یہی وہ فنکار تھے جنھیں میں نے ان کتابوں کی خطاطی، مصوری اور مسودوں کے مجلد کرنے کے کام پر لگایا، جو میں بعد میں استنبول بھیج دیتا۔ تصویروں اور اچھی کتابوں کی وہ محبت اگر نہ ہوتی جو میرے انشتے نے نوعمری ہی میں مجھ میں جگا دی تھی، تو میں ایسے مشاغل میں بھی شامل نہ ہو سکتا تھا۔

گلی کے بازار والے نکڑ پر جہاں کبھی انشتے رہا کرتے تھے، میری حجام کے ساتھ ملاقات ہوئی جو اپنے کام میں استاد تھا۔ وہ اپنی دکان میں انھی پرانے آئینوں، اُستروں، پانی کے جگ اور صابن بھرے برش کے درمیان کام میں مصروف تھا۔ ہماری نظریں ملیں، لیکن مجھے یقین نہیں کہ اُس نے مجھے پہچانا ہوگا۔ مجھے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سر دھونے والا پانی کا برتن اب بھی زنجیر کے ساتھ چھت سے لٹک رہا تھا اور جب اُس میں پانی ڈالا جاتا تو پہلے وقتوں کی طرح ہی نیم دائرہ بناتے ہوئے جھولتا۔

آس پڑوس اور وہ چند [illegible] راکھ اور دھوئیں میں غائب ہو گئے تھے جہاں اپنی جوانی کے ایام میں میں گھوما کرتا تھا۔ اُن کی جگہ جلے ہوئے کھنڈروں نے لے لی تھی، جہاں اب آوارہ کتے جمع ہوتے اور جہاں رکنے والے پاگل بچوں کو ڈرایا کرتے تھے۔ آگ سے تباہ ہونے والے دوسرے علاقوں میں عالی شان گھر تعمیر کیے جا چکے تھے اور میں ان مہنگی تعمیرات پر حیران ہوں، اطالوی دریچوں پر اور دیواروں سے باہر نکلے چھجوں والی کھڑکیوں سے بھی پُرتعیش دو منزلہ عمارتوں پر۔

دوسرے کئی شہروں کی طرح استنبول میں بھی کرنسی کی کوئی قدر و قیمت نہ رہی تھی۔ جب میں مشرق کے سفر سے واپس آیا تو جو بیکریاں کبھی ایک سوڈریکما (یونانی کرنسی) والی بڑی روٹی چاندی کے ایک سکے کے عوض بیچا کرتی تھیں، اب اُس سے آدھے وزن کی روٹیاں اُسی قیمت میں بنا کر بیچ رہی تھیں اور اُن کا ذائقہ بھی ویسا نہیں رہا تھا جو میرے بچپن میں ہوا کرتا تھا۔ اگر میری مرحومہ ماں اُس روز تک زندہ ہوتیں جب انھیں ایک درجن انڈوں کے عوض چاندی کے تین سکے دینے پڑتے تو وہ کہتیں: ''ہمیں مرغیوں اتنا بگڑنے سے پہلے گزر جانا چاہیے جب وہ زمین کی بجائے ہمارے اوپر بیٹ کرنے لگیں۔'' لیکن میں جانتا تھا کہ کرنسی کی کم قدر کا مسئلہ ہر جگہ تھا۔ افواہ تھی کہ اطالوی باشندوں اور فلیمش ڈچ بولنے والوں کے تجارتی جہازوں میں جعلی سکوں کے صندوق بھرے ہوئے تھے۔ شاہی ٹکسال جہاں چاندی کے سوڈریکما سے کبھی پانچ سو سکے بنائے جاتے تھے، اب ایران کے ساتھ مسلسل جنگ کے سبب اُسی مقدار سے آٹھ سو سکے بنائے جاتے تھے۔ جب ینی چری فوجیوں کو معلوم ہوا کہ اُن کو ادا کیے جانے والے سکے شاخ زریں میں سبزی فروشوں سے عرشے سے سمندر میں گرنے والے مٹر کے خشک دانوں کی طرح تیرتے تھے تو انھوں نے

بغاوت کر کے ہمارے سلطان کے محل کا یوں محاصرہ کر لیا جیسے وہ کسی دشمن کا قلعہ ہو۔

نصرت نامی ایک خوجانے، جو بایزید مسجد میں وعظ دیتا تھا، بدکاری، افراط زر، جرم اور چوری کے ان دنوں میں خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ ارض روم کے چھوٹے سے قصبے کے رہائشی اس امام مسجد نے پچھلے دس برس میں استنبول پر آنے والی تباہی کی وجہ..... جس میں باہچہ کاپی (Bahçekapi) اور کزنجلر (Kazanjılar) میں لگنے والی آگ شامل ہیں، طاعون جس نے لاکھوں جانیں لیں، لاتعداد جانوں کی قربانی دے کر ایرانیوں کے ساتھ لڑی گئی جنگیں، اس کے ساتھ ساتھ مغرب میں عیسائیوں کی بغاوت سے ہاتھ سے نکلنے والا چھوٹا سا عثمانی قلعہ ...... ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے انحراف، قرآن کریم کے احکامات کا عدم احترام، عیسائیوں سے رواداری، شراب کی کھلے عام فروخت اور درویشوں کی خانقاہوں میں موسیقی تھے۔

اچار فروش نے جذباتی انداز میں مجھے ارض روم کے امام مسجد کے متعلق بتایا اور کہا کہ وینس کے..... جعلی وہ شلنگ کے سکوں پر شہر کی معیشت ٹکی ہوئی تھی، سلطنت عثمانیہ کے سکے جن میں چاندی کی مقدار متواتر کم ہوتی جا رہی تھی..... بازار میں افراط کے ساتھ گردش اسی طرح میں تھے، جس طرح سرکیشیائی، ابغازی، منگریلی، بوسنیائی، جارجین اور آرمینیائی بے گلیاں اٹی پڑی تھیں اور جو ہمیں مکمل ذلت کی طرف اس طرح دھکیل رہے تھے کہ اس سے بچ نکلنا مشکل تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ لفنگے بدمعاش اور باغی، کافی خانوں میں اکٹھے ہو کر طلوع صبح تک ایک دوسرے کے فرقے بدلنے کے لیے بحثیں کرتے۔ مشکوک کردار کے مفلس لوگ، افیم کے عادی پاگل اور درویشوں کے غیر قانونی فرقے..... کے ماننے والے، اپنی راتیں خانقاہوں میں موسیقی کی تال پر ناچتے گزارتے اور ہر قسم کی بدکاری کے مرتکب ہوتے، ایک دوسرے اور جتنے بھی لڑکے مل جائیں ان کے ساتھ بدفعلی کرتے تھے۔

مجھے سمجھ نہ آئی کہ یہ بربط کی سریلی آواز تھی جس نے مجھے اپنے پیچھے بلایا یا میری یادوں اور خواہشوں کا آپس میں گڈمڈ ہونا، میں اچار فروش کی باتیں مزید برداشت نہ کر سکا اور موسیقی کو اُس کی باتوں سے چھٹکارے کا ایک رستہ جانا۔ میں بہرحال اس حقیقت سے واقف ہوں، جب آپ کو کوئی شہر بہت پسند ہو اور آپ اُس کے گلی کوچوں میں اکثر اس طرح پیدل گھومتے رہے ہوں کہ روح تو ایک طرف، آپ کا بدن ان گلیوں سے اتنی تفصیل سے واقف ہو کہ اتنے برسوں بعد، افسردگی کے سحر میں، شاید جیسے ہلکی برف باری کی اداسی نے مہمیز دی ہو آپ کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ آپ کی ٹانگیں خود بخود ہی آپ کو پسندیدہ علاقے میں لے جائیں گی۔

یوں میں فیرینیز بازار سے نکلنے میں کامیاب ہوا اور سلیمانیہ مسجد کے نزدیک سے شاخ زریں پر برستی برف باری دیکھنے لگا۔ برف شمال کی سمت میں تعمیر شدہ چھتوں اور شمال مشرقی ہوا کے رُخ میں بنے گنبد کے کئی حصوں پر اکٹھی ہونے لگی تھی۔ شاخ زریں میں داخل ہوتے بحری جہاز کے بادبان نیچے کیے جا رہے

تھے، جس نے پھڑ پھڑاتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔ اُس کے بادبانوں کا رنگ شاخِ زریں کی سیپ جیسی دھندلے سے سرمئی رنگ کی دھند جیسا تھا۔ صنوبر اور چنار کے درخت، چھتیں، شام کے دھندلکے کی اداسی، گردونواح سے آتی آوازیں، ہاکروں کا شور اور مسجد کے صحن میں کھیلتے بچوں کا شوروغل میرے ذہن میں گڈمڈ ہوتے ہوئے اعلان کر رہے تھے کہ اس کے بعد میں اور کہیں نہیں جا سکوں گا، سوائے اس شہر کے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میری محبوبہ کا چہرہ، جسے میرے ذہن سے محو ہوئے برسوں بیت چکے تھے، اچانک میرے سامنے آ سکتا تھا۔

پہاڑی سے نیچے اترتے، میں لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔ نمازِ مغرب کی اذان کے بعد میں نے کلیجی کی دکان پر پیٹ پوجا کی۔ دکان خالی تھی، میں مالک کی باتیں توجہ سے سنتا رہا۔ وہ مجھے یوں شوق سے کھاتا دیکھ رہا تھا جیسے کسی بلی کو کھانا کھلا رہا ہو۔ اُس سے راستہ معلوم کر کے میں غلام منڈی کے پیچھے تنگ گلیوں میں...... اندھیرا پھیلنے کے کافی دیر بعد...... پہنچا اور کافی خانہ تلاش کر لیا۔

کافی خانہ پر ہجوم اور گرم تھا۔ داستان گو جیسے آدمی، میں تبریز اور دوسرے ایرانی شہروں میں دیکھ چکا تھا۔ وہ انگیٹھی میں جلتی لکڑیوں کے پاس اونچے چبوترے پر بیٹھا تھا۔ اُس نے مجمع کے سامنے ایک تصویر کھول کر آویزاں کر رکھی تھی۔ یہ کاغذ پر عجلت میں بنائی گئی لیکن ایک خوب صورت تصویر تھی۔ وہ کتے کی کہانی بیان کر رہا تھا اور ہر تھوڑی دیر بعد اس کی تصویر کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

میں، ایک سگ

جیسا کہ آپ بلاشبہ دیکھ سکتے ہیں پیارے دوستو کہ میرے اگلے دانت کتنے لمبے اور تیز نوکیلے ہیں اور وہ میرے منہ میں مشکل سے ہی سماتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرا حلیہ دھمکی آمیز لگتا ہے لیکن اس سے مجھے خوشی ملتی ہے۔ میرے دانتوں کو دیکھ کر ایک قصاب کو یہ کہنے کا حوصلہ ملا کہ "میرے خدایا! یہ کتا تو بالکل نہیں، یہ تو کوئی جنگلی سور لگتا ہے!"

میں نے اُسے اتنی شدت اور قوت سے کاٹا کہ میرے دانت اُس کی ٹانگ کے گوشت میں ران کی ہڈی تک گڑ گئے۔ کسی بھی کتے کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اُس کے دانت جبلی غصے میں اس کے معیت کے مارے دشمن کے گوشت میں پیوست ہو جائیں۔ جب بھی کوئی ایسا موقع آئے یعنی جب میرا شکار جو اس کا حق دار ہو کہ اسے کاٹ کھایا جائے، حماقت اور بے خبری میں میرے قریب سے گزرے تو کسی توقع کے عالم میں میرے دانتوں میں چبھن اور درد ہونے لگتا ہے، میرا سر گھومتا ہے اور بلا ارادہ میرے منہ سے رونگٹے کھڑے کرنے والی غراہٹ خارج ہوتی ہے۔

میں ایک سگ زادہ ہوں یعنی کتا اور چوں کہ آپ انسان مجھ سے کم سمجھ دار درندے ہیں، آپ کہتے ہیں: کتے بولتے نہیں۔ اس کے باوجود آپ ایسی کہانی کو سچ ماننے کو تیار ہیں جس میں مردے بولتے ہوں اور کردار ایسی باتیں کرتے ہوں جو شاید حقیقت میں اُن کے لیے جاننا ممکن ہی نہ ہو۔ کتے باتیں کرتے ہیں، لیکن صرف اُن کے ساتھ ہی جنھیں معلوم ہو کہ سنتا کیسے ہے۔

بہت پرانے زمانے کی بات ہے، کسی دور دراز علاقے کا قصہ ہے کہ کسی مضافاتی شہر سے کوئی خوجا دار الخلافہ کی بڑی مسجدوں میں سے ایک میں آیا۔ ٹھیک ہے، ہم اس مسجد کو بایزید مسجد کہہ لیتے ہیں۔ خوجا کا نام ظاہر نہ کرنا ہی مناسب ہوگا، اسے ہم حضرت خوجا کے نام سے پکاریں گے۔ اس کے علاوہ میں اور راز میں کیوں رکھوں! وہ ایک گاؤدی قسم کا ملا تھا۔ وہ اپنی عقل کی کمی اپنی طاقت گفتار سے پوری کرتا۔ خدا رحم کرے۔ ہر جمعے کو وہ اپنے خطبے میں لوگوں کو اتنا جوش دلا دیتا کہ کچھ لوگ روتے روتے بے ہوش ہو جاتے یا بالکل ہی بے حال ہو جاتے۔ مجھے غلط مت سمجھیں، دوسرے مبلغوں کے برعکس، وہ خود آنسو نہیں بہاتا

آپ کی اجازت سے میں عزت مآب ہوجا کی آخری بات پر اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہوں گا۔
یہ بات سب کے علم میں ہے کہ حاجی، ہوجا، ملا اور مبلغ ہم کتوں سے کراہت رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ سارا معاملہ ہمارے محترم پیغمبر محمد ﷺ سے وابستہ ہے، جنہوں نے اپنی چادر پر سوئی بلی کو جگا کر اس کی نیند خراب کرنے کی بجائے چادر کا وہ حصہ ہی کاٹ دیا تھا۔ ان کی بلی سے ایسی شفقت جو اتفاق سے ہم سے روا نہ رکھی گئی اور بلیوں کی نسل کے ساتھ ہماری ازلی عداوت کے سبب لوگوں نے یہ سمجھا کہ نبی پاک ﷺ ہمیں ناپسند فرماتے تھے۔ انہیں یقین ہے کہ ہمارے چھونے سے لوگوں کا وضو ٹوٹ جائے گا، اس غلط اور کمزور عقیدے کا نتیجہ یہ ہے کہ مسجدوں میں ہمارے داخلے پر صدیوں سے پابندی ہے اور مسجدوں کے صحن میں داخل ہونے پر ہمیں جھاڑو لہراتے محافظوں سے مار کھانی پڑتی ہے۔

مجھے قرآن کی بے حد خوب صورت سورتوں میں سے ایک سورۃ کہف کی یاددہانی کرانے کی اجازت دیں۔ میں یاددہانی اس لیے نہیں کرا رہا کہ مجھے شک ہے کہ یہاں کافی خانے میں موجود ہم میں سے اکثریت نے قرآن نہیں پڑھا بلکہ میں تو بس آپ کی یادداشت ذرا تازہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سورۃ سات نوجوانوں کی کہانی بیان کرتی ہے جو کافروں کے درمیان زندگی سے تنگ آ کر ایک غار میں جا چھپے جہاں انہیں نیند نے آلیا۔ اللہ نے ان کے کانوں پر مہریں لگا دیں اور وہ 309 برس سوتے رہے۔ جب وہ بیدار ہوئے تو انہیں معلوم نہ ہو پایا کہ وہ اتنے برس سوتے رہے تھے، یہاں تک کہ ان میں سے ایک بازار گیا اور ایک پرانا متروک سونے کا سکہ چلانے کی کوشش کی۔ سب کے سب لوگ یہ جان کر ہکا بکا رہ گئے کہ ان کے ساتھ کیا بیتی تھی۔ یہ سورۃ، انسان کی خدا سے وابستگی، اس کے معجزوں، وقت کی ناپائیداری اور گہری نیند کی طمانیت کو نزاکت سے بیان کرتی ہے اور اگرچہ یہ میرا مقام نہیں، پھر بھی اس سورۃ کی آیت نمبر 18 یاد دلانے دیجیے، جس میں اس غار کے دہانے پر سوتے کتے کا تذکرہ ہے جس میں وہ سات نوجوان محو خواب تھے۔ یقیناً کوئی بھی قرآن میں اپنا ذکر آنے پر فخر کرے گا۔ ایک کتے کی حیثیت سے میں اس بیان پر فخر کرتا ہوں اور اس کے ذریعے میں ارض روم کے لوگوں کی توجہ لینا چاہتا ہوں جو اپنے دشمنوں کا حوالہ دوغلی نسل کے کتوں سے دیتے ہیں۔

تو پھر کتوں سے اس دشمنی کی کیا وجہ ہے؟ پھر آپ اس پر اصرار کیوں کرتے ہیں کہ کتے ناپاک ہوتے ہیں اور اگر کوئی کتا گھر میں داخل ہو جائے تو سارے گھر کی صفائی اور پاکی پر کیوں جت جاتے ہیں؟ آپ یہ یقین کیوں رکھتے ہیں کہ اگر کوئی ہمیں چھو لے تو اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ اگر آپ کا لباس ہمارے گیلے بدن سے چھو جائے تو آپ اسے کسی مخبوط الحواس عورت کی طرح سات بار دھونے پر اصرار کیوں کرتے ہیں؟ صرف قلعی گر ہی اس جھوٹی داستان پر یقین کر سکتے ہیں کہ جس برتن کو کوئی کتا منہ لگا دے، اسے پھینک دینا چاہیے یا پھر دوبارہ قلعی کروانا چاہیے۔ یا پھر، شاید بلیاں.....

جب لوگوں نے شہر کی سست زندگی کے لیے گاؤں چھوڑا، گڈریوں یا چرواہوں کے کتے انھی

مضافات میں رہ گئے تبھی مجھ جیسے کتوں کی ناپاکی کی افواہیں اڑنی شروع ہوئیں۔ تاہم، ظہورِ اسلام سے قبل سال کے بارہ میں سے دو مہینے ''سگ مہینے'' تھے۔ اگرچہ اب ایک کتے کو بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔ میں آپ پر اپنے مسائل کا بوجھ نہیں لادنا چاہتا، میرے پیارے دوستو آپ جو کہانی سننے اور اس کے اخلاقی نتیجے پر غور و خوض کرنے آئے ہیں، ایمان داری سے کہوں تو مجھے دراصل غصہ ان جذباتی مولویوں کے کافی اور ہمارے کافی خانوں پر حملے پر آتا ہے۔

آپ کیا سوچیں گے اگر میں کہوں کہ ارضِ روم کے حضرت کی پیدائش مشکوک تھی؟ لیکن لوگوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ تم کس قسم کے کتے ہو؟ تم بے چارے خوجا پر حملہ کر رہے ہو کیوں کہ تمہارا آقا تصویر آویزاں کرنے والا ایک داستان گو ہے جو کافی خانے میں داستان گوئی کرتا ہے اور تم اسے بچانا چاہتے ہو۔ لگے رہو!'' خدا معاف کرے، میں کسی کو بدنام نہیں کر رہا۔ لیکن میں کافی خانوں کا بڑا مداح ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے اس بات سے کوئی مسئلہ نہیں کہ میری شبیہ اس قدر سستے ورق پر بنائی گئی یا یہ کہ میں ایک چوپایہ درندہ ہوں، لیکن مجھے اس کی ضرور حسرت ہوتی ہے کہ میں کسی آدمی کی طرح دو ٹانگوں پر بیٹھ کر آپ کے ساتھ کافی نہیں پی سکتا۔ ہم اپنی کافی اور کافی خانوں کے لیے اپنی جانیں دے دیں گے...... یہ کیا ہے؟ دیکھا، میرا آقا ایک چھوٹے سے قہوہ دان سے میرے لیے کافی ڈال رہا ہے۔ آپ کا کہنا ہے، کوئی تصویر کافی نہیں پی سکتی؟ برائے مہربانی، خود دیکھ لیں کہ وہ کتنی خوشی سے چسکیاں لے رہا ہے۔

آہاں، یہ اپنا کام دکھاتی ہے، مجھے گرم جوش کر دیتی ہے، نگاہ تیز کرتی ہے اور میری سوچوں کو مہمیز دیتی ہے۔ اب سنیں جو میں کہنا چاہتا ہوں: چینی ریشم اور پھولوں سے سجے چینی برتنوں کے ڈھیر کے علاوہ وینس کے ڈیوک نے ہمارے محترم سلطان کی محترمہ بیگم نور حیات سلطان کو اور کیا بھیجا تھا؟ ریشم کی سمور اور پوشاک والی ایک نرم و نازک اطالوی کتیا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ کتیا اس قدر لاڈلی تھی کہ اس کا سرخ ریشمی لباس بھی تھا۔ ہمارے ایک دوست کا اس سے درحقیقت تعلق رہا تھا تو یوں مجھے معلوم ہوا کہ اپنے لباس کے بغیر موڈ میں نہ آتی تھی۔ بہرحال اس کی ان فرنگی سرزمینوں پر تمام ہی کتے ایسا لباس پہنتے تھے۔ میں نے سنا کہ وہاں کسی نام نہاد شائستہ اور مہذب اطالوی خاتون نے کوئی برہنہ کتا دیکھ لیا... یا جو بھی مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں... بہرحال وہ چلائی، ''میرے خدایا، یہ کتا تو برہنہ ہے!'' اور بے ہوش ہوئی اور مر گئی۔

نام نہاد یورپیوں اور کافر فرنگیوں کی سرزمینوں پر ہر کتے کا کوئی مالک ہوتا ہے۔ ان بے چارے جانوروں کی گردنوں میں زنجیریں ڈال کر سڑکوں پر پریڈ کروائی جاتی ہے، انہیں قابلِ رحم غلاموں کی طرح پابہ زنجیر کیا جاتا اور تنہا رکھا جاتا ہے۔ یہ فرنگی ان بے چارے جانوروں کو ان کے گھروں اور حتیٰ کہ بستر میں بھی زنجیروں میں باندھے رکھتے ہیں۔ کتوں کو اجازت نہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ چلیں، کجا کہ سونگھنے یا اچھل کود کی اجازت ہو۔ جب وہ گلیوں میں زنجیروں میں اس بری حالت میں گزرتے ہیں تو ایک دوسرے کو دور سے دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ استنبول میں جو کتے گلیوں میں آزادی سے جتھوں یا کمیونٹی کی

صورت گھومتے ہیں، جیسا کہ ہم گھومتے ہیں، کتے جو ضروری ہو تو انسانوں کو دھکاتے ہیں، جو کسی گرم پرسکون گوشے میں لیٹتے ہیں یا کہیں سائے میں پھیل کر بیٹھتے اور سکون سے سوتے ہیں اور جو جہاں چاہیں فضلہ کر سکتے ہیں اور جسے چاہیں کاٹ سکتے ہیں، ایسے کتے کافروں کے تصور میں بھی نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ میں نے ایسا سوچا ہے کہ ارضِ روم والوں کے پیروکار اس لیے کتوں کے لیے دعا اور انہیں استنبول کی گلیوں میں گوشت کھلانے اور اس کے بدلے دعا لینے کی مخالفت کرتے ہیں اور کیوں وہ خیراتی اداروں کے قیام اور ایسی خدمات کے مخالف ہیں۔ اگر وہ ہم سے دشمنوں کا سا سلوک کرنا چاہیں اور ہمیں کافر بھی کہنا چاہیں تو مجھے انہیں یاد دلانے دیجیے کہ کتوں کا دشمن ہونا اور کافر ہونا ایک ہی سی بات ہے۔ یہاں مجھے امید ہے کہ ان باعث رسوائی انسانوں کی سزا دور نہیں، اور میں دعا گو ہوں کہ یہ ہمیں خود کو کاٹنے کی دعوت دیں جیسا کہ بعض اوقات وہ مثال قائم کرنے کو دیتے ہیں۔

بات ختم کرنے سے پہلے، مجھے کہنے دیجیے: میرا پچھلا آقا ایک بے حد انصاف پرور انسان تھا۔ جب رات کو ہم چوری کے لیے نکلتے تو ایک دوسرے سے تعاون کرتے۔ میں بھونکنا شروع کرتا اور وہ ہمارے شکار کو ذبح کرتا جس کی چیخیں میرے بھونکنے میں دب کر رہ جاتیں۔ میری مدد کے بدلے، وہ قصوروار شخص کو جسے اس نے سزا دی ہوتی، کاٹ کر آدھا اور مجھے کھانے کو دے دیتا۔ مجھے کچا گوشت پسند نہیں۔ خدا کرے کہ ارضِ روم کے اس حوجا کو سزا دینے والا قاتل شخص اس بات کا خیال رکھے تا کہ اس بدذات کے کچے گوشت سے میرا معدہ خراب نہ ہو۔

مجھے قاتل کہا جائے گا

مجھے کبھی یقین نہ آتا کہ میں کسی کی جان بھی لے سکتا تھا، خواہ میرے ہاتھوں اس احمق کے قتل سے چند لمحے پہلے ہی مجھے یہ کیوں نہ بتایا جاتا اور یوں میرا اشتعال کبھی کبھی ایسے غائب ہو جاتا ہے جیسے کوئی پرانا بادبانی جہاز افق پر دور ہوتے نظروں سے اوجھل ہوتا جائے۔ کبھی کبھار میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے میرے ہاتھوں کوئی جرم نہیں ہوا۔ مجھے اُس بے چارے شخص سے مجبوراً چھٹکارا پائے چار روز ہو گئے ہیں، وہ میرے بھائیوں جیسا تھا اور اب کہیں جا کر میں اس صورتِ حال کو قبول کر پایا ہوں۔

میری ترجیح ہوتی کہ میں اس غیر متوقع اور خوفناک الجھن کو بغیر کسی کی جان لیے حل کر لیتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ میرے پاس اور کوئی انتخاب نہ تھا۔ میں نے مسئلے کو موقع پر حل کرتے ہوئے ذمے داری اپنی گردن پر لے لی۔ میں احمقانہ بہادری کرنے والے آدمی کے الزامات کے باعث تمام منی ایچر فنکاروں کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔

اس کے باوجود، اس بات کا عادی ہونے میں وقت لگتا ہے کہ آپ ایک قاتل ہیں۔ گھر میں ٹھہرنا میرے لیے مشکل ہو گیا تھا اس لیے میں باہر نکل آیا۔ اپنی گلی میں ٹھہرنا بھی میرے لیے مشکل ہو گیا تو میں دوسری گلی میں چلا آیا اور پھر اس سے اگلی میں۔ لوگوں کے چہروں غور سے دیکھتے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر خود کو بے گناہ اور معصوم سمجھتے ہیں کیوں کہ انہیں کسی کی زندگی کا دیا بجھانے کا موقع نہیں ملا۔ اس بات پر مشکل سے یقین آتا ہے کہ زیادہ تر لوگ قسمت کے محض ذرا سے الٹ پھیر کے سبب مجھ سے زیادہ نیک یا بہتر ہیں۔ بیشتر چہروں پر حماقت بھرے تاثرات ہیں کیوں کہ ابھی تک انہوں نے کسی کا قتل نہیں کیا اور سارے احمقوں کی طرح، لگتا ہے کہ ان کے ارادے نیک ہیں۔ اس بے چارے شخص کا حساب چکانے کے بعد چار روز تک استنبول کی گلیوں میں آوارہ گردی یہ بتانے کو کافی تھی کہ آنکھوں میں مکاری کی چمک اور چہرے پر اپنی روح کا تاریک سایہ لیے ہر شخص درپردہ ایک قاتل ہے۔ معصوم یا بے گناہ صرف فاتر العقل ہی ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر، آج شب غلام منڈی کی عقبی گلیوں میں واقع کافی خانے میں بھاپ اڑاتی کافی

ے خود کو وحدت دیتے ہوئے، پچھلی دیوار پر لگی کتے کی شبیہ کو دیکھتے، کتے کی روداد سنتے ہوئے میں دھیرے دھیرے اس اتفاق کو بھلانے اور دوسروں کے ساتھ مل کر ہنسنے لگا تھا۔ تب ہی مجھے احساس سا ہوا کہ میرے ہمراہ بیٹھا شخص مجھ سے ملتا جلتا کوئی قاتل تھا۔ اگرچہ وہ میری ہی طرح داستان گو کی باتوں پر ہنس رہا تھا، میرا وجدان اس کے میرے قریب رکھے بازو یا پیالے پر اس کی بے چینی سے بجتی انگلیوں سے جاگ اٹھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کیسے معلوم ہوا لیکن اچانک میں نے مڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ چونک گیا اور اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔ جب ہجوم منتشر ہونا شروع ہوا تو اس کا ایک واقف اسے بازو سے تھام کر بولا: "ایفرت حوجا کے آدمی یقیناً یہاں حملہ کریں گے۔"

بھنویں اچکاتے ہوئے اس نے دوسرے آدمی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ان کا خوف مجھ پر بھی چھا گیا۔ کسی کو کسی کا بھروسا نہ تھا۔ اس لمحے ہر کسی کو اپنے ساتھ بیٹھے شخص سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔

سردی بڑھ گئی تھی اور رستوں کے گوشوں میں اور دیواروں کے ساتھ برف جمع ہو رہی تھی۔ میں تنگ گلیوں میں ٹٹول کر راستہ تلاش کر رہا تھا۔ بعض اوقات، تیل کے لیمپ کی مدھم روشنی کسی لکڑی کے گھر کی تاریک کھڑکیوں اور بند کواڑوں سے چھن کر برف پر پڑتی لیکن مجھے زیادہ کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا اور میں اپنا رستہ چوکیدار کے پتھروں پر ڈنڈا بجانے، پاگل کتوں کے چلانے اور گھروں سے آتے شور سے تلاش کر رہا تھا۔ بعض اوقات، برف کی حیرت انگیز روشنی شہر کی تنگ اور مہیب گلیوں کو روشن کرتی محسوس ہوتی اور تاریکی میں کھنڈروں اور درختوں کے درمیان مجھے لگتا میں نے ویسا کوئی آسیب دیکھا تھا جنہوں نے ہزار برسوں سے استنبول کو ایک نامبارک شہر بنا رکھا تھا۔ کبھی کبھی مجھے گھروں سے کسی بیمار کے کھانسنے، خراٹے لینے یا نیند کے عالم میں نالہ و ماتم کی آوازیں آتیں یا مجھے ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتے شوہروں اور بیویوں کے چیخنے چلانے کا شور سنائی دیتا جب کہ ان کے بچے سسکیاں بھر رہے ہوتے۔

مسلسل چند راتوں سے، قاتل بننے سے پہلے کی خوشی کو دوبارہ جینے، اپنی ہمت بحال کرنے اور داستان گو کو سننے کے لیے میں اس کافی خانے میں آ رہا تھا۔ میرے بیشتر منی ایچر فنکار دوست، میرے وہ بھائی جن کے ساتھ میں نے اپنی عمر گزاری تھی، ہر شب یہاں آتے تھے۔ لیکن اب جب کہ میں اس بدسلیقہ آدمی کو خاموش کروا چکا ہوں جس کے ساتھ میں بچپن سے تصویریں بناتا آیا تھا، میں ان سے دوبارہ ملنا نہیں چاہتا۔ اپنے بھائیوں کی زندگیاں مجھے بہت شرمندہ کرتی ہیں، جو اس گھٹیا جگہ کے زندہ دل ماحول میں گپیں لگائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میں نے داستان گو کے لیے چند تصویریں بھی بنائی تھیں تاکہ وہ مجھ پر مغرور ہونے کا الزام نہ لگا سکے لیکن یہ ان کے رشک و حسد کو ختم کرنے میں ناکام رہا۔

ان کے پاس حسد کرنے کا جواز ہے۔ رنگ بنانے، کتابوں کے حاشیے بنانے اور ان کی تزئین کاری کرنے، اوراق ترتیب دینے، موضوعات کا انتخاب کرنے، چہروں کی تصویر کشی، جنگی اور شکار کے مناظر کی تصویریں بنانے اور وحشی درندوں، سلاطین، بحری جہازوں، گھوڑوں، جنگجوؤں اور عاشقوں کی

مکاسی میں، ان میں سے کوئی میری ہمسری نہیں کر سکتا تھا۔ تصویروں کو روحانی شاعری میں جگمگانے کے میرے فن کی مہارت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا اور نہ ہی طلاکاری میں میرا کوئی ثانی تھا۔ میں شیخی نہیں بگھار رہا، بلکہ آپ کو صرف یہ بتا رہا ہوں تاکہ آپ پوری طرح مجھے سمجھ سکیں۔ حسد وقت کے ساتھ کسی ماہر فنکار کی زندگی کا مصوری جتنا ہی ناگزیر حصہ بن جاتا ہے۔

اپنی اس آوارہ گردی کے دوران، جو میری بے چینی کے سبب لمبی ہوگئی تھیں، میرا سامنا اکثر اپنے نیک، معصوم اور مذہبی ہم وطنوں سے ہوتا، تب اچانک ایک عجیب خیال میرے ذہن میں آتا: اگر میں اس حقیقت کے بارے میں سوچوں کہ میں ایک قاتل ہوں تو میرے سامنے کھڑا شخص میرا چہرہ پڑھ لے گا۔ اس لیے میں شرمندہ ہوتے ہوئے خود کو دوسرے معاملات کے متعلق سوچنے پر مجبور کرتا ہوں جس طرح کم عمری میں میں نماز کے دوران دماغ میں آنے والے عورتوں کے خیالات کو نکالتا تھا۔ جوانی کے ان ایام کے برعکس اب میں بلاشبہ اس قتل کو بھلا سکتا ہوں جو مجھ سے سرزد ہو چکا ہے۔

آپ حقیقت میں یہ سمجھتے ہیں کہ میں یہ تفصیل صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ اس سب کا تعلق میری الجھن سے ہے۔ اگر قتل سے متعلق میں کوئی ایک راز بھی افشا کردوں تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ مجھے آپ سب کے درمیان کسی آسیب کی طرح گھومتے ہوئے بے نام، بے چہرہ قاتل سے اعتراف جرم کرنے والے کسی عام مجرم کے نچلے درجے پر لے آئے گی جو اپنا سر دے کر جرم کی سزا بھگتنے کے لیے خود کو قانون کے حوالے کر چکا ہو۔ مجھے یہ اجازت دیں کہ میں ہر تفصیل بیان نہ کروں اور کسی سراغ صرف خود تک ہی محدود رکھوں: میرے الفاظ اور رنگوں کے انتخاب سے مجھے پہچاننے کی کوشش کریں جیسے کہ جیسے ہوشیار لوگ چور پکڑنے کے لیے اس کا کھرا تلاش کرتے ہیں۔ اس پر ہمیں "اسلوب یا انداز" کے مسئلے کا سامنا ہوتا ہے، جو آج کل بڑی دلچسپی کا حامل ہے۔ کیا کسی منی ایچر فنکار کے لیے لازم ہے کہ اس کا اپنا انداز ہو؟ کیا ایسا ہونا چاہیے؟ رنگ کا کوئی اپنا استعمال، کوئی اپنی جداسی آواز؟

آیئے، منی ایچر فنکاروں کے سرپرست، اُستادوں کے اُستاد بہزاد کے ایک فن پارے کا جائزہ لیں۔ مجھے اس شاہکار کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اسے میری صورت حال سے بھی سروکار ہے کیوں کہ نوے سالہ پرانی ہرات کے انداز کی اس بے عیب کتاب میں ایک قتل کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ کتاب ایک ایرانی شہزادے کے کتب خانے سے ملی جو تخت کے لیے ایک سفاک جنگ میں مارا گیا تھا۔ یہ کتاب خسرو و شیریں کا قصہ بیان کرتی ہے۔ آپ کو خسرو اور شیریں کا مقدر تو معلوم ہوگا۔ میں فردوسی کے نہیں بلکہ نظامی کے نسخے کا حوالہ دے رہا ہوں۔

دونوں عشاق کی بے شمار آزمائشوں اور مصائب کے بعد آخر شادی ہو جاتی ہے۔ لیکن خسرو کی پہلی بیوی کے بطن سے اس کا جوان اور خبیث بیٹا شیرویہ انہیں سکون سے نہیں رہنے دیتا۔ شہزادے کے نظر نہ صرف بادشاہ کے تخت پر بلکہ اس کی نوجوان حسین بیوی شیریں پر بھی تھی۔ شیرویہ جس کے متعلق نظامی نے

نکلا؟ "اس کی سانس میں شیر کی سانس کی بد بو تھی۔" وہ کسی نہ کسی طرح اپنے باپ کو قید کر کے تخت پر قابض ہو جاتا ہے۔ ایک رات وہ اپنے باپ اور شیریں کی خواب گاہ میں داخل ہوا اور تاریکی میں ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھا، ان دونوں کو سوتے پا کر اس نے خاموشی سے اپنے باپ کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ یوں صبح تک اس کے باپ کا خون بہتا رہا اور وہ آہستہ آہستہ اسی بستر پر اس دنیا سے گزر گیا جہاں وہ اپنی حسین وجمیل شیریں کے ہمراہ دراز تھا، جو اس کے پہلو میں سکون سے گہری نیند سوئی رہی۔

عظیم ماہر فنکار بہزاد کی بنائی یہ تصویر اور داستان اُس دہشت کا بیان ہے جو میں کئی برس سے ساتھ لیے گھوم رہا ہوں۔ راتوں کی گھور تاریکی میں بیدار ہونے پر یہ خوف محسوس کرنا کہ کمرے میں کسی اجنبی کے تاریکی میں رینگنے کی ہلکی سی آواز آرہی ہے؛ ذرا تصور کریں کہ وہ مداخلت کار آپ کا ایک ہاتھ سے گلا دبا دے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں خنجر ہو۔ ہر تفصیل، خوب صورتی ومحنت سے بنی دیوار، کھڑکیاں اور ان کے فریم کی سجاوٹ، سرخ قالین کے ڈیزائن، آپ کے گلے سے نکلتی گھٹی ہوئی چیخ اور آپ کے حیرت انگیز نفاست اور محنت سے بنے عالیشان کمبل پر کشیدہ کاری کیے گئے زرد اور کاسنی پھولوں پر آپ کے قاتل کے تب بے رحمی سے رکھے پیر جب وہ آپ کی زندگی لے رہا ہو۔ تصویر کے حسن میں اضافہ کرتے ہوئے وہ آپ کو یاد دلاتے ہیں کہ وہ کمرا جس میں آپ کچھ دیر میں مرنے والے ہیں اور وہ دنیا جو آپ جلد ہی چھوڑ جائیں گے، کس قدر حسین ہیں۔ آپ کی موت سے تصویر کی خوب صورتی اور دنیا سے لاتعلقی، یہ حقیقت کہ بیوی کے موجود ہوتے ہوئے بھی موت کے وقت آپ تنہا ہیں، وہ ناقابل گریز ہیں جو ذہن کو ہلا دیتے ہیں۔

"یہ تصویر بہزاد کی بنی ہے۔" بیس برس قبل میرے بزرگ استاد نے تب بتایا تھا جب ہم میرے کپکپاتے ہاتھوں میں تھامی کتاب دیکھ رہے تھے۔ ان کا چہرہ قریب رکھی شمع کی بجائے تصویریں دیکھنے سے چمکنے لگا تھا۔ "یہ بہزاد کی بنی ہوئی ہے اور اس پر اُن کے دستخط کی بھی ضرورت نہیں۔"

بہزاد اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ انہوں نے تصویر کے کسی حصے میں اپنے دستخط نہیں چھپائے۔ لیکن بزرگ استاد کے مطابق، ان کے اس فیصلے کے پیچھے خجالت اور شرم کا احساس تھا۔ جب فن سچا ہو اور اصل نیکی کا وجود ہو تو فنکار اپنی شناخت کا ہلکا سا بھی اظہار کیے بغیر کوئی بے مثال شہکار تخلیق کر سکتا ہے۔

خود اپنی جان کے خوف میں، میں نے اپنے بدقسمت شکار کو ایک عام اور بے سلیقہ طریقے سے قتل کیا۔ جب میں اس آتش زدہ علاقے میں بار بار کئی راتیں یہ دیکھنے کے لیے گیا کہ میں کہیں اپنے پیچھے کوئی سراغ یا نشان تو نہیں چھوڑ آیا جو میرا بھانڈا پھوڑ دیتا تو الگ انداز کا سوال میرے ذہن میں الجھنے لگا۔ جسے انداز کہا جاتا تھا وہ کسی خامی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، جو اپنے مصور کا راز آشکار کر دیتی ہے۔

برف باری کی روشنی کے بغیر بھی میں وہ جگہ پہچان سکتا تھا کیوں کہ آتش زدگی سے تباہ یہی وہ جگہ تھی جہاں میں نے پچیس برس سے اپنے ساتھی کی جان لی تھی۔ برف نے اب ان تمام نشانوں کو ڈھانپ اور مٹا دیا تھا جن کو دستخط سمجھا جا سکتا، یہ ثابت کرتے ہوئے کہ اللہ نے اسلوب یا انداز اور دستخط کے معاملے پر

بہزاد اور مجھ سے اتفاق کیا تھا۔ اگر ہم نے اس کتاب میں مصوری کر کے ناقابل معافی گناہ کیا تھا ۔۔۔۔۔۔ جیسا چار روز پہلے اس فاتر العقل نے کہا تھا ۔۔۔۔۔ چاہے ہم نے بے خبری میں ایسا کیا ہو، تو اللہ ہم منی ایچر فنکاروں پر ایسی عنایت نہ کرتا۔

اس رات جب نفیس آفندی اور میں یہاں آئے تب برف باری شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم دور کہیں مونگریل کتوں کا بھونکنا سن سکتے تھے۔

"آخر ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟" اس بدنصیب نے پوچھا تھا، "اتنی رات گئے تم مجھے یہاں کیا دکھانا چاہتے ہو؟"

"ذرا آگے، بارہ قدم کے فاصلے پر وہ کنواں ہے جس میں میری برسوں کی بچت دفن ہے۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ میں نے بتایا ہے، اگر اسے تم راز رکھو تو انشتے آفندی اور میں چاہیں گے کہ تمہیں ایک بڑی رقم بطور انعام دیں۔"

"کیا میں یہ تمہارا اعتراف سمجھوں کہ کہ تم نے یہ سب برسوں سے طے کر رکھا تھا۔"

"میں تسلیم کرتا ہوں۔" میں نے تابع داری سے جھوٹ بولا۔

"تم اعتراف کرتے ہو کہ تمہاری بنائی تصویر دراصل بے ادبی ہے۔ ہے نا؟" اس نے معصومیت سے پوچھا، "یہ کفر اور توہین ہے اور کوئی مہذب شخص ایسا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ تم ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلو گے۔ تمہاری تکلیف اور درد بھی کم نہیں ہوں گے ۔۔۔۔۔ اور تم نے تو مجھے بھی اس جرم میں شریک کر لیا ہے۔"

اس کی بات سنتے ہوئے مجھے دہشت سے محسوس ہوا کہ اس کے الفاظ میں اتنی شدت اور گہرائی تھی کہ چاہے یا اَن چاہے بھی لوگ اس کی بات سنتے، اس امید میں کہ وہ ان کی اپنی ذات کے علاوہ دوسرے بے چاروں کے لیے درست ثابت ہوں گی۔ کتاب کے خفیہ ہونے اور اس پر خرچ بڑی رقم کے سبب، اس کے کتاب پر کام کرنے والے انشتے آفندی کے متعلق کئی قسم کی افواہیں اڑنے لگی تھیں ۔۔۔۔ اور اس لیے بھی کہ سربراہ مصور استاد عثمان انہیں ناپسند کرتے تھے۔ مجھے خیال ہوا کہ میرے بھائی مصور نفیس نے بدنیتی سے ان حقائق کو جھوٹے الزامات کو سچ ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ وہ کس حد تک ایماندار رہا تھا؟

میں نے اسے وہ الزام دہرانے دیے جنہوں نے ہمیں ایک دوسرے کے خلاف کر دیا تھا۔ اس نے بات کرتے ہوئے اپنے خیالات نہ چھپائے۔ وہ مجھے ایک غلطی چھپانے پر اُکسا رہا تھا جیسا کہ شاگردی کے دنوں میں ہم استاد عثمان کی پٹائی سے بچنے کے لیے کیا کرتے تھے۔ ان دنوں میں مجھے اس کا خلوص سچا لگتا تھا۔ بطور شاگرد اس کی آنکھیں اسی طرح پھیلی تھیں جیسے اب، لیکن مصوری کی مشقت سے تب وہ کمزور نہ ہوئی تھیں۔ لیکن پھر آخر میں نے اپنا دل سخت کر لیا، وہ سب کے سامنے ہر بات کا اعتراف کرنے کو تیار تھا۔

"میری بات سنو۔" میں نے جبری قصے سے کہا، "ہم مصوری کرتے ہیں، حاشیوں کی تزئین

کرتے ہیں، ہم صفحوں کے فریم بناتے ہیں، ہم سونے کے دلکش ورق سے صفحے کے صفحے سجا دیتے ہیں، ہم عظیم تصویریں بناتے ہیں، ہم توشہ خانوں اور صندوقوں کی نقاشی کرتے ہیں۔ ہم نے برسوں سے کچھ اور نہیں کیا۔ یہی ہمارا پیشہ ہے۔ وہ ہمیں تصویریں بنانے کی ذمہ داری دیتے ہیں۔ وہ ہمیں کسی فریم کے اندر بحری جہاز، ہرن یا سلطان کی شبیہ بنانے کا کہتے ہیں، کسی خاص انداز سے پرندے کی تصویر، کوئی خاص صورت، کسی خاص کہانی کا یہ منظر لے لو اور فلاں فلاں بھول جاؤ۔ وہ جو بھی کہیں، ہم بنا دیتے ہیں۔ سنو، انشٹے آفندی نے مجھ سے کہا تھا، ''یہاں ایک گھوڑا بناؤ، جو تمہارے تصور میں ہے۔'' تین روز میں نے پرانے عظیم فنکاروں کی طرح سینکڑوں گھوڑوں کی تصویریں بنائیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ میرے اپنے تخیل کا گھوڑا کون سا تھا۔ اپنے ہاتھ کی روانی کے لیے میں نے سمرقند کے کھردرے کاغذ پر کئی گھوڑے بنائے۔

میں نے وہ خاکے نکالے اور نفیس کو دکھائے۔ اس نے انہیں دلچسپی سے دیکھا اور مدہم سی چاندنی میں کاغذ پر جھک کر سیاہ و سفید گھوڑوں کا جائزہ لینے لگا۔ ''شیراز اور ہرات کے پرانے ماہر فنکار۔'' میں نے کہا۔ ''ان کا دعویٰ ہے کہ ایک منی ایچر فنکار کو اللہ کے متصورہ گھوڑے کی درست عکاسی کے لیے پچاس سال تک مسلسل تصویریں بنانا ہوں گی۔ ان کا کہنا تھا کہ گھوڑے کی بہترین تصویر تاریکی میں بنانی چاہیے کیوں کہ مسلسل پچاس سال کام کرتے کوئی منی ایچر فنکار نابینا ہو جائے گا لیکن اس دوران اس کے ہاتھ کو گھوڑے کے خطوط ازبر ہو جائیں گے۔''

اس کے چہرے کے اس معصوم تاثر سے جو میں نے کئی برس پہلے اپنے بچپن میں بھی دیکھا تھا، مجھے معلوم ہوا کہ وہ مکمل طور پر میری بنی تصویروں میں کھو گیا تھا۔

''وہ ہمیں کام کی ذمے داری دیتے ہیں اور ہم بہت پُراسرار، ناقابل رسائی گھوڑا بناتے ہیں جیسے پرانے فنکار بنایا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں ہے۔ یہ ناانصافی ہوگی کہ وہ تصویر کے سوا کسی اور پہلو کا ہمیں ذمے دار ٹھہرائیں۔''

یہ ایک موزوں جواب تھا۔

''اللہ سب دیکھتا اور سب سے باخبر ہے.... '' میں نے عربی میں کہا، ''اسے معلوم ہو جائے گا کہ تم اور میں، ہم نے یہ کام اس بات سے باخبر ہونے کے باوجود کیا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ انشٹے آفندی کے بارے میں تم کسے اطلاع دو گے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس معاملے میں ہمارے محترم سلطان کی رضامندی بھی شامل ہے۔''

خاموشی۔

مجھے خیال ہوا کہ کیا وہ واقعی اتنا نادان ہے یا اس کا یہ آپے سے باہر ہونا اور کھلی گفتگو اللہ کے خوف کی وجہ سے ہے۔

ہم کنوئیں کے دہانے پر آ کر رک گئے۔ میں نے سرسری نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور مجھے

محسوس ہوا کہ وہ خوف زدہ تھا۔ مجھے اس پر رحم آیا، لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ میں نے خدا سے دعا کی کہ وہ مجھے مزید اشارہ دے کہ میرے سامنے کھڑا شخص نہ صرف مسخرہ بلکہ ناقابل اصلاح گھٹیا آدمی ہے۔

''بارہ قدم گنو اور کھودنا شروع کرو۔''

''پھر تم کیا کرو گے؟''

''میں الشیخ آفندی کو وضاحت دوں گا اور پھر وہ تصویریں جلا دیں گے۔ اس کے سوا اور کیا رستہ ہے؟ اگر نصرت خوجا کے کسی مرید نے ایسا الزام سن لیا تو ہم یا کتاب خانے میں سے کسی کا کچھ نہیں بچے گا۔ کیا تم ارض روم والوں سے واقف ہو؟ یہ رقم لے لو تا کہ ہم سب کو یقین ہو جائے کہ تم ہماری کوئی مخبری نہیں کرو گے۔''

''رقم کس چیز کے اندر ڈالی ہوئی ہے؟''

''مٹی کے مرتبان میں سونے کے پتھر رکھے ہیں۔''

سونے کے سکوں کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن مٹی کے مرتبان کا خیال میرے ذہن میں کیسے آیا؟ وہ خیال جتنا بھی سوچتے احمقانہ ہی تھا۔ مجھے اس پر تسلی ہوئی کہ خدا میرے ساتھ تھا اور اس نے مجھے ایک اشارہ دیا تھا۔ میرے پرانے شاگرد ساتھی نے دولت کے لالچ میں ہر گزرتے برس اضافہ ہوتا رہا تھا، میری بتائی سمت میں گن کر قدم بڑھانے شروع کر دیے تھے۔

اس لمحے میرے دماغ میں دو باتیں تھیں۔ ایک یہ کہ کوئی ویسی رقم وہاں دفن ہی نہیں تھی! اگر میں اسے کوئی رقم نہ نکال سکا تو یہ گاؤدی ہمیں تباہ کر دیتا۔ اچانک میرا جی چاہا اسے گلے لگا کر اس کے رخسار چوم لوں، جیسا کہ ہماری شاگردی کے دنوں میں کیا کرتا تھا، لیکن پھر اچانک ہمارے بیچ کئی برس حائل ہو گئے! دوسرے، یہ کہ میرے دماغ پر یہ خیال حاوی تھا کہ ہم کھدائی کیسے کریں گے؟ کیا اپنے ناخنوں سے؟ لیکن یہ سوچ بچار، اگر اسے سوچ بچار کہا جائے تو صرف تھوڑے ہی وقت کے لیے تھی۔

سراسیمہ ہو کر میں نے کنوئیں کے قریب پڑا ایک پتھر اٹھا لیا۔ جب وہ ابھی ساتویں یا آٹھویں قدم پر تھا، میں لپک کر اس کے قریب پہنچا اور اس کے سر کے پچھلے حصے پر پوری قوت سے پتھر دے مارا۔ میں نے اتنی تیزی اور بے رحمی سے ضرب لگائی تھی کہ لمحے بھر کو میں خود ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ پتھر میرے اپنے سر پر لگا ہو۔ ہائے، میں نے اس کے درد کو محسوس کیا۔

اپنے کیے پر کرب زدہ ہونے کی بجائے میں یہ کام جلدی سے تمام کرنا چاہتا تھا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا تھا اور اس پر میری پریشانی مزید گہری ہو گئی۔

دیر بعد جب میں اسے کنوئیں میں گرا چکا تھا، میں نے غور کیا کہ میرے اس کام کی بدسلیقگی کیسے کسی منی ایچر فنکار کے لیے موزوں نہ تھی۔

میں تمہارا انشتے ہوں

میں قرہ (سیاہ) کا خالو ہوں، اُس کا انشتے، لیکن دوسرے لوگ بھی مجھے انشتے ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔ وہ وقت بھی تھا جب قرہ کی ماں نے اُسے مجھے انشتے آفندی کہنا سکھایا اور بعد میں نہ صرف قرہ بلکہ ہر کوئی مجھے اسی طرح پکارنے لگا۔ تیس برس پہلے جب ہم آک سرائے (Aksaray) محلے سے آگے اخروٹ اور لیموں کے پیڑوں کے سائے میں نیم تاریک اور حبس زدہ گلیوں کے ایک گھر میں منتقل ہوئے تو قرہ اکثر ہمارے گھر کے چکر لگانے لگا تھا۔ اس [illegible] آنے سے پہلے ہم وہاں رہا کرتے تھے۔ میں اگر محمود پاشا کے ساتھ گرما کی مہم پر جاتا تو خزاں میں واپسی پر معلوم ہوتا کہ قرہ اور اس کی ماں میرے گھر میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ قرہ کی ماں، خدا بخشے، میری مرحومہ بیوی کی بڑی [illegible] تھی۔ سرما کی شاموں میں میں اکثر گھر واپسی پر انہیں ایک دوسرے کے گلے لگ کر روتے اور دلاسا دیتے پاتا تھا۔ قرہ کا باپ، جو دور افتادہ علاقوں میں اپنی معلمی کی ملازمت برقرار نہیں رکھ پاتا تھا، ایک بدمزاج، غصیلا اور [illegible] شخص تھا۔ اس وقت قرہ چھے برس کا تھا، اپنی ماں کے ساتھ وہ بھی رونے لگتا، جب وہ خاموش ہوتی تو رونا بند کر دیتا [illegible] یعنی اپنے انشتے کا احترام کرتا تھا۔

اب اُسے اپنے سامنے دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے، ایک پُرعزم، بالغ اور مودب بھانجا۔ میرے لیے وہ جو احترام رکھتا ہے، جس محبت سے وہ میرے ہاتھ کو بوسہ دے کر اپنی پیشانی سے لگاتا ہے، مثال کے طور پر، جیسا کہ منگول دوات کا تحفہ دیتے اُس نے کہا تھا: "یہ خالصتاً سرخ رنگ کے لیے ہے"، اس کی اپنے گھٹنے جوڑ کر میرے سامنے احترام اور متانت سے بیٹھنے کی عادت، یہ سب صرف یہی نہیں بتاتے کہ وہ ویسا باشعور نوجوان بن گیا ہے جیسی اسے تمنا تھی بلکہ مجھے بھی یاد دلاتا ہے کہ میں ویسا کمزور مگر قابل احترام بوڑھا بن گیا ہوں جیسی مجھے آرزو تھی۔

وہ اپنے باپ سے مشابہت رکھتا ہے جسے میں نے ایک آدھ بار ہی دیکھا ہے۔ وہ دراز قد، دبلا پتلا ہے اور اپنے بازوؤں اور ہاتھوں کی حرکت سے کسی حد تک گھبرایا ہوا لیکن باوقار تاثر دیتا ہے۔ اس کی اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کی عادت یا توجہ سے میری آنکھوں میں یوں جھانکنا جیسے کہتا ہو، "میں سمجھتا ہوں، میں آپ کی باتیں عقیدت و احترام سے سن رہا ہوں۔" یا جس طرح وہ میرے الفاظ سے ہم آہنگ

روم کے ساتھ اپنے سر کو جنبش دیتا ہے۔ اب جب کہ میں اس بزرگ عمر کو پہنچ چکا ہوں، میں جانتا ہوں کہ حقیقی احترام دل سے نہیں بلکہ منفرد اصولوں اور پاس ادب سے ابھرتا ہے۔

جن برسوں میں قرہ کی ماں ہر بہانے اُسے ہمارے گھر لاتی تھی کیوں کہ یہاں اسے قرہ کے اچھے مستقبل کی توقع تھی، میں جان گیا کہ اسے کتابوں سے دلچسپی تھی اور یہی ہمیں ایک دوسرے کے قریب لایا۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ وہ میرا "شاگرد" بنے گا۔ میں نے اسے بتایا کہ شیراز میں منی ایچر فنکاروں نے افق کو حاشیے تک بلند کر کے کیسے نیا اسلوب یا انداز تخلیق کیا ہے، اور یہ کہ جب ہر کوئی لیلیٰ کے عشق میں گرفتار مجنوں کی ریگستان میں شکستہ حالت کی عکاسی کر رہا تھا، عظیم بہزاد نے اس کی تنہائی کی عکاسی کے لیے اسے خیموں کے درمیان یا عورتوں کے جھرمٹ میں گھومتے دکھایا جو لکڑیوں کو آگ لگانے کے لیے ان پر پھونکیں مار رہی تھیں۔ میں نے تبصرہ کیا کہ یہ کس قدر بے سروپا تھا کہ جب اکثر منی ایچر فنکار جنہوں نے شیریں کو نصف شب جھیل میں نہاتے چپکے سے دیکھتے خسرو کی تصویر کشی کی، انہوں نے نظامی کی نظم پڑھے بغیر ان محبت کرنے والوں کے گھوڑوں اور لباسوں کو جو شوخ رنگ دیے تھے، میرا نکتہ یہ تھا کہ جس منی ایچر فنکار نے تفصیل سے پڑھنے کی پروا اور زحمت کیے بغیر موقلم (برش) اٹھایا، اس کا سوائے لالچ کے اور کوئی محرک نہ تھا۔

مجھے اب یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ قرہ نے ایک اور خوبی حاصل کر لی تھی: فن میں ناکامی سے بچنے کے لیے اسے بطور پیشہ نہیں لینا چاہیے۔ چاہے کسی ایک آدمی کے پاس کتنی ہی فنکارانہ صلاحیت ہو اسے دولت و اختیار کے حصول کے لیے کوئی اور طریقہ اپنانا چاہیے تاکہ وہ اپنی محنت اور فن کا درست صلہ نہ پانے پر اپنے فن کو ترک کرنے سے بچ سکے۔

قرہ نے بتایا کہ کیسے وہ پاشاؤں، استنبول کے امیروں اور صوبوں کے گورنروں کی کتابیں بنانے تبریز کے منی ایچر فنکاروں اور خطاطوں سے ملا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ تمام فنکار غریب اور بدقسمتی کا شکار تھے۔ نہ صرف تبریز بلکہ مشہد اور حلب میں بھی متعدد منی ایچر فنکار کتابوں پر کام ترک کر کے ایک ورق کی عجیب قسم کی تصویریں بنانے لگے تھے ...... تجسس جو فرنگی سیاحوں کو خوش کرتا ...... حتیٰ کہ اخلاق سے گری تصاویر بھی۔ افواہ تھی کہ شاہ عباس کی کتاب جو تبریز امن معاہدے کے وقت ہمارے سلطان کو پیش کی گئی تھی، اسے وہاں سے نکال لیا گیا تاکہ اس کے اوراق کسی اور کتاب میں استعمال کیے جا سکیں۔ شہنشاہ ہندوستان اکبر ایک کتاب کی تیاری پر بے پناہ دولت خرچ کر رہے تھے اور تبریز اور قزوین کے بیشتر فنکار اپنا کام چھوڑ چھاڑ ان کے دربار میں جمع ہونے لگے تھے۔

یہ سب بتاتے ہوئے اس نے درمیان میں خوش گواری سے دیگر قصے بھی شامل کیے، مثال کے طور پر، اس نے مسکراتے ہوئے جعلی مہدی کی پرلطف کہانی سنائی جو ازبکوں میں وقوع ہوئی جب ان کی طرف امن کے لیے بھیجا گیا احمق صفوی شہزادہ بیمار ہو کر تین روز میں مر بھی گیا۔ میں اس کے چہرے پر چھائے سائے سے اس الجھن کا بتا سکتا تھا جس کا ہم دونوں نے حوالہ نہ دیا لیکن جو ہم دونوں کو پریشان کیے

ہوئے تھی اور اسے ابھی حل کیا جانا تھا۔

فطری بات تھی کہ قرہ بھی اس دوسرے نوجوان کی طرح جو ہمارے گھر آیا یا اس نے دوسروں سے ہمارے بارے میں سن رکھا تھا یا جس نے ادھر اُدھر سے میری بیٹی شکورے (Sekure) کے متعلق سن رکھا تھا، اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ شاید تب میں نے اسے اتنا خطرناک نہیں سمجھا کہ اہمیت دیتا لیکن ہر کوئی ــــ وہ بھی جنہوں نے اسے حقیقت میں کبھی نہ دیکھا تھا ــــ اس کی محبت میں گرفتار تھے۔ قرہ کا عشق ایک ایسے بدقسمت نوجوان کا عشق تھا جس کا ہمارے گھر میں بلا رکاوٹ آنا جانا تھا، جسے ہمارے ہاں پسند کیا جاتا تھا اور جسے شکورے سے حقیقت میں ملنے کا موقع بھی ملتا تھا۔ اس نے اپنی محبت چھپائی نہیں، جیسا کہ میری تمنا تھی اور میری بیٹی کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرنے کی غلطی کر بیٹھا۔

اس کے نتیجے میں اس کا ہمارے گھر آنا جانا مکمل طور پر بند کر دیا گیا۔

میرا خیال ہے کہ قرہ اب یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے استنبول سے جانے کے تین برس بعد کیسے میری بیٹی نے گھڑسوار رسالے کے سپاہی سے شادی کر لی تھی، اور یہ کہ اس سپاہی سے اس کے ہاں دو بیٹے ہوئے لیکن پھر بھی عقل سے عاری سپاہی ایک ایسی مہم پر چلا گیا جس سے وہ کبھی واپس نہ آیا۔ چار برس سے اس سپاہی کی کوئی خیر خبر نہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس مسئلے سے واقف تھا، اس لیے نہیں کہ استنبول میں ایسی افواہیں تیزی سے پھیلتی ہیں، بلکہ اس لیے کہ ہمارے درمیان طویل خاموشی کے وقفوں میں جس طرح وہ میری آنکھوں میں جھانکتا تھا، مجھے محسوس ہوا کہ اسے کافی عرصہ پہلے سب اندازہ ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ اس لمحے بھی جب اس کی نگاہیں رحل پر رکھی ہوئی "بادی الارواح" پر ہیں، میں جانتا تھا کہ اس کے کان میری بیٹی کے گھر میں بھاگتے دوڑتے بچوں کی آوازوں پر لگے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اسے خبر ہے کہ میری بیٹی اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ اپنے باپ کے گھر پلٹ آئی ہے۔

میں نے قرہ کی غیر حاضری میں بنائے اس گھر کے ذکر کو نظر انداز کر دیا تھا۔ شہرت اور دولت پر نظر رکھے کسی نوجوان کی طرح شاید قرہ نے اس موضوع کو زیر بحث لانا غیر اخلاقی سمجھا تھا۔ پھر بھی جب ہم گھر میں داخل ہوئے میں نے سیڑھیوں پر اسے بتایا کہ دوسری منزل پر ہمیشہ گرمی کم ہوتی تھی اور سیڑھیاں چڑھنے سے میرے جوڑوں کا درد بھی کم رہتا تھا۔ جب میں نے "دوسری منزل" کہا تو مجھے عجیب طرح کی خجالت ہوئی، لیکن مجھے بتانے دیں، مجھ سے کم حیثیت لوگ، حتیٰ کہ محدود تنخواہ والے سادہ گھڑسوار سپاہی بھی جلد ہی دو منزلہ گھر بنانے کے قابل ہوں گے۔

ہم نیلے دروازے والے اس کمرے میں بیٹھے تھے جہاں میں سردیوں میں مصوری کا کام کرتا تھا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ملحقہ کمرے میں شکورے کی موجودگی سے باخبر تھا۔ میں نے فوراً اس پر وہ معاملہ ظاہر کر دیا جس نے مجھے اسے تبریز وہ خط لکھ بھیجنے کی تحریک دی تھی جس میں اسے استنبول مدعو کیا گیا تھا۔

"جس طرح تم نے تبریز میں خطاطوں اور منی ایچر فنکاروں کو جمع کیا، میں بھی ایک کتاب کی

تزئین کاری کی تیاری کر رہا ہوں۔" میں نے بتایا، "دراصل مجھ سے یہ کام لینے والے ہمارے سلطان عالی مقام ہیں۔ چوں کہ یہ کتاب ایک راز ہے، اس لیے ہمارے سلطان نے اس کی ادائی سربراہ خزانچی کے ذریعے کی ہے اور مجھے سلطان کے تمام قابل اور ہنرمند منی ایچر فنکاروں سے متعارف کروایا گیا ہے۔ میں نے اس عمل میں ان میں سے ایک کو کتا، دوسرے کو درخت، تیسرے کو حاشیے کی تزئین اور اوراق پر بادل بنانے اور اس کے علاوہ ایک اور کو گھوڑے بنانے کی ذمے داری سونپی ہے۔ میں ہمارے سلطان کے سارے جہان کی تصویر کشی چاہتا تھا، بالکل وینس کے فنکاروں کی طرح۔ لیکن وینسی فنکاروں کے برعکس میرا کام محض مادی چیزوں کی عکاسی نہ ہوگا بلکہ یہ سلطان کی زیر سلطنت باطنی خوبیوں، خوشیوں اور خدشات کی بھی عکاسی کرے گا۔ اگر میں نے سونے کے سکے کی تصویر شامل کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ دولت کی تحقیر تھی، اگر میں نے موت اور شیطان کو شامل کیا تو اس کی وجہ ہمارا ان سے خوف کھانا تھا۔ میں درخت کے لافانی ہونے، گھوڑے کی تھکاوٹ اور کتے کی بیہودگی کو ہمارے سلطان کی دنیاوی سلطنت کی ترجمانی کے لیے دکھانا چاہتا تھا۔ میں اپنے جیسے مصوروں جن کی عرفیت "بگلا"، "زیتون"، "نفیس" اور "تتلی" تھے، سے بھی چاہتا تھا کہ وہ اپنی مرضی کے موضوعات کا انتخاب کریں۔ سرما کی ٹھٹھرتی شاموں میں جب گھروں سے نکلنا ناممکن سا ہوتا، ہمارے سلطان کے مصوروں میں سے کوئی ایک چوری چھپے مجھے دکھانے آتا کہ اس نے کتاب کے لیے کیا تیار کیا تھا۔

"ہم کس قسم کی تصویریں بنا رہے تھے اور اس انداز میں ان کی تصویر کشی کیوں کر رہے تھے؟ میں اس وقت تمھیں مناسب جواب نہیں دے سکتا۔ اس لیے نہیں کہ میں تم سے کوئی راز رکھ رہا ہوں اور اس لیے بھی نہیں کہ آخرکار میں تمھیں نہیں بتاؤں گا۔ یوں سمجھ لو کہ ابھی مجھے بھی معلوم نہیں کہ ان تصویروں کے اصل معنی ہیں کیا۔ مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ تصویریں ہونی کس طرح کی چاہئیں۔"

وہ خط روانہ کرنے کے چار ماہ بعد اس حجام سے معلوم ہوا جو ہمارے پرانے مکان والی گلی میں کام کرتا تھا کہ قرہ، استنبول واپس آ گیا تھا اور میں نے اسے ہمارے گھر مدعو کیا۔ میں پوری طرح واقف تھا کہ میری کہانی میں دکھ اور خوشی کا ایسا امتزاج تھا جو ہم دونوں کو مستقبل میں ایک دوسرے سے جوڑ دیتا۔

"ہر تصویر کوئی کہانی بیان کرتی ہے۔" میں نے کہا، "منی ایچر فنکار اپنے زیر مطالعہ مسودے کو خوب صورت بنانے کے لیے اہم مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے: محبت کرنے والے جب پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، جوانمرد رستم شیطانی دیو کا سرتن سے جدا کرتا ہے، رستم کا رنج وغم جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جسے قتل کیا وہ اسی کا اپنا بیٹا ہے، بیابانوں میں شیر، چیتے، ہرن اور گیدڑوں کے درمیان سرگرداں عشق کا مارا مجنوں، سکندر کا ذہنی کرب جب وہ معرکے سے پہلے جنگل میں پرندوں سے شگون لینے آتا ہے اور ایک عقاب کو اپنے آبیا پرندے کو شکار کرتے دیکھتا ہے۔ ہماری ان کہانیوں کے مطالعے سے تھکن زدہ آنکھیں ان تصویروں پر ٹھہر جاتی ہیں۔ اگر متن میں کچھ ایسا ہے جسے ہماری عقل اور تخیل گرفت میں

لانے سے قاصر ہیں تو تصویریں ہماری مدد کرتی ہیں۔ یہ تصویریں دراصل کہانی کے رنگوں میں کھلے معانی ہیں۔ لیکن تصویر کو کہانی کے متن کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔۔"

"یا یہ میرا ہی خیال تھا۔" میں نے تاسف سے مزید کہا، "لیکن یہ بے شک ممکن ہو سکتا ہے۔

دو سال قبل میں ایک بار پھر سلطان کے قاصد کی حیثیت سے وینس گیا۔ میں تفصیل سے وینس کے فنکاروں کی بنائی تصویریں دیکھیں۔ میں نے ان مناظر یا کہانی کو جانے بغیر جن سے متعلق وہ تصویریں تھیں، ان پر غور کیا اور مجھے ان خاکوں سے کہانی سمجھنے میں دقت پیش آئی۔ ایک روز میرا گزر ایک عوامی عمارت میں آویزاں تصویر سے ہوا اور میں مبہوت رہ گیا۔

کسی شے سے بڑھ کر وہ کسی آدمی کی شبیہ تھی، میرے جیسے کسی آدمی کی۔ وہ یقیناً کوئی کافر تھا، ہم میں سے نہ تھا۔ اسے غور سے دیکھتے مجھے لگا کہ میری شکل اس سے ملتی جلتی تھی۔ اگرچہ وہ مجھ سے بالکل مشابہ نہ تھا۔ اس کا چہرہ بالکل گول تھا جس میں لگتا تھا رخسار کی ابھری ہڈیاں نہ تھیں اور مزید یہ کہ اس کے چہرے پر میرے جیسی عمدہ ٹھوڑی نہ تھی۔ اگرچہ اس کی شکل قطعی میرے جیسی نہ تھی، لیکن اسے دیکھتے میرا دل ایسے دھڑکنے لگا جیسے وہ میری ہی شبیہ ہو۔

مجھے اس وینسی سے معلوم ہوا جو مجھے بازار کی سیر کرا رہا تھا کہ وہ شبیہ اس کے دوست، اسی جیسے کسی خاندانی رئیس کی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی تمام اہم چیزیں اس تصویر میں شامل کر دی تھیں۔ کھلی کھڑکی سے پس منظر میں دکھائی دیتے نظارے میں کھیت، [illegible] گاؤں اور رنگوں کا ایسا امتزاج دیکھا جا سکتا تھا جو اسے ایک حقیقی جنگل بناتے تھے۔ رئیس کے سامنے میز پر [illegible] کتابیں، وقت، زندگی، خطاطی کا قلم، ایک نقشہ، قطب نما، سونے کے سکوں کے ڈبے، نوادرات، کچھ بیکار [illegible] اشیا، کئی تصویروں کا حصہ رہنے والی ناقابل فہم لیکن الگ پہچانی جانے والی چیزیں، جنوں اور شیطان کے سائے اور اس آدمی کو مبہوت کر دینے والے حسن کی مالک بیٹی کی شبیہ جو اپنے باپ کے ساتھ کھڑی تھی۔

اس تصویر کو کس بیان سے سجایا اور مکمل کیا گیا تھا؟ جیسے جیسے میں اسے غور سے دیکھتا گیا، مجھ پر کھلا کہ پس پردہ وہ کہانی تو دراصل خود تصویر ہی تھی۔ کہانی بالکل بھی کسی تصویر کی توسیع نہ تھی، وہ خود اپنے اندر ہی مکمل تھی۔

میں وہ تصویر کبھی نہیں بھولا، جس نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ میں اس عمارت سے نکلا اور واپس اس گھر آیا جہاں میں بطور مہمان ٹھہرا ہوا تھا اور رات بھر تصویر پر غور کرتا رہا۔ میں بھی اسی طرح کی کوئی تصویر بنانا چاہتا تھا۔ لیکن نہیں، یہ مناسب نہیں تھا، صرف ہمارے سلطان ہی تھے جن کی تصویر ایسے بنائی جا سکتی تھی! ہمارے سلطان کی ہر اس چیز کے ساتھ جو ان کی ملکیت تھی، ان چیزوں کے ساتھ جو ان کی ترجمانی کریں اور ان کی سلطنت پر مشتمل ہوں، عکاسی کی جانی چاہیے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس خیال کے مطابق ایک کتاب تیار کی جا سکتی تھی۔

وینس مصور نے وہ شبیہ یوں بنائی تھی کہ تم فی الفور جان جاتے کہ وہ رئیس کون تھا۔ اگر تم نے اس آدمی کو دیکھ نہیں رکھا اور تم سے کہا جائے کہ ہزار دوسرے لوگوں کے ہجوم میں اسے تلاش کرو تو تم اس شبیہ کے بل پر درست آدمی کو پہچان لو گے۔ وینس کے فنکاروں نے مصوری کے ایسے طریقے جان لیے تھے جن کے ذریعے وہ ایک شخص کو دوسرے سے الگ پہچان سکتے تھے، اس کے لباس پر انحصار کیے بغیر، صرف اس کے چہرے منفرد نقوش کی مدد سے۔ یہ "پورٹریٹ ایچر" کا جوہر تھا۔

اگر کبھی تمہارے چہرے کی تصویر کشی اس انداز سے کی جائے تو کوئی بھی تمہیں کبھی نہ بھول پائے گا۔ تم چاہے کہیں بھی ہو تمہاری شبیہ پر نگاہ ڈالنے والا تمہاری موجودگی کو محسوس کرے گا جیسے تم قریب ہی ہو۔ جنہوں نے تمہیں زندگی میں کبھی نہیں دیکھا، تمہاری موت کے برسوں بعد بھی اس شبیہ کے ذریعے تمہارا ان سے یوں آمنا سامنا ہو سکتا ہے جیسے تم ان کے سامنے کھڑے ہو۔"

ہم دیر تک خاموش رہے۔ بالائی منزل پر راہداری کی اس کھڑکی سے جو گلی کے رخ کھلتی تھی، باہر گرتی برف کی رنگت کی [illegible] والی روشنی اندر چھن کر آ رہی تھی۔ یہ وہ کھڑکی تھی جس کے نچلے کواڑ کبھی نہ کھولے گئے تھے اور جس پر حال ہی میں کسی نے شہد کی مکھیوں کے چھتے کا موم لگا کر کپڑا چپکا یا تھا۔

"ایک منی ایچر فنکار تھا۔" میں نے کہا۔ "ہمارے سلطان کی خفیہ کتاب پر کام کرنے کے لیے وہ دوسرے منی ایچر فنکاروں کے ساتھ یہاں آتا تھا۔ ہم [illegible] تک اکٹھے کام کرتے تھے۔ اس کی طلا کاری سب سے اچھی تھی۔ وہ بدنصیب نفیس آفندی ایک رات جب یہاں سے گیا تو پھر کبھی لوٹ کر واپس نہ آیا۔ مجھے خدشہ ہے کہ انہوں نے اسے، میرے بے چارے بہترین طلا کار [illegible] کر دیا ہے۔"

میں، اور حان

قرہ نے پوچھا: "کیا واقعی انہوں نے اُسے قتل کر دیا ہے؟"
یہ قرہ طویل قامت، دُبلا پتلا اور ذرا ڈراؤنی شکل صورت والا تھا۔ میں نے یہ ان کی طرف جاتے سنا، جب وہ دوسری منزل پر نیلے دروازے والے کتاب خانے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور جب میرے نانا کہہ رہے تھے، "شاید انہوں نے اس کی جان لے لی ہو۔" پھر انہیں میں دکھائی دیا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

انہوں نے مجھے اس انداز سے دیکھا کہ میں جواب دیے بغیر فوراً ان کی گود میں چڑھ بیٹھا۔

انہوں نے مجھے فوراً گود سے نیچے اُتار دیا۔

"قرہ کی دست بوسی کرو۔" انہوں نے کہا۔

میں نے اس کے ہاتھ کو بوسہ دے کر پیشانی سے لگایا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی مہک نہ تھی۔

"کتنا پیارا بچہ ہے۔" قرہ نے میرا رخسار چوم کر کہا، "ایک دن یہ بہادر نوجوان بنے گا۔"

"یہ اورحان ہے، اس کی عمر چھے سال ہے۔ اس سے بڑا بھی ہے ایک، شوکت۔ وہ سات سال کا ہے۔ لیکن وہ کافی ضدی ہے۔"

"میں اُک سرائے کی پرانی گلی گیا تھا۔" قرہ نے کہا: "بہت سردی تھی، سب کچھ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن مجھے یوں لگا کہ کچھ بھی بدلا نہ ہو۔"

"افسوس! اب کچھ بدل چکا ہے، سب کچھ پہلے سے بدتر ہو چکا ہے۔" میرے نانا نے کہا، "بالکل بدتر۔" پھر وہ میری طرف مڑے۔ "تمہارا بھائی کہاں ہے؟"

"وہ ہمارے اُستاد کے پاس ہے، جلد سازی کے استاد۔"

"تو پھر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"اُستاد نے مجھ سے کہا کہ تم نے اچھا کام کیا ہے، تم اب جا سکتے ہو۔"

"تم یہاں تک اکیلے آئے ہو؟" میرے نانا نے پوچھا، "تمہارے بڑے بھائی کو تمہارے

ساتھ آنا چاہیے تھا۔" پھر انہوں نے قرہ کو بتایا، "میرا ایک جلد ساز دوست ہے، جس کے ساتھ یہ دونوں بیٹے میں دوبارا اپنے قرآن کے مدرسے کے بعد کام کرتے ہیں۔ یہ جلد سازی کا فن سیکھنے کے لیے اس کی شاگردی میں ہیں۔"

"تمہیں اپنے نانا کی طرح تصویریں بنانا پسند ہے؟" قرہ نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اب تم جاؤ۔" نانا نے مجھے کہا۔

کمرا انگیٹھی کی حرارت سے اتنا گرم تھا کہ میں وہاں سے جانا نہ چاہتا تھا۔ رنگ اور گوند کی خوشبو اندر اتارتے میں وہیں خاموشی سے کھڑا رہا۔ مجھے کافی کی مہک بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"پھر بھی کیا نئے انداز سے مصوری، دیکھنے کے نئے انداز کی نشانی ہے؟" نانا نے بات شروع کی، "یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بے چارے طلاکار کو قتل کیا، اس حقیقت کے باوجود کہ وہ پرانے انداز میں کام کرتا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ اس کی جان لے لی گئی ہے، صرف یہ کہ وہ غائب ہے۔ وہ سربراہ مصور استاد عثمان کے حکم سے ہمارے سلطان کے لیے کسی شاعرانہ یادگاری کہانی پر مصوری کر رہے تھے، کتاب کا نام "سرنامۂ ہمایوں" ہے۔ ہر منی ایچر فنکار اپنے گھر پر ہی کام کرتا ہے۔ تاہم استاد عثمان نے خود کو محل کے کتاب خانے تک محدود کر رکھا ہے۔ پہلے تو میں چاہوں گا کہ تم وہاں جا کر مشاہدہ کرو۔ مجھے خدشہ ہے کہ دوسروں، یعنی منی ایچر فنکاروں نے آپس میں جھگڑ کر ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ سربراہ مصور استاد عثمان کی برسوں پہلے دی گئی عرفیت سے پہچانے جاتے ہیں مثلاً "زیتون" اور "لگلا"..... تم ان کے گھر جا کر بھی انہیں کام کرتے دیکھو۔"

نیچے جانے کی بجائے میں واپس مڑ آیا۔ ساتھ والے کمرے میں جہاں خیر یے (Hayriye) سوتی تھی اور جہاں دیوار گیر الماری تھی، وہاں سے کچھ شور آ رہا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ کمرے میں خیر یے کی بجائے ماں تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ خجل سی ہو گئی۔ وہ آدھی الماری میں کھڑی تھی۔

"تم کہاں تھے؟" اس نے پوچھا۔

وہ جانتی تھی کہ میں کہاں تھا۔ الماری کے پیچھے ایک سوراخ تھا جہاں سے نانا کے کتاب خانے میں جھانکا جا سکتا تھا اور اگر اس کا دروازہ کھلا ہوتا تو چوڑی راہداری اور دیوان خانے کے پار سیڑھیوں کے ساتھ نانا کی خواب گاہ بھی دکھائی دیتی تھی۔

"میں تو نانا کے پاس تھا۔" میں نے کہا، "ماں، آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ نانا کے پاس مہمان ہے اور تم انہیں تنگ مت کرنا؟" ماں نے مجھے ڈانٹا لیکن اونچی آواز میں نہیں کیوں کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مہمان سن لے۔ "وہ کیا کر رہے تھے؟" بعد میں انہوں نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"وہ بیٹھے ہوئے تھے، لیکن رنگ نہیں کر رہے تھے۔ نانا بول رہے تھے اور وہ سن رہا تھا۔"

"وہ کس طرح بیٹھا تھا؟"

میں زمین پر بیٹھ گیا اور مہمان کی نقل اتاری۔ "ماں، دیکھو۔ میں ایک بہت سنجیدہ آدمی ہوں۔ میں غور سے نانا کی بات سن رہا ہوں جیسے کوئی نظم سنائی جا رہی ہو۔ میں اب اپنا سر ہلا رہا ہوں، مہمان کی طرح سنجیدگی سے۔"

"نیچے جاؤ۔" ماں نے کہا، "خیریے کو فوراً بلا لاؤ۔"

وہ نیچے بیٹھ گئی اور کاغذ کی ایک پرزے پر لکھنا شروع کر دیا۔

"ماں، آپ کیا لکھ رہی ہیں؟"

"جلدی کرو۔ میں نے تمہیں ابھی کہا تھا کہ نیچے جا کر خیریے کو بلاؤ۔"

میں نیچے باورچی خانے میں چلا گیا۔ میرا بھائی شوکت واپس آ چکا تھا اور خیریے نے اسے مہمان کے لیے بنے پلاؤ سے بھری پلیٹ دے رکھی تھی۔

"دھوکے باز۔" میرا بھائی کہنے لگا، "تم مجھے استاد کے پاس چھوڑ کر کھسک لیے۔ جلد سازی کے لیے ساری تہ مجھے لگانی پڑی۔ میری انگلیاں خراشوں سے سرخ ہو گئی ہیں۔"

"خیریے! ماں تمہیں بلا رہی ہیں۔"

"میں ذرا فارغ ہو لوں تو تمہیں پتا لگاتا ہوں گا۔" میرے بھائی نے کہا، "تمہیں اپنی سستی اور دھوکے بازی کا بدلہ چکانا ہو گا۔"

جب خیریے چلی گئی، میرا بھائی اپنا پلاؤ ختم ہونے سے پہلے ہی اسے چھوڑ کر غصے سے میری جانب بڑھا۔ میں وقت پر وہاں سے نکل نہیں پایا۔ اس نے میری کلائی پکڑ کر مروڑنا شروع کر دی۔

"مت کرو شوکت! مت کرو، مجھے درد ہو رہا ہے۔"

"دوبارہ کام چوری کرو گے اور بھاگ جاؤ گے؟"

"نہیں، میں کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"قسم کھاؤ۔"

"میں قسم کھاتا ہوں۔"

"قرآن کی قسم کھاؤ۔"

"قرآن کی قسم......"

اُس نے میرا بازو نہ چھوڑا۔ وہ مجھے کھینچ کر تانبے کے اس بڑے سے طشت کے پاس لے گیا جسے ہم کھاتے وقت بطور میز استعمال کرتے تھے اور مجھے گھٹنوں کے بل بٹھا دیا۔ وہ اتنا طاقت ور تھا کہ پلاؤ کھاتے ہوئے میرا بازو بھی مروڑتا رہا۔

"او ظالم، اپنے بھائی کو تکلیف دینا بند کرو۔" قمریے نے کہا۔ وہ چادر اوڑھ کر باہر جا رہی تھی۔

"اسے چھوڑ دو۔"

"اپنے کام سے کام رکھو تم کیڑے۔" میرے بھائی نے کہا۔ وہ میرا بازو مروڑے جا رہا تھا۔ "تم جا کہاں رہی ہو؟"

"لیموں خریدنے۔" قمریے نے کہا۔

"تم جھوٹی ہو۔ الماری لیموؤں سے بھری پڑی ہے۔" میرے بھائی نے کہا۔

اس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی، میں خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اسے لات ماری اور شمع دان اٹھا لیا، لیکن وہ مجھ پر جھپٹ پڑا اور مجھے نیچے گرا لیا۔ اس نے شمع دان کو میرے ہاتھ سے چھین کر پرے پھینکا اور تانبے کا طشت بھی گر گیا۔

"مصیبتو!" میری ماں نے کہا۔ اس نے اپنی آواز دھیمی رکھی تھی کہ کہیں مہمان نہ سن لے۔ وہ کتاب خانے کے کھلے دروازے کے سامنے، راہداری سے قمرو کی نظروں میں آئے بغیر بچ کیسے آ گئی؟

اس نے ہمیں ایک دوسرے سے چھڑایا۔ "تم دونوں بس ہر وقت میری بے عزتی کرواتے ہو۔ ہے ناں؟"

"اور حسن نے جلد ساز استاد سے جھوٹ بولا۔" شوکت نے بتایا۔ "سارا کام مجھ پر ڈال کر یہ وہاں سے بھاگ آیا۔"

"خاموش!" ماں نے اسے تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

اس نے ہلکا سا تھپڑ مارا تھا۔ میرا بھائی رویا نہیں۔ "مجھے بابا کے پاس جانا ہے۔" شوکت نے کہا۔ "جب وہ واپس آئیں گے تو حسن چچا کی یاقوتی دستے والی تلوار لیں گے اور ہم چچا حسن پاس واپس چلے جائیں گے۔"

"بکواس بند کرو!" میری ماں نے کہا۔ وہ یک دم اتنے غصے میں آ گئی کہ اسے بازو سے گھسیٹ کر باورچی خانے سے باہر صحن کے سایہ دار حصے کے پرلی طرف والے کمرے میں لے گئی۔ میں ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ میری ماں نے دروازہ کھول دیا۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو وہ بولی، "دونوں اندر چلو"

"لیکن میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" میں نے پھر بھی اندر جاتے کہا۔ ماں نے ہمارے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ اگرچہ کمرے میں پوری طرح اندھیرا نہ تھا... صحن میں انار کے درخت کی طرف کی کھڑکی سے مدھم سی روشنی اندر آ رہی تھی... لیکن میں خوف زدہ ہو گیا۔

"دروازہ کھولو ماں۔" میں نے کہا، "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"رونا بسورنا بند کرو، بزدل۔" شوکت نے مجھ سے کہا، "وہ جلدی دروازہ کھول ہی دیں گی۔"

ماں نے دروازہ کھول دیا۔ "مہمان کے جانے تک کیا تم تمیز کے دائرے میں رہو گے؟" اس

نے کہا: "ٹھیک ہے پھر۔ قرہ کے جانے تک تم باورچی خانے میں چولھے کے پاس بیٹھو گے اور تم اوپر نہیں جاؤ گے، سمجھ گئے؟"

"ہم یہاں بیٹھے اکتا جائیں گے۔" شوکت نے کہا: "خیر یہ کہاں گئی ہے؟"

"ہر معاملے میں ٹانگ مت اڑایا کرو۔" ماں نے کہا۔

ہمیں اصطبل میں بندھے گھوڑوں میں سے کسی کے ہنہنانے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ گھوڑا ایک بار پھر ہنہنایا۔ وہ ہمارے نانا کا نہیں بلکہ قرہ کا گھوڑا تھا۔ ہم پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا، جیسے کوئی تفریح کا موقع ہو۔ ماں مسکرا دی اور اس کی خواہش تھی کہ ہم بھی مسکرائیں۔ وہ قدم آگے بڑھ کر اس نے اصطبل کا دروازہ کھول دیا جو باہر سیدھا باورچی خانے کو جاتا تھا۔

"ہشش ــــ" وہ اصطبل کی طرف منہ کرکے بولی۔

وہ واپس مڑی اور ہمیں ہانک کر خیر یے کے تیل کی بو والے، چوہوں سے اٹے باورچی خانے میں لے گئی۔ اس نے ہمیں زبردستی بٹھا دیا۔ "مہمان کے جانے تک یہاں سے اُٹھ کر کھڑے ہونے کا سوچنا بھی مت۔ اور آپس میں لڑنا مت ورنہ لوگ سوچیں گے کہ تم بگڑے ہوئے بچے ہو۔"

"ماں!" اس کے باورچی خانے کا دروازہ بند کرنے سے پہلے میں پکارا۔ "میں کچھ بتانا چاہتا ہوں، ماں! انہوں نے ہمارے نانا کے طلا کار کو [illegible] سے مار ڈالا ہے۔"

میرا نام ہے قرمزی

میری نگاہ جب پہلی بار اس کے بیٹے پر پڑی تو میں جان گیا کہ شکورے کے چہرے کا کون سا نقش تھا جسے میں بھول گیا تھا اور جس کی مجھے چاہ تھی۔ اور حسن کے چہرے کی طرح اس کا چہرہ دبلا پتلا تھا اگرچہ اس کی ٹھوڑی ذرا لمبی تھی۔ میری محبوبہ کا دہن، جیسا میرا تخیل تھا، اس سے چھوٹا اور تنگ تھا۔ بارہ برس، شہر شہر گھومتے میں نے اپنی خواہش کے تحت شکورے کا دہن بڑا کر دیا تھا اور تصور کیا تھا کہ اس کے ہونٹ زیادہ شوخ، موٹے اور پرکشش ہوں گے چمکتی ہوئی رسیلی چیری کی طرح۔

اگر میں شکورے کی ویسی فنکاروں کے انداز میں بنی شبیہ یا تصویر ساتھ لے جاتا تو ان طویل سفروں میں میری وہ بری حالت نہ ہوتی جب میں اپنی محبوبہ کی صورت بمشکل ہی یاد کر پاتا تھا جسے میں کہیں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ کیوں کہ اگر محبوبہ کا چہرہ دل پر نقش ہو تو یہ دنیا ابھی تمہارا گھر ہے۔

شکورے کے چھوٹے بیٹے سے ملنے اور بات کرنے، اس کا چہرہ اپنے قریب اگرچہ مٹنے نے میرے اندر اس اضطراب کو جنم دیا جو بدنصیبوں، قاتلوں اور گناہ گاروں کے لیے مخصوص ہے۔ ایک اندرونی آواز نے پھر مجھے اکسایا: "اب جلدی کرو، جاؤ اور اس سے ملو۔"

لمحے بھر کو میں نے سوچا اور میرا جی چاہا کہ خاموشی سے اپنے انشتے کے پاس انھوں اور راہداری میں کھلنے والا ہر دروازہ کھولوں... میں نے انہیں انکھیوں سے شمار کیا تھا، پانچ اندھیرے دروازے جن میں سے ایک سیڑھیوں میں کھلتا تھا... یہاں تک کہ مجھے شکورے دکھائی دے جائے۔ لیکن میں بارہ برس سے اپنی محبوبہ سے جدا ہوں کیوں کہ مجھ بے وقوف نے اس پر اپنا حالِ دل کھول دیا تھا۔ اپنے انشتے کی باتیں سنتے ان تمام چیزوں پسندیدگی سے دیکھتے جنہیں شکورے نے بھی چھوا تھا اور وہ تکیہ جس کا سہارا لے کر وہ کتنی بار لیٹی ہوگی، میں نے انتظار کا فیصلہ کیا۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ سلطان ہجری کیلنڈر کے ہزار سال مکمل ہونے کی تقریب تک کتاب مکمل کروانا چاہتے تھے۔ ہمارے سلطان عالم پناہ یہ دکھانا چاہتے تھے کہ اسلامی کیلنڈر کے ہزارویں سال میں وہ اور ان کی سلطنت نہ صرف فرنگیوں کے اسلوب کو بلکہ خود انہیں بھی استعمال کر سکتے تھے۔ سلطان چوں کہ "سرنامہ

ہاؤن" کو بھی تیار کروا رہے تھے، اس لیے انہوں نے منی ایچر فنکاروں کو شاہی کتاب خانے میں ہجوم کرنے کی بجائے اپنے گھروں پر تنہائی میں سکون سے کام کرنے کی اجازت دے رکھی تھی، کہ وہ جانتے تھے کہ فنکار کافی مصروف تھے۔ ان کو یقیناً یہ بھی علم تھا کہ وہ سب میرے پیارے انشتے سے خفیہ ملاقات کے لیے بھی پابندی سے جاتے تھے۔

"تم سربراہ مصور استاد عثمان سے ملنے جاؤ گے۔" میرے انشتے نے کہا، "کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ نابینا ہو گئے ہیں اور دیگر کا کہنا ہے کہ وہ سٹھیا گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ نابینا اور ضعیف دونوں ہی ہو چکے ہیں۔"

اس حقیقت کے باوجود کہ میرے انشتے کو کوئی بڑا مصور نہیں سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی یہ ان کا میدان فن تھا، لیکن انہیں کتاب کی تزئین کاری کے فن پر عبور تھا۔ یہ در حقیقت سلطان کی اجازت اور حوصلہ افزائی کے سبب تھا، ایک ایسی صورت حال جو ان کے بزرگ استاد عثمان کے ساتھ تعلقات میں تناؤ کا باعث بنی۔

اپنے بچپن کو سوچتے ہوئے میں نے گھر کے فرنیچر اور دوسری چیزوں پر توجہ کی۔ بارہ سال قبل کا نیلا قالین مجھے ابھی تک یاد تھا جو فرش پر بچھا ہوا تھا، تانبے کا جگ، قہوے کے پیالے اور طشت، تانبے کا ڈول اور چینی کی کافی کی نازک پیالیاں جو پرتگال کے رستے لائی گئی تھیں، جیسا کہ میری مرحومہ خالہ نے لاتعداد موقعوں پر شیخی بگھاری تھی۔ یہ سب سیپ جڑی رحل، دیوار پر لگی اونی کا سٹینڈ، مخملیں سرخ تکیہ جسے چھوتے ہی مجھے اس کی پرانی نرمی یاد آ گئی، یہ سب سامان ایک سرائے نما گھر کا تھا جہاں شکورے کے ساتھ میرا بچپن بیتا تھا، اور اس سب میں ابھی تک میرے اس گھر میں مصوری کے رنگوں کی خوش گوار یادیں بسی تھیں۔

مصوری اور خوشی، میں اپنے اُن پیارے قارئین سے جنہوں نے میری کہانی اور نصیب پر اتنی توجہ دی، درخواست کرنا چاہوں گا کہ وہ یہ دو باتیں ذہن میں رکھیں کیوں کہ میری دنیا کی تخلیق ان ہی سے ہوئی ہے۔ وہ بھی وقت تھا کہ میں یہاں مطمئن تھا، ان کتابوں، خطاطی کے قلم اور تصویروں کے درمیان۔ پھر میں محبت میں گرفتار ہوا اور مجھے اس جنت سے نکال دیا گیا۔ محبت کی جلاوطنی کے اُن ایام میں اکثر سوچتا کہ مجھ پر شکورے اور اس کی محبت کا کتنا احسان تھا کیوں کہ انہوں نے مجھے خوش امیدی کے ساتھ زندگی اور دنیا کو گلے لگانا سکھایا تھا۔ مجھے اپنے بچپنے کی سی سادگی میں کوئی شک نہ تھا کہ میری محبت کا جواب محبت سے ملے گا اور میں دنیا کو ایک اچھی جگہ سمجھنے لگوں گا۔ اسی نے مجھے کتابوں کی لگن دی اور میں وہ سب شوق سے پڑھنے لگا جو میرے انشتے تب چاہتے تھے، مدرسے کے اسباق اور میری تزئین کاری اور مصوری۔ جہاں میں اپنی تعلیم کے پہلے دور اپنے کو شکورے کی محبت کی وجہ سے روشن، زندہ دل اور زرخیز سمجھتا ہوں، وہیں مسترد کیے جانے کے مرہون منت دوسرا نصف تاریک علم کی نذر ہوا۔ برفیلی راتوں میں میری خواہش ہوتی کہ باہر نکلوں اور کارواں سرائے میں انگیٹھی کے بجھتے شعلوں میں غائب ہو جاؤں۔ محبت بھری رات کے بعد بار بار خواب دیکھتا کہ میں پاتال میں گر رہا تھا، چاہے میرے ساتھ کوئی بھی عورت ہوتی، اور یہ اشارہ کہ میں بے وقعت

تھا۔۔۔۔۔اور اس سب کی ذمے دار شعور ے تھی۔

"کیا تم واقف تھے؟" انشتے نے کافی دیر بعد کہا، "کہ مرنے کے بعد ہماری روحیں اس دنیا کے ان آدمیوں اور عورتوں سے ملنے کے قابل ہوں گی، جو آرام سے اپنے بستروں میں سو رہے ہوں گے؟"

"نہیں، مجھے علم نہیں۔"

"موت کے بعد ہم ایک طویل سفر کرتے ہیں، اس لیے میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ مجھے ڈر صرف اس بات کا ہے کہ کہیں سلطان کی کتاب کے ختم ہونے سے پہلے نہ مر جاؤں۔"

میرے وجود کے ایک حصے نے خود کو انشتے سے زیادہ طاقت ور، معقول اور قابل بھروسا محسوس کیا اور دوسرا حصہ اس کافتان کی قیمت کا سوچ رہا تھا جو میں نے یہاں آنے سے پہلے اس شخص سے ملنے کی خاطر خریدا تھا جس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ مجھے دینے سے انکار کر دیا تھا اور اس گھوڑے کی نقرئی باگ اور زین بھی جسے میں بیچ جا کر اصطبل سے نکالوں گا اور یہاں سے چلا جاؤں گا۔

میں نے انھیں بتایا کہ مختلف منی ایچر فنکاروں سے ملاقاتوں میں جو بھی معلوم ہوا میں انھیں آگاہ رکھوں گا۔ میں نے ان کا ہاتھ چوم کر پیشانی سے لگایا۔ سیڑھیاں اتر کر جب میں صحن میں آیا تو مجھے سردی کا احساس ہوا اور میں نے تسلیم کیا کہ میں اب نہ بچہ تھا نہ بوڑھا۔ میں نے خوشی سے اس جہان کو محسوس کیا۔ جب میں نے اصطبل کا دروازہ بند کیا، ہلکی سی ہوا چلنے لگی۔ میں اپنے سفید گھوڑے کو صحن کے کچے راستے پر لے آیا اور ہم دونوں سردی سے کپکپا گئے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے ان کی خطوط ٹانگیں، اس کی بے صبری اور ضد خود میرے تھے۔ میں گلی میں آتے ہی پھرتی سے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا کسی افسانوی گھڑ سوار کی طرح کبھی واپس نہ پلٹنے کو گلی کا موڑ مڑ کر غائب ہونے والا تھا جب ایک بھاری بھرکم یہودن جو گلابی لباس پہنے اور ایک گٹھڑی اٹھائے ہوئے تھی، جانے کہاں سے نکلی اور مجھے پکارا۔ وہ کسی توشہ خانے کی طرح بڑی اور موٹی تھی۔ پھر بھی وہ تیز طرار، زندہ دل اور تحریکی تھی۔

"میرے بہادر، میرے نوجوان سورما۔ تم اتنے ہی وجیہ ہو جتنا لوگ کہتے ہیں۔" اس نے کہا، "کیا تم شادی شدہ ہو؟ یا کنوارے ہو؟ کیا تم ایستھر (Ester) سے جو استنبول میں واحد کپڑا فروش ہے، اپنی محبوبہ کے لیے ریشمی رومال خریدنا پسند کرو گے؟"

"نہیں!"

"اطلسی ریشم کا سرخ دوپٹہ؟"

"نہیں۔"

"نہیں، نہیں مت کہے جاؤ۔ کیسے ممکن ہے کہ تم جیسے جری بہادر کی کوئی منگیتر یا خفیہ محبوبہ نہ ہو؟ کون جانے کتنی لڑکیاں آنکھوں میں آنسو لیے تمہاری چاہت میں جلتی ہوں گی۔"

اس کا جسم کسی دبلے پتلے بازی گر کی طرح تنا اور وہ میری طرف ذرا سا جھکی۔ اسی وقت ایک

ماہر جادوگر کی طرح جو ہوا میں سے چیزیں پکڑ لیتا ہے، اس کے ہاتھ میں خط دکھائی دیا۔ میں نے چپکے سے خط جھپٹا، یوں جیسے میں برسوں سے اسی کی تربیت لے رہا تھا۔ میں نے فنکارانہ مستعدی سے اسے اپنے بنیان میں رکھ لیا۔ وہ خط مجھے کمر اور پیٹ کے درمیان میری ٹھنڈی جلد کو آگ کی طرح جلا رہا تھا۔

''گھوڑے کو اسی چال چلاتے جاؤ۔'' ایستھر نے کہا۔ ''دائیں موڑ مڑنا، اپنی رفتار کم کیے بغیر دیوار کے ساتھ چلنا لیکن جب انار کے پیڑ کے قریب پہنچو، مڑ کر اس گھر کو دیکھنا، اپنی دائیں طرف کھڑکی کو۔''

اس نے اپنا رستہ لیا اور لمحے بھر میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں پہلی بار گھڑ سواری کرنے والے کسی اناڑی کی طرح گھوڑے پر سوار ہوا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور میں عجیب سے جوش میں تھا، لیکن جب میری ٹانگوں نے گھوڑے کو ایڑ دی تو حواس اور مہارت نے گھوڑے اور مجھ پر غلبہ پا لیا۔ ایستھر کی ہدایت کے مطابق میرا مستقل مزاج گھوڑا ایک ہی رفتار سے سیدھا چلتا رہا اور ہم دائیں طرف ذیلی گلی میں مڑ گئے!

مجھے اس وقت احساس ہوا کہ شاید میں حقیقت میں وہیں تھا۔ جس طرح پریوں کی کہانیوں میں ہوتا ہے، ہر کھڑکی اور پردے کے پیچھے سے کوئی شرمیلی لڑکی مجھے دیکھ رہی تھی اور میں نے سوچا کہ برسوں پرانی آگ ایک بار پھر مجھے راکھ نہ کر دے۔ کیا مجھے یہی آرزو تھی؟ کیا میں پھر سے اس بیماری کا شکار ہو رہا تھا جس میں برسوں جلتا رہا تھا؟ اچانک سورج نے بادلوں کی قید سے نکل کر مجھے چونکا دیا۔

انار کا پیڑ کہاں تھا؟ کیا وہ کمزور سا پیڑ ہی تھا؟ ہاں! میں تھوڑا سا دائیں طرف مڑا تو مجھے درخت کے پیچھے کھڑکی نظر آئی لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ منحوس ایستھر نے مجھے الو بنا دیا تھا!

بالکل جب میں یہ سوچ رہا تھا تو کھڑکی کے برف بھرے کواڑ شور کے ساتھ کھلے۔ بارہ برس کے بعد میں نے برف سے لدی شاخوں کے درمیان، کھڑکی کے چوکھٹے میں جو دھوپ میں چمک رہا تھا، اپنی محبوبہ کا دلربا چہرہ دیکھا۔

کیا میری سیاہ چشم محبوبہ مجھے دیکھ رہی تھی یا میرے پیچھے کسی اور زندگی کو؟ میں نہیں بتا سکتا کہ وہ اداس تھی یا مسکرا رہی تھی یا اداسی کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔ بے وقوف گھوڑے، میرے دل کی نہ سنو، اپنی رفتار کم کرو! میں خاموشی سے زین پر ہی دوبارہ مڑا اور اپنی چاہت بھری نگاہ اس پر جمائے رکھی، یہاں تک کہ اس کا کھچا ہوا، باوقار اور اسرار بھرا چہرہ پیڑ کی شاخوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔

کافی دیر بعد، اس کا خط کھولنے اور اس کے اندر تصویر دیکھنے کے بعد میں نے سوچا کہ کھڑکی کے نیچے گھوڑے پر سوار اسے دیکھنا بالکل اس منظر سے مشابہ تھا، جس کی ہزاروں بار تصویر کشی ہو چکی تھی، جس میں خسرو کھڑکی تلے شیریں سے ملنے آتا ہے۔ ہماری بار بس وہاں ہمارے درمیان انار کا پیڑ بھی تھا۔ جب میں نے اس مشابہت کو محسوس کیا، تو میں اس محبت میں تڑپنے لگا جسے ان کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے، جنہیں ہم بہت پسند کرتے اور عزیز جانتے ہیں۔

میں ہوں ایستھر

میں جانتی ہوں، آپ لوگ سوچتے ہوں گے کہ شکورے نے قرہ کو خط میں کیا لکھا تھا۔ چوں کہ مجھے بھی تجسس تھا، اس لیے میں معلوم کر لیا کہ کیا لکھا گیا تھا۔ اگر آپ کہانی کے پچھلے صفحے پلٹ رہے ہیں تو میں ہی بتا دیتی ہوں کہ خط اس کے حوالے کرنے سے پہلے کیا ہوا۔

اب جب شام ہو رہی ہے، میں اپنے شوہر نسیم کے ساتھ شاخ زریں کے سامنے پرانے یہودی علاقے میں اپنے گھر میں ہوں، دو بوڑھے ننھے کانپتے ہوئے انگیٹھی میں لکڑیاں ڈال کر اپنے آپ کو گرم رکھنے کی کوشش میں ہیں۔ مجھے خود کو بوڑھا کہنے کی پرواہ نہ کریں۔ جب میں اپنا سامان باندھتی ہوں، ساری سستی اور مہنگی چیزیں، عورتوں کو لبھانے کو انگوٹھیاں، بچھوے اور سستے زیور، ریشمی رومالوں، دستانوں، چادروں اور قمیصوں کے رنگین کپڑے میں لپیٹ کر جو پرتگالی جہازوں پر یہاں پہنچتا ہے۔ جب میں یہ گٹھڑی اٹھاتی ہوں تو ایستھر کفلیر ہوتی ہے اور استنبول باندی اور ایسی کوئی گلی جہاں میں نے چکر نہ لگایا ہو۔ کوئی ایسی گپ شپ یا خط نہیں جو میں ایک سے دوسرے دروازے تک نہ پہنچاتی ہوں، استنبول کی آدھی لڑکیوں کے رشتے میں نے ہی کروائے ہیں لیکن میں نے یہ بات شیخی بگھارنے کے لیے شروع نہیں کی۔ جیسا میں نے بتایا تھا کہ ہم گھر میں آرام کر رہے تھے کہ ''ٹھک، ٹھک'' کسی نے دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ احمق کنیز خیریے میرے سامنے تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔ یہ ٹھنڈ کی وجہ سے تھا یا ہیجان سے لیکن وہ شکورے کی خواہش بتاتے کانپ رہی تھی۔

پہلے تو میں یہی سمجھی کہ یہ خط حسن کو پہنچانا ہے اور اس لیے میں حیران ہوئی۔ آپ کو شکورے کے شوہر کے متعلق تو معلوم ہی ہے، وہ جنگ سے ابھی تک واپس نہیں لوٹا۔ اگر مجھ سے پوچھیں تو بہت پہلے ہی وہ مارا گیا تھا۔ خیر، اس کے کبھی واپس نہ پلٹنے والے سپاہی شوہر کا ایک محبت کا مارا حسن نامی بھائی ہے۔ سو میری حیرت کا تصور کریں جب میں نے دیکھا کہ خط حسن نہیں، کسی اور کے لیے تھا۔ خط میں کیا لکھا تھا؟ ایستھر تو مارے تجسس کے پاگل ہو گئی اور آخر میں اسے پڑھنے میں کامیاب رہی۔

لیکن، افسوس کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں جانتے۔ ہے ناں؟ ایمان داری سے

بتاؤں تو مجھ پر شرمندگی اور پریشانی غالب آ گئے۔ آپ کو بھی پتا نہ چلے گا کہ میں نے خط کیسے پڑھا۔ شاید آپ مجھے اس مداخلت پر شرمندہ کریں اور حقیر جانیں، یوں جیسے آپ خود کسی حجام کی طرح تو وہ لینے والے نہیں ہیں۔ میں ابھی آپ کو بتاتی ہوں کہ مجھے خط سے کیا معلوم ہوا۔ پیاری شکورے نے دراصل یہ لکھا تھا:

"قرہ آفندی، تم میرے بابا سے قریبی رشتے کے باعث ہمارے گھر مہمان ہو۔ لیکن میری طرف سے اشارے کی توقع نہ کرنا۔ تمہارے جانے کے بعد اب تک بہت کچھ ہو چکا ہے۔ میری شادی ہوئی اور میرے دو مضبوط اور خوش باش بیٹے ہیں۔ ان میں سے ایک اورحان ہے، ابھی جب وہ کتاب خانے میں آیا تم اس سے ملے تھے۔ ان چار برسوں میں جب میں اپنے شوہر کی منتظر ہوں، میرے ذہن میں اور کوئی خیال نہیں آیا۔ میں اپنے دو بیٹوں اور بوڑھے باپ کے ساتھ رہتے خود کو تنہا، نا امید اور کمزور محسوس کر سکتی ہوں، لیکن کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ وہ میری اس حالت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس لیے مجھے خوشی ہوگی کہ اگر تم ہمارے ہاں آنا جانا چھوڑ دو۔ تم ایک بار پہلے بھی مجھے شرمندہ کر چکے ہو اور مجھے بابا کی نظر میں اپنا وقار بحال کرنے میں مشکل ہوئی! اس خط کے ساتھ میں وہ تصویر بھی واپس کر رہی ہوں جو تم نے تب بنائی اور مجھے بھیجی تھی جب تم پر جوش نوجوان تھے جسے اپنے ہوش و خرد پر اختیار نہ تھا۔ میں یہ اس لیے کر رہی ہوں تاکہ تم کوئی جھوتی امید نہ باندھو یا تم کوئی غلط معنی نہ نکالو کیونکہ غلط فہمی ہے کہ تصویر دیکھتے ہوئے کوئی محبت میں گرفتار ہو سکتا ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم ہمارے گھر آنا بالکل بند کر دو۔"

میری بے چاری شکورے، تم کوئی پاشا ہو نہ شہزادہ ہو کہ جس کے پاس اپنے خط کے آخر میں لگانے کو کوئی مہر ہو! خط کے آخر میں اس نے اپنے نام کا پہلا حرف ش لکھا کہ وہ خوف زدہ پرندے کے سوا کچھ نہ لگتا تھا۔

میں نے کہا، "مہر"۔ آپ شاید سوچ رہے ہیں کہ میں مہر بند خط کیسے کھولتی اور بند کرتی ہوں۔ لیکن دراصل خطوں کو مہر لگا کر بند ہی نہیں کیا جاتا۔ "استھر ایک ان پڑھ یہودن ہے۔" شکورے نے یہی خیال کیا تھا، "وہ میری تحریر نہیں سمجھ پائے گی۔" یہ سچ ہے کہ میں پڑھ نہیں سکتی لیکن میں ہمیشہ کسی اور سے پڑھوا تو سکتی ہوں۔ اور جو نہیں لکھا گیا ہے، اسے میں آسانی سے خود "پڑھ" سکتی ہوں۔ الجھ گئے، ہے نا؟

مجھے اب اس طرح بیان کرنے دیں کہ آپ میں سے احمق ترین بھی سمجھ جائے۔

ایک خط صرف الفاظ کی ترسیل نہیں کرتا۔ خط کو، بالکل کتاب کی طرح سونگھ کر، چھو کر اور سہلا کر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اب جو عقل مند ہیں، کہیں گے، "ٹھیک ہے پھر جو خط تمہیں بتاتا ہے، پڑھو۔" جب کہ بے عقل کہیں گے، "ٹھیک ہے پھر، پڑھو جو اس نے لکھا ہے۔" اب ذرا سنیں، شکورے نے اور کیا کہا:

1۔ اگرچہ استھر پر اعتماد کرتے ہوئے میں نے خط رازداری سے بھیجا ہے جس نے اس کام کو تجارت اور عادت بنا لیا ہے، میں اس بات پر زور دے رہی ہوں کہ میں سب کچھ چھپانا نہیں چاہتی۔

2۔ یہ کہ میرا اسے فرانسیسی پیسٹری کی طرح تہ کرنا رازداری کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہ سچ ہے۔

لیکن لفافے پر مہر نہیں لگائی گئی اور اس کے اندر ایک تصویر بھی ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ "ہر صورت ہمارا راز رکھو۔" "جو بھائے خود انکار نہیں بلکہ محبت کا دعوت نامہ ہے۔

3۔ مزید یہ کہ، خط کی خوشبو اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ خوشبو بالکل مبہم تھی کہ اس کی شناخت مشکل تھی۔ کیا اس نے خط کو اراد تاً خوشبو میں بسایا تھا؟ —— پھر بھی قاری کے تجسس کو ابھارنے کو کافی —— کیا یہ کسی عطارہ کا عطر ہے یا اس کے ہاتھوں کی خوشبو؟ اور خوشبو جو خط پڑھنے والے اس بے چارے کو مسرور کرنے کو کافی تھی، اس کا یقیناً قرو پر بھی اثر ہوا ہوگا۔

4۔ میں ایستھر ہوں جسے لکھنا پڑھنا نہیں آتا، لیکن اتنا میں بھی جانتی ہوں: اگرچہ تحریر اور اس کی روانی یہ ظاہر کرتے نظر آتے ہیں کہ "افسوس، میں عجلت میں ہوں اس لیے بے پرواہی سے لکھ رہی ہوں"، یہ خطوط جو یوں چہکتے ہیں جیسے نرمی سے چلتی ہوا میں تیرتے ہوں، بالکل برعکس پیغام دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کا اور عنان کا حوالہ دیتے یہ فقرہ "ابھی آیا تھا" اس سے مراد ہے کہ خط ابھی لکھا گیا تھا اور یہ ہر سطر میں برتی گئی احتیاط کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

5۔ خط کے ساتھ بھیجی گئی تصویر میں، وہ جو خسرو کی تصویر دیکھ کر اس کی محبت گرفتار ہوتی شیریں کو دکھایا گیا ہے، جیسا کہ اس کہانی میں ہے جس سے میں، یہودن ایستھر بھی واقف ہے۔ استنبول کی ساری محروم محبت عورتوں کو یہ کہانی پسند ہے لیکن میں نے کسی طرح خط کے ساتھ یہ تصویر بھیجتے نہیں دیکھا۔

یوں ہمیشہ آپ جیسے پڑھے لکھے خوش نصیبوں کے ساتھ ہوتا ہے: کوئی دوشیزہ جسے پڑھنا نہیں آتا، آپ کو اپنا خط پڑھنے کو دیتی ہے۔ خط اس قدر حیرت انگیز، ہیجان خیز اور پریشان کن ہے کہ وہ اگرچہ آپ کے اس راز میں شریک ہونے پر خجل ہے، شرمسار اور پریشان، لیکن آپ سے دوبارہ اسے پڑھ کر سنانے کو کہتی ہے۔ آپ دوبارہ پڑھتے ہیں۔ اتنی مرتبہ پڑھتے ہو کہ خط دونوں کو زبانی یاد ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ خط واپس لیتے ہوئے کہے گی، "اس نے یہ بات یہاں لکھی ہے؟" اور "کیا اس نے یہاں یہ کہا ہے؟" آپ جب صحیح جگہ انگلی رکھیں گے، وہ آپ کو وہ سنا دے گی، الفاظ کے صحیح معنی جانے بغیر، جب وہ ان واردی الفاظ کو دیکھ رہی ہوگی۔ بعض اوقات میں یہ بھول جاتی ہوں کہ میں خود بھی لکھ یا پڑھ نہیں سکتی اور میرا جی چاہتا ہے کہ ان ان پڑھ لڑکیوں کو گلے لگا لوں جن کے آنسو کاغذ پر برس رہے ہوتے ہیں۔

پھر واقعی کچھ خط پڑھنے والے لعنتی قسم کے ہوتے ہیں، خدایا، آپ ان جیسے مت بننا: جب لڑکی لکھے الفاظ سمجھے بغیر انہیں دیکھنے اور چھونے کو خط کو دوبارہ اپنے ہاتھوں میں لیتی ہے تو یہ ظالم اس سے کہیں گے، "تم کیا کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟ تم پڑھ نہیں سکتی، اور کیا دیکھنا چاہتی ہو؟" کچھ تو خط واپس ہی نہیں کریں گے یوں جیسے یہ ان ہی کی ملکیت بن گیا ہو۔ کبھی کبھار تو ان سے بات کر کے خط واپس لینے کا کام مجھے، ایستھر کو سونپا جاتا ہے۔ میں اسی قسم کی اچھی عورت ہوں۔ اگر ایستھر آپ کو پسند کرتی ہے تو وہ آپ کی بھی مدد ضرور کرے گی۔

میں، شکورے

اور، جب قرو اپنے سفید گھوڑے پر سوار گزرا تو میں کھڑکی میں کیوں آئی تھی؟ میں نے کسی وجدان کے تحت میں اسی وقت کھڑکی کے پٹ کیوں کھولے اور انار کی برف سے لدی شاخوں میں سے اسے دیر تک کیوں دیکھتی رہی؟ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں نے مخبر کے ذریعے ایستھر کو پیغام بھیجا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ قرو اسی راستے سے گزرے گا۔ اس دوران میں ارادتاً گلی اوپر دیوار گیر الماری اور انار کے رخ کھلنے والی کھڑکی والے کمرے میں صندوق میں رنگی چادروں کا جائزہ لینے گئی تھی۔ بالکل درست وقت پر ایک ترنگ میں میں نے کھڑکی کے پٹ پوری قوت سے کھولا اور کمرا دھوپ میں نہا گیا۔ کھڑکی میں کھڑے میں اور قرو آمنے سامنے تھے، جس نے سورج کی روشنی کی طرح مجھے چندھیا دیا۔ یہ خوب تھا۔

وہ بڑا ہو چکا تھا اور اپنے لڑکپن کا دبلا پن کھو کر ایک وجیہ مرد کے روپ میں ڈھل چکا تھا۔ شکورے، میرے دل نے مجھ سے کہا، صرف وجیہ ہی نہیں، اس کی آنکھوں میں جھانکو، وہ کسی بچے کا سا دل رکھتا ہے، انتہائی مخلص اور تنہا، اس سے شادی کر لو۔ اگرچہ میں نے اسے جو خط لکھا، وہ اس کے برعکس تھا۔

اگرچہ وہ مجھ سے بارہ برس بڑا تھا، جب میں بارہ برس کی تھی تو اس سے زیادہ سمجھ دار تھی۔ ان دنوں میرے سامنے سیدھے کھڑے ہو کر یہ اعلان کرنے کی بجائے کہ وہ یہ یا وہ کرنے والا ہے، اس جگہ سے چھلانگ لگانے یا وہاں چڑھنے والا ہے، وہ کسی کتاب یا تصویر میں اپنا منہ دے کر بیٹھ جاتا جیسے ہر چیز سے اسے خجل کرتی تھی۔ وقت کے ساتھ وہ میری محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے اظہار محبت کی خاطر ایک تصویر بنائی۔ اس وقت تک ہم دونوں بڑے ہو چکے تھے۔ جب میں بارہ برس کی ہوئی تو قرو مجھ سے نگاہیں نہ ملاتا تھا یوں جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کی نگاہ اس کی محبت مجھ پر عیاں کر دے گی۔ مثال کے طور پر، ”مجھے وہ ہاتھی دانت کے دستے والا چاقو پکڑاؤ“ کہتے ہوئے اس کی نگاہ مجھ پر نہیں بلکہ چاقو پر ہوتی۔ اگر میں اس سے پوچھتی، ”کیا چیری کا شربت تمہاری پسند کا بنا ہے؟“ وہ اس طرح کسی دلکش مسکراہٹ یا سر کی جنبش سے جواب نہ دیتا تھا جیسے جب ہمارا منہ بھرا ہو تو ہم کرتے ہیں۔ اس کی بجائے وہ پوری قوت سے چیختا، جیسے کسی بہرے سے بات کر رہا ہو، ”ہاں۔“ وہ میرے چہرے کی طرف دیکھنے سے گریزاں رہتا تھا۔

میں حیران کن حسن کی مالک تھی۔ دور سے، کھڑکی کے ذرا سے ہٹے پردوں، نیم وا دروازے یا میرے معین دوپٹے کی اوٹ سے، کوئی بھی شخص جو ایک بار میری جھلک دیکھ لیتا، فوراً مجھ پر فریفتہ ہو جاتا۔ یہ کوئی شیخی نہیں، میں صرف اس لیے بتا رہی ہوں تاکہ آپ میری کہانی سمجھ سکیں اور میرے دکھ میں شریک ہو سکیں۔

خسرو اور شیریں کی مشہور زمانہ داستان میں ایک منظر ہے جس پر قرہ اور میں نے مکمل کر بحث کی تھی۔ خسرو کا دوست شاپور چاہتا تھا کہ خسرو اور شیریں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جائیں۔ ایک روز شیریں اپنی خدمت گاروں کے ساتھ مضافات کی سیر کو جاتی ہے۔ جب وہ ستانے رکتی ہے تو ان درختوں میں سے کسی ایک کی شاخ پر خسرو کی تصویر دیکھتی ہے جسے شاپور نے وہاں لٹکا رکھا تھا۔ خوب صورت باغ میں کھڑے خوبرو خسرو کی تصویر دیکھ کر شیریں اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ اس لمحے یا ''منظر'' کو، جیسا کہ مصور کہیں گے، کئی تصویریں پیش کرتی ہیں، جس میں شیریں محبت و اضطراب بھری نگاہوں سے خسرو کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ میرے بابا کے ساتھ کام کرتے قرہ نے یہ تصویر کئی مرتبہ دیکھی اور دو مرتبہ تو اس کی نقل بھی بنائی۔ میری محبت میں گرفتار ہونے کے بعد اس نے ایک بار یہ تصویر اپنے لیے بنائی۔ لیکن اس مرتبہ اس نے خسرو اور شیریں کی بجائے تصویر میں خود کو اور مجھے بنایا، قرہ اور شکورے۔ اگر تصویر کے نیچے نام درج نہ ہوتے، تو صرف میں ہی جان سکتی تھی کہ تصویر میں موجود مرد و عورت کون تھے کیوں کہ کبھی کبھی مذاق میں وہ بیشہ اسی انداز اور رنگ میں ہماری تصویر بناتا تھا، میں نیلے رنگ اور وہ خود سرخ میں۔ اور یوں جیسے یہ اشارہ کافی نہ تھا، اس نے تصویر کے نیچے ہمارے نام بھی لکھ دیے۔ تصویر کو اسی جگہ رکھ کر جہاں میں اسے دیکھ سکتی، وہ بھاگ گیا۔ پھر وہ چھپ کر دیکھتا رہا کہ اسے دیکھ کر میرا ردعمل کیا ہوتا۔

میں خوب جانتی تھی کہ میں اس سے شیریں کی طرح محبت نہ کرتی تھی، اس لیے میں نے بے خبری ظاہر کی۔ اس موسم گرما کی اس شام جب قرہ نے مجھے وہ تصویر دی، جس دوران ہم نے خود کو اس ترش چیری کے شربت سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جو برف پوش پہاڑ اولو سے لائی گئی تھی، میں نے بابا کو بتا دیا کہ قرہ نے مجھ سے اپنی محبت کا اقرار کیا ہے۔ قرہ نے انہی دنوں مذہبی مدرسے سے اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ قرہ آس پڑوس کے علاقوں میں پڑھاتا تھا اور اپنی مرضی کی بجائے وہ میرے بابا کے اصرار پر بااثر اور قابل احترام نعیم پاشا کی سرپرستی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بابا کے بقول، قرہ کو ابھی خود پر مکمل بھروسا نہ تھا۔ میرے بابا نے نعیم پاشا کے حلقے میں قرہ کے لیے کم سے کم کسی کاتب یا منشی سے آغاز کرنے کو مقام کی تلاش کی کوشش شروع کر دی۔ انہیں شکایت تھی کہ قرہ خود اپنی کامیابی کے لیے زیادہ تگ و دو نہیں کر رہا تھا، دوسرے الفاظ میں قرہ نادان تھا۔ اسی شب بابا نے قرہ اور میرے حوالے سے اعلان کیا: ''میرے خیال میں میرے اس غریب بھانجے کی نظریں بڑی اوپر ہیں۔'' میری ماں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر انہوں نے مزید کہا کہ ''وہ ہماری سوچ سے زیادہ ہوشیار ہے۔''

مجھے یاد کر کے رنج ہوتا ہے کہ اگلے دنوں میرے بابا نے کیسا رویہ اپنائے رکھا، کیسے مجھے قرہ

سے دور رکھا گیا اور کیسے اس نے ہمارے گھر آنا چھوڑ دیا۔ لیکن میں اس خدشے سے اس کی تفصیل نہیں بتاؤں گی کہ آپ کہیں میرے بابا کو ناپسند کرنے لگیں۔ میں قسم کھا کر آپ سے کہتی ہوں کہ ہمارے پاس اور کوئی راہ نہ تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ ایسی صورت حال میں معقول لوگ فوراً اندازہ لگا لیتے ہیں کہ امید کے بغیر محبت ناامیدی ہے اور دل کی دنیا کی غیر منطقی حدوں کو سمجھتے ہوئے فوراً نتیجہ نکال لیتے اور یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دیتے ہیں کہ ''انھوں نے ہمیں مناسب جوڑ نہ سمجھا۔ بس ایسا ہی ہونا تھا۔'' لیکن میں آپ کو یہ ضرور بتاؤں گی کہ میری ماں نے کئی مرتبہ کہا، ''کم از کم بچے کا دل مت توڑو۔'' قرہ، جسے میری ماں نے ''بچہ'' کہا تھا، چوبیس برس کا تھا اور میں اس سے نصف عمر کی۔ چوں کہ میرے بابا نے قرہ کے اظہار محبت کو ایک طرح کی گستاخی سمجھا تھا، میری ماں کی بات پر انھیں ہنسی بھی نہیں آئی۔

اگرچہ جب ہمیں ان کے استنبول چھوڑ چلے جانے کی خبر ملی، ہم اسے پوری طرح بھولے تو نہیں تھے، لیکن ہم نے اسے اپنی محبتوں سے پوری طرح محروم کر دیا۔ چوں کہ کئی برس تک بھی شہر سے اس کی کوئی خیر خبر نہ آئی، میں نے یہ سوچا کہ اس کی بنائی تصویر اپنے بچپن کی یادوں اور دوستی کی نشانی کے طور پر سنبھال لوں۔ اپنے بابا اور بعد میں اپنے شوہر سے تصویر چھپانے کے لیے میں نے بڑی ذکاوت سے تصویر کے پیچھے لکھے ہمارے نام ''شکورے'' اور ''قرہ'' ایسے چھپائے کہ یوں لگے کہ جیسے ان پر کسی نے میرے باپ کی حسن پاشا روشنائی گرا دی ہو اور بعد میں کسی نے انھیں پھولوں میں بدل دیا۔ چوں کہ آج اس کی بنائی تصویر میں نے واپس لوٹا دی ہے، آپ میں سے کچھ نہ سمجھیں کہ میں کھڑکی میں کیوں آئی اور اس بارے کوئی تعصب رکھیں۔

اسے اپنا چہرہ دکھانے کے بعد میں ڈھلتی دھوپ کے سنہری رنگوں میں نہائی، باغ کو سرخی مائل نارنجی روشنیاں اوڑھے مرعوب ہو کر دیکھتی رہی، یہاں تک کہ مجھے شمالی ہوا میں ٹھنڈک محسوس ہونے لگی۔ ہوا بند تھی۔ مجھے اس بات کی قطعی پروا نہ تھی کہ گلی سے گزرنے والے مجھے کھلی کھڑکی میں کھڑے دیکھ کر کیا کہیں گے۔ نزیور پاشا کی بیٹیوں میں ایک، مسرورے، جو ہمیشہ خوش خلق رہتی تھی اور بے موقع ہمیشہ حیران کر دینے والی بات کہتی تھی، ایک بار اس نے حمام میں مجھے بتایا کہ بعض اوقات کوئی بھی شخص نہیں جانتا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ یہی میں جانتی ہوں۔ بعض اوقات میں کچھ کہوں گی اور پھر محسوس کروں گی کہ یہ تو صرف میری سوچ ہے اور جیسے ہی مجھے اپنی سوچ کا ادراک ہوتا ہے تو میں قائل ہوتی ہوں کہ اس کے بالکل برعکس سچ ہے۔

میرے بدقسمت شوہر کی طرح، نفیس آفندی کے اچانک غائب ہونے پر مجھے افسوس ہوا جو میرے بابا سے ملنے آنے والے مختلف ایجر فنکاروں میں سے ایک تھے۔ میں یہ دکھاوا نہیں کروں گی کہ میں چھپ کر ان لوگوں کی جاسوسی نہیں کرتی تھی۔ ''نفیس'' ان میں بدصورت ترین تھا اور سب سے نکما۔

میں نے کھڑکی کے پٹ بند کیے اور کمرے سے نکل کر نیچے باورچی خانے میں آ گئی۔

''ماں! شوکت نے بات نہیں مانی۔'' اورحان نے کہا: ''جب قرہ اصطبل سے گھوڑا نکال رہا تھا

تو شوکت باورچی خانے سے نکلا اور سوراخ سے اسے چھپ کر دیکھتا رہا۔"

"پھر کیا ہوا!" شوکت نے ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ "ماں بھی الماری کے سوراخ سے اس کی جاسوسی کر رہی تھی۔"

"خیر ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ روٹی کے ٹکڑے مکھن میں تل کر چینی اور بادام کے حلوے کے ساتھ کھانے میں رکھو۔"

اور حان یہ سن کر خوشی سے چھلانگیں لگانے لگا لیکن شوکت خاموش رہا۔ لیکن جیسے ہی میں واپس اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف گئی، وہ میرے پاس آ کر خوشی سے چیختے چلاتے مجھے دھکیلنے لگے۔

"ارے آہستہ، آہستہ!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بدمعاشو!" میں نے ان کی پیٹھ پر چپت لگائی۔

جب شام ڈھل رہی ہو تو گھر میں بچوں کا موجود ہونا کتنا بھلا لگتا ہے! بابا نے خاموشی سے خود کو ایک کتاب کے حوالے کر رکھا تھا۔

"آپ کا مہمان چلا گیا۔" میں نے کہا۔ "امید ہے اس نے آپ کو زیادہ پریشان نہیں کیا؟"

"اس کے برعکس،" انھوں نے جواب دیا۔ "اس نے تو مجھے محظوظ کیا۔ وہ ہمیشہ سے زیادہ اپنے رشتے کا باادب رہا۔"

"اچھا۔"

"لیکن اب وہ سمجھدار اور موقع شناس ہو گیا ہے۔"

انھوں نے یہ میرا ردعمل دیکھنے سے زیادہ اس انداز میں موضوع ختم کرنے کے لیے کہا تھا، جس کا مقصد قرہ کو غیر اہم بتانا تھا۔ کوئی دوسرا موقع ہوتا تو میں انھیں ویسا جواب دیتی جس کی میں عادی ہوں۔ لیکن اس مرتبہ مجھے اپنے سفید گھوڑے پر سوار قرہ کا خیال آیا اور میں نے چپ سادھ لی۔

مجھے معلوم نہیں کہ یہ کیسے ہوا مگر تھوڑی دیر کے بعد اور حان اور میں نے دیوار گیر الماری والے کمرے میں ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ شوکت بھی شامل ہو گیا اور تھوڑی دیر کے لیے دونوں کے بیچ ہاتھا پائی ہوئی۔ ان کے ایک دوسرے کو کھینچنے میں ہم سب فرش پر لڑھک گئے۔ میں نے ان کی گردنوں اور بالوں کو بوسہ دیا، انھیں اپنے سینے سے بھینچا اور ان کے بوجھ کو اپنی چھاتی پر محسوس کیا۔

"اوہ..." میں نے کہا۔ "تمہارے بالوں سے تو بدبو آ رہی ہے۔ تم دونوں کو میں کل خیریے کے ساتھ حمام بھیجوں گی۔"

"میں اب خیریے کے ساتھ نہانے کے لیے نہیں جایا کروں گا۔" شوکت نے کہا۔

"کیوں؟ کیا تم اتنے بڑے ہو گئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ماں! تم نے اپنی جامنی کرتی کیوں پہنی ہے؟" شوکت نے سوال کیا۔

میں نے دوسرے کمرے میں جا کر اپنی جامنی کرتی اتار دی۔ میں نے ایک رنگ اڑی سبز

رنگ کی کرتی پہن لی جو میں عام پہنتی تھی۔ جب میں لباس تبدیل کر رہی تھی تو مجھے سردی محسوس ہوئی اور میں کپکپا گئی۔ لیکن میں اپنی جلد کی حدت محسوس کر سکتی تھی اور میرا بدن زندگی سے بھرپور تھا۔ میں نے اپنے گالوں پر ہلکا سا غازہ لگایا تھا جو بچوں کے ساتھ فرش پر لوٹنے سے اتر گیا تھا لیکن میں نے ہتھیلی سے رگڑ کر اسے برابر کر لیا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ میری رشتے دار خواتین جنہیں میں تمام پر ملتی ہوں یا ہر کوئی جو مجھے دیکھتا ہے، کہتا ہے کہ میں دو بچوں کی ماں ڈھلتی جوانی والی چوبیس سالہ عورت کی بجائے سولہ سالہ کنواری دوشیزہ لگتی ہوں؟ ان کی بات پر یقین کریں، ورنہ میں آگے نہیں سناؤں گی۔

اس بات پر حیران مت ہو کہ میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔ برسوں سے میں اپنے بابا کی کتابوں میں حسین عورتوں کی تصویریں دیکھتی آئی ہوں۔ کم کم ہی کسی ایسی عورتیں موجود ہیں، اور وہ ہمیشہ شرمیلی، خجل اور ایک ہی سمت میں دیکھتی نظر آتی ہیں جیسے معذرت خواہ ہوں۔ وہ کبھی اپنا سر اٹھاتی ہیں نہ ہی سیدھی کھڑی ہوتی ہیں، وہ لوگوں کا اس طرح سامنا بھی نہیں کرتیں جیسے سلطان اور سپاہی کریں گے۔ صرف حقیر، بے پرواہ مصوروں کی اور عجلت میں بنائی تصویروں میں ہی کچھ عورتوں کی نگاہیں زمین کی بجائے کسی چیز پر مرکوز ہیں ۔۔۔ میں سوچتی تھی کہ کس پر، کیا کسی عاشق پر یا جام پر ۔۔۔ لیکن سیدھا قاری پر۔ میں عرصے سے اس قاری کے بارے میں سوچتی آئی ہوں۔

دو سو سال پرانی کتابوں کا تصور کر کے میں مسرت سے کانپ اٹھتی ہوں، امیر تیمور کے زمانے کی کتابیں، جن کی جلدوں کو حاصل کرنے کے لیے سونے کے سکے خوشی سے لٹائے گئے تھے اور وہ کتابیں جو اپنے اپنے زمانے کی داستانیں بیان کرتی ہیں۔ شاید کسی دور افتادہ علاقے کا کوئی باسی میری کہانی سنے گا۔ کیا کسی کتاب کے اوراق پر رقم ہونے کے پس پردہ یہی خواہش نہیں؟ کیا اسی خوشی کے حصول کے لیے سلطان اور وزیر سونے کی تھیلیاں نہیں لٹاتے کہ ان کی زندگیوں کی تاریخ لکھی جائے! جب میں یہ خوشی محسوس کرتی ہوں، بالکل کتابوں کی حسین عورتوں کی طرح جن کی ایک آنکھ کتاب کے اندر کی زندگی پر ہوتی ہے اور دوسری باہر کی زندگی پر، تو میں تمہارے ساتھ بات کرنا چاہتی ہوں، جو نہ جانے کس زمان و مکاں کے ہو اور مجھے دیکھ رہے ہو۔ میں پرکشش اور ذہین عورت ہوں اور مجھے خوشی ملتی ہے کہ مجھے دیکھا جا رہا ہے۔ اور اگر میں کبھی کبھار ایک آدھ غلط بیانی کرتی ہوں تو وہ صرف اس لیے کہ آپ میرے متعلق غلط نتیجہ نہ نکالیں۔

شاید آپ نے غور کیا ہو کہ میرے بابا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ مجھ سے پہلے ان کے ہاں تین بیٹے ہوئے جنہیں ایک ایک کر کے خدا نے واپس بلا لیا اور مجھے ان کی بیٹی کو ان کے پاس رہنے دیا۔ بابا مجھے دیوانوں کی طرح چاہتے ہیں، اگرچہ میں نے ان کی مرضی کے خلاف شادی کی۔ میں نے گھڑسوار فوج کے ایک سپاہی سے شادی کی جو مجھے دیکھنے میں اچھا لگا تھا۔ اگر یہ معاملہ میرے بابا پر چھوڑا جاتا تو میرا شوہر کوئی عالم ہوتا، جس کی نظر میں فن مصوری کی قدر ہوتی، وہ صاحب اختیار اور امیر ترین آدمی ہوتا۔ بابا کی کتابوں میں بھی ایسے آدمی کا شائبہ تک نہ ملتا تھا اور یوں میں ہمیشہ اپنے گھر میں پڑی گلتی سڑتی رہتی۔

میرے شوہر کی وجاہت داستانوی تھی اور میں نے درمیانی لوگوں کے ذریعے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ میری حمام سے واپسی پر اسے میرے سامنے آنے کا موقع ملا۔ اس کی آنکھیں آگ کی طرح دہک رہی تھیں اور میں وہیں اس پر فریفتہ ہو گئی۔ وہ سیاہ بالوں، گوری رنگت، سبز آنکھوں اور مضبوط بازوؤں والا مرد تھا لیکن اس کا دل معصوم اور محو خواب بچے جیسا تھا۔ اس کے باوجود کم سے کم مجھے یہی لگتا کہ اس میں کہیں خون کی بو تھی، شاید اس لیے کہ وہ اپنی طاقت جنگوں میں لوگوں کی جان لینے اور مال غنیمت جمع کرنے میں صرف کرتا تھا، اگرچہ گھر میں وہ کسی عورت کی طرح خاموش اور بے ضرر تھا۔ یہ آدمی جسے بابا، بنگلا سپاہی کہتے تھے اور یوں اسے ناپسند کرتے تھے، لیکن بعد میں جب مجھے شادی کی اجازت دے دی جب میں نے بابا کو خودکشی کی دھمکی دی اور جب اسے جنگ میں بہادری کے جوہر دکھانے پر دس ہزار چاندی کے سکوں کا فوجی اعزاز دیا گیا، واقعی ہر کوئی ہم پر رشک کرتا تھا۔

چار سال پہلے جب وہ صفویوں کے خلاف جنگ میں شریک ہونے کے بعد باقی فوج کے ساتھ واپس نہ آیا تو شروع میں میں اتنی پریشان نہ تھی۔ جیسے جیسے اسے میدان جنگ میں تجربہ حاصل ہوتا گیا، وہ اپنے لیے زیادہ مہارت سے مواقع پیدا کرنے لگا تھا، زیادہ مال غنیمت گھر لانے کے لیے، سرکاری اعزازات کے لیے اور اپنی ماتحتی میں لڑنے والے فوجیوں کی تعداد بڑھانے کے لیے۔ ایسی شہادتیں بھی تھیں جن کے مطابق وہ فوج کے ایک رسالے سے الگ ہو کر اپنے فوجیوں کے ساتھ پہاڑوں پر چلا گیا تھا۔ میں اسے اس کے کسی منصوبے کا حصہ سمجھی اور یہی خیال کیا کہ وہ واپس لوٹ آئے گا، لیکن دو سال گزرنے پر میں اس کی عدم موجودگی کی عادی ہو گئی اور خود کو اپنے صبر کے سپرد کر دیا، اور جب مجھے علم ہوا کہ استنبول میں کتنی ہی ایسی عورتیں تھیں جن کے گمشدہ شوہروں کی کوئی خبر نہ تھی۔

راتوں کو بستروں میں ہم اپنے بچوں کو لپٹا لیتیں اور گھٹ گھٹ کر روتیں۔ اپنے بچوں کو چپ کروانے کے لیے میں انھیں امید بھرے جھوٹ کہتی، مثلاً فلاں فلاں کے پاس ثبوت ہے کہ تمہارے بابا بہار سے پہلے لوٹ آئیں گے۔ بعد میں جب میرا ہی کہا جھوٹ گردش کرتا اور چکر کاٹ کر واپس مجھ تک پہنچتا تو اس کی سچائی کا یقین کرنے والی سب سے پہلے میں ہی ہوتی تھی۔

وسائل ختم ہونے پر ہمیں گزر بسر میں مشکل ہونے لگی۔ ہم چارشی کاپی (Charşikapı) میں میرے شوہر کے شریف ابخازی باپ کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ میرے سسر نے زندگی میں کبھی آرام نہ دیکھا تھا۔ میرا سبز آنکھوں والا دیور بھی وہیں رہتا تھا۔ میرے سسر نے، اپنے بڑے بیٹے کے فوج میں جانے کے بعد، شیشہ سازی کا کاروبار ترک کر دیا تھا اور اب اسے عمر رسیدگی میں دوبارہ وہی کام کرنا پڑا۔ حسن، میرا کنوارا دیور محکمہ مال میں کام کرتا تھا اور اپنے متمول ہوتے ہی وہ گھر کا بڑا بننے کے منصوبے بنانے لگا۔ ایک سرما اس خوف سے کہ وہ گھر کا کرایہ نہیں بھر سکیں گے، وہ اس کنیز کو غلام منڈی میں لے آئے، جو گھر کے کام کرتی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے چاہتے تھے کہ میں باورچی خانے کا کام کروں،

کپڑے دھوؤں اور کنیز کی جگہ بازار جا کر خریداری کروں۔ میں نے یہ کہتے احتجاج نہ کیا، "کیا میں اس قسم کی عورت ہوں جو ایسے سخت کام کرے؟" میں اپنے غرور کو بالائے طاق رکھ کر کام کرنے لگی۔ مگر اب میرے دیور حسن کے پاس کنیز نہ تھی جسے وہ اپنے کمرے میں لے جا سکتا، اس لیے وہ راتوں کو میرا دروازہ بجانے لگا۔ مجھے سمجھ نہ آتی تھی کہ میں کیا کروں۔

یقیناً میں فوراً ہی اپنے بابا کے گھر آ سکتی تھی لیکن قاضی کے مطابق میرا شوہر قانونی طور پر زندہ تھا اور اگر میں نے اپنے سسرال والوں کو ناراض کیا تو وہ نہ صرف مجھے اور میرے بچوں کو اس گھر میں زبردستی روک سکتے تھے بلکہ میرے بابا کو بھی "حبس بے جا" میں رکھنے کی سزا بھی مل سکتی تھی۔ سچ بتاؤں تو میں حسن سے محبت کر سکتی تھی۔ وہ میرے شوہر سے زیادہ ہمدرد اور معقول تھا اور اسے مجھ سے محبت بھی تھی۔ لیکن اگر میں یہ سب احتیاط نہ کرتی تو خدا نہ کرے، میں اس کی بیوی نہیں، کنیز ہوتی۔ بہرحال چوں کہ انہیں یہ ڈر تھا کہ میں وراثت میں سے اپنا حصہ طلب کروں گی اور پھر اپنے بچے لے کر اپنے بابا کے گھر چلی جاؤں گی، اس لیے انہیں قاضی کے میرے شوہر کی موت کا قانونی فیصلہ دینے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور اگر قاضی کی نگاہ میں میرا شوہر زندہ تھا تو میں قدرتی طور پر حسن یا کسی اور سے دوسری شادی نہ کر سکتی تھی۔ چوں کہ یہ الجھن بھری صورت حال مجھے اس شادی اور سسرال کا پابند رکھے ہوئے تھی، اس لیے میرے سسرال والے میرے شوہر کی "گمشدگی" کو ترجیح دیتے تھے۔ آپ بھول نہ جائیں، یاد دلا دوں کہ میں گھر کے سارے کام کرتی تھی، کھانا پکانے سے کپڑے دھونے تک اور یہ کہ ان میں سے ایک میری محبت میں گرفتار تھا۔

جب میرے سسر اور حسن اس صورت حال سے غیر مطمئن ہو گئے اور فیصلہ کیا کہ اب میری حسن سے شادی کا وقت آ گیا تھا لیکن ضروری تھا کہ قاضی کے سامنے میرے شوہر کی موت کی شہادت دینے والے گواہ موجود ہوں۔ اگر میرے گم شدہ شوہر کے قریب ترین رشتے دار یعنی اس کا باپ اور بھائی نے اس کی موت کو قبول کر لیا اور اگر میرے شوہر کی موت کے اعلان پر اور کسی کو اعتراض نہ ہو اور اگر چند سکوں کے عوض گواہ یہ بیان دے دیں کہ انہوں نے میدان جنگ میں اس کی لاش دیکھی تھی تو قاضی بھی تسلیم کر لے گا۔ میرے بیوہ کے اعلان کے بعد حسن کے لیے مجھے قائل کرنا مشکل ہو گا کہ میں گھر چھوڑ کر جاؤں گی نہ ہی وراثت میں سے اپنا حصہ طلب کروں گی اور نہ ہی ان سے بہرکوں گی اور یہ بھی کہ اپنی مرضی سے اس سے شادی کروں گی۔ قدرتی بات تھی کہ اس سلسلے میں اس کا اعتبار جیتنے کے لیے مجھے اس کے ساتھ شب بسری کرنا ہوتی تا کہ اسے یقین آ جاتا کہ میں خود کو اس کے سپرد کر رہی تھی، اپنے شوہر سے الگ ہونے کے لیے نہیں بلکہ میں پوری طرح اس کی محبت میں گرفتار تھی۔

ذرا سی کوشش سے ہو سکتا تھا کہ میں حسن سے محبت کرنے ہی لگتی۔ وہ عمر میں میرے گم شدہ شوہر سے آٹھ سال چھوٹا تھا اور جب میرا شوہر یہاں موجود تھا تو وہ میرے چھوٹے بھائی جیسا تھا اور ان احساسات کے باعث وہ مجھے پیارا تھا۔ مجھے اس کا انکسار اور محبت بھرا رویہ پسند تھا، میرے بچوں سے کھیلتے اس کی خوشی یا

جس چاہت سے وہ مجھے دیکھتا تھا، جیسے پیاس سے مر رہا ہو اور میں کسی ترش چیری کے ٹھنڈے شربت کا گلاس ہوں۔ دوسری طرف یہ بھی تھا کہ مجھے ایسے شخص سے محبت کے لیے خود کو زبردستی تیار کرنا پڑتا جو مجھ سے کپڑے دھلواتا تھا اور کنیزوں کی طرح بازار بھیجنے میں عار نہیں سمجھتا تھا۔ ان دنوں جب میں اپنے بابا کے گھر جاتی اور برتن پیالے وغیرہ دیکھ کر لگاتار رویا کرتی، ان راتوں جب بچے اور میں ایک دوسرے سے لپٹ کر سوتے، حسن نے میرا ارادہ بدلنے کو کوئی کوشش نہ کی۔ اسے یہ یقین نہ تھا کہ میں اس سے کبھی محبت کروں گی یہ کہ شادی کی یہ لازمی اور بنیادی جنسی شرط پوری نہ ہو سکے گی اور چوں کہ اسے خود پر بھی بھروسا نہ تھا، اس کا رویہ بہت نامناسب تھا۔ اس نے مجھ سے دست درازی کرنی چاہی۔ اس نے مجھے دھمکایا کہ میرا شوہر بھی واپس نہیں آئے گا اور یہ کہ وہ مجھے جان سے مار دے گا۔ مجھے دھمکاتے ہوئے وہ رونے لگا اور سچی محبت کو جنم لینے کی بھی اجازت نہ دی۔ میں جانتی تھی کہ میں اس سے کبھی شادی نہ کر سکتی تھی۔

ایک شب، اس نے میرے اور بچوں کی خواب گاہ کا دروازہ زبردستی کھولنا چاہا، میں فوراً اٹھی اور چیخنے لگی کہ گھر میں جن آ گئے تھے۔ اس شور وغل اور چیخوں سے میرے سسر کی آنکھ کھل گئی اور وہ حسن کی بدنیتی جان گئے جس کی حالت اس کے والد بھی کھوج سکتے تھے۔ میری چیخوں اور جنوں کے بارے میں احمقانہ باتوں میں میرے شریف سسر نے اپنی شرمندگی کا اعتراف کر لیا کہ اس کا بیٹا خطاکار تھا اور اس نے اپنے بھائی کی بیوی جو دو بچوں کی ماں تھی، پر ہاتھ ڈالا تھا۔ میرے سسر نے کوئی جواب نہ دیا جب میں نے کہا کہ "جن" سے اپنے بچوں کو بچانے کے لیے میں صبح تک جاگتی رہوں گی۔ اگلے روز میں نے اعلان کر دیا کہ میں اپنے بابا کی بیماری میں ان کی دیکھ بھال کے لیے اپنے بچوں کو ساتھ لیے عرصے کے لیے ان کے گھر جا رہی تھی، یوں حسن نے ہار مان لی۔ میں اپنی شادی شدہ زندگی کی نشانی چیزیں لے کر اپنے بابا کے گھر آ گئی۔ ان چیزوں میں میرے شوہر کا ہنگری سے لایا گھڑیال اور گھنٹیاں (جسے وہ بھی بیچ نہ پایا تھا)، تیز رفتار گھوڑوں کی نسوں سے بنا چابک، تبریز سے لائی گئی شطرنج کی بساط جس کے مہروں سے بچے کھیلتے تھے اور نقرئی شمع دان (Nahjivan (آذربائیجان) کی جنگ کا مال غنیمت) جسے مالی تنگی کے ایام میں بھی میں نے بچائے رکھا تھا۔

توقع کے عین مطابق، اپنے شوہر کا گھر چھوڑ کر میں نے حسن کی مجنونانہ محبت کو ایک بے بسی کے جنم میں بدل دیا تھا۔ یہ بخوبی جانتے کہ اس کا باپ اس کی حمایت نہ کرے گا، اس نے مجھے دھمکانے کی بجائے خطوط کے ذریعے میرا دل جیتنے کی کوشش شروع کر دی، جن کے گوشوں میں وہ کسی تنہا پرندے، نم آلود آنکھوں والے شیر اور اداس غزال کی تصویریں بناتا تھا۔ میں آپ سے نہیں چھپاؤں گی کہ اب میں وہ خطوط پڑھنے لگی تھی، وہ خطوط جو حسن کے زرخیز تخیل کا اظہار تھے، جس سے میں تب آگاہ نہ تھی جب ہم ایک چھت تلے رہتے تھے۔ تب میں یہی خیال کرتی تھی کہ اس نے اپنے کسی شاعر دوست سے وہ خطوط لکھوا کر ان پہ تصویریں بنوائی ہوں گی۔ اپنے آخری خط میں اس نے لکھا کہ مجھے اب کنیزوں کی طرح گھر کے کام نہیں

گرنے پڑیں گے کیوں کہ اس نے بہت دولت کمائی تھی۔ اس کے میٹھے، احترام بھرے اور خوش گوار لہجے نے بچوں کی نہ ختم ہونے والی لڑائیوں اور ضدوں اور بابا کی شکایتوں سے مل کر میرے دماغ کو واقعی میں کھولتی کیتلی بنا دیا تھا۔ بلاشبہ میں نے سکون کا ایک گہرا سانس بھرنے کو کھڑکی کے پٹ کھولے تھے۔

خیر یہ کہ رات کا کھانا لگانے سے پہلے میں نے عرب کھجور کے بہترین پھولوں سے میٹھا بنایا، میں نے چمچ بھر شہد میں تھوڑا سا لیموں کا رس ملایا اور پھر چپکے سے بابا کے کمرے میں داخل ہوئی جو "ہادی الارواح" پڑھ رہے تھے۔ میں نے کسی روح کی ہی طرح، انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلائے بغیر، وہ ان کے سامنے رکھ دیا، بالکل جیسے ان کی خواہش ہوتی تھی۔

"کیا برف گر رہی ہے؟" انہوں نے اتنی دھیمی اور اداس آواز میں پوچھا کہ میں سمجھ گئی کہ یہ آخری برف باری ہوگی جو میرے بے چارے بابا دیکھیں گے۔

میں ایک درخت ہوں

میں ایک درخت ہوں اور میں خاصا تنہا ہوں۔ میں بارش میں اشک بہاتا ہوں۔ اللہ کے لیے سنیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ اپنی کافی پئیں تا کہ نیند آپ سے روٹھ جائے اور آپ کی آنکھیں کھلی رہیں۔ میری طرف ایسے دیکھیں جیسے کسی جن [illegible] اور مجھے آپ کو بتانے دیں کہ میں اتنا تنہا کیوں ہوں۔

1- لوگ کہتے ہیں کہ میری تصویر اس کھردرے ورق پر بنائی گئی تا کہ داستان گو کے عقب میں درخت کی تصویر لٹکائی جا سکے۔ سچ ہے۔ اس لیے میرے آس پاس چھدرے درخت نہیں، نہ اشجار میدانوں کے ساتھ پتی پودے بھی نہیں، نہ سیاہ چٹانوں کی اشکال جو شیطان یا انسان سے مشابہ ہوں اور نہ ہی بل کھاتے چینی بادل۔ صرف زمین ہے، آسمان، میں اور افق۔ لیکن میری کہانی اس سے زیادہ الجھی ہوئی ہے۔

2- درخت کے طور پر ضروری نہیں کہ میں کتاب کا حصہ ہوں درخت کی تصویر کے طور پر میں اس لیے مضطرب ہوں کہ میں کسی کتاب کا ورق نہیں۔ چوں کہ میں کتاب میں کسی شے کی نمائندگی نہیں کر رہا، میرے ذہن میں یہی آتا ہے کہ میری تصویر دیوار پر آویزاں کی جائے گی اور کافر اور بت پرست مجھے سجدہ اور میری پرستش کریں گے۔ خدا کرے کہ ارض روم کے خوجا کے پیروکار یہ نہ سنیں کہ میں دل ہی دل میں اس خیال پر متفاخر ہوتا ہوں — لیکن پھر خوف اور شرمساری مجھ پر غالب ہو جاتے ہیں۔

3- میری تنہائی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میں کہاں سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہونا تو مجھے کہانی کا حصہ تھا لیکن میں خزاں میں پتے کی طرح اس سے جھڑ گیا۔ آئیں میں آپ کو اس بارے میں بتاؤں:

اپنی کہانی سے اس طرح نکلنا جیسے خزاں میں پتا جھڑتا ہے

چالیس سال قبل، ایرانی شاہ طہماسپ جو عثمانیوں کا شدید دشمن ہونے کے ساتھ ساتھ فن مصوری کا دنیا کا سب سے بڑا سرپرست بادشاہ تھا، بوڑھا ہونے لگا اور اس کے مے نوشی، موسیقی، شاعری اور مصوری کے شوق میں کمی آ گئی۔ مزید یہ کہ اس نے کافی چھوڑ دی اور یوں قدرتی طور پر اس کے دماغ نے کام چھوڑ دیا۔ لٹکتے چہرے اور توانائی اور جوش سے محروم کسی شکی بوڑھے کی طرح اس نے اپنا

دار الحکومت تبریز، جو ایران کا حصہ تھا، سے قزوین منتقل کر لیا تاکہ وہ عثمانی فوجوں سے مزید دور ہو جائے۔ ایک روز جب وہ مزید بوڑھا ہو چکا تھا، اس پر ایک جن نے غلبہ پایا، اسے دورہ پڑا اور اس نے خوش نویسی، حسین لڑکوں اور مصوری سے توبہ کر لی، جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس عظیم بادشاہ نے کافی کے ذوق کے ساتھ ہی اپنے حواس بھی کھو دیے تھے۔

اسی سبب جلد ساز، خطاط، طلاکار اور منی ایچر فنکار، جنہوں نے گزشتہ بیس برس تبریز میں رہتے ہوئے دنیا کے عظیم ترین شاہکار تخلیق کیے تھے، اب تیتروں کی طرح دوسرے شہروں میں بکھر گئے۔ شاہ طہماسپ کے بھتیجے اور داماد سلطان ابراہیم مرزا نے سب سے باصلاحیت فنکاروں کو مشہد مدعو کیا جس کا وہ صوبائی گورنر تھا اور انہیں منی ایچر فنکاروں کے کتاب خانے میں آباد کیا تاکہ وہ جامی کی "ہفت اورنگ" کی سات داستانوں کی کتابوں کی مصوری اور تزئین کاری کریں۔ جامی، امیر تیمور کے زمانے میں ہرات کا عظیم ترین شاعر تھا۔ شاہ طہماسپ اپنے اس وجیہہ اور ذہین بھتیجے کو پسند اور اس پر رشک بھی کرتا تھا اور اپنی بیٹی کی اس سے شادی کرنے پر پچھتانے کا بھی شکار تھا، جب اسے اس عالی شان کتاب کا علم ہوا تو اس نے رشک وحسد کے باعث اپنے بھتیجے کو مشہد کی گورنری سے ہٹایا اور قائن میں جلاوطن کر دیا۔ بعد میں خفگی کے نئے دورے میں اسے سبزوار بھیج دیا۔ یوں خطاط اور منی ایچر فنکار دوسرے شہروں میں دوسرے سلطانوں اور شہزادوں کے کتاب خانوں میں منتشر ہو گئے۔

معجزاتی طور پر سلطان ابراہیم مرزا کی عالی شان کتاب پر کام جاری رہا کیوں کہ اسے ایک نہایت مخلص مہتمم کی خدمات حاصل تھیں۔ وہ شخص گھوڑے کی پیٹھ پر سوار شیراز جاتا جہاں استاد طلاکار رہتے تھے، پھر وہ چند ایک اوراق لے کر نستعلیق رسم الخط کے ماہر خطاط کی تلاش میں اصفہان پہنچتا، اس کے بعد وہ بلند و بالا پہاڑ طے کر کے بخارا پہنچتا جہاں وہ ازبک خان کی زیر نگرانی کام کرنے والے عظیم استاد مصور سے اوراق کو ترتیب دلواتا اور تصویریں بنواتا، اس کے بعد وہ ہرات جاتا جہاں وہ بوڑھے اور تقریباً نابینا استادوں سے ان کی یادداشت کے سہارے پر حاشیے کے پودے اور پتے بنواتا اور پھر ہرات ہی کے ایک اور فنکار سے مل کر وہ تصویر میں دروازے کے اوپر کی تحریر کی طلائی ریکا رسم الخط میں تزئین کاری کروا لیتا۔ آخر میں وہ جنوب کا رخ کر کے قائن پہنچتا جہاں وہ چھ مہینے کے سفر میں تیار شدہ نصف ورق دکھاتا اور سلطان ابراہیم مرزا سے داد و تحسین وصول کرتا۔

اس رفتار پر واضح تھا کہ کتاب کبھی مکمل نہ ہوتی، سو گھڑسوار تاتاری ہرکاروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مسودے کے ورق کے ساتھ جس پر فنکاری اور خطاطی کی جانی تھی، ہر گھڑسوار کو ایک خط بھی دیا گیا جس میں فنکار کے لیے کام کی ہدایات درج ہوتی تھیں۔ یوں وہ پیغام رساں کتاب کے اوراق لیے ایران، خراسان، ازبک علاقوں اور ماوراالنہر کے رستوں پر نکل کھڑے ہوئے۔ ان ہرکاروں کی فوج کے سبب کتاب کی تکمیل کا کام تیز ہو گیا۔ بعض اوقات برفیلی راتوں میں مثال کے طور پر کسی کاروان سرائے میں

ابواب ۱۹ اور 25 آن ملتے جہاں ارد گرد بھیڑیوں کی آوازیں سنی جا سکتی تھیں اور وہ ستانہ گفتگو میں انہیں معلوم ہوتا کہ وہ ایک ہی کتاب کے منصوبے پر کام کر رہے تھے اور وہ اپنے کمروں سے اوراق الاکر معلوم کرنے کی کوشش کرتے کہ وہ کس داستان میں اور کہاں استعمال ہوں گے۔

مجھے اس تزئین شدہ کتاب کے اوراق کا حصہ ہونا چاہیے تھا جس کے بارے میں نے افسردگی سے سنا کہ وہ آج مکمل ہو گیا تھا۔ بدقسمتی سے سرما کے ایک روز وہ تاتاری ہرکارہ مجھے لیے اس پہاڑ کو عبور کر رہا تھا جس پر چور گھات لگائے بیٹھے تھے۔ پہلے انہوں نے بے چارے تاتاری کو مارا پیٹا، لوٹا اور پھر جیسا کہ ان کا انداز ہے، سفاکی سے قتل سے پہلے اس سے بدفعلی کی۔ نتیجے کے طور پر مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کس ورق کا حصہ تھا۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ مجھے دیکھ کر پوچھیں: "کیا تم مجنوں کی چھاؤں کے لیے بنے تھے جب وہ چرواہے کا بھیس بدل کر لیلیٰ سے اس کے خیمے میں ملنے جاتا؟" یا "تمنا، امید اور شکستہ دل شخص کی روح کی تاریکی کی نمائندگی میں رات میں گم ہونے کو بنے تھے؟" میں ان دو محبت کرنے والوں کی مسرت کی کس قدر تحسین کرنا چاہتا جو پورے جہان سے فرار ہو کر، سمندر عبور کرتے ہوئے پرندوں اور پھلوں سے بھرپور جزیرے میں سکونت پذیر ہوئے! میں سکندر کے ہندوستان فتح کرنے کی مہم میں اس کی زندگی کے آخری لمحات میں اس پر سایہ کرنا چاہتا تھا جب گرمی کی شدت سے اس کی نکسیر پھوٹ گئی تھی۔ یا کیا میں اپنے بیٹے کو محبت اور زندگی کے بارے میں نصیحت کرتے باپ کی مضبوطی اور دانش کی علامت تھا؟ مجھے کس کہانی کو معنی اور دل فریبی بخشنے کو بنایا گیا تھا؟

رہزنوں کے گروہ میں، جو ہرکارے کو قتل کرکے مجھے اٹھائے ایک سے دوسرے پہاڑ اور ایک سے دوسرے شہر لیے گھومے تھے، ایک ایسا چور بھی تھا جسے میری اہمیت کا ذرا احساس ہو گیا اور وہ اتنا خوش ذوق ضرور تھا کہ جان گیا کہ اصل درخت دیکھنے سے درخت کی تصویر دیکھنا زیادہ خوش گوار احساس تھا۔ لیکن چونکہ اسے معلوم نہ تھا کہ میں کس کہانی کا حصہ تھا، وہ جلد ہی مجھ سے بیزار ہو گیا۔ مجھے ایک سے دوسرے شہر ساتھ لیے گھومتے کہیں کسی پہاڑ پر پھینکنے کی بجائے، جیسا کہ مجھے خدشہ تھا، اس نے مجھے کارواں سرائے میں شراب کے بدلے ایک مہذب شخص کو فروخت کر دیا۔ بعض اوقات، راتوں کو وہ مہذب غریب شخص شمع کی روشنی میں مجھے دیکھتا اور رونے لگتا۔ کچھ عرصے بعد وہ کسی غم میں فوت ہو گیا اور اس کے بعد اس کا سامان نیلام کر دیا گیا۔ اس استاد داستان گو کی بدولت، جس نے مجھے خریدا، میں طویل سفر کرکے استنبول پہنچ گیا۔ آج رات میں یہاں آپ سب جو عثمانی سلطان کے مقابل نگاہ، آہنی عزم، باخبر، حساس مصور، فنکار اور خطاط ہیں۔۔۔۔۔ کے درمیان موجود ہونے کے باعث بے حد خوش اور خود کو قابل عزت محسوس کر رہا ہوں ۔۔۔۔۔ اور خدا کے لیے، میری آپ سے التجا ہے کہ ان کا یقین مت کریں جو یہ کہتے ہیں کہ مجھے کھردرے ورق پر عجلت میں کسی استاد مصور فنکار نے دیوار پر آویزاں کرنے کو بنایا تھا۔

لیکن ذرا دوسرے جھوٹ، افواہیں اور الزامات بھی سنیں! آپ کو یاد ہوگا کہ میرے مالک نے گزشتہ رات دیوار پر ایک کتے کی شبیہ لگائی تھی اور اس بدنام جانور کی مہم جوئی کی داستان سنائی تھی اور اس

کے ساتھ ساتھ ارض روم کے حضرت حوجا کی مہم جوئی بھی بیان کی! اب نصرت حوجا کے چاہنے والوں نے اس کہانی کو بالکل غلط طور پر سمجھا، وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری تنقید کا ہدف حوجا ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس قابل عزت شخصیت کی پیدائش مشکوک ہو؟ خدا معاف کرے! کیا ہمارے دماغ سے ایسا خیال بھی گزر سکتا ہے؟ کیسی شر انگیز بات، کتنا کھلا جھوٹ ہے! صاف ظاہر ہے کہ ارض روم کے حضرت کو ارض روم کا نصرت سمجھا جا رہا ہے، سو مجھے سیواس کے ندرت حوجا اور درخت کی داستان سنانے کی اجازت دیں۔

حسین نو عمر لڑکوں کے ساتھ بد فعلی اور فن مصوری کی مذمت کے ساتھ سیواس (Sivas) کے اس بھیجے ندرت حوجا کا یہ بھی موقف ہے کہ کافی پینا شیطانی فعل ہے، اسے پینے والے سب لوگ جہنم رسید ہوں گے۔ سیواس والو، کیا آپ جانتے ہیں کہ میری یہ بڑی سی شاخ کیسے جھکی؟ آئیے، میں آپ کو اس بارے میں بتاؤں لیکن قسم کھائیں کہ آپ یہ سب کسی اور کو نہیں بتائیں گے اور اللہ آپ کو بے بنیاد الزامات سے محفوظ رکھے۔ ایک صبح میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ جن جیسا ایک شخص، جس کا قد کسی مینار جتنا اور ہاتھ شیر کے پنجوں جیسے تھے، میری اس شاخ پر چڑھ کر گھنے پتوں میں چھپ کر بیٹھا اور دھتکرو ہو جا، میرے اس جملے پر پیشگی معذرت، وہ کتوں کے فعل میں مصروف تھے۔ جب وہ جن، جو مجھے بعد میں ادراک ہوا کہ دراصل شیطان تھا، ہمارے اس جوان لڑکے کے ساتھ مصروف تھا، وہ اس کے خوب صورت کان کو بوسے دے کر سرگوشی کیے جا رہا تھا: "کافی گناہ ہے، [illegible] ہے ——" اس لیے وہ لوگ جو کافی کو منکر جانتے ہیں، ہمارے مذہب کے احکام کی بجائے شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔

اور آخر میں میں فرنگی مصوروں کا ذکر کروں گا۔ اگر آپ میں ایسے کم نسل لوگ شامل ہیں جنہیں ان جیسا بننے کی تمنا ہے، میری تنبیہ سنیں اور احتراز برتیں۔ یہ فرنگی مصور، بادشاہوں، پادریوں، معززین اور حتیٰ کہ عورتوں کے چہروں کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں کہ تصویر کو غور سے دیکھنے کے بعد آپ ان لوگوں کو عام گلی محلے میں بھی پہچان لیں گے۔ بہر حال، ان کی بیویاں ویسے بھی گلی بازار میں کھلے منہ گھومتی پھرتی ہیں، باقی آپ خود تصور کر لیں۔ یوں جیسے یہی کافی نہ تھا، انہوں نے معاملے اور بڑھا دیے۔ میری مراد دلالی کے حوالے سے نہیں بلکہ مصوری سے ہے۔

ایک بڑا فرنگی متی ایچ فنکار اور ایک دوسرا استاد فنکار، فرنگی سبزہ زار کی سیر کے دوران مصوری اور فن پر گفتگو کر رہے ہیں۔ چہل قدمی میں ان کے سامنے جنگل کا منظر آ جاتا ہے۔ ان میں زیادہ ماہر دوسرے کو کہتا ہے: "نئے انداز میں مصوری ایسی قابلیت کا تقاضا کرتی ہے کہ اس جنگل کے درختوں کی عکاسی کی جائے تو دیکھنے والا یہاں اس جنگل میں آ سکے، اور اگر چاہے تو اس درخت کو الگ الگ پہچان سکے۔"

میں کہ جو معمولی سا ایک درخت ہوں، اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میری تصویر کشی اس نیت سے نہیں کی گئی۔ اور اس لیے نہیں کہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں اس طرح بنایا جاتا تو استنبول کے سارے کتے مجھے اصل درخت سمجھ کر مجھ پر پیشاب کرتے، بلکہ: میں درخت نہیں بلکہ اس کے معنی ہونا چاہتا ہوں۔

میرا نام ہے قرہ

رات دیر گئے برف باری شروع ہوئی اور صبح تک جاری رہی۔ میں نے ساری رات شکورے کا خط بار بار پڑھتے گزاری۔ میں خالی گھر کے خالی کمرے میں ٹہلتا رہا اور کبھی رک کر شمع کی پھڑ پھڑاتی مدھم لو میں اپنی محبوبہ کے خفگی بھرے حروف کو تکتے دیکھتا رہا جو مجھے فریب دینے کی کوشش میں دائیں بائیں ہلتے تھے۔ اچانک میری نگاہوں سے کھڑکی کے پیچھے [illegible] ہوتے اور میری محبوبہ کا چہرہ اور اس کی اُداس مسکراہٹ سامنے آتے۔ میں نے جب اس کا حقیقی چہرہ دیکھا، تو ان تمام چہروں کو بھول گیا جن کے ترش چیری سے دُھن میرے تخیل میں پختہ ہو گئے تھے۔

عین نصف شب کو میں شادی کے خوابوں میں کھو گیا۔ اس کی محبت یا اس کی جوابی محبت پر کوئی شک نہ تھا، ہماری شادی ہماری خوشی سے ہوئی تھی، لیکن میری تصوراتی خوشی نے اس گھر میں نمو پائی، تب غائب ہو گئی جب میں مناسب کام نہ ڈھونڈ پایا اور تصور میں اپنی بیوی سے بحث کرنے لگا، جسے میری کبھی باتوں کی پرواہ نہ تھی۔

مجھے معلوم ہے کہ یہ بدشگون تاثر میں نے غزالی کی کتاب "احیائے علوم" کے شادی کے مضر اثرات کے باب سے اخذ کیے تھے جنھیں میں نے عرب میں اپنے کنوارے دنوں میں راتوں کو پڑھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ اسی باب میں شادی کے فوائد پر بھی نصیحت تھی، اگرچہ اب مجھے صرف دو ہی فائدے یاد تھے: پہلا یہ کہ میری گھر گرہستی میں ترتیب آ جاتی (میرے متصوّرہ گھر میں ایسی کوئی ترتیب نہ تھی)۔ دوسرے یہ کہ میں احساسِ گناہ سے بچ جاؤں گا —— اور اس سے بڑھ کر —— تاریک گلیوں میں دلالوں کے پیچھے طوائفوں کے ٹھکانوں کو جانے سے بھی محفوظ ہو جاؤں گا۔

رات اتنی دیر گئے اپنی نجات کے خیال نے مجھے ایک دوسرے گناہ کی سوچ تک لا پہنچایا۔ شادی کی خواہش کے زیرِ اثر میں خود کو روکنے میں ناکام ہو کر کمرے کے گوشے میں چلا گیا، لیکن کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ بھی بے سود تھا، اس بات کا ثبوت کہ بارہ برس بعد میں پھر سے محبت میں گرفتار ہو گیا تھا!

اس پر میرے دل میں اتنا جوش اور خوف بھر گیا کہ میں کمرے میں شمع کے شعلے کی طرح لرزتا

گھومنے لگا۔ اگر شکورے کو کھڑکی میں کھڑا ہونا تھا تو یہ خط کس لیے تھا، جس نے اس کے برعکس سوچ کو تحریک دی؟ اس کے بابا نے مجھے کیوں بلایا؟ جب میں ٹہل رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ دروازہ، دیوار اور چرچراتا فرش میرے ہر سوال کا جواب میری طرح ہکلا کر اپنی چرچراہٹ سے دے رہے تھے۔

میں اس تصویر کو دیکھا جو میں نے برسوں پہلے بنائی تھی جس میں درخت سے لگی خسرو کی تصویر دیکھ کر اس کی محبت میں گرفتار ہوتی شیریں کی تصویر کشی تھی۔ اس پر مجھے ویسے خیالات نہ ہوئی جیسے گزشتہ برسوں میں یاد آنے پر ہوتی رہی تھی نہ ہی اس پر بچپن کی خوش گوار یادیں میرے ذہن میں آئیں۔ صبح تک میرے دماغ نے یہ گتھی سلجھائی۔ شکورے نے تصویر واپس کر کے عاشق کی شطرنج میں ایسی چال چلی تھی جس سے وہ مجھے مہارت سے ورغلا رہی تھی۔ میں نے شمع کی روشنی میں خط کا جواب لکھا۔

کچھ دیر سونے کے بعد صبح میں باہر نکل گیا اور خط کو اپنی جیب میں لیے سینے سے لگائے دیر تک گلیوں میں چلتا رہا، عادت کے مطابق قلم اور دوات میری پیٹی میں تھے۔ برف باری نے استنبول کی تنگ گلیوں کو چوڑا کر دیا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور کاہلی تھی، جیسا کہ میرے بچپن میں ہوتا تھا۔ میری نوجوانی کے موسم سرما کی طرح، استنبول کی چھتوں، گنبدوں اور باغات پر لگتا تھا کہ کووں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ میں اپنے قدموں کی چاپ سنتے اور اپنے منہ سے نکلتی بھاپ کو دیکھتے تیز تیز ٹہل رہا تھا۔ میں محل کے کتاب خانے کے قریب آنے پر قدرے جوش میں آ گیا کہ جہاں میرے پیارے انشٹے نے مجھے خاموشی سے جانے کا کہا تھا۔ یہودی محلے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے گلی کے آوارہ لڑکے کے ذریعے ایستھر کو پیغام بھیجا کہ ظہر کی نماز سے پہلے وہ مجھے کہاں ملے، اسے شکورے کو میرا خط دینا تھا۔

میں آیا صوفیہ کے عقب میں واقع شاہی فنکاروں کی کارگاہ پہنچا۔ چھت سے ٹکی برفیلی قلموں کے سوا عمارت میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی، جہاں میں شاگردی کے دنوں میں اپنے انشٹے کے پاس اکثر آیا کرتا تھا۔

ایک وجیہہ نوعمر شاگرد کے پیچھے پیچھے میں گوند اور جلد سازی کی بو میں بسے عمر رسیدہ جلد سازوں کے پاس سے گزرا، ماہر مگر اپنے فنکار جو کم عمری میں ہی کمر خمیدہ ہو گئے تھے اور نو عمر غم زدہ لڑکے جو اپنے گھٹنوں پر دھرے پیالوں کو دیکھے بغیر رنگ ملا رہے تھے۔ ایک گوشے میں، میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا اپنی گود میں رکھے شتر مرغ کے انڈے کے خول کی باریک بینی سے تزئین کر رہا تھا، ایک اور بوڑھا الماری کی نقاشی کر رہا تھا اور ایک نوعمر شاگرد ان دونوں کو بصد احترام دیکھ رہا تھا۔ کھلے دروازے سے میں نے شاگردوں کی سرزنش دیکھی، وہ آگے کو اس طرح جھکے ہوئے تھے کہ ان کے سرخ چہروں کی ناک اوراق سے مس ہو رہی تھی جس پر وہ اپنی غلطیاں تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک اور کمرے میں غمگین اور اداس شاگرد، لمحے بھر کو رنگوں، کاغذوں اور تصویر کشی کو بھول کر اس گلی میں جھانک رہا تھا جہاں سے ابھی میں گزر رہا تھا۔

ہم برفیلی سیڑھیوں سے اوپر چڑھے۔ ہم پیش دالان سے گزرے جو عمارت کی دوسری منزل کے گرد اگرد تھا۔ نیچے برف سے ڈھکے اندرونی صحن میں اونی لباس کے باوجود، سردی یا شاید سزا کے خوف

سے کھیلاتے دو نوعمر طلبا منتظر تھے۔ مجھے اپنی نوعمری کے ایام یاد آ گئے اور وہ پٹائی جو سست یا مہنگے رنگ ضائع کرنے والے شاگردوں کی ہوتی تھی، اور وہ پٹائی اور تلووں پر بید زنی جب تک کہ خون نہ نکلتا۔

ہم ایک گرم کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے دو نو آموز دیکھے جن کی شاگردی کے دن ابھی ختم ہوئے تھے۔ چوں کہ اُستاد و فنکار، جنہیں استاد عثمان نے عرف نام دے رکھے تھے، اب اپنے گھروں میں کام کرتے تھے، یہ کمرا جو کبھی میرے اندر عقیدت و احترام اور خوشی کا احساس بیدار کرتا تھا، اب کسی عظیم اور دولت مند سلطان کا کتاب خانہ نہیں بلکہ مشرق کے دور افتادہ پہاڑوں کی کوئی ویران کارواں سرائے لگتا تھا۔

کمرے کے ایک جانب، میں نے پندرہ سال بعد سربراہ مصور استاد عثمان کو دیکھا، وہ کسی بھوت کی طرح لگ رہے تھے۔ اپنے سفر کے دوران میں نے جب بھی تزئین کاری اور مصوری کے بارے میں سوچا تو عظیم استاد میرے تخیل میں یوں آتے جیسے وہ بذات خود بہزاد ہوں، اب اپنے سفید لباس اور آیا صوفیہ کی جانب کھلنے والی کھڑکی سے آتی برف سے سفید روشنی میں وہ کسی دوسری دنیا کی روح لگتے تھے۔ میں نے ان کی دست بوسی کی، ان کے ہاتھ، میں نے غور کیا کہ رنگ سے داغ دار تھے۔ میں نے بتایا کہ کیسے میرے انشتے نے مجھے نوعمری میں یہاں میرا اندراج کروایا تھا لیکن میں نے سرکاری ملازمت کو ترجیح دی اور چلا گیا۔ میں نے انہیں اپنے سفر کے قصے اور مشرق کے شہروں میں پاشاؤں کی ملازمت میں کاتب یا کسی نائب خزانچی کے طور پر کام کرنے کے واقعات سنائے۔ میں نے بتایا کہ تبریز میں سرحد پاشا اور دیگر کے ساتھ کام کے دوران میری خطاطوں اور تزئین کاروں سے ملاقات ہوئی، میں نے کتابیں تیار کیں۔ میں نے بغداد، حلب (Aleppo)، وان (Van) اور تفلس (Tiflis) میں کیسے وقت گزارا اور کیسے بہت سی جنگیں دیکھیں۔

''آہ تفلس!'' عظیم استاد نے کھڑکی سے نیچے برف میں ڈھکے باغ سے آتی روشنی پر نگاہ کرتے کہا، ''کیا اب برف باری ہو رہی ہے؟''

اُن کا انداز اُن بوڑھے ایرانی استادوں سے موزوں تھا جو اپنے فن میں کمال حاصل کرتے کرتے بینائی کھو بیٹھتے اور جو ایک مخصوص عمر کے بعد نیم بزرگ اور نیم دیوانے ہو جاتے تھے اور جن کے بارے میں لاتعداد داستانیں سنائی جاتی تھیں۔ میں نے ان کی جناتی سی آنکھوں میں سیدھا جھانکا اور معلوم کیا کہ انہیں میرے انشتے سے شدید نفرت تھی اور وہ مجھ پر بھی شک کرتے تھے۔ اس کے باوجود میں نے انہیں بتایا کہ کیسے عرب کے ریگستانوں میں برف نہیں پڑتی یوں جیسے صرف آیا صوفیہ ہی نہیں بلکہ یادوں پر بھی برف پڑ رہی تھی۔ میں نے کہانی بنی: جب تفلس کے قلعے پر برف باری ہوتی، دھوبنیں پھولوں کے رنگوں کے گیت گاتی تھیں اور بچے موسم گرما کے لیے اپنے تکیوں کے نیچے برف چھپاتے تھے۔

''جن ملکوں کا تم نے سفر کیا، مجھے وہاں کے تزئین کاروں اور مصوروں کا بتاؤ۔'' انہوں نے پوچھا، ''وہ کیا عکاسی کرتے ہیں؟''

خوابیدہ آنکھوں والے ایک نوجوان مصور نے، جو ایک گوشے میں اپنے خیالوں میں گم کاغذوں

پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ کمرے میں موجود دوسرے لوگوں کے ساتھ نظر اٹھائی اور میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "کوشش کرو یہ تمہارا اب سے ایماندارانہ جواب ہو۔" یہاں کے فنکاروں کی اکثریت اپنے ہی آس پڑوس میں موڑ کے پنساری تک کو نہ جانتی تھی یا کہ ایک اوقہ روٹی کی قیمت کیا ہے، لیکن انہیں ایران کے مشرقی علاقوں کی افواہوں کا تجسس تھا جہاں فوجیں ایک دوسرے سے متصادم تھیں، شہزادے ایک دوسرے کے گلے کاٹتے اور شہروں کو غارت گری کے بعد نذر آتش کر دیتے تھے، جہاں ہر روز جنگ اور امن ہوتا تھا، جہاں بہترین شاعری کی جاتی تھی اور صدیوں سے بہترین منی ایچر فنکاری اور مصوری ہوتی آئی تھی۔

"شاہ طہماسپ کی حکومت 52 سال رہی۔ آپ جانتے ہیں کہ اپنی عمر کے آخری برسوں میں اس نے کتابوں، منی ایچر فنکاری، مصوری سے توبہ کر لی، شاعروں، منی ایچر فنکاروں اور خطاطوں کی سرپرستی چھوڑ دی اور عبادت میں مشغول ہو گیا، اسی عالم میں اس کی موت ہوئی جس کے بعد اس کا بیٹا اسماعیل تخت پر بیٹھا۔" میں نے بتایا۔ "شاہ طہماسپ کو اپنے بیٹے کے باغیانہ مزاج کی خبر تھی، اس لیے اس نے ولی عہد کو بیس برس تک کمرے میں مقفل رکھا۔ جیسے ہی اسماعیل تخت نشین ہوا، غصے کی دیوانگی میں اس نے اپنے چھوٹے بھائیوں کو مروا دیا، کچھ کو تو وہ پہلے اندھا کروا چکا تھا۔ اسماعیل کے مخالفوں نے آخر اسے افیون کی لت لگائی اور اسے یوں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے اور اسے اس جہانِ فانی سے رخصت کرنے کے بعد انہوں نے اس کے نیم دیوانے بڑے سوتیلے بھائی محمد بندہ کو تخت نشین کر دیا۔ اس کے دورِ حکومت میں تمام شہزادوں، بھائیوں، صوبائی گورنروں اور ازبکوں، سبھی نے بغاوت کر دی۔ ان سب اور ہمارے سرحد پاشا میں ایسی شدید جنگیں ہوئیں کہ پورا ایران راکھ اور دھوئیں میں بدل کر بدنظمی کا شکار ہو گیا۔ بلاشبہ، شاہ جو دولت و عقل سے محروم اور نصف نابینا ہے، کتابوں کی تزئین اور تیاری کی سرپرستی کے قابل نہیں۔ اس لیے قزوین اور ہرات کے داستانوی مصور، یہ تمام بزرگ استاد اپنے شاگردوں کے ساتھ، یہ کاریگر جنہوں نے شاہ طہماسپ کے کتاب خانے میں شہکار تخلیق کیے تھے، مصور اور رنگ ساز جن کے موقلم نے سرپٹ بھاگتے گھوڑے اور صفحوں سے باہر نکلنے کو تیار تتلیاں بنائی تھیں، یہ تمام ماہر جلد ساز اور خطاط، سب کے سب بیکار ہو گئے۔ وہ غریب، محتاج، بے گھر اور محروم ہو گئے۔ کچھ شمال کی طرف ازبکوں کی جانب ہجرت کر گئے اور کچھ مغرب میں ہندوستان چلے گئے۔ باقی نے دوسری نوعیت کے کام کرنے شروع کر کے خود اور اپنے وقار کو برباد کرنا شروع کیا، کچھ نے غیر اہم شہزادوں اور صوبائی گورنروں کے ہاں ملازمت کر لی، وہ سب جو ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے، اور چھوٹی چھوٹی کتابوں پر کام شروع کر دیا جو گنتی کے تزئین شدہ اوراق پر مشتمل تھیں۔ عجلت میں لکھی، جلدی میں رنگ کی ہوئی ایسی سستی کتابیں جگہ جگہ ملنے لگیں جو عام سپاہیوں، ظالم پاشا اور بگڑے ہوئے شہزادوں کے ذوق کے عین مطابق تھیں۔"

"ان پر کیا صرف ہوتا تھا؟" استاد عثمان نے پوچھا۔

"میں نے سنا ہے کہ عظیم صادقی بے نے محض چالیس سونے کے سکوں کے عوض ازبک سپاہی

گھڑسوار کے لیے "عجیب و غریب مخلوقات" کی جو نقل مصوری کی تھی۔ ایک بدتہذیب پاشا جو مشرقی مہم سے ارض روم ہوا واپس لوٹ رہا تھا، اس کے خیمے میں، میں نے مصور سیاوش کی بنی نقش تصویروں کی جلد دیکھی۔ چند بڑے مصور جنہوں نے ابھی مصوری ترک نہ کی تھی، وہ انفرادی سطح پر تصویریں بنا کر فروخت کر رہے تھے، جو کہ بہر حال کسی کہانی کا حصہ نہ تھیں۔ اس طرح الگ الگ اوراق کو دیکھنے سے یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ کس منظر اور کس کہانی کی ترجمانی کرتے تھے، بس دیکھ کر صرف ان کی خوب صورتی سراہی جا سکتی تھی۔ مثال کے طور پر آپ یہ کہتے تھے کہ "کس قدر خوب، یہ تو اصلی گھوڑے جیسا ہے۔" اور فنکار کو اس بنیاد پر ادائیگی کرتے۔ جنگوں کے اور بیہودہ مناظر عام ہیں۔ میدان جنگ کی تصویر کی قیمت چاندی کے تین سو سکوں تک گر چکی ہے اور دلچسپی رکھنے والے گاہک بھی کم تھے۔ اپنی تصویریں سستی بیچنے اور گاہکوں کو متوجہ کرنے کو کچھ مصور کھردرے اور نامکمل اوراق پر روشنائی سے تصویریں بنا کر رنگ بھر دیتے ہیں۔

"ایک طلا کار تھا جو بے حد مطمئن اور باصلاحیت تھا۔" استاد عثمان نے کہا، "وہ اپنا کام آتی نجابت سے کرتا تھا کہ ہم اسے "نفیس آفندی" کہنے لگے۔ لیکن وہ ہمیں چھوڑ گیا ہے۔ چھ روز ہو گئے، اور وہ کہیں نہیں مل رہا۔ وہ غائب ہی ہو گیا ہے۔"

"کوئی ایسے سرتوں بھرے کتاب خانے کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"تتلی، زیتون، لقلق اور نفیس آفندی ان چار فنکاروں کی تربیت شروع سے ہی میں نے کی ہے، اب یہ ہمارے سلطان کے حکم پر گھر بیٹھے ہی کام کرتے ہیں۔" استاد عثمان نے کہا۔

ایسا اس لیے کیا گیا تا کہ وہ بظاہر آسانی سے "سور نامۂ ہمایوں" پر کام کر سکیں۔ اس مرتبہ سلطان نے محل کے صحن میں استاد منی ایچر فنکاروں کے لیے الگ انتظام کی بجائے حکم جاری کیا کہ وہ گھروں میں رہ کر کام کریں۔ جب مجھے خیال آیا کہ یہ حکم شاید میرے انشتے کی کتاب کے لیے تھا تو میں خاموش ہو گیا۔ کیا استاد عثمان کسی اور پردہ وارادے سے یہ کہہ رہے تھے؟

"نوری آفندی!" انہوں نے ایک زرد چہرے اور خمیدہ کمر مصور کو پکارا۔ "ہمارے استاد قرہ کو کتاب خانے کا "معائنہ" کرواؤ۔"

"معائنہ" ہمارے سلطان کی منی ایچر فنکاروں کے کتاب خانے کی معمول کی سیر کی روایت کا نام تھا، وہ وقت جب عالی مقام سلطان کو کتاب خانے کے معاملات میں واقعی دلچسپی تھی۔ سربراہ خزانچی حازم، شاعرانہ وقائع نگار لقمان اور سربراہ مصور عثمان کی سرپرستی میں، ہمارے سلطان کو بتایا جاتا کہ کس وقت کون سے ورق پر کام ہو رہا ہے، طلا کاری کون کر رہا ہے، تصویروں کو رنگ کون دے رہا ہے اور ایک ایک کر کے بتایا جاتا کہ کیسے رنگ بھرنے والے، ترتیب دینے والے، طلا کار اور ماہر منی ایچر فنکار جن کی قابلیت کے سبب اتنے معجزے جیسے کام ہوئے، کام کیسے کرتے تھے۔ مجھے اس بات پر رنج ہوا کہ وہاں منعقدہ تقریب کی بجائے ایک جعلی قسم کی تقریب ہوتی ہے کیوں کہ شاعرانہ وقائع نگار لقمان آفندی جو تزئین

کی جانے والی کتابیں لکھتا تھا اب خرابیِ صحت کی وجہ سے گھر پر ہی ہوتا تھا، اور کیوں کہ استاد عثمان اکثر بیمار بھی اور ضعف کا شکار رہتے، کیوں کہ چار ماہر فنکار: زیتون، بگلا اور لقلق اپنے گھروں میں ہی کام کرتے تھے اور اس لیے کہ ہمارے سلطان کی اب کتاب خانے میں دلچسپی، بچوں کے شوق کی طرح ماند پڑ چکی تھی۔ جیسا کہ اکثر منی ایچر فنکاروں کے ساتھ ہوا، نوری آفندی بیکاری زندگی کا تجربہ، اور اپنے فن میں مہارت حاصل کیے بغیر ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ کیا اس نے اتنے برس اپنی میز پر جھکے کر ہی امید کرنے میں گزارے تھے: وہ کتاب خانے میں جو کچھ ہوتا اس پر اپنی نظر رکھتا تھا کہ کون کس غیر معمولی ورق پر کام کر رہا تھا۔

میں نے بڑے شوق سے پہلی مرتبہ "سور نامہ ہمایوں" کے اوراق دیکھے جن میں ہمارے سلطان کے شہزادے کی ختنوں کی تقریب کی عکاسی تھی۔ جب میں ابھی ایران میں ہی تھا، میں نے باون روزہ جشن کے بارے میں سنا تھا۔ اس تقریب میں استنبول کے تمام پیشوں اور گلڈ نے شرکت کی تھی، بلاشبہ تب مجھے دکھائی جانے والی اس کتاب پر کام شروع نہ ہوا تھا۔

میرے سامنے رکھی گئی پہلی تصویر میں مرحوم ابراہیم پاشا کے محل کے شاہی احاطے سے عالم پناہ ہمارے سلطان بیچ چوگان (Hippodrome) میں جشن کو چہرے پر طمانیت کا تاثر لیے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے کے خدوخال اگرچہ دوسروں سے ممتاز نہیں بنائے گئے تھے، لیکن مقبولیت و مہارت سے تصویر کشی کی گئی تھی۔ ہمارے سلطان کو صفحے کے بائیں طرف دکھایا گیا تھا اور دوسرے صفحے کے دائیں طرف عہدیداروں اور کھڑکیوں کے درمیان وزیر، پاشا، ایرانی سفارتی، فرنگیوں اور وینس کے سفیر کھڑے تھے۔ چوں کہ وہ سلطان نہیں تھے، ان کی آنکھیں جو قلت اور بے یقینی سے بنائی گئی تھیں، میدان میں ہونے والے جشن میں کسی خاص مقام پر مرکوز نہ تھیں۔ بعد میں میں نے دوسری تصویروں میں دیکھا کہ اسی ترتیب کو دہرایا گیا تھا، اگرچہ دیواری سجاوٹوں، درختوں کو مختلف انداز اور رنگوں میں دکھایا گیا تھا۔ جب کاتب ایک بار متن لکھ دیتے، تصویریں بن جاتیں، کتاب کی جلد مکمل ہو جاتی تو قاری کو اوراق پلٹتے ہر بار ہپوڈروم مختلف رنگوں میں دکھائی دیتا جہاں سلطان اور ان کے مہمانوں کی نگاہوں کے سامنے جشن جاری تھا، جو ہمیشہ ایک ہی انداز میں کھڑے نیچے ہجوم پر نگاہیں جمائے ہوتے تھے۔

وہاں میں نے ہپوڈروم (Hippodrome) میں پلاؤ کے سینکڑوں طشت کی جانب لوگ بھاگتے دیکھے۔ میں نے بچھڑے بغل سے زندہ خرگوش اور پرندے نکلنے پر لوگوں کی حیرانی دیکھی۔ میں نے ماہر شعبدوں کے گروہ کو چھکڑے میں سلطان کے سامنے پریڈ میں گزرتے دیکھا جس کے لوگ فرش پر لیٹے ایک آدمی کی چھاتی پر رکھے تانبے کے برتنوں کو ضربیں لگا رہے تھے لیکن کوئی ضرب اس آدمی کو نہیں لگ رہی تھی۔ سرو اور پھولوں سے آئینے سجانے والے گاڑی میں ہمارے سلطان کے سامنے سے گزرے۔ میں نے چینی کے تھیلوں سے لدے اونٹوں کے ساتھ چینی طوطوں کے پنجرے اٹھائے خوش آہنگ گیت گاتے حلوائیوں کو دیکھا اور ضعیف قفل سازوں کو جو مختلف قسم کے تالے، قفل، بیکار کنڈے، گراری والے تالے اٹھائے ہوئے تھے،

جب وہ نئے زمانوں اور نئے دروازوں کی برائی کر رہے تھے۔ تلی، بگلے اور زیتون نے جادوگروں کی تصویر کشی کی تھی: ان میں سے ایک جادوگر بانس پر انڈوں کو لڑھکا رہا تھا یوں جیسے وہ سنگ مرمر کے چوڑے ٹکڑے پر ہوں، دوسرا طنبورہ بجا رہا تھا۔ ایک گاڑی میں میں نے دیکھا کہ بحری کپتان قلیچ علی پاشا نے کیسے سمندر سے پکڑے کافروں سے مٹی سے "کافر پہاڑ" بنوایا تھا، پھر اس نے تمام غلاموں کو ایک گاڑی میں لادا اور جب سلطان کے سامنے پہنچا تو اس نے "پہاڑ" کے اندر موجود بارود انھیں یہ دکھانے کو اڑا دیا کہ کیسے اس نے توپوں کی گولہ باری سے کافروں سرزمینوں کو فتح کیا تھا۔ میں نے ڈاڑھی مونچھ منڈے گلابی اور اودی وردی پہنے قصابوں کو چھرے لہراتے اور اپنے سامنے کھال اُتری بھیڑوں کو دیکھ کر مسکراتے دیکھا۔ تماشائیوں نے شیروں کو سدھانے والوں کو ہمارے سلطان کے سامنے زنجیروں میں جکڑے شیر لانے پر داد دی، جو انھیں بجز کا رہے تھے یہاں تک کہ ان شیروں کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ اگلے صفحے پر میں نے شیر کو اسلام کی علامت کے طور پر مکار عیسائیوں کی علامت گلابی سوروں کو بھگاتے دیکھا۔ میں نے چھکڑے میں ہی بنی دکان کی چھت سے الٹے لٹکے ایک حجام کو ایک گاہک کی ڈاڑھی بناتے دیکھا جب کہ اس کا معاون سرخ وردی پہنے آئینہ اور چاندی کے پیالے میں خوشبودار صابن لیے بخشش کا منتظر تھا۔ میں نے اس عالیشان تصویر بنانے والے منی ایچر فنکار کا نام دریافت کیا۔

"یہ بلاشبہ اہم ہے کہ تصویر کی خوب صورتی ہمیں زندگی کی بہجتات، محبت، خدا کی تخلیق شدہ کائنات کے رنگوں کے ذریعے غور و فکر اور ایمان کی طرف بلاتی ہے۔ منی ایچر فنکار کی شناخت اہم نہیں۔"

کیا منی ایچر فنکار نوری اپنی سوچ میں اس سے زیادہ بار یک بیں تھا، جتنا میرا خیال تھا کیوں کہ وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے انشٹے نے مجھے یہاں تفتیش کے لیے بھیجا تھا یا وہ محض بڑے مصور استاد عثمان کی بات دہرا رہا تھا؟

"کیا نفیس آفندی نے ہی ساری طلاکاری کی ہے؟" میں نے پوچھا، "ان کی غیر حاضری میں یہ کون کر رہا ہے؟"

اندرونی صحن کے سامنے کھلے دروازے سے بچوں کی چیخ و پکار سنائی دیتی تھی۔ شاگردوں کے ایک شعبے کے استاد نے ان شاگردوں کی مار پیٹ اور بے عزتی شروع کر دی تھی، جن کی جیبوں سے شاید کاغذ میں دو سرخ سیاہی کا سفوف اور سونے کے ورق پکڑے گئے تھے۔ ان میں سے دو وہی تھے جنھیں میں نے اوپر آتے ہوئے سردی میں ٹھٹھرتے منتظر دیکھا تھا۔ نوعمر مصور ان کا مذاق اڑانے کا موقع ہاتھ آنے پر دروازے کی طرف دوڑے۔

"جب تک شاگرد ہمارے استاد عثمان کی ہدایت کے مطابق پیوڈروم کو گلابی رنگ دیتے تھے،" نوری آفندی نے محتاط ہو کر کہا، "تب تک ہمارے بھائی نفیس آفندی جہاں بھی گئے ہوں، وہ واپس آ کر ان دو صفحات کی طلاکاری مکمل کر دیں گے۔ ہمارے منی ایچر فنکار استاد عثمان چاہتے تھے کہ نفیس آفندی

چونا روم کے گرد آلود فرش کو ہر منظر میں نیا رنگ دیتے، گلابی، ہندوستانی سبز، زعفرانی زرد، یا بلخ کی ریت کا رنگ۔ جو بھی پہلی تصویر کو دیکھے یہی خیال کرے گا کہ یہ گرد بھرا میدان خاکی رنگ کا ہی ہونا چاہیے، لیکن دوسری اور تیسری تصویر میں وہ لطف اٹھانے کو نیا لے کی بجائے دوسرے رنگ دیکھنا چاہے گا۔ تزئین کاری سے ورق پر خوشی بکھرنی چاہیے۔''

مجھے ایک ورق پر چند تصویریں نظر آئیں جو کوئی شاگرد اس کونے میں چھوڑ گیا تھا۔ وہ ''کتاب فتوحات'' کے لیے کام کر رہا تھا جس میں ایک بحری بیڑے کو جنگ کے لیے روانہ ہوتے دکھایا گیا تھا۔ لیکن یہ واضح تھا کہ اس کے دوستوں، جو درے یا بید کھا رہے تھے، کی چٹکیوں نے اسے وہاں سے ہٹ کر انہیں دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ بحری بیڑہ جو اس نے ایک جیسے جہازوں کی نقل سے بنایا تھا، سمندر میں تیرتا لگ رہا تھا، پھر بھی اس مصنوعی پن اور بادبانوں میں ہوا کے نہ ہونے کا تعلق نوجوان کی عدم مہارت سے تھا۔ میں نے رنج سے دیکھا کہ کاغذ کا وہ نمونہ کسی ایسی پرانی کتاب سے جلد بازی میں قطع کیا گیا تھا جسے میں پہچان نہ پایا۔ یقیناً استاد عثمان بہت کچھ نظر انداز کر رہے تھے۔

نوری آفندی نے ہمارے اپنی میز پر آنے پر فخر سے بتایا کہ اس نے ہمارے سلطان کے شاہی نشان کی طلاکاری مکمل کر لی تھی جس پر وہ پچھلے تین ہفتوں سے کام کر رہا تھا۔ میں نے احترام سے نوری آفندی کی طلاکاری کی تعریف کی جو ایک خالی ورق پر بنائی گئی تھی تاکہ اس کے وصول کنندہ اور اسے بھیجنے کا سبب دونوں راز میں رہیں۔ میں جانتا تھا کہ مشرق کے [illegible] پاشا، سلطان کے شاہی نشان کے وقار اور طاقت کو دیکھ کر بغاوت سے گریز کرتے تھے۔

اس کے بعد ہم نے خطاط جمال کے ہاتھ کے [illegible] شاہکار دیکھے لیکن ہم ان پر سرسری نظر ڈال کر رنگ اور تزئین کاری کے ان مخالفوں کو اہمیت دینے سے گریز کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے جن کا موقف تھا کہ اصل فن صرف خطاطی تھا اور یہ کہ تزئین کاری کی اہمیت ثانوی تھی۔

ناصر طلاکار، امیر تیمور کے بیٹوں کے زمانے کے نظامی کی ''خمسہ'' کی اس تصویر کو درست کرنے کے ارادے میں خراب کر رہا تھا، جس میں خسرو نے شیریں کو چاندنی میں جھیل میں غسل کرتے دیکھا تھا۔

92 سالہ سابق استاد جو نیم نابینا تھا اور اس کے پاس کہنے کو اس دعوے کے سوا کچھ نہ تھا کہ ساٹھ سال پہلے اس نے تبریز میں استاد بہزاد کا ہاتھ چوما تھا اور یہ کہ وہ عظیم استاد اس وقت نابینا اور نشے میں تھا، اس نے ہمیں لرزتے ہاتھوں سے اس قلم دان پر مبنی ایجر فنکاری دکھائی جو وہ اب تین ماہ بعد مکمل ہونے پر وہ سلطان کو تحفے میں پیش کرتا۔

کچھ دیر بعد سارے کتاب خانے پر خاموشی چھا گئی جہاں اسی کے لگ بھگ مصور، طالب علم اور شاگرد نچلی منزل کے چھوٹے کمروں میں کام کرتے تھے۔ یہ مار پٹائی کے بعد کی وہ خاموشی تھی جس کا مجھے کئی بار کا تجربہ تھا؟! ایسی خاموشی جو اعصاب شکن قہقہے، فقرہ بازی، کبھی کبھار چند سسکیوں یا پٹائی ہونے والے

وقوں کی رونے کے دورے سے پہلے دبی دبی کراہوں سے ٹوٹتی تھی، جو استادوں کو اپنی شاگردی کے ایام کی یاد دلاتی۔ لیکن 92 سالہ نیم نابینا استاد نے مجھے یہاں سب جنگوں اور افراتفری سے دور لمحے بھر کو گہری سوچ میں ڈال دیا: یہ احساس کہ ہر چیز اپنے انجام کو پہنچنے والی ہے۔ دنیا کے انجام سے کچھ دیر پہلے بھی ایسی ہی خاموشی چھا جائے گی۔

مصوری سوچ کی خاموشی اور بصارت کی موسیقی ہے۔

جب میں نے استاد عثمان کو الوداع کہنے کی خاطر ان کا ہاتھ چوما، مجھے ان کے لیے نہ صرف احترام بلکہ ایسا جذبہ بھی محسوس ہوا جس نے میری روح کو کرب آشنا کر دیا: ترس و ترحم میں ملا جلا تقدس جو کسی ولی کے لیے موزوں ہے، خاص قسم کا احساس خطا۔ شاید اس لیے کہ میرے انیشٹے چاہتے تھے کہ مصور کھلم کھلا یا چوری چھپے فرنگی مصوروں کے انداز کی پیروی کریں، اور وہ ان کے حریف تھے۔

مجھے اچانک یہ بھی محسوس ہوا کہ شاید میں اس عظیم استاد کو آخری مرتبہ زندہ دیکھ رہا تھا اور انہیں خوش کرنے کی خواہش میں، میں نے ان سے ایک سوال پوچھا:

''میرے عظیم استاد، میرے ... ایک حقیقی منی ایچر فنکار کو کسی عام منی ایچر فنکار سے کیا چیز ممتاز کرتی ہے؟'' میرا خیال تھا کہ سربراہ مصور ایسے خوشامدی سوالات کے عادی تھے، مجھے ٹکا توڑ جواب دیں گے اور یہ کہ وہ تو یہ بھی جو لیے ہوتے کہ میں کون...

''ایسا کوئی معیار نہیں جو کسی عظیم منی ایچر فنکار کو کسی بے ہنر اور بے ایمان منی ایچر فنکار سے الگ کر سکے۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ پھر بھی وہ مہارت اور اخلاقیات جن سے وہ ہمارے فن کے لیے خطرہ بننے والی برائیوں کا سامنا کرتا ہے، زیادہ اہم ہیں۔ آج اس کا تعین کرنے کے لیے کہ کوئی کتنا خالص مصور ہے، میں اس سے تین سوال پوچھوں گا۔''

''اور وہ سوال کیا ہوں گے؟''

''موجودہ روایت اور ساتھ ہی چینی اور یورپی فرنگیوں کے زیر اثر کیا وہ یہ ماننے لگا ہے کہ اس کی مصوری کا اپنا ایک الگ انداز یا اسلوب ہونا چاہیے؟ کیا بطور مصور وہ دوسروں سے الگ انداز، دوسروں سے الگ کوئی پہلو اپنانا چاہتا ہے اور کیا وہ اسے فرنگی مصوروں کی طرح اپنے کام پر دستخط کر کے ثابت کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے؟ ان باتوں کے تعین کے لیے میں اس سے ''انداز یا اسلوب'' اور ''دستخط'' کے بارے میں سوال کروں گا۔''

''اور پھر؟'' میں نے احترام سے پوچھا۔

''پھر میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس مصور کا ان کتابوں کے ایک سے دوسرے کے پاس پہنچنے کے بارے میں کیا خیال ہے جن کی جلدیں کھولی گئیں اور دوسرے ادوار میں، جب وہ شاہ یا سلطان فوت ہو گئے جنہوں نے ان کو اپنی سرپرستی میں بنوایا تھا، ہماری تصویریں دوسری کتابوں میں استعمال کی گئیں۔ یہ ایک

نازک معاملہ ہے جو کسی کے اس پر پریشان یا خوش ہوئے بغیر ردعمل کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لیے میں مصور سے ''وقت'' کے بارے میں ایک سوال پوچھوں گا۔ مصور کا وقت اور اللہ کا وقت۔ کیا تم میری بات سمجھے ہو میرے بچے؟''

نہیں۔ لیکن میں نے یہ کہنے کی بجائے پوچھا، ''اور تیسرا سوال؟''

''تیسرا سوال نابینا پن کے بارے میں ہے۔'' سربراہ مصور نے کہا اور پھر خاموش ہو گئے جیسے اس بات کی کسی وضاحت کی ضرورت نہ تھی۔

''نابینا پن'' کے بارے میں کیا؟'' میں قدرے خجل ہو کر کہا۔

''نابینا پن خاموشی ہے۔ اگر تم میرے دو سوالوں کو آپس میں جوڑو تو نابینا پن ہی ظاہر ہوگا۔ مصوری میں کوئی اسی آخری حد تک جا سکتا ہے، یہ وہ سب دیکھتا ہے جو اللہ کی عطا کردہ تاریکی میں ظاہر ہوتا ہے۔''

میں نے مزید شکریہ کہا اور باہر نکل آیا۔ میں بغیر جلدی کیے سرو پیڑ جیسوں سے اترا۔ میں جانتا تھا کہ میں عظیم استاد کے یہ تینوں سوال صرف گفتگو کی خاطر نہیں بلکہ اپنی ہم عصر ان عظیم ہستیوں کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے تتلی، زیتون اور بگلے سے پوچھوں گا۔

میں البتہ فوراً ہی ان ماہر مصوروں کے گھروں کی طرف نہ گیا۔ میں یہودی محلے کے اس نئے بازار میں استھر سے ملا جو شاخ زریں اور باسفورس کا بلندی سے نظارہ پیش کرتا تھا۔ استھر وہی گلابی لباس پہنے ہوئے تھی جسے پہننا یہودی ہونے کے سبب اس کی مجبوری تھی۔ اپنے ڈیل ڈول اور چاق و چوبند جسم، اس کا منہ جو لگاتار چلتا رہتا تھا، آنکھیں اور بھنویں جو اشارے کرتی تھیں، بلاشبہ خریداری کرتی کنیزوں، رنگ اڑے دوپٹے کا قفتان پہنے غریب عورتوں اور اس ہجوم میں وہ ایسے ہی کھڑی تھی، جیسے گاجروں، پیاز اور شلغم کے ڈھیروں میں گم تھا۔

اس نے میرا دیا خط پراسرار انداز سے اپنی شلوار میں ایسے اڑس لیا جیسے پورا بازار ہماری جاسوسی کر رہا ہو۔ اس نے مجھے بتایا کہ شکورے میرے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے اپنی بخشش لی اور جب میں نے کہا، ''مہربانی کر کے جلدی کرو اور خط فوراً پہنچا دو'' تو اس نے اپنی گٹھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اسے ابھی کئی کام نمٹانے تھے اور وہ دوپہر سے پہلے خط نہیں پہنچا سکتی تھی۔ میں نے اسے شکورے کو خبر پہنچانے کا کہا کہ میں تین نوجوان اور مشہور منی ایچر فنکاروں سے ملنے جا رہا تھا۔

مجھے ''تتلی'' کہتے ہیں

ابھی نمازِ عصر کی اذان نہیں ہوئی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی، میں نے کھولا اور قرہ آفندی کو اپنے سامنے کھڑے پایا، جو شاگردی کے دنوں میں ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور رخسار پر بوسہ دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آیا وہ اپنے انشتے کا کوئی پیغام لایا تھا جب اس نے کہا کہ وہ ان اوراق کو دیکھنا چاہتا تھا جن پر میں مصوری کیا کرتا تھا اور میری بنائی تصویریں، یہ کہ وہ دوستی کے ناتے آیا تھا اور ہمارے سلطان کے نام پر مجھ سے سوال پوچھا جاتا تھا۔ ''بہت خوب!'' میں نے کہا، ''مجھے کس سوال کا جواب دینا ہے؟''

اس نے بتایا۔ بہت خوب، پھر!

انداز یا اسلوب اور دستخط

''جب تک کہ اپنی بصارت اور ہنر کی بجائے دولت و شہرت سے تحریک پانے والے بے وقعت فنکاروں کی تعداد بڑھتی رہے گی۔'' میں نے کہا، ''ہم اس ''اسلوب'' اور ''دستخط'' کے خیال سے مغلوب ہونے جیسی بے ہودگی اور بے انتہا حرص دیکھتے رہیں گے۔'' میں نے یہ تعارف اس لیے کروایا کہ یہ ایسے ہی تھا اس لیے نہیں کہ مجھے اس کا یقین تھا۔ حقیقی قابلیت اور صلاحیت کو دولت اور شہرت کی محبت بھی خراب نہیں کر سکتی۔ مزید، اگر سچ کہا جائے تو دولت اور شہرت باصلاحیت لوگوں کا حق ہیں، جیسے میرے معاملے میں، اور یہ بھی بڑے کارنامے کرنے پر اکساتے ہیں۔ لیکن اگر میں یہ سب کھل کر کہتا تو منی ایچر فنکاروں کے حلقے میں رشک وحسد کا شکار اوسط درجے کے مصور مجھ پر ٹوٹ پڑتے سو یہ ثابت کرنے کو کہ میں اس کام سے ان سے زیادہ محبت رکھتا ہوں، میں چاول کے ایک دانے پر درخت کی تصویر بناؤں گا۔ میں خوب واقف ہوں کہ ''اسلوب''، ''دستخط'' اور ''کردار'' کی یہ حرص ہم تک مشرق سے ان بدقسمت چینی استادوں کے ذریعے پہنچی ہے جو یورپیوں کے زیرِ اثر مسیحی پادریوں کے ذریعے مغرب سے آنے والی تصویروں کے باعث جھنگ گئے۔ تاہم مجھے اس موضوع کی تشریح کے لیے تین مثالیں پیش کرنے دیجیے۔''

اسلوب اور دستخط پر تین مثالیں

الف: ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہرات کے شمال میں کسی پہاڑی قلعہ میں ایک نوجوان خان رہتا تھا جو مصوری اور منی ایچر فنکاری میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس خان کو اپنے حرم میں صرف ایک عورت سے محبت تھی اور وہ حسین وجمیل تاتاری عورت بھی، جس سے خان کو دیوانہ وار محبت تھی، اُس سے محبت کرتی تھی۔ ان کو وصل انہیں ایسی بے خودی دیتا کہ ان کی واحد خواہش ابدی زندگی جینا تھی۔ ان پر جلد ہی یہ منکشف ہو گیا کہ اس خواہش کی تکمیل کا سب سے بہترین طریقہ کتابیں کھولنا اور گھنٹوں اور دنوں مسلسل پرانے استادوں کی حیرت انگیز بے عیب تصویریں دیکھنا تھا۔ جب وہ ہر لحاظ سے مکمل ان بے عیب تصویروں کو دیکھتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ وقت تھم جائے گا اور ان کی مسرت ان تصویروں میں سنائی گئی سنہری دور کی داستانوں میں ضم ہو جائے گی۔ شاہی کتاب خانے میں ایک ماہر ترین منی ایچر فنکار تھا جس نے ان ہی کتابوں کے ان ہی اوراق کے لیے بار ہا بے عیب تصویریں بنائی تھیں۔ اپنی روایت کے مطابق، وہ فنکار شیریں کے لیے فرہاد کے کرب کی عکاسی ہو یا لیلیٰ اور مجنوں کی محبت بھری نگاہوں کا تبادلہ یا داستانوی باغ ارم میں خسرو اور شیریں کی نظروں کا تبادلہ، وہ یہ سب تصویریں ایک معمولی سی تبدیلی کے ساتھ بناتا: ان داستانوی محبت زدگان کی بجائے وہ خان اور اس کی تاتاری محبوبہ کی تصویر بنا دیتا۔ ان اوراق کی بدولت خان اور اس کی محبوبہ کو یقین تھا کہ ان کی بے خودی کبھی ختم نہ ہوگی، یوں انہوں نے اس منی ایچر فنکار پر تحسین اور دولت کی برسات کر دی۔ آخر کار اس ستائش نے منی ایچر فنکار کو جھٹکا دیا اور شیطان کے بہکاوے میں آ کر اس نے یہ حقیقت بھلا دی کہ اپنی تصویروں کی کاملیت کے لیے وہ پرانے استادوں کا مرہون منت تھا اور یہ سوچا کہ خود اپنی ذہانت کے استعمال سے وہ ان تصویروں کو زیادہ متاثر کن بنائے گا۔ جب خان اور اس کی محبوبہ نے اس فنکار کے انفرادی انداز اور تبدیلیوں کو کسی نقص کی طرح ہی دیکھا اور پریشان ہوئے۔ تصویروں میں جن کا خان نے تفصیل سے جائزہ لیا، اس نے محسوس کیا کہ اس کی پہلے والی بے خودی کئی طرح سے منتشر تھی اور اسے اپنی تاتاری حسین محبوبہ سے حسد ہونے لگا جسے مصور نے خودی بنایا تھا۔ یوں اپنی حسین وجمیل تاتاری حسینہ کو حسد میں مبتلا کرنے کو اس نے ایک اور کنیز سے وصل کیا۔ اس کی محبوبہ اس بے وفائی پر اتنی دل گرفتہ ہوئی کہ اس نے ایک روز خاموشی سے حرم کے صحن میں صنوبر کے درخت سے پھانسی لے لی۔ خان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے جانا کہ حادثے کا سبب منی ایچر فنکار کا اپنا الگ انداز رکھنے کی تمنا تھی، سو اس نے اس فنکار کو اندھا کروا دیا جسے شیطان نے بہکایا تھا۔

ب: ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ شرق کا ایک بوڑھا سلطان تھا جو مصوری، خطاطی اور منی ایچر فنکاری کا شوقین تھا، اپنی بے مثال حسن کی مالکہ چینی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ افسوس، ہوا یوں کہ سلطان کا پہلی بیوی سے ایک وجیہہ بیٹا اور سلطان کی نوجوان بیوی ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے۔ بیٹے نے جو اپنے باپ سے فریب دہی کے خوف میں تھا اور اپنے ممنوعہ عشق پر شرمندہ، خود کو کتاب خانے میں بند کر کے مصوری

شروع کر دی۔ چوں کہ وہ اپنے دکھ اور محبت کی طاقت پر تصویریں بناتا تھا، اس کی ہر تصویر اتنی اعلیٰ ہوتی تھی کہ قدر دان انھیں کسی پرانے اُستاد کے شہکار سمجھتے تھے۔ سلطان کو اپنے جوان بیٹے پر فخر تھا اور اس کی خوب صورت چھوٹی بیوی تصویر دیکھتے کہتی: ''ہاں۔ بہت عمدہ۔ وقت گزرتا رہے گا اور اگر وہ ان پر اپنے دستخط ثبت نہیں کرے گا تو کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ اتنی شاہانہ تصویریں کس نے بنائی تھیں۔'' سلطان نے جواب دیا، ''اگر میرا بیٹا ان پر دستخط کر دے تو کیا وہ پرانے اُستادوں کے اسلوب اور تکنیک جو اس نے نقل کیے، کے ساتھ غیر منصفانہ زیادتی نہیں کرے گا۔ اگر دستخط کر دے تو کیا وہ یہ نہیں کہہ رہا ہو گا کہ میری تصویروں میں میرے عیوب ہیں۔'' چھوٹی بیوی نے جان لیا کہ دستخط کے سلسلے میں وہ اپنے بوڑھے شوہر کو قائل نہ کر سکے گی۔ لیکن آخر کار وہ اس کے جوان بیٹے کو جس نے خود کو کتاب خانے میں محدود کر لیا تھا، قائل کرنے میں کامیاب رہی۔ اپنی ممنوعہ محبت چھپانے کے سبب احساسِ ذلت کے شکار ہونے، حسین سوتیلی ماں کی تجویز پر قائل اور شیطان کے بہکاوے میں آ کر بیٹے نے ایک تصویر میں دیوار اور گھاس کے درمیان میں ایک نہاں گوشے میں دستخط کر دیے۔ خسرو و شیریں کا منظر بکی تصویر تھی جس پر اس نے دستخط کیے۔ اس تصویر سے آپ واقف ہیں: خسرو اور شیریں کی شادی کے بعد، خسرو کی پہلی بیوی سے اس کا بیٹا شیرویہ شیریں پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ ایک رات شیرویہ کھڑکی کے رستے ان کی خواب گاہ میں داخل ہو کر اپنے باپ کے سینے میں خنجر گھونپ دیتا ہے۔ سلطان نے جب اپنے بیٹے کی یہ منظر کشی دیکھی تو اسے لگا تصویر میں کوئی عیب تھا۔ اس نے دستخط دیکھے تو تھے لیکن شعوری طور پر وہ ان سے آگاہ نہ تھا اور تصویر کے بارے میں اس کا ردِ عمل تھا: ''اس تصویر میں کہیں کوئی خامی ہے۔'' چوں کہ پرانے اُستادوں سے غلطی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی، سلطان کو ایک خوف نے اپنے شکنجے میں لے لیا، اسے شک ہوا کہ وہ کتاب کوئی کہانی یا داستان کا ذکر نہ تھی بلکہ جو بات کتاب کے موافق نہ تھی، وہ تھی حقیقت۔ جب بوڑھے کو یہ احساس ہوا تو وہ خوف کے نرغے میں آ گیا۔ تصویر کی طرح اس کا مصور بیٹا کھڑکی کے رستے اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا اور اپنے باپ پر نگاہ ڈالے بغیر، تصویر جتنا ہی بڑا خنجر اپنے باپ کے سینے میں اتار دیا۔

ج: قزوین کا رشید الدین اپنی ''تاریخ'' میں لکھتا ہے کہ 250 سال قبل قزوین میں کتابوں کی تزئین کاری، خطاطی اور مصوری انتہائی لائقِ احترام اور مرغوب فنون سمجھے جاتے تھے۔ اس وقت کے قزوین کے بادشاہ نے چالیس برس بازنطین سے چین تک حکومت کی ... اور شاید کتابی فن سے محبت ہی اس کی بڑی سلطنت کا راز تھی ... لیکن بدقسمتی سے اس کا کوئی جانشین نہ تھا۔ اپنے مفتوحہ علاقوں کو اپنی وفات کے بعد تقسیم سے بچانے کی خاطر شاہ نے اپنی حسین و جمیل بیٹی کے لیے کوئی ذہین منی ایچر فنکار تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے کتاب خانے کے تین غیر شادی شدہ اور نوجوان عظیم مصوروں میں مقابلے کا انتظام کیا۔ رشید الدین کی ''تاریخ'' کے مطابق مقابلے کا مقصد سادہ تھا: جو کوئی بھی غیر معمولی تصویر بنائے گا وہی فاتح ٹھہرے گا۔ خود رشید الدین کی طرح، نوجوان منی ایچر فنکار آگاہ تھے کہ تصویر پرانے مصوروں کے انداز میں ہوتی

چاہیے۔ اس لیے ان تینوں نے کسی مقبول داستانوی منظر کا انتخاب کیا جس میں سرو وصنوبر کے درختوں سے
گھرے جنت نظیر باغ میں دشر میلے خرگوشوں اور ابابیلوں کے درمیان کوئی محبت کی ماری حسین وجمیل دوشیزہ
کرب کے عالم میں زمین پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ تینوں منی ایچر فنکاروں نے اس منظر کی تصویر کشی بے
ارادہ پرانے اُستادوں کے انداز میں کی۔ لیکن ان میں سے ایک جو دوسروں سے ممتاز رہتے ہوئے سب
سے اعلیٰ تصویر بنانا چاہتا تھا، اس نے نرگس کے پھولوں کے بیچ ایک نہاں گوشے میں اپنے دستخط کر دیے۔
اس گستاخ عمل کے باعث فنکار نے خود کو پرانے مصوروں کی عاجزی وانکساری سے الگ کر لیا، اسے نتیجے
میں قزوین سے چین جلاوطن کر دیا گیا۔ اب باقی دو منی ایچر فنکاروں کے درمیان مقابلہ ہوا۔ اس مرتبہ ان
دونوں فنکاروں نے کسی نظم جیسی خوب صورت تصویر بنائی جس میں ایک عالی شان باغ میں گھوڑے پر سوار
دوشیزہ کی عکاسی کی تھی۔ لیکن منی ایچر فنکاروں میں سے ایک نے، کون جانے موقلم کی کسی غلطی سے یا جانتے
بوجھتے، ترچھی آنکھوں اور [illegible] سے رخساروں والی دوشیزہ کے سفید گھوڑے کے نتھنوں کی عجیب طریقے سے
تصویر کشی کی اور اسے شاہ اور اس کی بیٹی نے ایک عیب تصور کیا۔ سچ ہے کہ اس منی ایچر فنکار نے اپنے دستخط
نہیں کیے تھے لیکن اس شاندار تصویر [illegible] اپنے کام کی الگ پہچان کے لیے اس نے گھوڑے کے نتھنے الگ
اور انوکھے انداز میں بنائے تھے۔ شاہ نے یہ اعلان کرتے ہوئے کہ "عدم کاملیت، اسلوب کی ماں ہے"
اس مصور کو بازنطین میں جلاوطن کر دیا۔ تاہم، قزوینی رشید الدین کی "تاریخ" کے مطابق، ایک آخری
اہم واقعہ باقی تھا۔ شاہ کی بیٹی اور اس باصلاحیت منی ایچر کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں، جس نے
استادوں کے انداز میں اور اپنے کسی دستخط یا تبدیلی کے بغیر تصویر بنائی تھی۔ شادی سے پہلے پورا روز شاہ کی
بیٹی افسردگی کے عالم میں اس وجیہہ فنکار کی بنائی تصویر دیکھتی رہی جسے اگلے روز اس کا شوہر بننا تھا۔ اس شام
تاریکی پھیلنے کے بعد، وہ اپنے باپ کے سامنے پیش ہوئی: "ہاں، یہ سچ ہے کہ پرانے استاد اپنے غیر معمولی
شہکاروں میں کسی دوشیزاؤں کی تصویر کشی چینی کے طور پر کیا کرتے تھے اور یہ ہم تک مشرق سے پہنچی ہوئی
ایک ناقابل تبدیل روایت ہے۔" اس نے کہا، "لیکن جب وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہوتے تو اپنی حسین
محبوبہ کی پلکوں، آنکھوں، ہونٹوں، بالوں، مسکراہٹ یا حتیٰ کہ بھنووں کے کسی پہلو کی تصویر کشی بھی شامل کر
لیتے تھے۔ ان کی مصوری میں یہ خفیہ سی تبدیلی ایک ایسی نشانی ہوتی تھی جسے صرف اور صرف وہ محبت کرنے
والے ہی جان سکتے تھے۔ میں نے سارا دن گھوڑے پر سوار خوب صورت دوشیزہ کو دیکھتے گزارا اور اس
دوشیزہ میں میرا نام ونشان تک نہیں ہے۔ یہ مصور ضرور اپنے فن میں استاد ہوگا اور نوجوان اور وجیہہ بھی
ہوگا، لیکن اسے مجھ سے محبت نہیں ہے۔" یہ سن کر شاہ نے فوراً شادی منسوخ کر دی اور اس کے بعد باپ بیٹی
نے اپنی باقی زندگی ساتھ گزاری۔

"اس لیے تیسری تمثیل کے مطابق، عدم کاملیت انداز یا اسلوب کی نشانی ہے۔" قرہ نے نرمی
اور احترام کے ساتھ کہا، "اور کیا یہ حقیقت کہ منی ایچر فنکار محبت میں مبتلا ہے، حسینہ کے چہرے، آنکھ یا

مسکراہٹ کی تصویر کشی میں چھپے کسی "اشارے" سے عیاں ہو جاتی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے ایسے انداز میں کہا جس میں میرا اعتماد اور غرور جھلکتا تھا۔ "استاد منی ایچر فنکار کی محبت کا محور دوشیزہ کے ذریعے اس کی تصویر میں نظر آنے والا انداز کوئی عیب یا نقص نہیں بلکہ نیا فنکارانہ اصول ہے۔ کیوں کہ وقت گزرنے اور نقالی کے بعد ہر کوئی دوشیزاؤں کے چہرے اس مخصوص حسین دوشیزہ کی طرح بنائے گا۔"

ہم خاموش ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ قرہ نے، جس نے میری تینوں کہانیاں غور سے سنی تھیں، اب اپنی توجہ راہداری سے آنے والی میری بیوی کی آوازوں کی طرف مبذول کر لی تھی۔ میں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"پہلی کہانی نے بیان کیا کہ "انداز" ایک عیب ہے۔" میں نے کہا۔ "دوسری کہانی نے بتایا کہ کسی کامل تصویر کو کسی دستخط کی ضرورت نہیں، اور تیسری کہانی پہلی اور دوسری کہانیوں کا امتزاج ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ "دستخط" اور "اسلوب" ہمارے کام کے بارے میں جو معقولیت اور احمقانہ ذاتی خود تحسین کے ذرائع ہیں۔"

یہ آدمی جسے میں نے ابھی قابل قدر سمجھا، مصوری کو آخر کتنا سمجھتا ہے؟ میں نے پوچھا:

"کیا میری کہانیوں سے تمہیں سمجھ آئی کہ میں کون ہوں؟"

"یقیناً۔" اس نے بے یقینی سے کہا۔

سو آپ اس کی آنکھوں اور خیال سے یہ اندازہ لگانے کی زحمت کریں کہ میں کون ہوں، اجازت دیں کہ میں خود ہی بتا دوں۔ میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ قزوین کے پرانے استادوں کی طرح، میں مسرت سے تصویریں بنا اور ان میں رنگ بھر سکتا ہوں۔ میں یہ مسکراتے ہوئے کہتا ہوں کہ میں ہی سب سے بہتر ہوں۔ مجھے قرہ کے ملاقات کے سبب کی کوئی پرواہ نہیں —— اگر اتفاقاً میرا وجدان درست ہو تو —— وہ طلا کار نفیس آفندی کی گمشدگی کے بارے معلومات کے لیے آیا تھا۔

قرہ نے شادی اور فن کے امتزاج کے بارے میں دریافت کیا۔

میں بہت اعلیٰ کام کرتا ہوں اور مجھے اپنا کام پسند ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک حسین ترین لڑکی سے شادی کی ہے۔ جب میں مصوری نہیں کر رہا ہوتا تو ہم دونوں ہم وصل ہوتے ہیں۔ میں پھر اپنا کام دوبارہ کرنے لگتا ہوں۔ میں نے کچھ ایسے جواب نہ دیا تھا۔ "یہ ایک سنجیدہ معاملہ ہے۔" میں نے کہا، "اگر منی ایچر فنکار کے موئے قلم سے ہی شہکار وجود میں آتے ہیں، جب اس کی بیوی کا مسئلہ ہو تو وہ اتنی نرمی کی تخلیق سے قاصر رہتا ہے۔" میں نے کہا، "اس کے برعکس بات بھی درست ہے۔ اگر کسی آدمی کا سرکنڈے کا قلم اس کی بیوی کو آسودہ کرتا ہے تو اس کی فنکاری کا قلم موازنے میں کم ہو گا۔" میں نے مزید کہا۔

منی ایچر فنکاروں کی قابلیت کے حاسدوں کی طرح قرہ نے بھی اس جھوٹ کو سچ مانا اور خوش ہو گیا۔

اس نے کہا کہ وہ میری مصوری کے آخری صفحات دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے رنگوں، دوات، صیقل کرنے والے پتھروں، قلم، موقلم اور قلم تراش کے درمیان اپنی کام کی میز کے پاس بٹھایا۔ قرہ اس دوہرے ورق والی تصویر کا جائزہ لے رہا تھا جو میں ''سرنامۂ ہمایوں'' کے لیے بنا رہا تھا جس میں ہمارے شہزادے کی تقریبِ ختنہ کی عکاسی تھی۔ میں اس کے پاس سرخ مسند پر جا بیٹھا جس کی گرمی نے مجھے اپنی حسین بیوی کی یاد دلا دی جو تھوڑی دیر پہلے اس پر بیٹھی تھی۔ بلاشبہ جب میں قلم سے ہمارے سلطان کے حضور بدقسمت قیدیوں کے رنج و الم کی عکاسی کر رہا تھا جب میری ذہین بیوی میری قربت میں تھی۔

دو ورقی منظر جس کی میں مصوری کر رہا تھا، اس میں ہمارے سلطان کے سامنے مجرم اور مقید قرض داروں کی حضوری کے بارے میں تھا۔ میں نے ہمارے سلطان کو چاندی کے سکوں کے تھیلوں سے بھرے قالین کے ایک گوشے میں دکھایا جیسا کہ میں نے ایسی تقریبات میں انھیں کئی بار دیکھا تھا۔ ان کے عقب میں، میں نے قرض داروں کا کھاتہ پڑھتے سربراہ خزانچی کو دکھایا۔ میں نے سزا یافتہ قرض داروں کو اپنی دکھ اور درد سے ترچھی بھنووں، چہرے کے کھنچے تاثرات اور نم آنکھوں کے ساتھ، اپنی گردنوں میں آہنی بیڑیاں لیے ایک دوسرے سے جڑے دکھایا۔ میں نے حسین چہروں والے بانسری نوازوں کی سرخ رنگ میں تصویر کشی کی جب وہ سلطان کی شان میں کہے قصیدوں پر موسیقی دے رہے تھے اور سلطان انھیں تحفے عنایت کر رہے تھے: سزا یافتہ قیدیوں کی ابتر کی صورت۔ تکلیف اور قرض کی شرمندگی سے رہائی پر زور دینے کے لیے، شروع میں میرا ایسا کوئی منصوبہ نہ تھا۔ آخری بدقسمت قیدی کے ساتھ میں نے اس کی بیوی کو محرومی کے عالم میں اودا لباس پہنے، اور لمبے بالوں والی اس کی حسین بیٹی کو بھی شامل کیا جو قرمزی بغیر آستین کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ پیشانی پر شکنیں لیے قرہ شاید سمجھ گیا کہ تصویر کشی کیسے جینے کی محبت کے برابر ہے، میں یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ کیوں بیڑیاں پہنے قرض داروں کا گروہ دو صفحات پر پھیلایا گیا تھا، میں وہ بھی اس کے سامنے بیان کرنا چاہتا تھا کہ جن پر میری بیوی اور میں تصویر کی تعریف کے دوران ہنستے ہوئے تبادلہ خیال کرتے رہے تھے، مثلاً میں نے کتنی محبت سے رنگ بھرے تھے، جیسے پرانے اُستاد بھی نہ کر پاتے اور سلطان کے اطلسی ریشم کے کافتان کا رنگ قریب ہی ستاتے کتے کے رنگ جیسا تھا، لیکن اس نے مجھ سے ایک بے حد گستاخ سوال پوچھا:

کیا میں کسی طرح یہ بتا سکتا تھا کہ بدنصیب نفیس آفندی کہاں ہو سکتا تھا؟

''بدنصیب'' سے اس کی کیا مراد تھی! میں نے یہ نہ کہا تھا کہ نفیس آفندی کوئی حقیر نقال تھا جو طلا کاری کسی اندرونی تحریک کی خاطر نہیں بلکہ صرف دولت کے لیے کرتا تھا۔ ''نہیں۔'' میں نے کہا، ''میں نہیں جانتا۔''

کیا میں نے کبھی خیال کیا کہ ارضِ روم کے مبلغ کے جارح اور جنونی پیروکار نفیس آفندی کو نقصان پہنچا سکتے تھے؟

میں نے خود کو مجتمع رکھا اور یہ بتانے سے گریز کیا کہ نفیس آفندی بلاشک وشبہ ان ہی میں سے ایک تھا۔ ”نہیں۔“ میں نے کہا: ”کیوں؟“

غربت، طاعون، بدکاری اور چہ میگوئیاں، جن کے سبب ہم اس استنبول شہر میں غلام ہیں، صرف پیغمبر خدا ﷺ کے زمانے کے اسلام سے دوری کے باعث اور نئی روایات کو اپنانے اور اپنے مابین فرنگیوں اور یورپیوں کے انداز پھیلانے کے باعث ہے۔ یہی سب ارضِ رومی مبلغ بھی کہہ رہا تھا لیکن اس کے دشمن سلطان کو یہ باور کرانے کی کوشش میں تھے کہ ارضِ رومی درویشوں کی خانقاہوں پر حملے کر رہے ہیں جہاں موسیقی بجائی جاتی ہے اور وہ بزرگ ولیوں کی قبروں کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ لوگ واقف ہیں کہ میں حالی مقام ارضِ رومی ہو جائے ان کی طرح عداوت نہیں رکھتا، اس لیے وہ اشاروں میں پوچھتے ہیں: ”کیا تم نے ہی ہمارے بھائی نفیس آفندی کا کام تمام کیا ہے؟“

اچانک مجھ پر یہ واضح ہوا کہ یہ افواہیں عرصے سے منی ایچر فنکاروں میں گردش میں تھیں۔ بے صلاحیت نااہلوں کا ٹولہ خوشی خوشی الزام مجھ پر لگا رہا تھا کہ میں ہی وحشی قاتل تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں اس احمق قرہ کی سر کیلیائی کھوپڑی پر روشنائی کی دوات دے ماروں کیوں کہ وہ منی ایچر فنکاروں کے اس حاسد گروہ کی افواہوں کو سنجیدگی سے لے رہا تھا۔

قرہ میرے کام کی جگہ کا جائزہ لے رہا تھا، ہر چیز کو ذہن میں جیسے نقش کر رہا تھا۔ میری قینچیوں، رنگنے کے زرد مادے سے بھرے مٹی کے پیالوں، رنگ کی پیالوں، سیب جسے کام کرتے میں اکثر کھاتا رہتا تھا، چولہے کے اوپر دھرے کافی کے برتن، مسند، نیم وا کھڑکیوں سے چھن کر آتی روشنی، آئینہ جسے میں صفحے کی ترتیب دیکھنے کے لیے رکھتا تھا، میری قمیصیں، ادھر کونے میں کسی گناہ کی طرح پڑا میری بیوی کا سرخ دوپٹہ، جسے وہ قرہ کی دستک پر جلدی میں چھوڑ کر اٹھ گئی تھی، وہ ہر شے کا بغور مشاہدہ کرتا رہا۔

باوجود اس حقیقت کے کہ میں نے اپنے خیالات اس سے چھپا رکھے، میں کمرے اور اپنی بنائی تصویروں کو اس کی بے باک نظروں کے سپرد کر چکا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا فخر و غرور آپ سب کے لیے باعث حیرانی ہوگا لیکن میں سب سے زیادہ دولت کماتا ہوں، اور اس لیے میں ہی بہترین منی ایچر فنکار ہوں۔ خدا ضرور تزئین کاری کے فن کو بے خودی بنانا چاہتا ہوگا ہوتا کہ وہ ظاہر کر سکے کہ جو واقعی دیکھتے ہیں، ان کے لیے خود دنیا ہی ایک بے خودی ہے۔

itsurdu.blogspot.com

مجھے ''بگلا'' کہتے ہیں

نماز ظہر کے وقت میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر قرہ تھا، میرے بچپن کا پرانا ساتھی۔ اسے سردی لگ رہی تھی، میں نے اسے اندر بلا لیا۔ میں نے یہ بھی نہ پوچھا کہ اسے میرا گھر کیسے ملا۔ اسے اس کے انشتے نے نفیس آفندی کی غیر حاضری کا سبب اور اتا پتا معلوم کرنے بھیجا تھا۔ صرف یہی نہیں، وہ استاد عثمان کا بھی پیغام لایا تھا۔ ''مجھے اجازت دو کہ ایک سوال پوچھ سکوں۔'' وہ بولا، ''استاد عثمان کے مطابق،

''ایک سچے مِنی ایچر فنکار کو وقت دوسروں سے الگ کرتا ہے۔ مصوری کا وقت۔''

اس پر میرے خیالات کیا تھے؟'' ذرا غور سے سنیں۔

مصوری اور وقت

بہت عرصہ پہلے، جیسا کہ سب جانتے ہیں، اسلامی سلطنت کے مصور، جن میں ہمارے پرانے عرب فنکار بھی شامل ہیں، دنیا کا تخیل اس طرح باندھتے تھے جیسے آج کے کافر فرنگی، وہ ہر چیز کو کسی آوارہ گرد، بے عقل یا اپنی دکان میں مصروف کسی عام سی سطح پر دیکھتے۔ موجودہ زمانے کی مصوری کی تکنیک سے بے خبر ہونے کے سبب، جن سے شناسا ہونے پر فرنگی فنکار فخر کرتے ہیں، ان کی دنیا پھیکی، بے رنگ اور محدود رہی، کسی کم عقل یا دکان کے منشی کے سادہ تناظر کی طرح۔ پھر ایک بڑا واقعہ رونما ہوا اور مصوری کا پورا جہان ہی بدل گیا۔ مجھے یہاں سے بات شروع کرنے دیں۔

مصوری اور وقت کی تین کہانیاں

الف: ساڑھے تین سو سال قبل ماہ صفر کے ایک یخ بستہ روز بغداد پر منگولوں نے قبضہ کیا اور اسے بے رحمی سے غارت کیا۔ تب نہ صرف عرب ممالک بلکہ تمام اسلامی مملکت کا ایک ابن شاکر نامی بہت مشہور و معروف اور قابل خطاط اور کاتب تھا، جس نے اپنی نوعمری کے باوجود بائیس جلدوں کی کتابت کی تھی جن میں سے بیشتر قرآن تھے اور وہ بغداد کے مشہور عالم کتب خانوں میں موجود تھے۔ ابن شاکر کا ماننا تھا کہ

یہ کتابیں رحتی دنیا تک موجود، اور یوں وقت کے ایک گھیرے اور لا متناہی تسلسل میں زندہ رہیں گی۔ اس نے رات رات بھر شمع کی کپکپاتی لو میں ان داستانوی کتابوں پر محنت کی تھی، جن سے آج کوئی بھی واقف نہیں کہ چند ہی روز میں انھیں منگول ہلاکو خان کے سپاہیوں نے ورق ورق کیا، جلایا اور دریائے فرات کی لہروں کے حوالے کر دیا۔ عرب خطاط مسلسل روایت اور کتابوں کے ابدی ہونے کے نظریے سے وابستہ تھے، وہ پانچ صدیوں سے عادتاً، نابینا ہونے سے بچنے کی احتیاط میں آنکھوں کو آرام دینے کی خاطر طلوع ہوتے سورج کی طرف پشت کر کے بیٹھتے اور مغربی افق کو دیکھتے تھے۔ ایک صبح کی خنکی میں ابن شاکر نے مسجد خلافت کے اس بالکنی سے جہاں موذن ایمان والوں کو نماز کا بلاوا دیتا تھا، وہ سب دیکھا جو پانچ صدیوں سے جاری کتابت کی روایت کو ختم کر رہا تھا۔ اس نے پہلے ہلاکو کے سنگ دل سپاہیوں کو پورے شہر کو تخت و تاراج کرتے، لاکھوں لوگوں کا قتل عام، ان خلفائے اسلام میں سے آخری کا قتل کرتے جنھوں نے بغداد پر پانچ سو سال حکومت کی تھی، عورتوں کی عصمت دری، کتب خانوں کو نذر آتش اور لاکھوں کتابوں کو برباد ہوتے دیکھا جب وہ دریائے فرات میں بہائی جا رہی تھی۔ دو روز بعد لاشوں کے تعفن اور تڑپتی چیخوں کے درمیان اس نے فرات کی لہروں کو لہو رنگ کتابوں کی روشنائی سے خون رنگ ہوتے دیکھا اور اس نے ان تمام کتابوں کا سوچا جن کی اس نے خوب صورت انداز میں کتابت کی تھی، وہ کتابیں جو اب روئے زمین سے مٹ چکی تھیں، اس قتل و غارت گری کو روکنے کو کچھ بھی تو نہ کر پائی تھیں اور یوں اس نے عہد کیا کہ دوبارہ کبھی کچھ نہ لکھے گا۔ مزید یہ کہ وہ اپنے کرب و اذیت اور وہ سب جو اس نے دیکھا تھا، اس کا اظہار مصوری کے ذریعے کرنا چاہتا تھا، جسے وہ اس سے قبل تحقیر کی نگاہ سے دیکھتا اور اسے ہمیشہ اللہ کے حضور بے ادبی سمجھتا آیا تھا۔ یوں اس کاغذ سے فائدہ اٹھاتے جو وہ ہمیشہ اپنی جیب میں ساتھ رکھتا تھا، اس نے مینارے سے جو دکھائی دیا اس کی تصویر کشی کر ڈالی۔ منگول حملے کے بعد اسلامی مصوری کے احیا کے تین سو سال کے لیے ہم اس تجربے کے احسان مند ہیں جس نے اسے مجددوں اور عیسائیوں کی فنکاری سے ممتاز کیا، یعنی بلندی سے دنیا کی کرب بھری عکاسی۔ ہم اس احیا کے لیے افقی خط اور ابن شاکر کے اس قتل و غارت گری کے بعد اپنی تصویروں اور دل میں مصوری کی تمنا لیے شمال کا رخ کرنے کے احسان مند ہیں، شمال جہاں سے منگول آئے تھے۔ مختصر یہ کہ ہم اس کے مشکور ہیں کہ اس نے چینی فنکاروں سے مصوری کی تکنیک سیکھی۔ اس لیے یہ ظاہر ہے کہ پچھلی پانچ صدیوں سے لامتناہی وقت کا جو تصور عرب خطاطوں کے دلوں میں تھا، اس کا اظہار آخر خطاطی کی بجائے مصوری میں ہوا۔ اس کا ثبوت یہ حقیقت ہے کہ ان مسودوں اور کتابوں کی تصویریں، جو ختم ہو گئی تھیں، اللہ کی فانی دنیا میں ہمیشہ دوام کے لیے دوسری کتابوں میں منتقل ہو گئیں۔

ب: ابھی نہیں لیکن زیادہ دیر بھی نہیں گزری، ایک مرتبہ کا ذکر ہے جب ہر شے دوسری کی نقل تھی اور یوں عمر بڑھنے یا موت کی بات نہ ہوتی تو آدمی وقت بیتنے کے ساتھ بھی خرد مند نہ ہوتا۔ ہاں، جب دنیاوی جہان کی عکاسی ایک ہی طرح کی کہانیوں اور تصویروں سے کی جا رہی تھی جیسے وقت رواں نہ تھا، فاخر

شاہ کی چھوٹی سی فوج نے صلاح الدین خان کو شکست دے دی، جیسا کہ سمرقند کے بیلم کی مختصر تواریخ نے تصدیق کی ہے۔ اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد فاتح فاخرشاہ نے پہلا کام یہ کیا کہ شکست خوردہ صلاح الدین کو گرفتار کیا اور اذیت دے کر قتل کروا دیا۔ اس کے بعد حسب دستور اسے شکست خوردہ خان کے کتب خانے اور حرم کا دورہ کرنا تھا۔ کتب خانے میں پرانے شاہ کے تجربہ کار جلد ساز نے مرحوم شاہ کی کتابوں کی جلدیں کھول کر اوراق کو از سر نو ترتیب دیتے ہوئے نئی کتابیں بنانا شروع کر دی تھی۔ اس کے خطاط "ہمیشہ فتح مند صلاح الدین خان" کی جگہ "فاتح فاخرشاہ" لکھنے لگے تھے اور اس کے منی ایچر فنکاروں نے مرحوم شاہ کی اوراق پر ہنرمندی سے بنی خوب صورت تصویریں مٹانی شروع کر دی تھی جو اب لوگوں کی یادداشت سے محو ہونے لگا تھا اور اس کی جگہ نوجوان فاخرشاہ کی تصویریں بنانے لگے تھے۔ حرم میں داخل ہونے کے بعد اسے حسین ترین عورت کی تلاش میں دشواری نہ ہوئی اور اسے بہ زور حاصل کرنے کی بجائے، کہ وہ کتابوں اور فن میں درک رکھنے والا ایک نفیس اور مہذب آدمی تھا، وہ اس عورت سے گفتگو کرنے لگا۔ (مرحوم) صلاح الدین خان کی اشک بار حسین و جمیل بیوی نریمان سلطان نے فاخرشاہ سے صرف ایک التجا کی کہ لیلیٰ مجنوں کی داستان کی اس رومانوی تصویر کو نہ مٹایا جائے جس میں لیلیٰ کو نریمان اور مجنوں کو صلاح الدین کا روپ دیا گیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس طرح اس کے (مرحوم) شوہر نے جو کتابوں کے ذریعے جو دوام حاصل کرنے کی خواہش کی تھی، اسے کم سے کم اس ایک ورق پر دوام مل جائے گا۔ فاتح فاخرشاہ نے خندہ پیشانی سے یہ معمولی سی درخواست قبول کر لی اور اس کے فنکاروں نے تصویر کو جوں کا توں رہنے دیا۔ اس کے بعد نریمان اور فاخر میں قربت ہوئی اور کچھ ہی عرصے میں ماضی کی تلخیاں بھلا کر وہ ایک دوسرے سے سچی محبت کرنے لگے۔ پھر بھی فاخرشاہ، لیلیٰ مجنوں کی وہ تصویر نہ بھول پایا۔ نہیں، اسے یہ حسد بے چین کرتا تھا کہ اس تصویر میں اس کی بیوی اپنے سابقہ شوہر کے ہمراہ تھی۔ جو بات اسے کھائے جا رہی تھی، وہ یہ تھی کہ اس پرشکوہ کتاب میں بطور اساطیر اس کی تصویر کشی نہ کی گئی تھی، اس لیے وہ اپنی بیوی کے ساتھ لافانی نہ ہو سکے گا۔ پانچ برس یہ شک اسے کترتا رہا اور ایک مسرت بھری شب نریمان کے ساتھ قربت کے بعد وہ ہاتھ میں شمع لیے چور قدموں سے کتب خانے میں داخل ہوا، لیلیٰ مجنوں والی جلد کھولی اور نریمان کے مرحوم شوہر کی جگہ اپنی تصویر بنا دی۔ بہت سے بادشاہوں کی طرح اسے بھی منی ایچر فنکاری اور مصوری کا شوق تھا، اگرچہ وہ ایک نوآموز فنکار تھا اور اپنی شبیہ صحیح طرح نہ بنا سکا تھا۔ صبح جب اس کے کتب خانے کے مہتمم نے کسی خدشے کے تحت کتاب کھولی تو اس میں نریمان کے چہرے والی لیلیٰ کے ساتھ (مرحوم) صلاح الدین خان کی جگہ کسی اور کی تصویر تھی، اور اسے فاخرشاہ سمجھنے کی بجائے اس نے اعلان کیا کہ وہ فاخرشاہ کا جانی دشمن نوخیز اور خوبرو عبداللہ شاہ تھا۔ اس افواہ نے فاخرشاہ کے سپاہیوں کو بہکایا اور ہمسایہ ریاست کے نئے جارح حکمران عبداللہ شاہ کے حوصلے بڑھا دیے جس نے اس کے فوراً بعد لڑی جانے والی جنگ میں فاخرشاہ کو شکست دے کر گرفتار اور قتل کر دیا اور اپنے دشمن کے کتب خانے اور حرم پر اپنی حکومت قائم کی اور دوامی حسن کی مالکہ نریمان سلطان کا نیا شوہر بن گیا۔

ج: استنبول کے منی ایچر فنکار مشہور زمانہ دراز قامت محمت کی داستان سناتے ہیں جسے ایران میں محمد خراسانی کے نام سے جانا جاتا تھا زیادہ تر درازعمری اور نابینا پن کی مثال میں۔ اگرچہ دراز قامت محمت کی داستان مصوری اور وقت کی حکایت ہے۔ اس نے نو برس کی عمر میں تربیت لینی شروع کی اور نابینا ہوئے بغیر تقریباً 110 سال مصوری کرتا رہا۔ اس کی انفرادیت کسی انفرادیت کا نہ ہونا تھی۔ میں یہاں بدلہ لینے سے کام نہیں لے رہا بلکہ دل سے تعریف کر رہا ہوں۔ دوسروں کی طرح دراز قامت محمت نے بھی پرانے قابل فنکاروں کے انداز میں مصوری کی بلکہ ان سے بڑھ کر اور اس باعث وہ تمام فنکاروں میں عظیم ترین تھا۔ اس کی انکساری اور مصوری کی لگن نے، جسے وہ اللہ کی خدمت قرار دیتا تھا، اسے کتاب خانوں کے اندرونی تنازعوں اور سربراہ مصور بننے کے عزم سے بلند کر دیا اگرچہ وہ اس کے لیے موزوں عمر اور قابلیت رکھتا تھا۔ بطور منی ایچر فنکار 110 برس وہ انتہائی صبر سے معمولی تفصیل کی بھی عکاسی کرتا رہا: صفحے کا گوشہ بھرنے کے لیے بنائی گئی گھاس، ہزاروں پتے، اڈتے بادل، گھوڑوں کی ایال، اینٹوں کی دیواریں، نہ ختم ہونے والی دیواری سجاوٹیں اور ترچھی آنکھوں اور نازک ٹھوڑیوں والے لاتعداد چہرے جو ایک دوسرے کی نقل تھے۔ دراز قامت محمت خاصا مطمئن اور الگ تھلگ رہنے والا آدمی تھا اور اس نے کبھی الگ دکھائی دینے یا انفرادیت پر اصرار نہ کیا۔ وہ جس کسی بھی شہزادے کے لیے مصوری کر رہا ہوتا اس کے کتاب خانے کو اپنا گھر سمجھتا اور خود کو اس گھر کا مستقل حصہ۔ جب خان اور شاہ جب ایک دوسرے کی جانیں لیتے اور منی ایچر فنکار نئے آقا کی تلاش میں حرم کی عورتوں کی طرح بکھر جاتے، نئے کتاب خانوں کا انداز پہلے دراز قامت محمت کے بنائے پتوں، گھاس، پتھروں کی گولائیوں اور اس کے صبر کے خدوخال میں ظاہر ہوتا۔ جب اس کی عمر اسی برس ہوئی تو لوگوں فراموش کر بیٹھے کہ وہ فانی انسان تھا اور یقین کرنے لگے کہ وہ اپنی ہی بنائی لازوال داستانوں میں زندہ تھا۔ شاید اسی لیے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ وقت کی قید سے آزاد تھا اور یہ کہ وہ کبھی بوڑھا ہو کر نہ مرتا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس کے اپنا کوئی گھر نہ ہونے، ان ہی کمروں یا خیموں کے گوشوں میں سونے جو منی ایچر فنکاروں کے کتاب خانے تھے، اور زیادہ تر وقت مسودوں کے اوراق دیکھتے بتانے کے باوجود، اس کے نابینا نہ ہونے کو وقت کا معجزہ سمجھتے تھے کہ وہ اس کے لیے تھم گیا تھا۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ دراصل نابینا ہی تھا لیکن اب اسے بصارت کی ضرورت نہ رہی تھی کیوں کہ وہ مصوری اپنی یادداشت کے بل پر کرتا تھا۔ 119 برس کی عمر میں یہ استادوں فنکار، جس نے کبھی شادی کی تھی نہ ہی کسی عورت سے قربت رکھی تھی، شاہ طہماسپ کے کتاب خانے میں ایک ترچھی آنکھوں، گول چہرے والے ایسے سولہ سالہ لڑکے سے ملا جس کا چہرہ وہ پچھلی ایک صدی سے بناتا آیا تھا، جو نصف چینی نصف کروشیائی تھا اور وہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس ناقابل تصور حسن کے مالک شاگرد لڑکے کو ورغلانے کے لیے، جیسا کہ کوئی سچا عاشق کرتا، اس نے منصوبہ بنایا اور منی ایچر فنکاروں کی سازشوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے خود کو جھوٹ، فریب اور چال بازی کے سپرد کر دیا۔ شروع میں خراسان کا یہ منی ایچر فنکار استاد کو دو طریقے

اپنانے سے تنگ تو ادائی حاصل ہوئی جس سے وہ ایک صدی سے گریز کرتا آ رہا تھا لیکن اس کوشش نے اسے پرانے اتفاقی ایام سے دور کر دیا۔ ایک سہ پہر کھلی کھڑکی میں کھڑے اس خوبرو شاگرد کو خوابیدہ انداز میں دیکھتے اسے تبریزی کی برقیلی ہوا لگ گئی۔ اگلے روز پے در پے چھینکوں کے دورے میں وہ اپنی بینائی کھو بیٹھا۔ دو روز بعد وہ کتاب خانے کی پتھریلی سیڑھیوں سے پھسل کر گرا اور دم توڑ گیا۔

''میں نے دراز قامت محمد کا نام تو سنا ہے لیکن یہ داستان کبھی نہیں سنی۔'' قرہ نے کہا۔

اس نے نرمی سے یہ تبصرہ کیا یہ ظاہر کرنے کو کہ وہ جانتا تھا کہ کہانی ختم ہو گئی تھی اور اس کا ذہن میری سنائی کہانی میں اُلجھا ہوا تھا۔ میں کچھ دیر خاموش ہو گیا تا کہ وہ جی بھر کر مجھے دیکھ سکے۔ میرے ہاتھ فارغ ہوں تو مجھے اُلجھن ہوتی ہے، سو دوسری کہانی سنانے کے بعد میں وہ تصویر بنانے لگا تھا جسے میں قرہ کی دستک سے پہلے بنا رہا تھا۔ میرا خوب صورت شاگرد محمود، جو ہمیشہ میرے گھٹنے پر بیٹھ کر رنگ بناتا، میرے قلم تراشتا اور کبھی کبھار میری غلطیاں مٹاتا تھا، خاموشی سے میرے ساتھ بیٹھا دیکھ اور سن رہا تھا۔ گھر کے اندر سے میری بیوی کے چلنے پھرنے اور کام کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

''آہا — قرہ نے کہا۔'' سلطان کھڑے ہو رہے ہیں۔''

وہ مرعوب ہو کر تصویر کو گھور رہا تھا اور میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کے مرعوب ہونے کی وجہ غیر اہم تھی، لیکن صاف بات بتاؤں تو آپ کو بتا دوں کہ سلطان عالی مقام جو ''سرنامۂ ہمایوں'' میں رسم ختنہ کی تمام اڑھائی سو تصویروں میں جلوہ گر ہوں گے، بالائی دریچے میں بیٹھے تاجروں، انجمنوں، تماشائیوں، سپاہیوں اور قیدیوں کے جلوسوں کو دیکھتے۔ صرف میری ایک تصویر میں انہیں کھڑے دکھایا گیا تھا جب وہ چوک میں کھڑے ہجوم پر سکوں کی تھیلیاں اچھال رہے تھے۔ میرا مقصد لوگوں کے چہروں کی حیرت اور جوش و خروش کی عکاسی تھا جب وہ سکے جھپٹنے کے لیے دھینگا مشتی کر رہے تھے۔

''اگر حیرت مصوری کے موضوع کا حصہ ہے تو ایسے کام کو حیرت سے ہی کرنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر اس میں درد شامل ہے تو تصویر سے بھی درد ابھرنا چاہیے۔ تاہم درد کو پہلی نگاہ میں دکھائی نہیں دینا چاہیے بلکہ تصویر کی اندرونی ہم آہنگی میں، تصویر میں موجود چہروں یا ان کے آنسوؤں سے نہیں۔ میں نے حیرت کی عکاسی ویسے نہیں کی جیسے منی ایچر نگار صدیوں سے دکھاتے آئے تھے، منہ میں دابی انگلی، میں نے تو پوری تصویر کو مجسم حیرت میں ڈھال دیا تھا۔ یہ میں نے یہ سلطان کو اس کے پیروں پر کھڑا کر کے کیا۔''

مجھے پریشانی ہوئی کہ وہ میرے ذاتی ساز و سامان اور مصوری کے اوزاروں — نہیں بلکہ میری پوری زندگی کا کسی سراغ کی تلاش میں کیسے جائزہ لے رہا تھا، اور پھر خود میں اپنے گھر کو اس کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔

آپ تبریز اور شیراز میں بنائی گئی محلات، حماموں، قلعوں کی تصویروں سے واقف ہیں تا کہ تصویر اللہ سبحان تعالیٰ کی تخلیق کی نقل ہوں جو سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے۔ منی ایچر نگار محل کو جیسے

کسی جادوئی اُسترے کے ساتھ دو حصوں میں کاٹ دیتا اور وہ چیزیں جن کی تفصیل کبھی باہر سے نظر نہ آتی، ان کی برتنوں، گلاس، دیواروں کی سجاوٹوں، پردوں، پنجروں میں مقید طوطوں، حرم اور تکیے جن پر حسینائیں یوں ٹیک لگائے بیٹھی ہوتیں جنہیں سورج کی کرنوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کسی متجسس و مرعوب قاری کی طرح قرہ میرے رنگوں، میرے کاغذات، کتابوں، میرے خوش رو معاون، "کتابِ لباس" کے اوراق اور فرنگی سیاحوں کے لیے بنائی گئی مجلد کتاب، فحش اور دیگر بیہودہ مناظر کے اوراق جو میں نے چوری چھپے ایک پاشا کے لیے بنائے تھے، شیشے، کانسی اور مٹی کی مختلف رنگوں کی دوات، ہاتھی دانت کا گراری والا چاقو، سونے کے دستے والے دو مو قلم کا جائزہ لے رہا تھا اور ہاں، میرے خوب رو شاگرد کی نظروں کا بھی۔

"پرانے مصوروں کے برعکس میں نے کئی ایک جنگیں دیکھی ہیں۔" میں نے طاری خاموشی کو اپنی وجود سے بھرنے کو کہا: "جنگی مشینیں، توپیں، فوجیں، لاشیں، ہمارے سلطان اور جرنیلوں کے خیموں کی چھتوں کو مزین کرنے والا میں ہی تھا۔ ایک فوجی مہم کے بعد استنبول واپسی پر میں نے ہی اس جنگ کے مناظر کو محفوظ کیا جو دوسری صورت میں سب بھول جاتے، دو ٹکڑوں میں بٹی لاشیں، متحارب فوجوں کا تصادم، ہماری توپوں کے سامنے تھر تھر کانپتے قابلِ رحم کافر، محصور شدہ قلعہ کی فصیلوں کا دفاع کرتے سپاہی، سر قلم کیے جانے والے باغی اور سرپٹ بھاگتے ہوئے حملہ آور گھوڑوں کا غیظ و غضب۔ جو بھی میری یادداشت میں ہو، میں صفحات کی نذر کر دیتا ہوں: کافی پینے والی نئی مشین، گھڑ سوار جعفری کا انداز جو میں نے پہلے نہ دیکھا ہو، ایک توپ، نئی فرنگی رائفل کا گھوڑا، دعوت میں کس نے کس رنگ کا لباس زیبِ تن کیا تھا، کس نے کیا کھایا، کس نے اپنا ہاتھ کہاں اور کیسے رکھا...."

"ابھی جو تم نے تین کہانیاں سنائی ہیں، ان سے سبق کیا حاصل ہوتا ہے؟" قرہ نے یوں پوچھا کہ یہ ہر بات کا خلاصہ تھا اور دھیرے سے مجھ سے جواب طلب کیا۔

"الف۔" میں نے کہا: "مسجد کے مینار والی پہلی کہانی بتاتی ہے کہ مصور چاہے جتنا بھی قابل ہو، تصویر کو وقت ہی "مکمل" بناتا ہے۔ "ب" حرم اور کتب خانے والی دوسری کہانی ظاہر کرتی ہے کہ وقت سے فرار کا واحد طریقہ ہنر اور مصوری ہے۔ جہاں تک تیسری کہانی کی بات ہے، اس کا تم بتاؤ۔"

قرہ پُر اعتماد انداز میں کہنے لگا: "ج، ایک سو انیس سالہ بوڑھے مصور کی تیسری کہانی "الف" اور "ب" کو ملا کر ظاہر کرتی ہے کہ ایسا شخص جو کامل زندگی اور کامل مصوری سے منہ موڑ لیتا ہے، اس کے لیے وقت صرف موت کو اپنے پیچھے چھوڑ کر کیسے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ کہانی یہی ظاہر کرتی ہے۔"

مجھے ”زیتون“ کہتے ہیں

میں نمازِ ظہر کے بعد تیزی مگر احساسِ مسرت سے دو نو عمر لڑکوں کے حسین چہرے بنا رہا تھا، جب مجھے دروازے پر دستک سنائی دی۔ حیرت سے میرے ہاتھ کو جھٹکا سا لگا۔ میں نے مو قلم چھوڑ دیا۔ میں نے احتیاط سے اپنے گھٹنوں پر رکھی تختی ایک طرف رکھ دی۔ ہوا کی تیزی سے دوڑ کر دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے دعا کی۔ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا کیوں کہ آپ جو اس کتاب کے اندر سے مجھے سن سکتے ہیں، ہمارے اس خلیفہ اور قابلِ رحم جہان کے ہم سے زیادہ اللہ کے قریب ہیں۔ شہنشاہِ ہندوستان اور دنیا کا امیر ترین بادشاہ اکبر ایک ایسی کتاب تیار کروا رہا ہے جو ایک روز داستانوی کتاب بن جائے گی۔ اپنے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اس نے اسلامی دنیا کے چاروں گوشوں میں پیغام روانہ کیے اور دنیا کے عظیم ترین فنکاروں کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ ان کے بھیجے گئے قاصد گزشتہ روز مجھ سے ملنے آئے تھے اور مجھے ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی۔ اس بار جب میں نے دروازہ کھولا تو اس قاصد کی بجائے میرے بچپن کا شناسا قرہ کھڑا تھا جسے میں بالکل ہی بھول چکا تھا۔ تب وہ ہمارا ساتھ نہ دے پایا تھا، وہ ہم سے حاسد تھا۔ ”جی؟“

اس نے بتایا کہ وہ گپ شپ کرنے، دوستانہ ملاقات کرنے اور میری بنائی تصویریں دیکھنے آیا تھا۔ میں نے اسے خوش آمدید کہا تاکہ وہ سب دیکھ لے۔ مجھے علم ہوا کہ وہ آج ہی سربراہ مصور استاد عثمان سے ملنے گیا تھا اور ان کی دست بوسی کی تھی۔ اس نے بتایا کہ عظیم استاد نے اسے کچھ حکمت بھری باتیں بتائی تھیں۔ ”کسی مصور کی خصوصیت نابینا پن اور یادداشت پہ اس کے باتوں سے ظاہر ہو جاتی ہے۔“ انہوں نے بتایا تھا۔ سو اسے ظاہر ہو جانے دو۔

نابینا پن اور یادداشت

فنِ مصوری سے پہلے تاریکی تھی اور بعد میں بھی تاریکی ہوگی۔ اپنے رنگوں، تصویروں، فن اور محبت کے ذریعے ہم یاد رکھتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ”دیکھو!“ ”علم رکھنے سے مراد ہے کہ آپ نے

دیکھ لیا، دیکھا، یاد کیے بغیر علم رکھتا ہے۔ یوں مصوری ہے، تاریکی کو یاد کرنا۔ تمام بڑے فنکار جو مصوری سے محبت کرتے تھے اور جن کا خیال تھا کہ رنگ اور بصارت تاریکی سے ابھرے تھے، رنگوں کے ذریعے اللہ کی تاریکی کی طرف لوٹنے کی آرزو رکھتے تھے۔ یادداشت سے عاری فنکاروں کو اللہ یاد تھا نہ ہی اُس کی تاریکی۔ تمام عظیم استاد اپنے کام میں رنگوں کے اندر اور وقت سے ماوراء کے درمیان گہرے اور مکمل خلا کی جستجو کرتے ہیں۔ مجھے ذرا واضح کرنے دیں کہ اس تاریکی کو یاد کرنے سے کیا مراد ہے، جسے ہرات میں پرانے عظیم فنکاروں نے آشکار کیا تھا۔

نابینا پن اور یادداشت کی تین کہانیاں

الف: لامعی چلبی کی فارسی شاعر جامی کی کتاب ''تحفۃ الاحرار'' کے ترکی زبان میں ترجمے میں، جس میں اولیا کا تذکرہ ہے، تحریر ہے کہ قرہ قویونلو (Black Sheep Turkomen) کے حکمران جہان شاہ کے کتب سازوں کے کتاب خانے میں، ایک مشہور فنکار شیخ علی تبریزی نے خسرو و شیریں کی داستان کی شاندار تصویر کشی کی تھی۔ میں نے جو کچھ سنا اس کے مطابق، اس مشہور کتاب کی تکمیل میں گیارہ سال لگے جس میں استادوں کے استاد منی ایچر فنکار شیخ علی نے ایسے ذوق اور قابلیت سے اعلیٰ تصویریں بنائیں جس میں اس کا ثانی صرف عظیم ترین استاد بہزاد ہی ہو سکتا تھا۔ ابھی اس عظیم کتاب پر بھی مصوری نہ ہوئی تھی کہ جہان شاہ کو معلوم ہو گیا کہ وہ جلد ہی ایک ایسی کتاب کا مالک بننے والا ہے جس کی دنیا جہاں میں کوئی نظیر نہ ہو گی۔ وہ آق قویونلو (White Sheep Turkomen) کے حکمران نوجوان اوزون حسن کے خوف اور حسد میں گرفتار تھا اور اسے اپنا جانی دشمن قرار دے دیا۔ جہان شاہ کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس کتاب کی تکمیل کے بعد اس کی شہرت بڑھ جائے گی اور یہ کہ اوزون حسن کے لیے اس سے بہتر کتاب بنائی جا سکتی تھی۔ اصل حاسدین کی طرح جو اپنے اطمینان کو اس خیال سے زہر آلود کرتے ہیں کہ ''اگر اور کسی کو اس نعمت کی خبر ہو گئی؟'' جہان شاہ کو فوراً خیال آیا کہ اگر منی ایچر فنکار نے اگر ایک اور نقل تیار کر لی یا حتیٰ کہ بہتر نقل تو وہ اس کے جانی دشمن اوزن حسن کی ہو گی۔ اس لیے اس عالیشان کتاب کا واحد مالک بننے کی خاطر اس نے طے کیا کہ کتاب مکمل ہوتے ہی منی ایچر فنکار شیخ علی کو قتل کروا دے گا۔ لیکن اس کے حرم کی ایک نرم دل سرکیشیائی حسینہ نے اسے مشورہ دیا کہ اس ماہر منی ایچر فنکار کی بصارت لے لینا بہت ہو گا۔ جہان شاہ نے اس ہوشیار مشورے کو قبول کیا اور اپنے خوشامدی حلقے تک پہنچا دیا، یہاں تک کہ یہ بات اڑتے اڑتے شیخ علی کے کانوں تک پہنچ گئی۔ پھر بھی شیخ علی کسی عام متوسط درجے کے مصور کی طرح کتاب ادھوری چھوڑ کر تبریز سے فرار نہ ہوئے۔ انہوں نے اندھا کیے جانے سے بچنے کے لیے کام کی رفتار کم کی نہ ہی ناقص تصویریں بنائیں کہ وہ ویسی شان دار نہ بن سکیں۔ بلاشبہ وہ مزید لگن اور شوق اور یقین سے کام کرنے لگے۔ اس گھر میں جہاں وہ تنہا رہتے تھے، وہ نماز فجر کے بعد کام شروع کر دیتے اور شمع کی روشنی میں وہی گھوڑے، سرو و صنوبر، محبت گزیدہ اژدہے اور

وجیہہ شہزادے بناتے رہے یہاں تک کہ ان کی آنکھوں میں تلخ آنسو بھر آتے۔ بیشتر وقت وہ دونوں ہرات کے پرانے عظیم فنکاروں کی بنی کوئی تصویر دیکھتے رہتے اور دوسرے ورق پر اس کی ہو بہو نقل تیار کرتے۔ آخر کار انھوں نے قرہ قویونلو جہان شاہ کی کتاب مکمل کر لی اور استاد منی ایچر فنکار کی توقع کے مطابق پہلے ان کی مدح سرائی کی گئی اور سونے کے سکے نچھاور کیے گئے اور پھر دستار میں لگائی جانے والی تیز نوکیلی سوئی سے انھیں نابینا کر دیا۔ شیخ علی اپنی تکلیف ختم ہونے سے پہلے ہی ہرات چھوڑ کر آق قویونلو کے اوزن حسن کے پاس چلے گئے۔ "ہاں، بے شک میں نابینا ہوں۔" انھوں نے اوزن حسن سے کہا، "میں نے گزشتہ گیارہ برس حسن لاثانی مسودے پر مصوری کی، اس کے ہر قلم اور موقلم کا نشان مجھے یاد ہے اور میرا ہاتھ اپنی یادداشت کے بل پر اسے دوبارہ بنا سکتا ہے۔ عالی حضرت! میں آپ کے لیے ہر زمانے کی عظیم کتاب تیار کر سکتا ہوں۔ چوں کہ اب اس دنیا کی ناپاکی میری آنکھوں کی توجہ نہیں بٹا سکتی، میں اللہ کی عظمت و جلال کی اپنی یادداشت سے اس کی خالص ترین صورت میں عکاسی کروں گا۔" اوزن حسن کو عظیم استاد منی ایچر فنکار کا یقین آ گیا اور استاد منی ایچر فنکار نے حسبِ وعدہ، آق قویونلو کے حکمران کے لیے ایک عالیشان کتاب تیار کی۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ اس نئی کتاب سے ملنے والی روحانی طاقت ہی اوزن حسن کے ہاتھوں قرہ قویونلو کی شکست اور بعد ازاں بنگول (Bingol) میں جہان شاہ کی ہلاکت کا سبب بنی۔ یہ عالیشان کتاب، مرحوم جہان شاہ کے لیے شیخ علی تبریزی کی بنائی کتاب کے ساتھ، استنبول میں ہمارے سلطان کے خزانے میں تب پہنچی جب ہمیشہ فتح مند رہنے والے اوزن حسن کو اطلقبیلی کی جنگ (Battle of Otlukbeli) میں سلطان محمد فاتح نے شکست دی۔ وہ جو حقیقت میں دیکھ سکتے ہیں، جانتے ہیں۔

ب: چوں کہ جنت مکانی سلطان سلیمان خان قانونی نے خطاطوں کو مصوروں پر ترجیح دی، آج کے بد قسمت منی ایچر فنکار حالیہ کہانی کو مثال کے طور پر بیان کریں گے کہ مصوری کس طرح خطاطی سے آگے بڑھ گئی۔ تاہم کوئی بھی اگر ذرا زیادہ توجہ دے تو جان لے گا کہ یہ کہانی دراصل اندھے پن اور یادداشت کے بارے میں ہے۔ شاہ جہان امیر تیمور کی موت کے بعد اُن کے بیٹے اور پوتے بے رحمی سے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو گئے۔ ایسے موقع پر جب کوئی کسی دوسرے کے شہر پر قابض ہو جاتا تو سب سے پہلے اپنا سکہ ڈھلواتا اور مسجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھواتا۔ فاتح کے طور پر دوسرا کام یہ ہوتا کہ اپنی ملکیت بننے والی ساری کتابوں کی جلدیں اکھڑواتا اور ایک نیا انتساب لکھا جاتا جس میں فاتح کے "شاہ جہان" ہونے کی شیخی ہوتی، نیا سرورق تیار کیا جاتا اور نئی جلد سازی ہوتی تا کہ فاتح کی کتاب کو کوئی نیا دیکھنے والا بھی سمجھتا کہ وہ واقعی دنیا کا حکمران تھا۔ جب امیر تیمور کے پوتے اُلغ بیگ کے بیٹے عبداللطیف نے ہرات پر قبضہ کیا، اس نے کتاب سازی کے دقیقہ شناس اپنے باپ کے اعزاز میں کتاب کی تیاری کے لیے مصوروں، خطاطوں اور جلد سازوں کو اتنی جلدی حرکت دی اور ان پر اتنا دباؤ ڈالا کہ جلدیں کھول کر اوراق برباد اور نذرِ آتش کیے جا رہے تھے، تصویریں خلط ملط ہو گئیں۔ چوں کہ اُلغ بیگ کے شایانِ شان نہ تھا کہ اس کا بیٹا

ذہن میں رکھے بغیر کس تصویر کا تعلق کس داستان سے تھا، کتابیں ترتیب دے۔ اس لیے اس نے ہرات کے تمام منی ایچر فنکاروں کو جمع کیا اور کہا کہ وہ داستانیں بیان کریں تاکہ تصویروں کو صحیح ترتیب دی جاسکے۔ تاہم ہر مصور کی زبان نے داستان الگ طریقے سے سنائی جس باعث تصویروں کی ترتیب مزید غلط ہو گئی۔ یوں سب سے عمر رسیدہ منی ایچر فنکار کو تلاش کیا گیا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے گزشتہ 54 برس سے ہرات کے بادشاہوں اور شہزادوں کی کتابیں تیار کرتے اپنی آنکھوں کی روشنیاں گل کر لی تھیں۔ جب لوگوں کو ادراک ہوا کہ تصویروں کو غور سے دیکھنے والا بوڑھا فنکار دراصل نابینا تھا تو ایک شور اٹھا۔ کچھ نے ہنسی اڑائی۔ بوڑھے فنکار نے درخواست کی کہ سات سال سے کم عمر ایسا ذہین لڑکا تلاش کیا جائے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ ایسا لڑکا ڈھونڈ کر ان کے پاس لایا گیا۔ بوڑھے استاد نے کئی ایک تصویریں اس کے سامنے رکھیں۔ ''جو کچھ دیکھ رہے ہو بتاؤ۔'' انھوں نے ہدایت کی۔ جب لڑکا تصویروں کو بیان کر رہا تھا، بزرگ استاد آسمان کی طرف منہ اٹھائے غور سے سن رہے تھے اور پھر وہ بولے، ''یہ فردوسی کی ''شاہنامہ'' سے ہے جس میں سکندر دم توڑتے دارا کا سر گود میں لیے بیٹھا تھا... یہ سعدی کی ''گلستان'' جس میں استاد اپنے وجیہ شاگرد کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا... یہ نظامی گنجوی کی ''مخزن الاسرار'' میں اطبا کے مقابلے کی داستان...'' دوسرے منی ایچر فنکار اپنے بزرگ اور نابینا ساتھی سے زچ ہو کر بولے، ''یہ تو ہم بھی بتا سکتے تھے۔ یہ تو مشہور ترین داستانوں کے معروف مناظر ہیں۔'' اس پر بزرگ منی ایچر فنکار بچے کے سامنے مشکل ترین تصویریں رکھیں اور دوبارہ توجہ سے سننے لگے۔ ''فردوسی کی ''شاہنامہ'' میں ہرمزا ایک ایک کر کے خطاطوں کو زہر دے رہا ہے۔'' انھوں نے آسمان کو تکتے کہا، ''مثنوی روم کی سستی وفا کی جس میں ایک کاریگر بیوی کا شوہر اسے اور اس کے عاشق کو ناشپاتی کے پیڑ سے چھپ کر دیکھتا ہے۔'' یوں لڑکے کے بیان سے انھوں نے ان ساری تصویروں کو پہچان لیا جنھیں وہ خود نہیں دیکھ سکتے تھے اور یوں کتابوں کی درست جلد سازی ممکن ہوئی۔ جب الغ بیگ اپنی فوج کے ساتھ ہرات میں داخل ہوا تو اس نے بزرگ منی ایچر فنکار سے یہ جاننا چاہا کہ ایک نابینا نے کیسے ان تصویروں کی شناخت کر لی جنھیں بینا طے نہ کر پائے تھے۔ ''جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ میری یادداشت میری بصارت کی تلافی کرتی ہے۔'' بزرگ مصور نے جواب دیا، ''میں نے کبھی فراموش نہیں کیا کہ کہانیاں تصویروں ہی نہیں بلکہ الفاظ کے ذریعے بھی ذہن میں تازہ کی جاتی ہیں۔'' الغ بیگ نے جواب دیا کہ اس کے اپنے منی ایچر فنکار بھی ان داستانوں سے واقف تھے لیکن پھر بھی وہ تصویروں کو ترتیب نہ دے سکے۔ عمر رسیدہ منی ایچر فنکار نے کہا، ''کیوں کہ جب مصوری کی بات آتی ہے تو وہ اس سے خوب واقف ہیں جو کہ ان کا ہنر یا فن ہے، لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ پرانے فنکاروں نے یہ تصویریں خود اللہ کی یادداشتوں سے بنائی ہیں۔'' الغ بیگ نے پوچھا کہ کوئی بچہ یہ باتیں کیسے جان سکتا تھا۔ ''کچھ نہیں جانتا۔'' بزرگ منی ایچر فنکار نے کہا، ''لیکن میں ایک بوڑھا اور نابینا منی ایچر فنکار جانتا ہوں کہ اللہ نے یہ فانی جہان ویسے بنایا ہے جیسے کوئی سات سالہ ذہین بچہ اسے دیکھنا چاہے گا، مزید یہ کہ اللہ نے دنیا ایسے بنائی تاکہ سب سے بڑھ کر

itsurdu.blogspot.com

اسے دیکھا جائے۔ الفاظ اس نے ہمیں بعد میں دیئے کہ ہم وہ سب ایک دوسرے سے بانٹ سکیں جو ہم نے دیکھا ہو۔ ہم نے غلطی سے یہ خیال کیا کہ یہ داستانیں لفظوں سے ابھری ہیں اور یہ کہ تصویریں ان داستانوں کے لیے بنائی گئی تھیں۔ اس کے برعکس، مصوری اللہ کی یادداشتوں کی تلاش اور دنیا کو ویسے دیکھنے کا عمل ہے جیسا کہ وہ دنیا کو دیکھتا ہے۔''

ج: ڈھائی سو برس قبل عرب منی ایچر فنکاروں کی روایت تھی کہ وہ بینائی سے محرومی کے قائل ہم خدشوں اور ابدی فکروں کو ختم کرنے کے لیے طلوعِ آفتاب کے وقت مغربی افق کی طرف دیکھتے تھے۔ اسی طرح ایک صدی بعد شیراز میں منی ایچر فنکار اخروٹوں کو گلاب کی پتیوں کے ساتھ پیس کر صبح خالی پیٹ کھایا کرتے تھے۔ اسی دور میں اصفہان کے بزرگ منی ایچر فنکاروں کا خیال تھا کہ ان کے بصارت کھونے کا سبب دھوپ تھی اور وہ ایک ایک کر کے یوں اس کا شکار ہوئے جیسے طاعون کا، وہ دھوپ کی براہ راست کرنوں سے بچنے کے لیے کمروں کے نیم تاریک گوشوں میں یا اکثر شمع کی روشنی میں کام کرتے۔ بخارا کے ازبک فنکاروں کے کتاب خانوں میں منی ایچر فنکار دن کے اختتام پر شیخ کے دم کیے پانی سے اپنی آنکھیں دھوتے۔ لیکن یہ تمام احتیاط ایک طرف، عظیم مصور بہزاد کے استاد ہرات کے منی ایچر فنکار سید میرک نے اندھے پن کے بارے میں ایک خالص ترین نقطۂ نظر دریافت کیا۔ منی ایچر فنکار سید میرک کے مطابق نابینا پن سزا نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے اس منی ایچر فنکار کو ایک عطا تھی جس نے اپنی تمام عمر اس کے عظمت و جلال کی عکاسی میں صرف کی تھی، کہ مصوری اللہ کے فانی جہان کے تخیل کی تلاش تھی اور یہ منظر و تناظر صرف تاریکی چھانے کے بعد یادداشت سے ہی مکمل ہو سکتا تھا، صرف زندگی بھر کی محنت کے بعد، اور صرف تب جب اس مشقت سے منی ایچر فنکار کی آنکھیں تھک چکی ہوں۔ یوں اللہ کا اس جہان کا تخیل کسی نابینا منی ایچر فنکار کی یادداشت سے ہی آشکار ہوتا ہے۔ جب کسی عمر رسیدہ منی ایچر فنکار کے تخیل میں یہ عکس ابھرتے ہیں، یعنی جب وہ دنیا کو اپنی یادداشت اور نابینا پن سے ویسے دیکھتا ہے جیسے اللہ، تب ایسا مصور جس نے اپنے ہاتھ کو تربیت دینے میں عمر گزار دی ہو ان پر شکوہ مناظر کو ورق پر منتقل کر دے گا۔ مورخ مرزا محمد حیدر دولت، جنہوں نے ہرات کے منی ایچر فنکاروں کی داستانیں تفصیل سے تحریر کیں، بتاتے ہیں کہ استاد سید میرک نے مصوری کے اپنے مندرجہ بالا نظریے کو ایک مصور کی مثال سے واضح کیا، جو گھوڑا بنانا چاہتا تھا۔ ان کی دلیل تھی کہ کوئی بہت نالائق مصور بھی جس کا دماغ آج کے وحشی مصوروں کی طرح خالی ہو، گھوڑے کو دیکھتے ہوئے اس کی تصویر بناتے بھی اپنے تصور میں موجود تصویر ہی بنائے گا کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں گھوڑے کو دیکھنا اور کاغذ پر اس کی تصویر بنانا ممکن نہیں۔ پہلے، مصور گھوڑے کو دیکھتا ہے اور یوں دیکھنے سے اس کے تخیل میں جو گھوڑا موجود ہوتا ہے وہ اسے کاغذ پر منتقل کر دیتا ہے۔ مصور کاغذ پر جو تصویر بناتا ہے وہ اس گھوڑے کی نہیں ہوتی جو اس نے دیکھا ہو بلکہ اس گھوڑے کا تخیل ہے جو اس نے ابھی دیکھا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی بالکل حقیر مصور کے لیے بھی تصویر صرف یادداشت کے بل پر بنتی ہے۔ اس خیال کی

منطقی توسیع، جو مصور کی زندگی کو اندھے پن کی سعادت اور نابینا یادداشت کی تیاری قرار دیتا ہے، یہ ہے کہ ہرات کے استاد فنکار کتابوں کے شوقین شاہوں اور شہزادوں کے لیے بنائی گئی تصویروں کو ہاتھ کی تربیت یا ایک مشق سمجھتے تھے۔ وہ نہ ختم ہونے والی خاکہ نگاری اور کسی وقفے کے بغیر کئی روز شمع کی روشنی میں مسلسل کاغذوں کو دیکھنے کے کام کو ایک باعث خوشی مشقت کے طور پر قبول کرتے تھے جو منی ایچر فنکاروں کو بصارت سے محرومی کی طرف لے جاتا تھا۔ منی ایچر فنکار سید میرک نے عمر بھر اس انتہائی شاندار امکان کے مناسب لمحے کی تلاش جاری رکھی، اپنی مرضی سے نابینا ہونے کے لیے بہت باریکی سے درختوں اور ان کے پتوں کی، انگلیوں کے ناخنوں، چاول کے دانوں، یہاں تک بالوں کی لٹوں پر تصویریں بنائیں یا پھر بڑھتی تاریکی کے منڈلاتے سایوں سے احتیاط سے بچنے کے لیے دھوپ سے بھرے خوب صورت باغات کی تصویریں بنائیں۔ جب وہ ستر برس کے تھے تو سلطان حسین بایقرا (Hüseyin Baykara) نے عظیم مصور کو انعام دینے کی غرض سے انھیں شاہی خزانے میں داخلے کی اجازت بخشی جہاں سلطان نے ہزاروں مسودے جمع کر رکھے تھے اور جو مقفل رہتے تھے۔ خزانے میں اعلیٰ سونا، ریشمی اور مخملیں کپڑے کے انبار تھے اور استاد میرک سونے کے شمع دان کی روشنی میں ان عالیشان کتابوں کے ورق پلٹتے رہے، جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک داستان تھی، جنھیں ہرات کے پرانے فنکاروں نے بنایا تھا۔ تین دن رات مسلسل ان کا جائزہ لینے کے بعد عظیم استاد نابینا ہو گئے۔ انہوں نے اسے بالغ [illegible] اور اسی پہ رضا ہوتے قبول کر لیا، جیسے کوئی اللہ کے فرشتوں کو خوش آمدید کہے اور اس کے بعد انہوں نے دوبارہ بات کی اور نہ ہی مصوری۔

"تاریخ راشدی" کا مصنف مرزا محمد حیدر دولت واقعات کے یہ رخ اختیار کرنے پر [illegible] ہیں، "کوئی منی ایچر فنکار جو اللہ کے لافانی زماں کے تصور اور منظر نامے سے وابستہ ہو کبھی بھی عام فانی اشیا سے مخصوص اوراق کی طرف نہیں پلٹ سکتا۔" پھر وہ لکھتے ہیں، "جب بھی نابینا منی ایچر فنکار کی یادداشتیں اللہ تک رسائی کرتی ہیں تو وہاں ایک مکمل سکوت چھا جاتا ہے، ایک مبارک تاریکی اور کورے ورق کا لامتناہی پن۔"

یقیناً استاد عثمان کے نابینا پن اور یادداشت کے سوال پر میرا جواب سننے کی خواہش کی بجائے قرہ خود کو مطمئن کرنا چاہتا تھا کہ اس نے مجھ سے یہ سوال پوچھا جس دوران وہ میری اشیا، میرے کمرے اور تصویروں کو بغور جائزہ لے رہا تھا۔ پھر بھی مجھے خوشی ہوئی کہ میری سنائی کہانیوں نے اس پر اثر کیا تھا۔

"نابینا پن سعادت کی وہ بادشاہت ہے جہاں شیطان اور احساس گناہ کا داخلہ ممنوع ہے۔" میں نے اس سے کہا۔

قرہ نے کہا، "تبریز میں استاد میرک کے زیر اثر پرانے انداز کے چند منی ایچر فنکار آج بھی اندھے پن کو اللہ کی رحمت قرار دیتے ہیں اور انھیں نابینا ہونے پر نہیں بلکہ بوڑھا ہونے پر شرمندگی ہوتی ہے۔ آج بھی چند منی ایچر فنکار اس خدشے سے کہ دوسرے اسے ہنر و قابلیت سے محرومی کا ثبوت سمجھیں گے، خود کو نابینا ظاہر کرتے ہیں۔ اس اخلاقی اعتقاد کے نتیجے میں جس پر قزوین کے جمال الدین کا اثر ہے، کچھ منی

ایچر فنکار ہفتوں بغیر کچھ کھائے پیے آئینوں میں گھرے تاریک کمروں میں تیل کے لیمپ کی مدھم روشنی میں پرانے فنکاروں کے تزئین شدہ اوراق کو بہ غور دیکھتے ہیں تاکہ نابینا نہ ہونے کے باوجود جان سکیں کہ کوئی نابینا شخص دنیا کا تصور کیسے کرتا ہے۔"

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ کتاب خانے کا ایک خوبصورت شاگرد کھڑا تھا جس کی بادام سی آنکھیں پوری کھلی تھیں۔ اس نے بتایا کہ ہمارے بھائی، طلا کار نفیس آفندی کی لاش ایک دور افتادہ کنویں سے ملی ہے اور یہ کہ اس کا جنازہ نماز عصر کے بعد مہر ماہ مسجد میں پڑھایا جائے گا۔ پھر وہ دوسروں کو یہ خبر دینے بھاگ گیا۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرماتا۔

میں ہوں ایستھر

اچھا تو ذرا مجھے بتایئے، کیا محبت آدمی کو احمق بنا دیتی ہے یا یہ صرف احمق ہی ہیں جو محبت میں گرفتار ہوتے ہیں؟ میں تو برسوں سے کپڑا فروش ہوں اور شادیاں کراتی ہوں اور مجھے اس کی ذرا سمجھ نہیں آسکی۔ میرے لیے ایسے آدمیوں یا جوڑوں کو جاننا بڑا سنسنی خیز ہوتا تھا جو محبت میں جتنا ذہین اتنے ہی ذہین، زیادہ مکار اور سازشی ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ میں احمق تو جانتی ہوں: اگر کوئی مرد مکر و فریب، حیلہ بازی اور دھوکے بازیوں پر اُتر آئے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ محبت میں ہرگز گرفتار نہیں۔ جہاں تک قرہ آفندی کی بات ہے، یہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنا سکون اطمینان کھو بیٹھا ہے، جب وہ شکورے کا ذکر کرتا ہے تو خود پرسے ضبط کھو بیٹھتا ہے۔

بازار میں میں نے اسے وہ سارے رٹے رٹائے اسرار بتائے جو میں ہر کسی کو بتاتی ہوں: شکورے ہر وقت اس کے بارے سوچتی ہے، کہ اُس نے اپنے خط پر اس کا ردعمل معلوم کرنا چاہا، میں نے اسے پہلے بھی اس حال میں نہ دیکھا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اُس نے مجھے ایسی نگاہ سے دیکھا کہ مجھے اس پر ترس آگیا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں یہ خط سیدھا شکورے کو دے آؤں۔ ہر احمق یہ سمجھتا ہے کہ اس کی محبت کی صورتِ حال عجلت کا تقاضا کرتی ہے اور یوں وہ اپنی محبت کی شدت عیاں کر دیتا اور نادانی میں اپنے محبوب کے ہاتھ ہتھیار دے دیتا ہے۔ اگر اس کا محبوب عقل مند ہو تو وہ جواب میں دیر کرے گا۔ نتیجہ: عجلت محبت کا ثمرے تاخیر لاتی ہے۔

اگر محبت کا مارا قرہ جانتا کہ اس کے "فوراً" پہنچانے والے خط کو لیے میں نے اپنا ایک پھیرا لگایا تھا تو وہ میرا شکریہ ادا کرتا۔ بازار کے چوک میں اُس کے انتظار میں کھڑے میں سردی سے جم ہی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ خود کو گرم کرنے کے لیے پہلے ذرا میں اپنی کسی "بیٹی" کے ہاں چلی چلوں۔ میں ان لڑکیوں کو اپنی بیٹیاں کہتی ہوں جن کے خط مجھے پہنچانے ہوتے ہیں، جن کی شادیاں مجھے کروانی ہیں، "میری بیٹیاں" — یہ بدصورت لڑکی میری اتنی مشکور تھی کہ ہر بار میری آمد پر وہ میرے گرد پروانے کی طرح چکر لگاتی اور بغیر میرے کہے میری مٹھی میں نقرئی سکے دے دیتی۔ اب وہ حاملہ تھی اور خوش مزاج۔ اس نے چائے

itsurdu.blogspot.com

چولہے پر چڑھائی۔ میں نے اس کے ہر گھونٹ کا لطف لیا۔ جب اس نے کچھ دیر مجھے اکیلے چھوڑا تو میں نے قرہ آفندی کے دیئے سکے گنے۔ چاندی کے پچیس سکے۔

میں نے دوبارہ اپنی راہ لی۔ میں ذیلی گلیوں اور ان منحوس رستوں سے گزری، جو برف اور کیچڑ سے تقریباً ناقابل گزر تھیں۔ جب میں ایک دروازے پر دستک دے رہی تھی تو میرا شرارت کا جی چاہا اور میں چلانے لگی:

''کپڑے والی آئی ہے! کپڑے والی!'' میں پکاری، ''آؤ اور کسی سلطان کے لائق سوتی ململ دیکھو۔ آؤ اعلیٰ کشمیری شالیں دیکھو، برصہ کا مخملیں کپڑا اور ریشمی جھالر دار مصری قمیصوں کا کپڑا، کشیدہ کاری والے میز پوش، بستر کی چادریں اور میرے رنگین رومال ــــ کپڑے والی!''

دروازہ کھل گیا۔ میں اندر داخل ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح گھر سے بستروں، تلنے والے تیل اور سیلن کی بو آ رہی تھی، وہی بو جو بڑھتی عمر والے کنواروں سے مخصوص ہے۔

''بڑھیا۔'' اس نے کہا، ''آخر تم چلا کیوں رہی ہو؟''

میں نے خاموشی سے خط نکالا اور اسے تھما دیا۔ نیم روشن کمرے میں وہ خاموشی سے اور جھجکتے میرے قریب آیا اور اسے میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا جہاں ہر وقت تیل کا لیمپ روشن رہتا تھا۔ میں دہلیز پر انتظار میں کھڑی رہی۔

''کیا تمہارا پیارے بابا گھر نہیں؟''

اس نے جواب نہ دیا۔ وہ خط پڑھنے میں گم تھا۔ میں نے اسے تنہا چھوڑ دیا تا کہ وہ پڑھ سکے۔ وہ لیمپ کے پیچھے کھڑا تھا، یوں میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتی تھی۔ خط ختم کرنے کے بعد اس نے دوبارہ پڑھا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا، ''کیا لکھا ہے اس نے؟''

حسن نے پڑھا:

''میری پیاری شکورے، جس طرح میں برسوں ایک ہی شخص کے خواب دیکھتے زندہ رہا ہوں، میں تمہارے کسی بھی دوسرے کا خیال دل میں لائے بغیر اپنے شوہر کے انتظار کو سمجھتا ہوں۔ تمہارے جیسے مقام کی خاتون سے کوئی وفا اور نیکی کے علاوہ کیا توقع رکھ سکتا ہے؟ (حسن نے تلخی سے پڑھا) میری تمہارے بابا سے مصوری کے سلسلے میں ملاقات تمہیں ہراساں کرنے کے لیے نہ تھی۔ ایسا کبھی خیال بھی میرے ذہن میں نہ آئے گا۔ مجھے تمہاری طرف سے ملنے والے کسی اشارے یا حوصلہ افزائی کا بھی دعویٰ نہیں۔ جب تمہارا چہرہ کسی مقدس روشنی کی طرح کھڑکی میں ظاہر ہوا تو میں نے اسے خدا کی عطا کے سوا کچھ نہ جانا۔ تمہارا چہرہ دیکھنے کی مسرت کے سوا مجھے کیا چاہیے۔ (''اس نے یہ فقرہ نظامی سے لیا ہے۔'' حسن نے برہمی سے کہا)۔ تم مجھے خود سے فاصلہ رکھنے کا کہتی ہو تو پھر بتاؤ کیا تم کوئی فرشتہ ہو کہ تمہارے قریب جانا اتنا خوف زدہ کرنے والا ہو؟ سنو میں جو کہنا چاہتا ہوں: دور افتادہ اجاڑ کارواں سرائے میں جہاں نگرانوں اور

پھانسی کی قید سے بھاگے ٹھگوں کے سوا کوئی اور نہ ہوتا تھا۔ میں نصف شب کو اپنے سے زیادہ تنہا اور بدنصیب بھیڑیوں کی آوازیں سنتے پہاڑیوں پر اترتی چاندنی دیکھتے سونے کی کوشش کرتا اور سوچا کرتا تھا کہ کسی روز تم اچانک میرے سامنے آ جاؤ گی بالکل جیسے تم کھڑکی میں آئی تھیں۔ غور سے پڑھو: میں اب کتاب کے لیے تمہارے بابا کے پاس واپس گیا ہوں، تم نے میری بچپن میں بنائی تصویر واپس دے دی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تمہاری موت نہیں بلکہ اس کی نشانی ہے کہ میں نے تمہیں دوبارہ پا لیا ہے۔ میں نے تمہارے بیٹے اورحان کو دیکھا۔ بے چارہ بن باپ کا بچہ۔ ایک روز میں اس کا باپ ہوں گا!"

"خدا اس کی حفاظت فرمائے۔ اس نے اچھا لکھا۔" میں نے کہا۔ "یہ تو خاصا شاعر ہو گیا ہے۔"

"کیا تم کوئی فرشتہ ہو کہ تمہارے قریب جانا اتنا خوف زدہ کرنے والا ہو؟" اس نے دہرایا۔ "یہ سطر اس نے ابن زرہانی سے لی ہے۔ میں اس سے بہتر لکھ سکتا تھا۔" اس نے اپنا خط جیب سے نکالا۔ "یہ لو اور اسے شکورے تک پہنچا دو۔"

پہلی مرتبہ خطوط کے ساتھ رقم لیتے مجھے مسئلہ ہوا۔ مجھے اس شخص، اس کے جنون اور یک طرفہ محبت پر کچھ محسوس ہوا، جیسے کراہت۔ حسن نے بھی مجھے میرے شک کی تصدیق میں، اتنی دیر میں پہلی بار اپنے اخلاق کو ایک طرف رکھا اور قدرے رکھائی سے کہا:

"اسے کہنا کہ اگر ہم چاہیں تو اسے قاضی کے ذریعے یہاں واپس آنے پر مجبور کر دیں۔"

"کیا تم واقعی چاہتے ہو کہ میں یہ کہہ دوں؟"

خاموشی۔ "نہیں۔" اس نے کہا۔ تیل کے لیمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی جس میں میں نے اسے کسی نادم بچے کی طرح سر جھکاتے دیکھا۔ حسن کے کردار کے اس رخ کے باعث مجھے اس کے جذبات کا ذرا احترام ہے، اور میں اس کے خطوط پہنچا دیتی ہوں۔ جیسا آپ سوچ سکتے ہیں، میں یہ صرف رقم کی خاطر نہیں کرتی۔

میں گھر سے نکل رہی تھی جب اس نے دروازے پر مجھے روک لیا۔

"کیا تم شکورے کو بتایا کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں؟" اس نے جوش سے احمقوں کی طرح پوچھا۔

"کیا تم اسے اپنے خطوط میں یہ نہیں بتاتے؟"

"مجھے بتاؤ کہ میں اسے اور اس کے بابا کو کیسے قائل کروں؟ میں انہیں کیسے اپنی طرف مائل کروں؟"

"اچھا انسان بن کر۔" میں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"اس عمر میں، اب دیر ہو چکی ہے....." اس نے سچے کرب سے کہا۔

"محکمہ مال کے افسر حسن! تم کافی کمانے لگے ہو۔ یہی کسی آدمی کو اچھا بناتی ہے....." یہ کہہ کر

میں باہر نکل آئی۔

گھر اس قدر تاریک اور قسمین تھا کہ باہر کی ہوا گرم لگی۔ دھوپ نے میرے چہرے کو چھوا۔ میں نے شکورے کی خوشی کی دعا کی۔ لیکن مجھے سیلن زدہ، سرد اور تاریک گھر میں بیٹھے اُس بے چارے شخص کے لیے بھی کچھ محسوس ہوا۔ اپنی ترنگ میں میں یہ سوچتے ہوئے لاتیلی کی معاملہ مندی کی طرف مڑ گئی کہ دارچینی، زعفران اور کالی مرچ کی خوشبو میرا مزاج بحال کر دے گی۔ میں غلط تھی۔

شکورے کے گھر، اس نے دونوں خط لیتے ہی قرہ کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے بتایا کہ محبت کی آگ نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس خبر نے اسے خوش کیا۔

"بکواس کرنے والی کنواریاں ابھی باتیں کر رہی ہیں کہ نفیس آفندی کو کیوں قتل کیا گیا ہوگا۔" میں نے خود ہی موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"خیر ہے! تو رات کے لیے حلوہ بناؤ اور اسے بے چارے نفیس آفندی کی بیوہ قلبیے (Kalbiye) کو دے آؤ۔" شکورے نے کہا۔

"تمام ارض روم کے دوسرے لوگ اس کے جنازے میں شرکت کریں گے۔" میں نے کہا۔

"اس کے رشتے دار کہتے ہیں کہ وہ اس کے خون کا انتقام لیں گے۔"

شکورے پہلے ہی قرہ کا خط پڑھ چکی تھی۔ میں نے توجہ اور ناراضی سے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ یہ عورت کیسی لومڑی تھی جو اپنے جذبات کو چہرے پر جھلکنے سے روک سکتی تھی۔ خط پڑھتے مجھے لگا کہ اسے میری خاموشی اچھی لگی تھی کہ وہ اسے قرہ کے خط کو فوقیت دینے پر میری پسند بھی تھی۔ شکورے نے خط ختم کر کے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ اس کے اطمینان پر مجھے پوچھنا پڑا "اس نے کیا لکھا ہے؟"

"بالکل ویسے جیسے بچپن میں تھی —— اسے مجھ سے اب بھی محبت ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں ایک شادی شدہ عورت اور اپنے شوہر کی منتظر ہوں۔"

آپ کی توقع کے برعکس، یہ حقیقت کہ اس نے مجھے اپنے معاملے شامل کرنے کے بعد مجھ سے جھوٹ بولا، مجھے برا نہ لگا۔ دراصل اس کی بات نے مجھے پرسکون کر دیا۔ اگر وہ لڑکیاں اور عورتیں بھی، جن کے خط میں پہنچاتی اور دنیا کے رنگ ڈھنگ پر شکورے جیسی آئی ہوں، شکورے کی طرح تفصیل میں جائیں تو ان کا اور میرا کام تقریباً آدھا ہو جائے گا۔ زیادہ اہم یہ کہ ان کی بہتر شادیاں ہوں گی۔

"دوسرے والے نے کیا لکھا ہے؟" میں نے پوچھ ہی لیا۔

"میں حسن کا خط ابھی پڑھنا نہیں چاہتی۔" اس نے کہا۔ "کیا حسن کو معلوم ہے کہ قرہ استنبول واپس لوٹ آیا ہے؟"

"اسے تو یہ بھی خبر نہیں کہ اس کا کوئی وجود بھی ہے۔"

"کیا تم نے حسن سے بات کی؟" اس نے اپنی خوب صورت سیاہ آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔

"جیسا تم نے کہا تھا۔"

"ہاں؟"

"وہ کرب کا شکار ہے۔ اسے تم سے شدید محبت ہے۔ چاہے تمہارے دل میں کوئی اور ہو، اب اس سے چھٹکارا پانا مشکل ہوگا۔ اس کے خط قبول کر کے تم نے اس کی بڑی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس سے ہوشیار رہو۔ کیوں کہ وہ نہ صرف یہ چاہتا ہے کہ تم واپس جاؤ بلکہ یہ ثابت کر کے کہ اس کا بڑا بھائی وفات پا چکا ہے، وہ تم سے شادی کی تیاری میں ہے۔" میں ان الفاظ کا بوجھل پن کم کرنے کو مسکرائی تاکہ اس بدنیت کی ترجمان نہ لگوں۔

"پھر دوسرے والے نے کیا کہا؟" اس نے پوچھا لیکن کیا وہ خود جانتی تھی کہ کس کا پوچھ رہی تھی؟

"منی ایچ ونکار؟"

"میرا دماغ گندہ ہے۔" [illegible] اس نے کہا، شاید خود اپنے خیالوں سے خائف۔ "لگتا ہے کہ سب کچھ اور الجھ جائے گا۔ بابا بوڑھے ہو رہے ہیں۔ ہمارا کیا بنے گا، ان بن باپ کے بچوں کا؟" میں کوئی مصیبت نازل ہوتے محسوس کر سکتی ہوں، شیطان ہم [illegible] کے خلاف کوئی شرارت کر رہا ہے۔ استھر! کچھ ایسا کہو جس سے مجھے حوصلہ ملے۔"

"میری پیاری شکورے اور ابھی پریشان مت ہو۔ [illegible] نے اپنے جذبات کی رو میں کہا، "تم واقعی ذہین ہو اور تم بہت خوب صورت ہو۔ ایک روز تم اپنے وجیہہ شوہر کے ساتھ ہوگی، تم اپنی پریشانیاں بھول کر اس کی بیٹے سے لگوگی، تم خوش ہوگی۔ میں تمہاری آنکھوں میں یہ پڑھ سکتی ہوں۔"

میرے اندر ایسی محبت ابھری کہ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

"ٹھیک، لیکن میرا شوہر کون بنے گا؟"

"کیا تمہارا دل تمہیں کوئی جواب نہیں دے رہا؟"

"اس لیے کہ میرا دل جو کہہ رہا ہے مجھے سمجھ میں نہیں آ رہی کہ میں شکستہ دل ہوں۔"

لمحے بھر کو مجھے خیال آیا کہ شکورے مجھ پر بالکل بھروسا نہیں کرتی، کہ وہ کمال مہارت سے اپنا عدم اعتماد چھپا رہی ہے تاکہ معلوم کر سکے کہ میں کیا جانتی ہوں، یہ کہ وہ مجھ میں رحم جگا رہی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ ابھی خطوں کے جواب دینے کا نہیں سوچ رہی تو میں نے اپنی گٹھڑی اٹھائی اور صحن کے رستے باہر نکل آئی۔ لیکن جانے سے پہلے میں وہ بات کہنا نہ بھولی جو سب کنواریوں سے کہتی تھی، چاہے وہ جنگلی سی ہوتیں:

"وہ دوست میری پیاری، اگر تم اپنی یہ حسین آنکھیں کھلی رکھو، کوئی بدقسمتی، کوئی بدبختی تم پر نہیں آئے گی۔"

میں، شکورے

اگر سچ کہا جائے تو جب بھی کپڑا فروش ایستھر آیا کرتی تو میں ان خیالوں میں کھو جاتی تھی کہ محبت میں گرفتار کوئی شخص کبھی ایسا خط لکھے گا جو میرے جیسی ذہین عورت کا دل چھو لے گا۔۔۔ خوب صورت، مہذب اور بیوہ مگر پھر بھی اپنے وقار کو برقرار رکھے۔۔۔ اور اس دل کو دھڑکنا سکھا دے گا۔ اور یہ جان کر کہ خط شادی کے کسی عام خواہش مند نے لکھا تھا، اس سے میرے اپنے شوہر کے انتظار کے ارادے اور صبر کو مزید تقویت مل جاتی تھی۔ لیکن آج کل جب بھی ایستھر آیا کرتی ہے، میں الجھن کا شکار ہو کر خود کو بدنصیب سمجھنے لگتی ہوں۔

میں نے اپنے جہان کی آوازیں سنیں۔ باورچی خانے سے پانی ابلنے کی آواز اور لہسن اور پیاز کی خوشبو آ رہی تھی۔ خیریہ دال اُبال رہی تھی۔ شوکت اور اورحان صحن میں انار کے پیڑ تلے کھیل میں گم تلوار بازی کر رہے تھے۔ میں نے ان کا شور سنا۔ بابا ساتھ والے کمرے میں خاموشی سے بیٹھے تھے۔ میں نے حسن کا خط کھول کر پڑھا اور مجھے تسلی ہوئی کہ فوری پریشانی کی کوئی وجہ نہ تھی۔ پھر بھی میں اس سے کچھ اور خائف ہو گئی اور خود کو شاباش دی کہ ایک ہی گھر میں رہتے میں نے اس کی دست درازی کو ناکام بنا دیا تھا۔ پھر میں نے قرہ کا خط اتنی احتیاط سے تھاما اور پڑھا جیسے وہ کوئی نازک اور حساس پرندہ ہو اور میری سوچیں گڈمڈ ہو گئیں۔ میں نے خط دوبارہ پڑھے۔ سورج بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا اور مجھے خیال آیا کہ اگر میں حسن سے قربت کر لیتی تو سوائے اللہ کے کوئی گواہ نہ ہوتا۔ اس کی صورت میرے گم شدہ شوہر سے مشابہ تھی، ایک ہی بات ہوتی۔ کبھی کبھار میرے دماغ میں ایسا ہی کوئی عجیب خیال آتا تھا۔ سورج نے میرے پورے وجود کو گرما دیا۔ اورحان جب کمرے میں چپکے سے داخل ہوا، کھلے دروازے سے سورج کی کرنیں مجھ پر پڑ رہیں۔

"ماں! کیا پڑھ رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے پھر، یاد ہے کیسے میں نے کہا تھا کہ ایستھر کے لائے خط میں نے دوبارہ نہیں پڑھے؟"
میں نے غلط کہا تھا۔ میں اب بھی انہیں پڑھ رہی تھی۔ اس بار میں نے انہیں تہہ کیا اور اپنے بازوؤں میں اڑس لیا۔
"یہاں آؤ، میری گود میں۔" میں نے اورحان سے کہا اور وہ میری گود میں آ بیٹھا۔ "اور وہ قم

اتنے بھاری ہو۔ خدا تمہاری حفاظت کرے، تم بڑے ہو گئے ہو۔" میں نے یہ کہہ کر اسے چوما۔ "تم تو برف کی طرح ٹھنڈے ہو۔۔۔"

"تم کتنی گرم ہو ماں!" اس نے میرے سینے سے لگتے میری بات کاٹی۔

ہم خاموشی سے اس طرح ساتھ لگے بیٹھے لطف اٹھا رہے تھے۔ میں نے اس گردن کی مہک سونگھ کر اسے بوسہ دیا۔ میں نے اسے اور زور سے گلے لگا لیا۔ ہم ساکت تھے۔

"مجھے گدگدی ہو رہی ہے۔" اس نے بعد میں کہا۔

"اچھا تو مجھے بتاؤ۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اگر جنوں کا سلطان آ کر کہے کہ وہ تمہاری ایک خواہش پوری کرے گا تو کیا مانگو گے؟"

"میں چاہوں گا کہ شوکت چلا جائے۔"

"اس کے علاوہ؟ کیا تم ایک باپ کی بھی خواہش کرو گے؟"

"نہیں، میں بڑا ہو کر خود آپ سے شادی کروں گا۔"

ذوالحلق عمر، اپنی خوب صورتی کھونا یا شوہر اور دولت سے محروم ہونا تو مصیبتیں تھے ہی لیکن سب سے وحشت خیز بات یہ ہے کہ آپ سے کوئی پیار کرنے والا نہ ہو۔ میں نے اور جان کے گرم وجود کو نیچے اتارا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ میری جیسی ہوشیار عورت کو کسی اعلیٰ حیثیت کے آدمی سے شادی کر لینی چاہیے، میں اوپر اپنے بابا کے پاس گئی۔

"اعلیٰ حضرت سلطان خود دیکھنے کے بعد کہ ان کی کتاب مکمل ہو چکی ہے، آپ کو انعام سے نوازیں گے۔" میں نے کہا۔ "آپ دوبارہ وہیں جائیں گے۔"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" بابا نے جواب دیا۔ "اس قتل نے مجھے رنج پہنچایا ہے۔ ہمارے دشمن بظاہر کافی طاقت ور لگتے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔ میرے حالات نے ان کا حوصلہ بڑھایا ہے، اس سے غلط فہمیوں اور بے بنیاد امیدوں کو جنم ملا ہے۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"جتنی جلدی ہو سکے میری شادی ہو جانی چاہیے۔"

"کیا؟" میرے بابا نے کہا۔ "کس سے؟ لیکن تم تو شادی شدہ ہو۔ تمہیں کیسے یہ خیال آیا؟" انہوں نے پوچھا۔ "کس نے تمہارا ہاتھ مانگا ہے؟ چاہے ہم کوئی مناسب اور پرکشش بر ڈھونڈ بھی لیں۔" میرے ذی ہوش بابا نے کہا۔ "مجھے شبہ ہے کہ ہم کوئی ایسا ڈھونڈ لیں گے، تم سمجھتی ہی ہو۔" انہوں نے میری بدنصیبی صورت حال کا خلاصہ پیش کیا۔ "تم جانتی ہو کہ ایسے کئی پیچیدہ معاملے ہیں جنہیں تمہاری دوبارہ شادی سے پہلے حل کرنا ضروری ہے۔" ایک طویل خاموشی کے بعد وہ بولے۔ "میری پیاری بیٹی! کیا تم مجھے چھوڑ کر

جانا چاہتی ہو؟"

"گزشتہ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میرا شوہر وفات پا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ میں اس طرح نہیں روئی جیسے کوئی ایسی عورت روتی جس نے ایسا خواب دیکھا ہوتا۔

"ان کی طرح جو تصویروں کی تعبیر جانتے ہیں، کسی کو خواب کی تعبیر بھی آنی چاہیے۔"

"کیا آپ مناسب سمجھیں گے کہ میں اپنا خواب سناؤں۔"

ایک توقف آیا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اور جلدی سے ــــ جیسا کہ ذہین لوگ کرتے ہیں ــــ مسئلے کے تمام ممکنہ نتائج کو اخذ کیا۔

"تمہارے خواب کی تعبیر بتاتے ہو سکتا ہے کہ میں اس کی موت کا قائل ہو جاؤں لیکن تمہارا سسر، تمہارا دیور اور قاضی جو ان کی درخواست سنے گا، زیادہ ثبوت مانگیں گے۔"

"مجھے بچوں کے ساتھ یہاں واپس آئے دو سال ہونے کو آئے ہیں اور میرے سسرالی مجھے واپس جانے پر مجبور نہیں کر رہے......"

"کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ انہیں اپنی بداعمالی کا جواب دینا ہے۔" میرے بابا نے کہا۔ "اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تمہارے طلاق کی درخواست دینے پر آمادہ ہوں گے۔"

"اگر ہم مالکی یا حنبلی فرقوں سے ہوتے۔" میں نے کہا۔ "تو قاضی اس حقیقت کو مانتے ہوئے کہ چار برس بیت گئے ہیں مجھے نہ صرف طلاق دلوا دیتا بلکہ مجھے نان نفقہ بھی دلوتا۔ لیکن چوں کہ بفضل خدا ہم حنفی ہیں اس لیے یہ قانون ہم پر لاگو نہیں۔"

"مجھ سے اسکودر قاضی کے شافعی موقف کی بات نہ کرو وہ کوئی عقل کی بات نہیں۔"

"استنبول کی وہ تمام عورتیں جن کے شوہر محاذ پر گم شدہ ہیں، اپنے گواہوں کے ساتھ طلاق کے لیے اس کے پاس جاتی ہیں۔ وہ چوں کہ شافعی ہے اس لیے صرف اتنا ہی پوچھتا ہے کہ کیا تمہارا شوہر گم شدہ ہے؟ کتنے عرصے سے؟ تمہاری گزر بسر نہیں ہو رہی؟ کیا یہ تمہارے گواہ ہیں؟ اور فوراً طلاق دلوا دیتا ہے۔"

"پیاری شکورے! کس نے تمہارے ذہن میں یہ باتیں ڈالی ہیں؟" انہوں نے کہا۔ "تمہاری عقل کہاں گئی ہے۔"

"مجھے طلاق ملنے کے بعد، اگر ایسا کوئی آدمی ہو جو مجھے واقعی عقل سے محروم کر سکتا ہے، ظاہر ہے آپ ہی مجھے بتائیں گے کہ وہ کون ہو سکتا ہے اور اپنے شوہر کے متعلق میں آپ کے فیصلے پر بھی اعتراض نہیں کروں گی۔"

میرے تیز فہم بابا نے جب محسوس کیا کہ ان کی بیٹی بھی ان کی طرح ذہین ہے تو وہ پلکیں جھپکانے لگے۔ اس کی تین وجوہات تھیں۔ 1- کیوں کہ وہ لاجواب ہو گئے تھے اور انہیں نکلنے کی راہ چاہیے تھی۔ 2- کیوں کہ ان کے ناامیدی اور پریشانی سے آنسو بہنے کو تھے۔ 3- چوں کہ وہ بے بس اور لاجواب تھے،

چالاکی سے پچھلی دونوں وجوہات کو ملا کر یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ جلد ہی دکھ سے رو دیں گے۔"

"کیا تم بچوں کو لے کر چلی جاؤ گی اور بوڑھے باپ کو تنہا چھوڑ دو گی؟ تم جانتی ہو کہ ہماری کتاب ــــ "جی، انہوں نے "ہماری کتاب" کہا ــــ " کی وجہ سے میرے قتل کا خدشہ ہے، لیکن اب جب کہ تم بچوں کو لے کر یہاں سے جانا چاہتی ہو تو میں موت کا خیر مقدم کرتا ہوں۔"

"میرے پیارے بابا! کیا آپ ہی نہیں کہا کرتے تھے کہ صرف طلاق ہی مجھے میرے اس بیکار بُرے دور سے چھٹکارا دلا سکتی ہے؟"

"میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے تنہا چھوڑ جاؤ۔ کسی روز تمہارا شوہر واپس آ سکتا ہے، چاہے وہ تب بھی آئے تمہارے شادی شدہ ہونے میں کوئی برائی نہیں، جب تک کہ تم اپنے باپ کے گھر میں ہو۔"

"میں آپ کے ساتھ اس گھر میں رہنے کے سوا کچھ نہیں چاہتی۔"

"میری پیاری! کیا تم ابھی نہیں کہہ رہی تھیں کہ تم جلد از جلد شادی کرنا چاہتی ہو؟"

اپنے باپ کے ساتھ بحث کا نتیجہ لا حاصل نکلتا ہے: اس دوران آپ کو بھی یقین ہو جاتا ہے کہ آپ ہی غلط تھے۔

"میں نے کہا تھا۔" میں نے زمین پر نظریں جمائے کہا۔ پھر اپنے آنسو روکے اور اپنے ذہن میں آئی سچائی سے حوصلہ پا کر میں بولی: "ٹھیک ہے پھر، کیا میں دوبارہ کبھی شادی نہیں کروں گی؟"

"میرے دل میں ایسے داماد کا خاص مقام ہو گا جو تمہیں مجھ سے دور نہ لے جائے۔ تم سے شادی کا خواہش مند کون ہے، کیا وہ ہمارے ساتھ اس گھر میں رہنا پسند کرے گا؟"

میں خاموش ہو گئی۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ گھر داماد کی بابا کبھی عزت نہیں کریں گے اور رفتہ رفتہ اسے حقیر سمجھتے ہوئے اس کا جینا حرام کر دیں گے۔ اور اس شخص کی میرے بابا کے ہاتھوں ذہنی نوچی تضحیک پر جو اپنی دلہن کے خاندان کے ساتھ رہ رہا ہو، میں جلد ہی اس سے چھٹکارا پانے لگوں گی۔

"تمہاری صورت حال میں باپ کی رضامندی کے بغیر شادی عملی طور پر ناممکن ہے۔ ہے ناں؟ میں نہیں چاہتا کہ تم شادی کرو اور تمہیں شادی کی اجازت دینے سے انکار کرتا ہوں ــــ"

"میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میں صرف طلاق لینا چاہتی ہوں۔"

"...... کیوں کہ کوئی بے عقل جسے اپنے سوا کسی کی پرواہ نہ ہو، تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میری پیاری شکورے، تم جانتی ہو کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس کتاب کو مکمل کرنا ہو گا۔"

میں نے کچھ نہ کہا، کیوں کہ اگر میں بولتی ــــ شیطان کے بہکاوے میں آ کر جو میرے غصے سے واقف تھا ــــ تو میں اپنے بابا کے منہ پر کہہ دیتی کہ میں جانتی تھی کہ وہ رات کو خیریے کو بلاتے تھے۔ لیکن کیا مجھ جیسے مقام والی عورت کو زیب دیتا کہ وہ تسلیم کرے کہ وہ جانتی تھی کہ اُس کا بوڑھا باپ ایک کنیز سے قربت رکھتا تھا؟

"کون ہے جو تم سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

میں نے نیچے زمین پر نگاہیں گاڑ لیں، شرمندگی سے نہیں بلکہ غصے سے۔ اپنے غصے کو جانے اور کسی طور کچھ کہہ نہ پانے نے مجھے اور بھی برہم کر دیا۔ اسی لمحے مجھے میرے بابا اور نجر بے میرے تصور میں ایک بیہودہ حالت میں دکھائی دیے۔ جب میں نے یہ کہا، میرے آنسو بہنے کو تھے۔

"نزوکھتی چولہے پر رکھی ہے، میں نہیں چاہتی کہ وہ جل جائے۔"

میں نے سیڑھیوں کے ساتھ والے ہمیشہ بند کھڑکی والے کمرے سے گزری جو کنوئیں کی طرف کھلتی تھی۔ تاریکی میں ہی میں نے لپٹا ہوا بستر تلاش کیا، اسے کھول کر بچھایا اور لیٹ گئی۔ آہ، کتنا شان دار احساس ہے، لیٹنا اور کسی ایسے بچے کی طرح روتے روتے سو جانا جسے غلطی سے سرزنش کی گئی ہو اور یہ جاننا کتنا اذیت ناک ہے کہ دنیا میں صرف میں ہی وہ واحد شخص ہوں جو مجھے پسند کرتی ہو۔ اپنی تنہائی میں، جب میں روتی ہوں، صرف تم ہی تو ہو جو میری آہوں اور سسکیوں کو سنتے اور میری مدد کو آ سکتے ہو۔

کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ اور حان بھی میرے بستر پر آ گیا تھا۔ اس نے اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سسکیاں بھر کر رو رہا تھا۔ میں نے اسے قریب کیا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔

"مت رو ماں۔" اس نے کہا۔ "بابا جنگ سے واپس آ جائیں گے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے اس سے بہت محبت ہے، اور میں نے اسے سینے سے بھینچ لیا تاکہ خود اپنی ساری پریشانیاں بھول جاؤں۔ اس سے پہلے کہ میں گدے سے نازک اور حان کو ساتھ لگا کر سو جاؤں، مجھے صرف ایک پریشانی کا اعتراف کرنے دیں: مجھے ندامت ہے کہ میں نے ابھی قصے میں نجر بے اور اپنے بابا کے تعلق کے بارے میں بتایا ہے۔ نہیں، میں جھوٹ نہیں بول رہی تھی لیکن میں پھر بھی اتنی شرمندہ ہوں کہ چاہوں گی کہ بہتر ہو کہ آپ یہ بات بھول جائیں۔ یوں ظاہر کریں کہ جیسے میں نے کوئی ذکر کیا ہی نہیں، جیسے کہ نجر بے اور میرا بابا کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ براہِ مہربانی؟

میں تمہارا انشتے ہوں

افسوس، یقین رکھنا دشوار ہے، بہت دشوار۔ میں ساتھ والے کمرے سے اُس کی سسکیاں سن سکتا تھا لیکن اپنے ہاتھوں میں تھامی کتاب کے صفحے دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ امام غزالی کی ''زادِ آخرت'' کے ایک صفحے پر وہ جسے میں پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا تحریر تھا کہ موت کے تین روز بعد مرنے والے کی روح اللہ کے اذن سے اس جسم کو دیکھنے آتی ہے، جس میں وہ کبھی باسی تھی۔ اپنے بدن کو قابلِ رحم حالت میں دیکھ کر قبر میں خون آلود، گلتے سڑتے اور کیڑوں سے بھرے، روح رنج والم اور آنسوؤں میں ماتم کناں ہوگی: ''آہ دیکھو ...... میری قابلِ رحم فانی بدن، میرا پیارا پرانا خستہ حال جسم۔'' یکا یک میں نے نفیس آفندی کے کنوئیں کی تہہ میں تلخ انجام کا سوچا اور قدرتی طور پر اُس کی روح اُس کے جسم کو قبر کی بجائے کنوئیں میں پا کر کتنی پریشان ہوئی ہوگی۔

جب شکورے کی سسکیاں ختم ہو گئیں تو میں نے موت کے موضوع پر اس کتاب کو ایک طرف رکھ دیا۔ میں نے ایک اور اونی بنیان پہنی، پسلیوں کو گرم رکھنے کے لیے کمر کے گرد اپنی اونی پٹی لپیٹی، خرگوش کی سمور کے استر والی شلوار پہنی اور جب میں گھر سے نکل رہا تھا تو دیکھا کہ شوکت دہلیز پر کھڑا تھا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں نانا؟''

''تم اندر جاؤ۔ میں جنازے کے لیے جا رہا ہوں۔''

میں برف سے ڈھکی گلیوں سے گزرا، اس یا اُس طرف خمیدہ پرانے گرتے گھروں سے گزرا اور آتش زدگی کا شکار علاقے سے بھی۔ میں کسی بوڑھے ہی کی طرح برف پر پھسلنے سے بچنے کو نپے تلے محتاط قدم اٹھاتے دیر تک چلتا رہا۔ میں اُس دور دراز علاقے، باغوں اور کھیتوں سے گزرا۔ فصیل شہر تک پہنچنے کے لیے میرا گزر ان دکانوں سے ہوا جہاں گھیوں اور پچیوں کا کاروبار ہوتا تھا، لوہاروں، کاٹھی اور زین سازوں، نعل سازوں کے قریب سے گزرا۔

مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے جنازہ شہر کے ادرنے دروازے کے قریب مہرماہ مسجد سے شروع کرنے کا فیصلہ کیوں کیا۔ مسجد میں میں نے مرحوم کے بڑے سر والے اور رنج زدہ بھائیوں کو گلے لگایا جو برہم

اور سرکش دکھائی دے رہے تھے۔ ہم منی ایچر فنکاروں اور خطاطوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور رو دیے۔ میں جب سرمئی وحند میں نماز ادا کر رہا تھا جو اچانک اتری اور ہر شے کو ڈھانپ لیا تھا تو میری نگاہ مسجد کے پتھر یلے پلیٹ فارم پر دھرے تابوت پر پڑی اور میں نے بدمعاش قاتل کے خلاف ایسا اشتعال محسوس کیا کہ ساری نماز ہی میرے دماغ میں گڈمڈ ہوگئی۔

نماز جنازہ کے بعد جب تابوت کو کندھا دیا جا رہا تھا، میں ابھی منی ایچر فنکاروں اور خطاطوں کے ہمراہ تھا۔ لگا اور میں بھول چکے تھے کہ جب ہم کی رات صبح تک چراغوں کی روشنی میں میری کتاب پر کام کرتے تھے اور وہ مجھے نفیس آفندی کی طلاکاری کی کمتری کا یقین دلاتا تھا اور یہ بھی کہ اس کے رنگوں کے استعمال میں عدم توازن تھا۔۔۔۔ وہ ہر چیز کو گہرا ایسا رنگ دیتا تھا تاکہ وہ خوب دکھائی دے ا ہم دونوں یہ بھی بھول گئے کہ میں یہ کہہ کر اسے باور کرواتا تھا کہ "لیکن کوئی اور یہ کام کرنے کا اہل نہیں" اور ہم نے ایک بار پھر آہیں بھرتے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ زیتون نے مجھے گلے لگانے سے پہلے دوستی اور احترام کی نگاہ سے دیکھا۔۔۔۔ جو شخص گلے ملنا جانتا ہے، وہ اچھا آدمی ہے۔۔۔۔ اور اس سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ مجھے یاد آ گیا کہ کتاب خانے کے سارے فنکاروں میں وہی تھا جسے میری کتاب پر بھروسا تھا۔

صحن کے دروازے کی سیڑھیوں پر میں نے سربراہ مصور استاد عثمان کو اپنے برابر پایا۔ ہم دونوں کے پاس الفاظ نہ تھے، ایک عجیب سناٹا ور ابھرا۔ مرحوم کا ایک بھائی رونے اور سسکیاں بھرنے لگا، اور کوئی پکارا، "اللہ اکبر۔"

"کون سے قبرستان؟" استاد عثمان نے یوں ہی بات کرنے کو مجھ سے پوچھا۔

کسی وجہ سے "میں نہیں جانتا" کہنا مجھے اچھا نہ لگا۔۔۔ میں اور بنا سوچے میں نے ساتھ کھڑے شخص سے پوچھا، "کون سے قبرستان میں؟ اور نے دروازے والے؟"

"ایوب۔" ایک بدمزاج، باریش بے وقوف سے نوجوان نے کہا۔

"ایوب۔" میں نے استاد کی طرف مڑ کر کہا لیکن وہ بہرحال بدمزاج بے وقوف کی بات سن چکے تھے۔ پھر انہوں نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے کہتے ہوں کہ "میں سمجھتا ہوں" کہ مجھے خبر ہوگئی کہ وہ اس سے زیادہ ہماری ملاقات کو طول نہ دینا چاہتے تھے۔

فرنگیوں کی طرز مصوری میں ہمارے سلطان کی بڑھتی دلچسپی میں میرے اثر کا تذکرہ کیے بغیر استاد عثمان یقیناً اس پر خفا تھے کہ سلطان نے اس مسودے کی تزئین اور مصوری کی نگرانی کا حکم مجھے دیا تھا جسے "خفیہ" کہتا تھا۔ ایک موقعے پر سلطان نے عظیم استاد عثمان کو اپنی ایک تصویر کی نقل کا حکم دیا تھا جو کسی وینس فنکار کی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ اس مصوری نقل کا ذمے دار استاد عثمان مجھے ٹھہراتے تھے کہ انہیں ایک عجب تصویر بنانی پڑی جو انہوں نے "اذیت" قرار دیتے ہوئے کراہت سے بنائی۔ ان کی برہمی جائز تھی۔

سیڑھیوں کے درمیان ذرا رک کر میں نے آسمان کو دیکھا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ میں خاصا

چاہئیں، یہ کہ ہمیں پرانے فارسی استادوں کے معین راستوں کی پیروی کرنی چاہیے کہ کسی فنکار کو کوئی منظر صرف دولت کی خاطر نہیں بنانا چاہیے۔ ہمارا ماننا ہے کہ ہماری کتابوں میں اسلحے، افواج، غلاموں اور فتوحات کی جگہ پرانی اساطیر، پرانی داستانوں اور کہانیوں کو نئے انداز میں متعارف کروانا چاہیے۔ ہمیں پرانے طریقوں کو یکسر ترک نہیں کرنا چاہیے۔ حقیقی منی ایچر فنکاروں کو بازاروں میں دکانوں کی آوارہ گردی نہیں کرنی چاہیے اور چند اضافی کورش کی خاطر کوئی پرانی شے، غیر مہذب تصویریں نہیں بنانی چاہئیں۔ اعلیٰ حضرت سلطان ہمیں درست قرار دیں گے۔''

''تم خود کو احمقانہ طور پر ملزم ٹھہرا رہے ہو۔'' میں نے کہا تا کہ وہ اپنی بکواس بند کر دے۔ ''مجھے یقین ہے کہ نقاش خانہ کسی ایسے جرم کے قاتل شخص کو پناہ نہیں دے سکتا۔ تم سب آپس میں بھائی ہو۔ ایسے چند موضوع پر تصویر کشی میں کوئی حرج نہیں جن کی عکاسی پہلے نہ ہو چکی ہو۔ کم سے کم اتنا حرج نہیں کہ اس سے عداوت پیدا ہو جائے۔''

جیسا کہ جب میں نے پہلے یہ دہشت ناک خبر سنی تو میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔ نفیس آفندی کا قاتل محل کے کتاب خانے کے اعلیٰ فنکاروں میں سے تھا اور وہ اس مجمع میں شامل تھا جو قبرستان کی طرف جاتے پہاڑی سے اتر رہا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ قاتل اپنی شیطانیت اور سرکشی جاری رکھے گا، یہ کہ وہ اس کتاب کا بھی دشمن تھا جو میں تیار کر رہا تھا اور غالباً مصوری اور تزئین کاری کا کام حاصل کرنے میرے گھر بھی آتا رہا ہو۔ کیا تتلی بھی میرے گھر آنے والے دوسرے فنکاروں کی طرح شکورے پر فریفتہ ہو گیا تھا؟ جب وہ زور دے کر اپنی بات کہہ رہا تھا تو کیا وہ وقت بھول گیا تھا جب میں نے اس سے ایسی تصویریں بنانے کی درخواست کی تھی جو اس کے نقطہ نظر کے خلاف تھیں یا وہ صرف کمال مہارت سے مجھ پر طنز کر رہا تھا؟

نہیں، میں نے کچھ دیر بعد سوچا کہ وہ مجھ پر طنز نہیں کر سکتا تھا۔ تتلی دوسرے ماہر مصوروں کی طرح میرا مقروض احسان تھا: جنگوں اور ہمارے سلطان کی عدم دلچسپی کے سبب منی ایچر فنکاروں کے معاوضوں اور تحفوں میں کمی آ گئی تھی، اس وجہ سے کچھ عرصہ سے ان کی آمدنی کا واحد بڑا ذریعہ وہ تھا جو میرے ساتھ کام کر کے کماتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری توجہ حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے اور اس سبب، اگرچہ یہی ایک سبب نہ تھا، میں ان سے اپنے گھر پر الگ الگ ملتا تھا، یہ مجھ سے عداوت رکھنے کا کوئی بڑا سبب نہ تھا۔ میرے تمام منی ایچر فنکار اتنے بالغ نظر ضرور تھے کہ بھرم داری کا برتاؤ رکھتے، ایسے آدمی کو سراہتے جس کے وہ خود اپنے مفاد کے لیے مقروض تھے۔

خاموشی توڑنے اور گفتگو کے پرانے موضوع کو دہرانے سے بچنے کی خاطر میں نے کہا: ''او وہ کیا اس کی کرامات بھی رکیں گی! وہ تابوت کو اس پہاڑی پر اتنی ہی تیزی سے لے کر جا رہے ہیں جتنی تیزی سے نیچے لائے تھے۔''

تتلی اپنے سفید دانت نکال کر مسکرایا: ''سردی کے باعث۔''

کیا یہ شخص کسی کو قتل کر سکتا تھا، میں نے سوچا، مثلاً رشک وحسد کے سبب؟ کیا یہ مجھے بھی قتل کر سکتا تھا؟ اس کے پاس یہ عذر تھا: یہ آدمی میرے مذہب کی توہین کر رہا تھا۔ نہیں، وہ ایک عظیم فنکار ہے۔ اہلیت کا اہل ہونا، وہ کسی کے قتل پر کیوں مصر ہوگا؟ بڑھاپے کا مطلب نہ صرف خود کو پہاڑی پر چڑھانا بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے، موت سے خائف نہ ہونا بھی ہے۔ اس کا مطلب خواہش کی کمی ہے، کیونکہ خلوت، کسی ہیجان کے باعث نہیں بلکہ روایت کے طور پر۔ کسی وجدان کے تحت میں نے اسے وہیں اپنا فیصلہ سنا دیا:

"میں کتاب پر کام مزید جاری نہیں رکھوں گا۔"

"کیا؟" تتلی نے بدلتے تاثرات سے کہا۔

"اس میں کسی قسم کی بدشگونی ہے۔ ہمارے سلطان نے اخراجات بھی کم کر دیے ہیں۔ تم بگلے اور زیتون کو بھی یہ بتا دینا۔"

شاید وہ مزید سوال وجواب کرتا لیکن ہم نے خود کو سرو کے بلند وبالا درختوں اور قبروں کے درمیان آگہی سرخوشی میں قبرستان کی ڈھلان پر پایا۔ جب ہجوم قبر کے گرد جمع ہوا، مجھے صرف رونے اور سسکیاں بھرنے میں شدت اور بسم اللہ اور الا علیٰ ملت رسول اللہ کی پکاروں سے معلوم ہوا کہ تابوت قبر میں اتارا جا رہا تھا۔

"اس کا چہرہ پورا کھول دو۔" کسی نے کہا۔

وہ سفید کفن ہٹا رہے تھے اور وہ یقیناً میت کی آنکھوں میں جھانک رہے ہوں گے، اگر واقعی اس کے کچلے سر میں کوئی آنکھ بچی تھی تو۔ میں پیچھے تھا اور کچھ بھی نہ دیکھ پایا۔ میں نے اس مرتبہ موت کی آنکھوں میں جھانکا تھا، قبر کی بجائے، ایک بالکل مختلف جگہ ____

ایک یاد: تیس سال قبل ہمارے سلطان کے جنت مکانی دادا نے قبرص، وینس (یا اطالیہ) سے واپس لینے کا فیصلہ کیا۔ شیخ الاسلام ابو سعود آفندی نے فتویٰ دیا کہ یہ جزیرہ جو کبھی مکہ و مدینہ کی رسد گاہ تھا جہاں حاجیوں کے لیے رسد رکھی جاتی تھی، لہٰذا مقدس سرزمین کے مددگار جزیرے کو عیسائی کافروں کے قبضے سے واپس لینا ہوگا۔ وینس والوں کو اس غیر متوقع فیصلے سے آگاہ کرنے کی دشوار ذمے داری میرے کندھوں پر آئی کہ انھیں یہ جزیرہ چھوڑنا ہوگا۔ اس کے نتیجے میں مجھے وینس کے گرجا گھر دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے محلات دیکھ کر میں مبہوت تھا، لیکن سب سے زیادہ مجھے ان کے گھروں میں لگی تصویریں پسند آئیں۔ اس کے باوجود، حیرت کے عالم اور وینس والوں کی مہمان نوازی پر بھروسا کرتے میں نے غرور و نخوت سے انھیں بتایا کہ ہمارے سلطان قبرص کا قبضہ چاہتے تھے۔ عجلت میں طلب کی گئی کانگرس میں وینس والے اتنے برہم تھے کہ فیصلہ ہوا کہ خط پر بحث بھی ناقابل قبول تھی۔ غصیلے ہجوم نے مجھے ڈیوک کے محل میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ جب چند بدمعاش، محافظوں اور دربانوں کی نظر بچا کر نکل آئے اور میرا گلا دبانے لگے تو ڈیوک کے ذاتی محافظ ایک خفیہ راستے سے مجھے وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے جو ایک نہر پر کھلتا تھا۔ وہاں کھم

میں، جو آج جیسی نہ تھی، میں نے لمحے بھر کو سوچا کہ سفید لباس میں دراز قد اور زرد رُو کشتی بان، جس نے مجھے بازو سے تھام لیا تھا، موت کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دکھائی دیا تھا۔

میں نے خفیہ کتاب کو ختم کرنے کے بعد وینس جانے کا خواب دیکھا۔ میں قبر کے قریب گیا جس پر مٹی ڈالی جا چکی تھی۔ اس وقت منکر نکیر اس سے سوال جواب کر رہے ہوں گے کہ مرد ہے یا عورت؟ مذہب کیا ہے؟ اور وہ کس کو پیغمبر تسلیم کرتا ہے؟ میرے ذہن میں میری موت کا خیال در آیا۔

میرے نزدیک ایک کوا زمین پر اُترا۔ میں نے محبت سے قرہ کی آنکھوں میں جھانکا اور اُسے کہا کہ میرا بازو تھام کر میرے ساتھ واپس چلے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں چاہتا تھا کہ وہ اگلی صبح کتاب پر کام کے لیے آئے۔ میں نے بے شک اپنی موت کا تصور کیا تھا اور ایک بار پھر ادراک کیا کہ وہ کتاب ہر قیمت پر مکمل کرنی ہو گی۔

مجھے قاتل کہا جائے گا

انہوں نے بدقسمت نفیس آفندی کی کچلی ہوئی اور مسخ شدہ لاش پر سرد کیچڑ زدہ مٹی ڈالی اور میں ان سب سے بڑھ کر رو دیا۔ میں چلایا، "میں اس کے ساتھ مرنا چاہتا ہوں!" اور "مجھے بھی اس کی قبر میں ڈال دو!" اور لوگوں نے میری کمر تھامے رکھی کہ میں کہیں گر ہی نہ جاؤں۔ میں نے منہ کھول کر سانس لی اور انہوں نے میری پیشانی پر اپنی ہتھیلیاں رکھ کر میرا سر پیچھے کیا تا کہ میں صحیح طرح سانس لے سکوں۔ مرحوم کے رشتے داروں کی نگاہوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے شاید سسکیاں بھرنے اور آہ و زاری میں مبالغہ کر دیا تھا، میں نے خود کو مجتمع کیا۔ میرے ضرورت سے زائد رونے پر کتاب خانے والے یہ باتیں بنا سکتے تھے کہ نفیس آفندی اور میں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے۔

لوگوں کی خود پر مزید توجہ سے گریز کے لیے میں جنازے کے اختتام تک چنار کے ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ احمق جسے میں نے جہنم واصل کیا تھا، کے ایک رشتے دار نے مرحوم سے بھی زیادہ احمق... نے مجھے درخت کے پیچھے دیکھ لیا اور اپنے خیال میں معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اس نے کچھ دیر مجھے گلے لگایا اور پھر نادان نے کہا، "تم "بغتہ" تھے یا "بدھ"؟"

"مرحوم کی کتاب خانے میں کچھ عرصہ عرفیت "بدھ" تھی۔" میں نے کہا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

کتاب خانوں کی عرفیت کی کہانی سادہ تھی، جس نے ہمیں ایک دوسرے سے خفیہ جوڑ رکھا تھا۔ شاگردی کے ایام میں جب منی ایچر فنکار عثمان کو نائب استاد سے استاد کے درجے پر ترقی دی گئی، ہم سب کے دلوں میں ان کا بے حد عزت و احترام اور محبت تھی۔ وہ کامل فنکار تھا اور انہوں نے ہمیں سب کچھ سکھایا کہ خدا نے انہیں مسحور کن فنکارانہ استعداد اور کسی جن کی سی ذہانت سے نواز رکھا تھا۔ ہر صبح، جیسا کہ شاگردوں کا فرض تھا، ہم میں سے کوئی ایک استاد کے گھر جاتا اور ان کے پیچھے پیچھے ان کے قلم اور موقلم کا ڈبہ، تھیلا اور کاغذوں سے بھرا بستہ اٹھائے واپس کتاب خانے آتا۔ ہم ان کے قرب کے لیے اتنے بے چین ہوتے کہ یہ طے کرنے کے لیے آپس میں جھگڑ پڑتے کہ صبح انہیں لینے کون جائے گا۔

استاد عثمان کا ایک پسندیدہ شاگرد تھا۔ لیکن اگر وہی شاگرد روزانہ انہیں لینے جاتا تو اس نے بھی

ختم نہ ہونے والی افواہوں اور بدمزہ لطیفوں کو ہوا ملتی جو ہر کتاب خانے کی زندگی کا حصہ ہیں، اس لیے عظیم استاد نے فیصلہ کیا کہ ہم میں سے ہر ایک کو ہفتے کا ایک دن سونپا جائے گا۔ عظیم استاد جمعہ کو کام کرتے تھے اور ہفتے کے روز گھر رہتے تھے۔ ان کا بیٹا، جس سے انہیں بہت محبت تھی... جس نے بعد میں یہ پیشہ چھوڑ کر انہیں اور ہمیں دھوکا دیا۔ پیر کے روز کسی عام شاگرد کی طرح اپنے باپ کے ساتھ آتا۔ ہمارا ایک دبلا اور دراز قد ساتھی تھا جسے "جمعرات" کہا جاتا، ہم میں سب سے زیادہ قابل، جو کسی پراسرار بیماری کے بخار سے کم عمری میں فوت ہو گیا۔ نفیس آفندی، خدا اس پر رحم فرمائے، بدھ کے روز جاتا تھا اور اسے "بدھ" کہا جاتا تھا۔ بعد میں ہمارے عظیم استاد نے محبت سے ہمارے با معنی نام رکھ دیے جیسے "منگل" کی جگہ "زیتون"، "جمعہ" کی جگہ "بگلا" اور "اتوار" کی جگہ "تتلی" اور مرحوم کو اس کے طلاکاری کے اعلیٰ کام کی وجہ سے "نفیس" کا نام دیا گیا۔ عظیم استاد نے نفیس آفندی سے کہا ہو گا، "خوش آمدید" بدھ، کیا حال ہے تمہارا آج؟" جیسے وہ ہم سب کا ان دنوں صبح کو خیر مقدم کیا کرتے تھے۔

جب مجھے ان کا خود کو مخاطب کرنے کا انداز یاد آیا تو مجھے لگا میری آنکھوں سے آنسو نکلیں گے۔

استاد عثمان ہماری تعریف کرتے تھے اور ان کی آنکھیں نم ہو جاتیں جب وہ ہمارے کام کی خوبی کی تحسین میں کچھ کہتے، وہ ہمارے ہاتھ اور بازو چومتے تو پرانی پٹائی یاد آنے کے باوجود ہم یوں محسوس کرتے جیسے ہم جنت میں شاگرد تھے اور یوں ان کی محبت کی بدولت ہماری قابلیت بڑھی۔ حتیٰ کہ حسد کا رنگ بھی جب مختلف تھا، جو ان مسرت بھرے برسوں کو گہناتے ہوئے تھا۔

میں اب مکمل طور پر منقسم ہوں، بالکل ان تصویروں کی طرح جن کے سر اور ہاتھ کسی ایک مصور نے بنائے ہوں اور جسم اور لباس دوسرے نے۔ جب میرے جیسا خدا خوف شخص غیر متوقع قاتل بن جائے تو اُسے حالات سے ہم آہنگ ہونے میں وقت تو لگتا ہی ہے۔ میں نے دوسری آواز اختیار کر لی ہے، کسی قاتل کے لیے موزوں تاکہ میں اسی طرح زندگی جاری رکھوں کہ جیسے میری پرانی زندگی جاری تھی۔ میں اب دوسری تمسخر آمیز اور شیطانی آواز میں بات کر رہا ہوں جسے میں اپنی معمول کی زندگی سے دور رکھتا ہوں۔ وقتاً فوقتاً آپ میری معمول کی مانوس آواز بھی ضرور سنیں گے جو اگر میں قاتل نہ بنتا تو میری ایک ہی آواز ہوتی۔ لیکن جب میں کتاب خانے میں دی گئی اپنی عرفیت کے تحت بولتا ہوں تو میں اپنے قاتل ہونے کا کبھی اعتراف نہ کروں گا۔ کوئی ان دو آوازوں کو ایک دوسرے سے وابستہ نہ کرے، میری مخفی ذات کو ظاہر کرنے والا میرا کوئی ذاتی انداز مصوری یا نقائص نہیں۔ بلاشبہ میرے خیال میں انداز یا کہہ لیں کہ ایسی کوئی بھی بات جو کسی فنکار کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہے، دراصل ایک نقص ہے... انفرادی خصوصیت نہیں، جیسا کہ بعض لوگ بڑی نخوت سے کہتے ہیں۔

میں اقرار کرتا ہوں کہ میری صورت حال میں یہ بات ایک مسئلے کو پیش کرتی ہے۔ اگرچہ میں کتاب خانے میں دی گئی عرفیت سے بات کر سکتا ہوں، جو استاد عثمان نے بڑی محبت سے مجھے دی تھی اور جس

سے ایلچی آفندی جنہیں یہ عرف نام پسند تھا، مجھے پکارتے تھے، کسی بھی طرح میں آپ کو یہ معلوم نہ کرنے
دوں گا کہ میں قاتل ہوں، [illegible] یا بکا۔ کیوں کہ اگر آپ جان گئے تو آپ مجھے سلطان کے شاہی محافظ دستے
کے جلادوں کے حوالے کرنے میں ذرا نہیں جھجکیں گے۔

اور مجھے ذرا خیال کرنا ہوگا کہ میں کیا سوچتا اور کہتا ہوں۔ دراصل مجھے معلوم ہے کہ جب میں
اکیلا اپنے معاملوں پر غور کر رہا ہوتا ہوں تو آپ سن رہے ہوتے ہیں۔ میں اپنی مایوسی اور اضطراب یا اپنی
زندگی کی چھوٹی بڑی غلط کاریوں کو بے پرواہی سے سوچنے کا متحمل نہیں۔ یہاں تک کہ "الف"، "ب" اور
"ج" کہانیاں سناتے بھی مجھے آپ کی نگاہوں کا احساس تھا۔

جنگجوؤں، عشاق، داستانوی سورماؤں کا ایک رخ جس کی میں نے ہزاروں مرتبہ تصویر کشی کی،
اس افسانوی وقت میں ــــ مثال کے طور پر وہ جن دشمنوں سے رزم آرا تھے، یا آگ اگلتے اژدھوں کے
سر قلم کرتے یا خوب صورت دوشیزائیں جن کے لیے وہ آنسو بہاتے ہوں۔ لیکن ایک دوسرا پہلو اور ان کے
بدن، چہروں کا ایک اور رخ، کتابوں کے اس شوقین کی طرف ہوگا جو اس عالیشان تصویر کو دیکھ رہا ہوگا۔
اگر میرا کوئی انداز یا خصوصیت ہے [illegible] میرے فنی کام میں نہاں نہیں بلکہ میرے جرم اور باتوں میں بھی
ہوگی اہاں، میرے لفظوں کے رنگوں سے [illegible] کی کوشش کریں۔

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر آپ [illegible] تو اس بدقسمت نفیس آفندی کی بے چاری روح
کو سکون ملے گا۔ جب میں یہاں درختوں کے، [illegible] کے درمیان کھڑا شاخ زریں کے چھجے
پانیوں اور استنبول کے سرمئی گنبدوں کو دیکھ رہا، اور محسوس کر رہا ہوں کہ زندہ ہونا کس قدر اچھا ہے، وہ اس پہ
مٹی ڈال رہے ہیں۔ بے چارہ نفیس آفندی، فصیل نقشوں والے ارض کے ملمع کے حلقے میں شامل ہوتے
ہی وہ مجھے ناپسند کرنے لگا تھا، تاہم پچھلے پچیس برس میں جب ہم نے سلطان کی کتابوں پر مل کر مصوری کی، کئی
بار ہم نے خود کو ایک دوسرے کے قریب محسوس کیا۔ بیس برس قبل موجودہ سلطان کے والد کی منظوم شاہی تاریخ
پر کام کرتے ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ لیکن فضولی کے دیوان کے آٹھ مصور صفحات پر کام
کرتے تو ہم بے حد قریب آگئے تھے۔ تب گرما کی ایک شام، اس کی قابل فہم لیکن غیر منطقی خواہشوں کی
رعایت میں ــــ کسی بھی اچھے فنکار کو اس متن کو اپنی روح کی گہرائی سے محسوس کرنا چاہیے جس پر وہ مصوری کر
رہا ہو ــــ میں یہاں آیا اور تحمل سے اسے فضولی کے دیوان کو پڑھتے سنتا رہا جب ہمارے سر پر شور کرتے
ابابیلوں کے غول محو پرواز تھے۔ مجھے آج بھی اس شام پڑھا ایک مصرع یاد ہے: "میں، میں نہیں بلکہ تا ابد تو
ہوں۔" میں ہمیشہ حیران ہوتا رہا ہوں کہ اس مصرع پر کوئی کیسے مصوری کر سکتا ہے۔

جیسے ہی مجھے اطلاع ملی کہ اس کی لاش مل گئی ہے، میں اسے گھر کی طرف دوڑا۔ وہ چھوٹا سا باغیچہ
جہاں بیٹھ کر ہم نے کبھی شاعری پڑھی تھی، اب برف میں ڈھکا ہوا متروک لگتا تھا، بالکل کسی ایسے باغ کی
طرح جہاں برسوں بعد دوبارہ آیا جائے۔ اس کا گھر بھی ایسا ہی تھا۔ ملحقہ کمرے میں عورتوں کے بین اور

مبالغہ آمیز رونے چلانے کو بڑھتے سن سکتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کے مقابلے پر ہوں۔ جب اس کا سب سے بڑا بھائی بولنے لگا تو میں غور سے سننے لگا: ہمارے لاچار وبے کس بھائی نفیس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا اور اس کا سر کچل دیا گیا تھا۔ جب اسے کنویں سے نکالا گیا جہاں وہ چار روز سے پڑا تھا تو اس کے بھائی اس کی شناخت بمشکل ہی کر پائے اور اس کی بیوی بے چاری قلیبے نے جسے وہ گھر سے بلا لائے تھے، رات کی تاریکی میں اس کی ناقابل شناخت لاش کو پھٹے ہوئے کپڑوں سے پہچانا۔ مجھے یوسف کو اس کنویں سے نکالتے مدائن کے تاجروں کی تصویر کشی یاد آئی، جہاں انھیں ان کے حاسد بھائیوں نے پھینکا تھا۔ مجھے یوسف زلیخا کی داستان میں اس منظر کی تصویر کشی پسند ہے کیوں کہ یہ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ حسد زندگی کا ایک خاص جذبہ ہے۔

اچانک خاموشی چھا گئی۔ میں نے خود پر ان کی نگاہیں محسوس کیں۔ کیا مجھے رونا چاہیے؟ میری نگاہ قرہ سے ملی۔ وہ بدمعاش ہمیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے انشٹے آفندی کی طرف سے اسے یہاں سچائی بے نقاب کرنے کے لیے بھیجا گیا ہو۔

"ایسے بھیانک جرم کا ارتکاب کون کرسکتا ہے؟" سب سے بڑا بھائی چلایا۔ "کس قسم کا سفاک شخص ہمارے بھائی کو یوں ذبح کرسکتا تھا، ہمارا بھائی جو کبھی کسی چیونٹی تک کو نقصان نہ پہنچاتا۔"

اس نے اس سوال کا جواب اپنے آنسوؤں میں ہی دیا اور میں اپنے فریبی رنج وغم سے اس کے ساتھ شامل ہو گیا، جب میں اپنے جواب کی تلاش میں بھی تھا: نفیس کے دشمن کون تھے؟ اگر میں نہ ہوتا تو اسے اور کون قتل کرسکتا تھا؟ مجھے یاد آیا کہ چھے برس پہلے — میرا خیال ہے جب "کتاب حرفت" تیار کی جارہی تھی — وہ بعض فنکاروں سے الجھ پڑتا جو پرانے استادوں کی تخلیق مسترد کر کے ان اوراق کو برباد کرنے کا رجحان رکھتے تھے جن پر ہم مصوروں نے بہت محنت سے کی تھی وہ ناگوار رنگوں سے حاشیوں کو برباد کر دیتے، جو زیادہ تیزی مگر گھٹیا پن سے طلاکاری کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ وہ کون تھے؟ بعد میں یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ دشمنی اس سبب نہیں بلکہ اس خوب صورت جلد ساز شاگرد کے باعث ابھری تھی جو نچلی منزل پر کام کرتا تھا، لیکن یہ پرانا قصہ ہے۔ بعض ایسے لوگ تھے جو نفیس کے وقار، اس کی نفاست اور نسوانی دانش مندانہ برتاؤ پر برہم تھے، لیکن یہ سارا ہی مختلف معاملہ تھا: نفیس پرانے طریقے سے غلامانہ طور پر جڑا ہوا تھا، طلاکاری اور مصوری کے درمیان رنگوں کی ہم آہنگی میں انتہا پر، اور مثال کے طور پر استاد عثمان کے سامنے وہ کسی قدر غرور سے دوسرے منی ایچر فنکاروں کی غیر موجود خامیاں نکالتا تھا... خصوصاً میری... اس کا آخری جھگڑا اس مسئلے سے متعلق تھا جس بارے میں استاد عثمان پچھلے چند برس سے کافی حساس ہو چکے تھے: شاہی منی ایچر فنکار جو چوری چھپے راتوں کو گل کی سرپرستی سے باہر چھوٹے چھوٹے کام کر کے آمدن حاصل کرتے تھے۔ حالیہ برسوں میں جب ہمارے سلطان کی دلچسپی اور اس کے ساتھ سربراہ خزانچی کی طرف سے آنے والی رقم کم ہو گئی تھی، تمام منی ایچر فنکار بھاری بھرکم نوجوان پاشاؤں کے دو منزلہ گھروں کے چکر لگانے لگے تھے اور بہترین فنکار رات دیر گئے انشٹے کے گھر جاتے۔

مجھے اندیشے کے ایلچی، ہماری کتاب پر کام بند کرنے کے فیصلے یا اس ڈر سے کہ یہ دشمنوں جیسی کوئی پریشانی نہ تھی۔ انہیں یقیناً اندازہ تھا کہ اس قاتل نے احمق نفیس آفندی کو قتل کیا وہ ہم میں سے ہی تھا جو ان کی کتاب کی تزئین کاری کر رہے تھے۔ خود کو ان کی جگہ رکھیں: کیا آپ کسی قاتل کو جو پندرہ روز بعد رات کی تاریکی چھپنے کے بعد اپنے گھر مصوری کے لیے بلائیں گے؟ کیا آپ پہلے قاتل اور سب سے اہم اپنی مصوری کی ضمانت نہیں کریں گے؟ مجھے ذرہ برابر شک نہیں کہ وہ اندازہ کریں گے کہ رنگوں کے انتخاب، طلاکاری، صفحوں پر حاشیے بنانے، چہروں کی مصوری اور صفحوں کی ترتیب میں کون مثلی ایچر فنکار سب سے قابل اور ہنرمند ہے، اور اس کے بعد وہ صرف میرے ساتھ کام کریں گے۔ میں یہ تصور تک نہیں کرتا کہ وہ اس قدر حقیر سوچ رکھتے ہوں کہ میرے متعلق سوچیں کہ میں کسی حقیقی قاتل اور ایچر فنکاری کی بجائے کوئی عام سا قاتل ہوں۔

انکھیوں سے میں اس احمق قرہ آفندی کو دیکھ رہا ہوں جسے انشٹے اپنے ساتھ لائے تھے۔ منتظر ہوئے ہجوم کے ساتھ جب یہ دونوں قبرستان سے نکلے اور ایوب گھاٹ کی طرف چل دیے تو میں نے ان کا پیچھا کیا۔ وہ چپوؤں والی لمبی کشتی میں سوار ہوئے اور اس کے بعد میں چند نو عمر شاگردوں کے ساتھ جو بیچارے اور مرحوم کو بھول چکے تھے اور خوش گپیوں میں مشغول تھے، چپوؤں والی دوسری کشتی میں سوار ہو گیا۔ ایک وقت دونوں کشتیاں اتنی نزدیک آ گئیں کہ یوں لگا جیسے وہ ایک دوسرے میں چپکنے کو ہوں اور میں صاف دیکھ سکتا تھا کہ قرہ، انشٹے کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔ میں نے جب سوچا کہ زندگی کا خاتمہ کتنا آسان ہے۔ میرے پیارے خدا! آپ نے ہم میں سے ہر کسی کو یہ قاتل طاقت دی ہے لیکن آپ نے اس کے استعمال سے ہمیں خوف زدہ بھی کر رکھا ہے۔

پھر بھی اگر کوئی شخص اس خوف پر قابو پا لے اور قتل کرے تو وہ بالکل مختلف شخص بن جاتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ میں نہ صرف شیطان سے بلکہ اپنے اندر بدی کے ذرا سے شائبے سے بھی خوف زدہ تھا۔ تاہم اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ بدی کو گوارا کیا جا سکتا ہے اور مزید یہ کہ کسی فنکار کے لیے بدی لازم ہے۔ جب میں اس کم بخت آدمی کو قتل کر چکا تو میرے ہاتھوں کی لرزش کو نظر انداز کیا جائے جو چند دن ہی رہی، تو میں بہتر ہو گیا۔ میں شوخ اور تیز رنگ استعمال کرنے لگا اور سب سے اہم، مجھے معلوم ہوا کہ میں اپنے تخیل میں حیرت انگیز شعبدے دکھا سکتا تھا۔ لیکن یہ بات سوال اتفاقی ہے کہ استنبول میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو میری اعلیٰ مثلی ایچر فنکاری کی واقعی تحسین کر سکتے ہیں؟

شاخ زریں کے عین درمیان، جہاں کے نزدیک راس سے آگے، میں نے کیدِ توزی سے استنبول پر نگاہ کی۔ بادلوں سے اچانک نکلتی دھوپ میں برف پوش گنبد چمکنے لگے۔ شہر جتنا بڑا اور رنگوں بھرا ہو، اپنا جرم اور گناہ چھپانے کی اتنی ہی زیادہ جگہیں مل جائیں گی، جتنا ہجوم ہو گا، اس کے پیچھے چھپنے والے لوگ بھی زیادہ ہوں گے۔ کسی شہر کی عقل و دانش کو اس کے علما، کتب خانوں، مثلی ایچر فنکاروں، خطاطوں اور مدرسوں سے نہیں بلکہ ہزاروں برس میں تاریک گلیوں میں ہونے والے در پردہ جرائم کی تعداد سے ماپا جانا

itsurdu.blogspot.com

چاہیے۔ بلاشبہ اس منطق سے استنبول، دنیا کا سب سے زیادہ عقل و دانش سے بھرپور شہر ہے۔

اُنکاپانی (Unkapani) گھاٹ پر میں قرہ اور انشتے کے ان کی کشتی سے اترنے کے ذرا دیر بعد اپنی کشتی سے اترا۔ جب وہ ایک دوسرے کو سہارا دیئے پہاڑی پر چڑھ رہے تھے تو میں ان کے عقب میں تھا۔ سلطان محمت مسجد کے قریب حال ہی میں ہونے والی آتش زدگی کی جگہ وہ رکے اور ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ انشتے آفندی اکیلے تھے اور لمحے بھر کو وہ ایک بے بس سے بوڑھے لگے۔ میرا جی چاہا کہ بھاگ کر جاؤں اور انہیں بتاؤں کہ جس وحشی کے جنازے میں شرکت کر کے ہم آ رہے تھے، اس نے مجھے کس طرح شریکِ راز کیا تھا۔ میں یہ اعتراف کرنے کو تھا کہ میں نے یہ سب ہمیں بچانے کے لیے کیا تھا اور یہ پوچھنے والا تھا کہ "کیا وہ دعویٰ سچ ہے جو نفیس آفندی نے کیا تھا؟ کیا ہم ان تصویروں کے ذریعے اپنے سلطان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا رہے ہیں، جو ہم نے بنائی ہیں؟ کیا ہماری مصوری تکنیک ہمارے مذہب سے سرکشی اور اس کی توہین ہے؟"

اترتی شام میں، میں برف آلود گلی کے بیچ کھڑا اس تاریک راستے کو دیکھ رہا تھا جسے میرے ہمراہ جنوں، پریوں، ڈاکوؤں، چوروں، گھروں کو لوٹتے باپ بچوں اور برف سے ڈھکے درختوں کے دکھ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ گلی کے آخر میں، انشتے آفندی کے دو منزلہ پُرشکوہ گھر کی چھت تلے، جسے میں اب اخروٹ کے درختوں کی تنومند شاخوں کے پیچھے سے دیکھ سکتا ہوں، وہاں دنیا کی حسین ترین عورت رہتی ہے۔ لیکن نہیں، مجھے خود کو دیوانہ کیوں بنانا چاہیے؟

میں، طلائی سکہ

نورے سیٹی امیں بائیس قیراط سونے کا عثمانی سلطانی سکہ ہوں اور مجھ پر عالم پناہ ہمارے عالی مرتبت سلطان کی مہر ہے۔ نصف شب کو اس عمدہ کافی خانے میں چھائی جنازے کی رنج و اداسی میں، ہمارے سلطان کے عظیم فنکاروں میں سے ایک، بگلے نے ابھی میری تصویر مکمل کی ہے، اگرچہ وہ ابھی تک مجھے طلاکاری سے سجا نہیں سکا۔ یہ میں آپ کے تخیل پر چھوڑتا ہوں۔ میری تصویر آپ کے سامنے ہے، تاہم میں آپ کے پیارے بھائی بگلے، اس منی ایچر فنکار کی جیب میں پایا جا سکتا ہوں۔ وہ اب کھڑا ہو رہا ہے، مجھے اپنے بٹوے میں سے نکال اور آپ سب کو دکھا رہا ہے۔ آداب، تمام فنکاروں اور معزز مہمانوں کو میرا سلام۔ میری چمک دیکھتے ہوئے آپ کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور میں جب تیل کے لیمپ کی روشنی میں جھلملاتا ہوں تو آپ کو خوشی ملتی ہے اور آخرکار آپ میرے مالک، استاد بگلے سے رشک کرنے لگتے ہیں۔ آپ کو ایسا کرنے کا کامل حق ہے کیوں کہ کسی بھی مصور کی قابلیت کو جانچنے کا مجھ سے بہتر کوئی پیمانہ نہیں۔

پچھلے تین مہینے میں استاد بگلا مجھ جیسے 47 طلائی سکے کما چکا ہے۔ ہم سب اس کے بٹوے میں موجود ہیں اور آپ خود دیکھ لیں کہ استاد بگلا ہمیں کسی سے نہیں چھپا رہا، وہ جانتا ہے کہ وہ استنبول کے منی ایچر فنکاروں میں سب سے زیادہ کماتا ہے۔ مجھے فنکاروں میں قابلیت کا پیمانہ اور غیر ضروری اختلافات کو ختم کرنے کا سبب سمجھے جانے پر فخر ہے۔ ماضی میں، ہمارے کافی کا عادی بننے اور دماغ تیز ہونے سے پہلے، یہ احمق منی ایچر فنکار اپنا وقت اس بحث میں صرف کرنے پر مطمئن تھے کہ سب سے زیادہ باکمال فنکار کون تھا یا رنگوں کی سب سے زیادہ سمجھ بوجھ کسے تھی یا کون بہترین درخت بنا سکتا تھا یا بادل بنانے میں سب سے زیادہ مہارت کسے حاصل تھی اور اس دوران نوبت ہاتھا پائی اور ایک دوسرے کے دانت توڑنے تک پہنچ جاتی۔ اب جب کہ میرا فیصلہ ہی سب کچھ طے کرتا ہے، کتاب خانے میں ایک خوش گوار فضا ہے اور مزید یہ کہ ایسی فضا جو ہرات کے پرانے فنکاروں کو میسر ہوتی۔

میرے فیصلے پر طاری ہونے والے خوش گوار ماحول اور ہم آہنگی کے علاوہ، مجھے چند مختلف باتوں کے بارے میں بتانے دیں جنہیں میرے عوض لیا جا سکتا ہے: خوب صورت اور نوعمر کنیز کا ایک پیر جو

اس کے وجود کا پچاسواں حصہ ہو گا، استخوانی حاشیے والا اخروٹ کی لکڑی کے دستے والا حجام کا ایک اچھا سا آئینہ، ہوئے لقرئی سکوں کی مالیت کے چاندی کے ورق سے بنی خوب صورتی سے رنگ شدہ آفتابی نمونوں والی الماری، 120 تازہ روٹیاں، تین لوگوں کے لیے قبر کی زمین اور تابوت، چاندی کا بازو بند، کسی گھوڑے کا دسواں حصہ، کسی بوڑھی فربہ کنیز کی ٹانگیں، بیل کا ایک بچھڑا، دو اعلیٰ چینی برتن، ایرانی مصور ایچر وفنکار محمد درویش تبریزی اور ہمارے سلطان کے کتاب خانے میں کام کرنے والے ایسے دیگر فنکاروں کا ماہانہ معاوضہ، ایک اچھا شکاری باز پنجرے کے ساتھ، مئے سرخ کے دس جگ، اپنے حسن کے باعث دنیا بھر میں مشہور نوعمر لڑکوں میں سے ایک محمود کے ساتھ ایک بہشتی پہر، اور بہت سے اور لاتعداد مواقع۔

میرے یہاں آنے سے پہلے میں نے دس روز ایک غریب موچی شاگرد کی میلی جراب میں گزارے۔ ہر شب وہ بدنصیب آدمی ان لاتعداد چیزوں کو گنتے نیند میں گم ہو جاتا جو وہ میرے عوض خرید سکتا تھا۔ کسی لوری کی طرح میٹھی اس رزمیہ نظم کے مصرعوں نے مجھ پر ثابت کیا کہ روئے زمین پر ایسی کوئی جگہ نہ تھی جہاں کوئی سکہ نہ جا سکتا۔

یہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ اگر وہ سب بیان کرنے بیٹھوں جو یہاں آنے سے قبل مجھ پر بیتی، تو اس سے کئی کتابیں بھر جائیں۔ ہمارے درمیان کوئی نہیں، ہم سب دوست ہیں، جب تک کہ آپ وعدہ کریں کہ کسی کو نہ بتائیں گے اور جب تک کہ یگا آفندی نہیں ہوتا تو میں آپ کو ایک راز بتاؤں گا۔ آپ قسم کھاتے ہیں کہ کسی کو نہیں بتائیں گے؟

ٹھیک ہے پھر، میں اعتراف کرتا ہوں۔ میں بائیس قیراط سونے کا اصلی عثمانی سلطانی سکہ نہیں ہوں جسے چمبرلی تاش (Çemberlitaş) ٹکسال میں ڈھالا گیا۔ میں کھوٹا سکہ ہوں۔ انہوں نے مجھے وینس میں ملاوٹ زدہ سونے سے ڈھالا اور بائیس قیراط عثمانی سونے کے سکے کے طور پر یہاں لے آئے۔ میں مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے سمجھا اور مجھ سے ہمدردی کی۔

وینس کے ٹکسال میں میں جو معلوم کر سکا اس کی بنیاد پر، یہ دھندا برسوں سے جاری ہے۔ یہاں تک کہ حال ہی میں وینس کافروں نے جو ملاوٹ زدہ سکے مشرق لا کر خرچ کیے، وہی ڈوکٹ (وینسی سکے) تھے جو وینس کی ٹکسال میں ڈھالے گئے تھے۔ ہم عثمانی جو ہمیشہ تحریر کا احترام کرتے ہیں، ہم نے اس میں سونے کی مقدار پر توجہ نہ دی اور استنبول میں وینس کے کھوٹے سکوں کی ریل پیل ہو گئی۔ بعد میں یہ جان کر کہ کم سونے اور زیادہ تانبے والے سکے سخت تھے، ہم نے انہیں دانتوں سے کاٹ کر پہچاننا شروع کیا۔ مثال کے طور پر، تم چاہت کی آگ میں جل رہے ہیں ہو تو تم محمت نامی اس نوجوان کی طرف بھاگتے ہو جس کا حسن بے مثال ہے، جو سب کا محبوب ہے، وہ پہلے سکے کو دانت تلے دبا کر دیکھتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ وہ کھوٹا ہے۔ کسی اور چیز کو نہیں۔ نتیجے میں وہ تمہیں ایک گھنٹے کی بجائے صرف آدھ گھنٹہ جنت کی سیر کروائے گا۔ وینسی کافروں نے یہ جان کر کہ ان کے کھوٹے سکے خسارے کا سبب بن رہے ہیں، فیصلہ کیا کہ عثمانی سکوں

کی نقل بنا کر عثمانیوں کو دوبارہ بے وقوف بنایا جائے۔

اب، مجھے ایک انوکھی بات کی طرف توجہ دلانے دیں: جب یہ وینس کا فرمصوری کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ وہ مصوری نہیں کر رہے بلکہ درحقیقت تخلیق کر رہے ہیں۔ لیکن جب بات دولت کی ہو تو وہ اصل کی بجائے جعلی سکے بناتے ہیں۔

ہمیں آہنی صندوقوں میں بھرا، بحری جہازوں پر لادا اور ہچکولے کھاتے وینس سے استنبول پہنچایا گیا۔ میں نے خود کو ایک صراف کی دکان میں اس کے مالک کے بدبودار منہ میں پایا۔ میں نے کچھ انتظار کیا اور پھر ایک سادہ سا کسان سونے کے تبادلے کی امید لیے دکان میں داخل ہوا۔ صراف نے جو اصلی دنیادار تھا، اعلان کیا کہ وہ سونے کا کھوٹ دیکھنے کے لیے اسے دانتوں سے کاٹے گا۔ سو اس نے کسان کا سکہ لے کر منہ میں ڈال لیا۔

جب ہم منہ میں ملے تو مجھے معلوم ہوا کہ کسان کا سکہ اصلی عثمانی سلطانی سکہ تھا۔ اس نے مجھے اس بدبو میں گھور کے دیکھا اور کہا، "تم جعلی بھنڈ کے سوا کچھ نہیں۔" وہ ٹھیک کہتا تھا لیکن اس مغرورروئیے نے میری انا مجروح کی اور میں نے اس سے جھوٹ بولا: "دراصل میرے بھائی، وہ تم ہو جو کھوٹا ہے۔"

اس دوران کسان فخریہ اصرار کر رہا تھا: "اس سونے کا سکہ کیسے کھوٹا ہو سکتا ہے؟ میں نے اسے بیس برس پہلے زمین میں دفن کیا تھا، کیا تب ملاوٹ کی لعنت تھی؟"

میں سوچ رہا تھا کہ کیا نتیجہ ہوگا کہ صراف نے کسان کے سکے کی بجائے مجھے منہ سے نکالا۔ "اپنا سونے کا سکہ لے جاؤ، مجھے وینس کا فروں کا کھوٹا سکہ نہیں چاہیے۔" "اس نے کہا" "تمہیں ذرا شرم نہیں آتی؟" کسان نے تلخ لفظوں کا تبادلہ کیا، پھر مجھے لے کر باہر نکل گیا۔ دوسرے صرافوں سے یہی بات سن کر وہ مایوس ہو گیا اور مجھے کھوٹے سکے کے طور پر نوے نقرئی سکوں کے بدلے بیچ دیا۔ یوں ہاتھ بدلنے کا میرا سات برس پر محیط سفر شروع ہوا۔

مجھے اجازت دیں اس فخریہ اعتراف کی کہ میں نے استنبول میں اپنا بیشتر وقت ایک سے دوسرے بٹوے اور ایک سے دوسری جیب میں جاتے گزارا جیسا کسی ذہین سکے کو موزوں تھا۔ میرا بدترین خواب برسوں کسی جگہ میں پتھروں تلے دبے رہنا، کسی باغیچے میں دفن ہونا ہے، ایسا نہیں ہے کہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا لیکن یہ دورانیے کبھی زیادہ عرصے نہیں رہے۔ مجھے رکھنے والے بیشتر لوگ جلد از جلد مجھ سے چھٹکارا چاہتے ہیں خصوصاً جب انہیں معلوم ہو جائے کہ میں کھوٹا ہوں۔ اس کے باوجود، میرا کسی ایسے شخص سے واسطہ نہیں پڑا جو شرم نہ کرنے والے کسی خریدار کو خود بتا دے کہ میں کھوٹا ہوں۔ خریدار جس نے یہ پہچانے بغیر کہ میں جعلی ہوں، میرے بدلے چاندی کے ایک سو تیس سکے ادا کیے ہیں، جیسے ہی اسے معلوم ہوگا کہ اس سے دھوکا ہوا ہے تو وہ غم و غصے اور بے صبری کے دورے میں خود کو لعنت ملامت کرے گا اور اس کے یہ دورے تب تک ختم نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ وہ کسی اور کو دغا دے کر مجھ سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ اس بحران میں،

جب وہ دوسروں کو دغا دینے کی بار بار کوشش کرتا اور ہر بار جلد بازی اور غصے کی وجہ سے ناکام ہوتا ہے تو وہ اس غم و غصے میں اس "بد اخلاق" شخص پر لعنت بھیجتا رہے گا جس نے اس سے پہلے دغا کیا تھا۔

استنبول میں گزشتہ سات برسوں میں میں نے 560 ہاتھ بدلے ہیں اور کوئی ایسا گھر، دکان، بازار، مسجد، گرجا یا سناگوگ نہیں جہاں میں نہ گیا ہوں۔ جب میں ادھر اُدھر گھوم رہا تھا تو مجھے خبر ہوئی کہ کافی گپ شپ جاری ہے، بہت سی کہانیاں اڑی ہیں اور میرے نام سے میرے سچ سے بھی بڑھ کر کئی جھوٹ منسوب کیے گئے ہیں۔ میں اس میں اپنی ناک گھسیڑ رہا ہوں: میرے سوا اب کوئی زیادہ قیمتی نہیں سمجھا جاتا، میں بے رحم ہوں، اندھا ہوں، میں بھی دولت کا گرویدہ ہوں، بدبخت دنیا خدا نہیں بلکہ میرے گرد منڈلاتی ہے اور ایسا کچھ نہیں جسے میں نہ خرید سکوں — اور میری گندی، بیہودہ اور گھٹیا فطرت کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ اور جو جانتے ہیں کہ میں ملاوٹ زدہ ہوں، زیادہ سخت رائے دیتے ہیں۔ جب میری اصل قدر کم ہوتی ہے، علامتی قدر بڑھ جاتی ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ شاعری زندگی کی بدنصیبی کے لیے گویا دلاسا ہے۔ لیکن اس سارے بے رحم مواد نے احمقانہ افسانوں کے باوجود میں نے جانا کہ ایک بڑی اکثریت مجھے پسند کرتی ہے۔ اس نفرت کی زمانے میں ہماری محبت کو ہم سب کو مسرور کرنا چاہیے۔

میں استنبول کا چپہ چپہ دیکھا ہے، گلی گلی اور محلہ محلہ۔ میں نے یہودیوں سے ابخازی اور عربوں سے چینی سارے ہاتھ دیکھ رکھے ہیں۔ استنبول میں ہمیشہ میرا اچھا خیر مقدم کیا گیا۔ نوجوان لڑکیاں مجھے یوں چومتی ہیں جیسے میں ان کے خوابوں کا شہزادہ ہوں، وہ مجھے تکیوں کے نیچے، اپنے سینے میں، اور جانے کہاں کہاں چھپاتی ہیں اور یہ یقین کرنے کو کہ میں وہیں موجود ہوں مجھے ٹٹول کر دیکھتی بھی ہیں۔ مجھے عوامی حمام کی بھٹی کے قریب، حجرے میں، منکے فروش کی دکان میں چھوٹی سی بوتل میں اور باورچی کے والوں کے تھیلے میں بنی خفیہ جیب میں رکھا گیا ہے۔ میں اونٹ کے چمڑے سے بنی بیلٹوں میں، کوٹوں کے اندر مصری خانے دار کپڑے کے استر میں، جوتوں میں اور رنگ برنگی شلواروں کے خفیہ خانوں میں استنبول میں گھوما۔ استاد گھڑی ساز پیئر و نے مجھے دادا کے گھڑیال کے خفیہ خانے میں چھپایا اور ایک یونانی پنساری نے مجھے کاشاری پنیر میں دبا دیا۔ مجھے دبیز کپڑے میں زیورات اور ہیروں اور چابیوں کے ساتھ چھپا کر چمنیوں، تندوروں، کھڑکیوں کی سلوں تلے، بھوسے سے بھرے تھیلوں، تہ خانوں اور صندوقوں کے خفیہ خانوں رکھا گیا۔ میں کئی ایسے باپوں سے واقف ہوں جو کھانے کی میز سے اچانک اٹھ کر مجھے دیکھنے گئے کہ میں وہیں موجود ہوں جہاں مجھے ہونا چاہیے یا نہیں، میں ایسی عورتوں کو جانتا ہوں جو مجھے کسی میٹھی گولی کی طرح بلاسبب چوستی ہیں، ایسے بچوں سے واقف ہوں جو مجھے ناک کے قریب لا کر سونگھتے ہیں اور قبر میں پاؤں لٹکائے ایسے بوڑھوں سے جنہیں تب تک چین نہیں آتا جب تک وہ مجھے دن میں سات بار اپنے اونی بٹوے سے نکال کر دیکھ نہ لیں۔ ایک سرکیشیائی عورت تھی جو سارا دن گھر کی صفائی کے بعد ہمیں اپنے بٹوے سے نکال کر کھردرے برش کے ساتھ رگڑ کر دھوتی تھی۔ مجھے وہ کانا صراف یاد ہے جو جباروں کی شکل میں

ہمارے ڈھیر لگاتا، دربان جسے نیلوفر کی خوشبو آتی تھی اور جو اپنے گھر والوں کے ساتھ ہمیں یوں دیکھتا جیسے کسی بھوت کرنے والے منظر کو دیکھ رہا ہو، اور وہ طلا کار جو اب ہم میں نہیں ...... نام لینے کی ضرورت نہیں ...... وہ ہمیں مختلف طرح سے سجاتے اپنی شامیں گزارتا تھا۔ میں نے مہاگنی کی ناؤ میں سفر کیا، میں سلطان کے محل کی سیر کر چکا ہوں، مجھے ہرات کی بنی کتابوں کے ساتھ چھپایا گیا، گلاب کی خوشبو دیتے جوتوں کی ایڑیوں میں اور زنبیل میں۔ میں نے سینکڑوں ہاتھ دیکھے ہیں: گندے، بالوں بھرے، نرم اور فربہ، چکنے، کپکپاتے اور بوڑھے۔ میں افیون کے اڈوں، شمع سازوں کی دکانوں میں، خشک مچھلی اور پورے استنبول کے پسینے سے معطر رہا ہوں۔ اتنے جوش و خروش اور شور و غل کے تجربے کے بعد ایک گھٹیا چور جس نے رات کی تاریکی میں اپنے شکار کو ذبح کر دیا اور مجھے اپنے بٹوے میں ڈال لیا تھا، اپنے ملعون گھر واپس آنے کے بعد اس نے مجھ پر تھوکا اور بولا، "لعنت ہو تجھ پر، یہ صرف تیری وجہ سے ہوا۔" میں اس قدر برہم ہوا، اتنی تکلیف ہوئی مجھے کہ میں بس غائب ہو جانا چاہتا تھا۔

تاہم، اگر میرا وجود نہ ہوتا تو کوئی بھی اچھے اور برے فنکار میں فرق نہ کر سکتا تھا اور اس سے منی ایچر فنکاروں میں جھگڑا چھوٹ پڑتا، وہ سب ایک دوسرے کے درپے ہو جاتے۔ سو میں غائب نہیں ہوا ہوں۔ میں قابل اور ذہین ترین منی ایچر فنکار کے بٹوے میں داخل ہوا اور یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ مجھ سے بہتر ہیں تو پھر کسی بھی طرح میرا قبضہ حاصل کریں۔

میرا نام ہے قرمزی

مجھے خیال آیا کہ کیا شکورے کے بابا کو ان خطوط کا علم ہے کہ جو ہم نے ایک دوسرے کو لکھے، اگر میں اس کے لہجے پر غور کرتا جو کسی شرمیلی کنواری دوشیزہ کا تھا جسے اپنے باپ کا ڈر ہو، تو میں یہ خیال کر سکتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان میرے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا گیا تھا۔ تاہم مجھے محسوس ہوا کہ معاملہ یہ نہ تھا۔ ایستھر کی نگاہوں کی عیاری، کھڑکی میں شکورے کا مسحور کن جلوہ، وہ فیصلہ کن انداز جس سے انشتے نے مجھے مصوروں کے پاس بھیجا اور ان کی مایوس کن اضطراب جب انہوں نے مجھے آج صبح آنے کا حکم دیا — ان سب نے مجھے بے چین کر دیا۔

صبح ہوتے ہی میں انشتے کے پاس پہنچا، وہ ان تصویروں کے بارے میں بتانے لگے جو انہوں نے وینس میں دیکھی تھیں۔ ہمارے سلطان عالم پناہ کے سفیر کے طور پر انہوں نے کئی محلات، چرچ اور دولت خانوں کی سیر کی تھی۔ چند دنوں میں ہی انہوں نے ہزاروں تصویریں دیکھیں۔ انہوں نے کینوس پر بنے یا لکڑی پر یا دیوار گیر میورل، ہزاروں چہرے دیکھے۔ "ہر ایک، دوسرے سے مختلف تھا۔ وہ سب جدا، ایک دوسرے سے ممتاز انسانی چہرے تھے۔" انہوں نے بتایا۔ وہ ان کی رنگارنگی، ان کے رنگ، ان پر پڑتی روشنی کی نفاست حتیٰ کہ شدت اور ان کی آنکھوں سے ملتے معنی و تاثر سے مبہوت تھے۔

"یوں جیسے جان لیوا طاعون کی وبا کی طرح، ہر کوئی اپنی شبیہ بنوا رہا تھا۔" انہوں نے کہا، "پورے وینس میں امرا اور بااثر لوگ اپنی زندگیوں کی یادگار علامت اور اپنی امارت، طاقت و اختیار کی نشانی کے طور پر اپنی تصویریں بنوا رہے تھے تاکہ وہ ہمیشہ وہاں موجود رہیں، ہمارے سامنے ایستادہ، اپنے وجود نہیں بلکہ اپنی انفرادیت اور امتیاز کے اعلان کے طور پر۔"

ان کے الفاظ حقارت آمیز تھے جیسے وہ حسد، عزم یا حرص کے تحت بول رہے ہوں۔ اگرچہ ان تصویروں کی بات کرتے ہوئے جو انہوں نے وینس میں دیکھی تھیں، ان کا چہرہ اچانک کسی بچے کی طرح چمک اٹھتا۔

بارسوخ لوگوں، شہزادوں اور اعلیٰ خاندانوں جو فن کے سرپرست تھے، ان میں شبیہ بنوانا

چھوت کی ایسی بیماری کی طرح پھیل چکا تھا کہ جب بھی وہ چرچ کی دیواروں پر بائبل کے مناظر اور مذہبی اساطیر کی مصوری چاہتے تو ان کفار کا اصرار ہوتا کہ خود ان کی صورت بھی کہیں کسی گوشے میں نظر آئے۔ مثال کے طور پر سینٹ سٹیفن کی تدفین کی تصویر میں، قبر کے پاس نم آنکھوں والے سوگواروں میں وہ شہزادہ بھی جوش و خروش اور منفرد انداز میں نظر آئے گا جو آپ کا میزبان تھا، اور جس کے محل کی دیوار پر وہ تصویر آویزاں تھی۔ اس سے آگے ایک گوشے میں فریسکو میں جس میں سینٹ پیٹر کسی مریض کو اپنے سائے سے شفا دیتے نظر آئیں گے، آپ کو ایک عجیب خود فریبی کے احساس سے ادراک ہوگا کہ تکلیف سے تڑپتا بدقسمت شخص دراصل آپ کے مہربان میزبان کا بیٹا کتنا بھائی تھا۔ اگلے روز، روزِ حشر مردوں کو زندہ کیے جانے کی عکاسی میں آپ کو وہ مہمان دکھائی دے جائے گا جو پچھلے روز آپ کے ہمراہ دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا۔

"کچھ تو تصویر کا حصہ بننے کی خاطر بہت آگے نکل گئے۔" میرے انشتے نے یوں خائف لہجے میں کہا جیسے وہ شیطان کے بہکاووں کی بات کر رہے ہوں، "وہ ایک مجمع میں جام بھرتے خادم تک بننے پر آمادہ تھے یا انبیا کو سنگسار کرتے بے رحم آدمی یا قاتل جس کے ہاتھ خون سے رنگے ہیں۔"

"کچھ نہ سمجھنے کا دکھاوا کرتے میں نے کہا،" بالکل جس طرح ہم ان قدیم ایرانی تزئین شدہ کتابوں میں شاہ اسماعیل کو تخت پر متمکن ہوتے دیکھتے ہیں، جن میں فارسی داستانوں کی تصویر کشی ہے، یا جس طرح خسرو وشیریں کی کہانی میں ہم امیر تیموری کی تصویر دیکھتے ہیں جس نے درحقیقت بہت بعد میں حکومت قائم کی۔"

کیا شور گھر کے اندر ہو رہا تھا؟

"یوں ہے جیسے کہ وحشی تصویریں ہمیں مرعوب کرنے کو بنائی گئی ہیں۔" میرے انشتے نے کچھ توقف کے بعد کہا، "اور یہ کافی نہیں کہ ہم ان تصویریں بنانے والوں کی طاقت اور دولت سے مرعوب ہوں، وہ ہم سے یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہم یہ جان لیں کہ اس دنیا میں صرف زندہ رہنا ہی بہت خاص اور پر اسرار ہے۔ وہ اپنے منفرد چہروں، آنکھوں، انداز اور لباس جس کی ہر تہ کو سائے سے واضح کیا گیا ہے، سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اسراری مخلوق بن کر ہمیں خائف کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

انھوں نے بیان کیا کہ وہ کس طرح ایک جنونی شوقین کی عالی شان گیلری میں گم ہو گئے جس کی جاگیر کومو جھیل کے ساحل پر واقع تھی، اس نے بادشاہوں سے پادریوں اور سپاہیوں سے شاعروں تک فرنگیوں کی تاریخ کی تمام اہم شخصیات کی تصویریں جمع کر رکھی تھیں۔ "جب میرے مہمان نواز میزبان نے مجھے اپنی گیلری کی سیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا، جس کی خواہش میں نے اس کے محل کی سیر کے دوران کی تھی تو میں نے جانا کہ ان تمام معروف اہم کفار جن میں سے بیشتر دیکھنے میں حقیقی لگتے تھے اور میری آنکھوں میں تکے جا رہے تھے، انھوں نے اس دنیا میں صرف اپنی شبیہ بنوا کر اہم مقام حاصل کیا تھا۔ ان کی مشابہت نے انھیں ایک جادوئی رنگ دے دیا تھا، انھیں اتنا ممتاز رکھا کہ لمحے بھر کو ان تصویروں کے درمیان میں میں نے

خود کو پر عیب اور ناتواں پایا۔ اگر میری تصویر اس طور بنائی گئی ہوتی، یوں لگتا ہے جیسے میں بہتر طور پر سمجھ پاتا کہ میں اس دنیا میں کیوں موجود ہوں۔"

وہ خوف زدہ تھے کیوں کہ انہیں اچانک یہ ادراک ہوا، یا شاید خواہش ہوئی کہ اسلامی فنکاری جس کا آغاز اور تکمیل ہرات کے پرانے استادوں نے کی، اب شاید شبیہ بنانے کی خواہش کے سبب اپنے انجام کو پہنچ جائے۔ "تاہم، یوں تھا جیسے کہ میں بھی غیر معمولی، مختلف اور منفرد بننا چاہتا تھا۔" انہوں نے کہا۔ جیسے شیطان کے بہکاوے میں، انہوں نے خود کو اس کی طرف کھنچتے محسوس کیا جس سے وہ خائف تھے۔ "میں یہ کیسے کہوں؟ یہ ایسے ہے کہ جیسے یہ نفس کا گناہ، جیسے خدا کے سامنے تکبر کرنا، جیسے خود کو بہت اہم سمجھنا، خود کو دنیا کا مرکز و محور ماننا۔"

اس کے بعد ان پر یہ خیال وارد ہوا: یہ طریقے جو فرنگی فنکار استعمال کرتے ہیں جیسے مغرور بچوں کا کھیل، ہمارے سلطان کے لیے صرف جادو سے بڑھ کر ہو سکتے ہیں لیکن درحقیقت اگر اس کے فنکاروں کو درست راہ پر لے آیا جائے تو ہمارے مذہب کی خدمت کا ایک طاقت ور ذریعہ بن سکتے ہیں۔

مجھے معلوم ہوا کہ تزئین شدہ کتاب کی تیاری کا خیال تب آیا: میرے انشتے جو وینس سے استنبول سے واپس آئے تھے، انہوں نے مشورہ دیا کہ اچھا ہوگا اگر ہمارے سلطان فرنگی طرز پر اپنی شبیہ بنوائیں۔ جب سلطان نے اس تجویز کو مسترد کر دیا تو اس کتاب کی تیاری پر اتفاق ہوا جس میں ہمارے سلطان اور ان کی ترجمان اشیا کی عکاسی ہو۔

"یہ کہانی ہے جو ناگزیر ہے۔" ہمارے عاقل ترین اور عالیشان سلطان نے کہا، "خوب صورت مصوری کہانی کو نفاست سے مکمل کرتی ہے۔ ایسی مصوری جو کہانی کی تکمیل نہ کر سکے، آخر ایک جھوٹا صنم بن جائے گی۔ چوں کہ ہم اس غیر حاضر کہانی کا یقین نہیں کر سکتے، ہم قدرتی طور پر تو تصویر کا یقین کرنے لگیں گے۔ یہ اس بت پرستی سے مختلف ہوگا جو خانہ کعبہ میں ہوتی تھی، یہاں تک کہ ہمارے نبی ﷺ نے بتوں کو پاش پاش کر ڈالا۔ اگر کہانی کا حصہ نہیں تو پھر مثال کے طور پر، ہم وہاں کھڑے اس بونے کے لیے سرخ کارنیشن کی عکاسی کیسے کریں گے؟"

"کارنیشن کا حسن اور انفرادیت دکھا کر۔"

"پھر منظر کی ترتیب میں، کیا تم پھول کو صفحے کے عین درمیان رکھو گے؟"

"میں خائف تھا۔" میرے انشتے نے کہا، "لمحے بھر کو میں گھبرا گیا جب مجھے ادراک ہوا کہ سلطان کے خیالات مجھے کس سمت لے جا رہے تھے۔"

میرے انشتے کو جس چیز نے خائف کیا، وہ صفحے کے عین درمیان پھول رکھنے کا نظریہ تھا... اور یوں دنیا کے مرکز میں ایسے جو خدا کی رضا نہ تھی۔

"اس کے بعد۔" ہمارے سلطان نے کہا تھا، "تم ایسی تصویر چاہو گے جس کے عین درمیان

ہوا ہو۔" یوں تھا جیسے میں نے ایسا فرض کیا تھا،" لیکن اس تصویر کی کبھی نمائش نہیں ہوگی: اصل ارادے سے قطع نظر، کچھ دیر بعد ہم دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر کی عبادت شروع کر دیں گے۔ اگر میں معاذ اللہ ان کفار جیسا یقین رکھوں، کہ حضرت عیسیٰ خود خدا تھے، تو پھر میں یہ بھی یقین کرلوں گا کہ خدا کو اس دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ وہ انسانی صورت میں ظہور کر سکتا ہے۔ صرف تب ہی میں انسانوں کی یوں پوری تفصیل سے تصویر کشی کو قبول اور ان کی نمائش کروں گا۔ تم بالکل سمجھتے ہو کہ آخر کار، ہم بغیر ارادہ دیوار پر آویزاں تصویر کی پرستش شروع کر دیں گے، ہے ناں؟"

میرے انشتے نے کہا، "میں بخوبی سمجھ گیا ہوں اور چوں کہ میں سمجھ گیا، ہم دونوں جو سوچ رہے تھے میں اس سے خائف تھا۔"

ہمارے سلطان نے تبصرہ کیا، "اس وجہ سے میں اپنی شبیہ کی نمائش کی اجازت بھی نہیں دے سکتا۔"

"اگرچہ وہ واقعی ایسا چاہتے ہیں۔" میرے انشتے نے دبی دبی شیطانی ہنسی سے سرگوشی کی۔

اب خوف زدہ ہونے کی باری میری تھی۔

"اس کے باوجود، میری خواہش ہے کہ میری شبیہ فرنگی فنکاروں کی طرز پر بنائی جائے۔" ہمارے سلطان نے بات جاری رکھی، "اپنی شبیہ [illegible] کتاب کے اوراق میں چھپائے رکھا جائے گا۔ وہ کتاب جو کچھ بھی ہوگی، صرف تم مجھے بتاؤ گے۔"

"حیرت اور رعب بھرے لمحے میں میں نے ان کی بات پر غور کیا۔" میرے انشتے نے بتایا اور پھر پہلے سے زیادہ شیطانی ہنسی ہنستے، وہ اچانک کوئی اور ہی بن گئے۔

"ہمارے سلطان عالی مقام نے مجھے اپنی کتاب پر فوری کام شروع کرنے کا حکم دیا۔ خوشی سے میرا سر گھومنے لگا۔ انہوں نے مزید کہا کہ کتاب وینس کے ڈیوک کے لیے تحفے کے طور پر بنائی جائے گی جس سے ملاقات کے لیے مجھے دوبارہ جانا تھا۔ ایک بار جب یہ کتاب مکمل ہو گئی تو ہجری کیلنڈر کے ہزارویں برس میں یہ ہمارے سلطان اسلامی خلیفہ کی ناقابل تسخیر طاقت کی علامت بن جائے گی۔ انہوں نے درخواست کی کہ میں کتاب پر مصوری انتہائی رازداری سے کروں، خصوصاً اس لیے کہ یہ وینس والوں کے لیے امن کا پیغام ہوگی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کتاب خانے کے حسد سے گریز کروں۔ انتہائی مسرت کی حالت میں اور رازداری کا حلف لے کر میں نے اس مہم کا آغاز کیا۔"

میں تمہارا انشتے ہوں

اور یوں یہ اس جمعہ کی صبح تھی، جب میں نے اس کتاب کے متعلق بتانا شروع کیا جس میں ہمارے سلطان کی وینس طرز کی شبیہ ہوتی۔ میں نے قرہ کے ساتھ کتاب کے موضوع پر بات کرتے بتایا کہ میں نے ہمارے سلطان سے اس بارے کیسے بات کی اور وہ کیسے اس کے لیے رقم فراہم کرنے پر قائل ہوئے۔ میرا اور پردہ مقصد یہ تھا کہ قرہ کتاب کے لیے وہ کہانیاں لکھے۔ جو میں نے ابھی شروع ہی نہ کی تھی۔ جنھیں تصویروں کے ساتھ پیش کرنا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ کتاب کی بیشتر تصویریں میں نے مکمل کی تھیں اور آخری تصویر تقریباً مکمل ہی تھی۔ "اس میں موت کی تصویر کشی ہے۔" میں نے بتایا۔ "اور میں نے سب سے ذہین منی ایچر فنکار بگے سے اس درخت کی تصویر بنوائی جو ہمارے سلطان کی سلطنت کے امن کا عکاس ہوگا۔ اس میں شیطان کی تصویر ہے اور ایک گھوڑے کی۔ اس میں ایک کتا ہے، جیسے ہوشیار اور مکار اور سونے کا ایک سکہ بھی۔ میں نے استاد منی ایچر فنکاروں سے یہ سب چیزیں اتنی مہارت و خوبی سے بنوائیں۔" میں نے قرہ کو بتایا، "کہ تم انھیں ایک بار ہی دیکھ کر فوراً جان جاؤ گے کہ ان کا متن کیا ہونا چاہیے۔ شاعری اور مصوری، الفاظ اور رنگ، یہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں، جیسا کہ تم جانتے ہی ہو۔"

لمحے بھر کو میں نے سوچا کہ کیا مجھے اسے بتانا چاہیے کہ میں اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر سکتا تھا۔ کیا وہ ہمارے ساتھ اس گھر میں رہے گا؟ میں نے خود کو اس کی مکمل توجہ اور بیگانہ تاثر سے متاثر ہونے سے بچنے کا کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری شکورے کے ساتھ فرار کے منصوبے بنا رہا تھا۔ پھر بھی اپنی کتاب کی تکمیل کے لیے میں کسی اور پر اعتماد نہ کر سکتا تھا۔

نماز جمعہ سے اکٹھے واپس آتے ہوئے ہم نے "سایوں" وینس فنکاروں کی تصویروں میں عظیم ترین اختراع پر بات کی۔ میں نے کہا، "اگر ہم نے اپنی تصویریں دنیا کی تحسین کرتے اور باتیں کرتے پیدل چلنے والوں کے نقطہ نگاہ سے بنائیں، یعنی اگر ہمارا ارادہ گلی سے تصویر بنانے کا ہو، تو ہمیں اس ماحول کو ذہن میں رکھنا اور سمجھنا چاہیے، جیسا کہ فرنگی مصور کرتے ہیں... جو درحقیقت ان کے بنائے سایوں میں سب

سے نمایاں ہے۔"

"سائے کی عکاسی کیسے ہوتی ہے؟" قرہ نے پوچھا۔

جب میرا بھانجا یہ سب سن رہا تھا تو ہر ذرا دیر بعد میں نے اسے مضطرب پایا۔ وہ اس مشغول دوات کے ساتھ کھیلنے لگا، جو اس نے مجھے تحفے میں دی تھی۔ کبھی وہ چمٹے سے انگیٹھی میں آگ بھڑکانے لگتا۔ ہر ذرا دیر بعد مجھے خیال ہوتا کہ وہ انگیٹھی میرے سر پر الٹا دے گا اور میری جان لے لے گا کیوں کہ میں فن مصوری کو اللہ کے نقطۂ نگاہ سے دور لے جا رہا تھا، کیوں میں ہرات کے استادوں کے خوابوں اور ان کی مصوری کی روایت سے دغا کر رہا تھا اور کیوں کہ میں نے ہمارے سلطان کو ایسا کرنے پر اکسایا تھا۔ کبھی کبھار قرہ ساکت بیٹھا اپنی نگاہیں دیر تک مجھ پر جمائے رکھتا۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا: "جب تک میں آپ کی بیٹی کو حاصل نہیں کر لیتا میں آپ کا غلام رہوں گا۔" ایک بار، جیسے میں اس کے بچپن میں کیا کرتا تھا، میں اسے باہر صحن میں لے گیا، کسی باپ کی طرح درختوں، پتوں پر پڑتی روشنی، پگھلتی برف اور دور جانے پر گھر سکڑ کر چھوٹے کیوں نظر آتے ہیں، کے متعلق بیان کیا۔ لیکن یہ میری غلطی تھی: اس سے صرف یہ ثابت ہوا کہ ہمارا پرانا باپ بیٹے کا رشتہ عرصہ ہوا ختم ہو چکا تھا۔ قرہ کے بچپن کے تجسس اور علم کے حصول کے جذبے کی جگہ اب کسی سٹھیائے بوڑھے کی بڑبڑ کو صبر و رضا سے سننے نے لے لی تھی۔ میں صرف ایک ایسا بوڑھا تھا جس کی بیٹی قرہ کی محبت کا مرکز تھی اور ان مختلف ممالک اور شہروں کا تجربہ اور اثر میرے بھانجے کی روح نے پوری طرح جذب کر لیا تھا، جن کا وہ بارہ برس سفر کرتا رہا تھا۔ وہ مجھ سے بیزار تھا اور مجھے اس پر ترس آتا تھا۔ اور وہ خفا تھا، میرا خیال ہے، صرف اس لیے نہیں کہ بارہ سال پہلے میں نے اسے اپنی بیٹی سے شادی کی اجازت نہ دی تھی ...... تب اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ اس لیے کہ میں ہرات کے استادوں کے انداز کے برخلاف مصوری کا خواب دیکھ رہا تھا۔ مزید یہ کہ میں نے اس حماقت پر اس سے اتنے یقین سے بات کی تھی، میں نے تصور کیا کہ میری موت اس کے ہاتھوں لکھی تھی۔

لیکن میں اس سے خوف زدہ نہ تھا، اس کے برعکس میں نے اسے خوف زدہ کرنا چاہا۔ چوں کہ میرا خیال تھا کہ خوف اس کے مناسب تھا جو میں نے اس سے لکھنے کی درخواست کی تھی۔ میں نے کہا: "ان تصویروں کی طرح، خود کو دنیا کے مرکز میں رکھنا ضروری ہے۔ میری مصوروں میں سے ایک نے بڑی ذہانت سے موت کی تصویر کشی کی ہے۔"

یوں میں نے اسے وہ تصویریں دکھانی شروع کیں جو میں پچھلے ایک برس سے استاد منی ایچر فنکاروں سے خفیہ طور پر بنوا رہا تھا۔ شروع میں وہ کچھ جھجکا حتیٰ کہ خوف زدہ ہوا۔ جب اسے سمجھ آئی کہ موت کی عکاسی "شاہنامہ" کے مانوس مناظر سے متاثر ہو کر کی گئی تھی، مثلاً افراسیاب کا سیاوش کو موت کی گھاٹ اتارنا یا رستم کے ہاتھوں یہ جانے بغیر کہ وہ اسی کا بیٹا ہے، سہراب کا قتل، تو اسے اس مضمون میں دلچسپی ہو گئی۔ سلطان سلیمان کے جنازے کی تصویر کشی میں سے ایک، میں نے فرنگیوں کی رنگوں کی ترتیب کی حساسیت کو خود

اپنی طرز سے ملا کر تھیں لیکن اور اس رنگوں میں بنائی ۔۔۔۔ جو میں نے بعد میں شامل کی تھی۔ میں نے بادلوں اور افق کی ملاپ سے ابھرنے والی گہرائی کا بھی ذکر کیا۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ موت منفرد تھی، بالکل فرنگیوں کی ان شبیہوں کی طرح جو میں نے وینس کی محلات میں آویزاں دیکھی تھیں، سب کی مختلف طرز کی عکاسی کی خواہش رکھتے تھے۔ ''وہ اتنا ممتاز اور مختلف ہونا چاہتے تھے اور وہ ایسا اس قدر جنون سے چاہتے تھے۔'' میں نے کہا، ''دیکھو ذرا موت کی آنکھوں میں جھانکو۔ دیکھو کہ آدمی کیسے موت سے نہیں بلکہ بے مثال، منفرد اور غیر معمولی بننے کی خواہش میں نہاں شدت سے خوف زدہ ہیں۔ ذرا اس تصویر کو دیکھو اور اس کا دیباچہ لکھو۔ موت کو زبان دو۔ یہ لو کاغذ اور قلم۔ میں تمہارا لکھا سیدھا خطاط کو دے دوں گا۔''

وہ خاموشی سے تصویر کو تکتا رہا۔ ''اسے کس نے بنایا ہے؟'' اس نے بعد میں پوچھا۔

''تتلی۔ وہ سب سے زیادہ قابل ہے۔ استاد عثمان برسوں اس سے محبت کرتا رہا اور متاثر رہا۔''

''کافی خانہ جہاں داستان گو داستانیں سناتا ہے، وہاں میں نے اس والے کتے کی زیادہ بھدی شبیہ دیکھی ہے۔''

''میرے مصور جن میں سے بیشتر روحانی طور پر استاد عثمان سے وابستہ ہیں، میری کتاب کے لیے کی گئی محنت کی زیادہ قدر نہیں کرتے۔ جب وہ رات کو یہاں سے کام ختم کر کے جاتے ہیں تو میں تصور کرتا ہوں کہ وہ کافی خانے میں ان دولت کے عوض بنائی تصویروں کا اور میرا بیہودہ مذاق اڑاتے ہیں۔ اور ان میں سے کون بھولے گا کہ ہمارے سلطان نے میرے ایما پر اپنی شبیہ بنوانے کے لیے ایک نوجوان وینسی مصور کو سفارت خانے کے ذریعے دعوت دی تھی۔ اس کے بعد سلطان نے استاد عثمان کو اس شبیہ کی نقل بنانے کا کہا۔ وینسی مصور کی نقل پر مجبور کیے جانے والے استاد عثمان نے اس جبر اور اس کے نتیجے میں بننے والی گھٹیا تصویر کی ذمے داری مجھ پر ڈالی۔ وہ اس میں حق بجانب تھے۔''

سارا دن میں نے اسے تصویریں دکھائیں۔۔۔ سوائے آخری تصویر کے جسے میں کسی بھی وجہ سے مکمل نہ کر سکا۔ میں اسے لکھنے پر اکساتا رہا۔ میں نقش نگاروں کے مزاج پر بات کرتا رہا اور میں نے اس رقم کا شمار کیا جو میں انھیں دے چکا تھا۔ ہم نے ''تناظر یا نقطہ نگاہ'' پر بات کی اور اس پر کہ وینسی تصویروں کے پس منظر کی چھوٹی چھوٹی اشیا کہیں تو ہین کے زمرے میں تو نہیں آتیں، اور ساتھ ہی ہم نے اس امکان پر بھی بات کی کہ بدنصیب نفیس آفندی اپنے عزم اور اپنی دولت پر حسد کے سبب قتل کیا گیا تھا۔

اس رات جب قرہ گھر واپس گیا تو میں پر اعتماد تھا کہ وہ اگلے روز حسب وعدہ دوبارہ آئے گا، اور یہ کہ دوبارہ وہ باتیں سنے گا جو میں اپنی کتاب میں شامل کہانیوں کے بارے میں بتاؤں گا۔ میں کھلے دروازے کے پار اس کے قدموں کی چاپ مدھم ہوتے سنتا رہا۔ اس رات کی ٹھنڈک میں ایسا کچھ تھا جو میرے بے خواب اور مضطرب قاتل کو مجھ اور میری کتاب سے زیادہ طاقت ور اور شیطانی بنا رہا تھا۔

میں نے اس کے پیچھے صحن کا دروازہ سختی سے بند کر دیا۔ ہر شب کی طرح میں نے نیاز بو والا

مٹی کا بھاری گملا دروازے کے پیچھے رکھ دیا۔ انگیٹھی کو بجھانے اور بستر پر جانے سے پہلے مجھے شکورے اندھیرے میں سفید لباس پہنے بھوت جیسی دکھائی دی۔

"کیا تم واقعی اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، پیارے بابا۔ عرصہ ہوا میں شادی کو فراموش کر چکی ہوں۔ اس کے علاوہ میں شادی شدہ ہوں۔"

"اگر تم اب بھی اس سے شادی کرنا چاہتی ہو تو میں تمہیں اجازت دینے پر راضی ہوں۔"

"مجھے اس سے قربت کی خواہش نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ یہ آپ کی مرضی کے خلاف ہے۔ پورے خلوص دل سے۔ مجھے کسی ایسے شخص کی تمنا نہیں جو آپ کی پسند نہ ہو۔"

میں نے دیکھا کہ لمحے بھر کے لیے انگیٹھی کے شعلوں کا عکس اس کی آنکھوں میں جھلکا۔ اس کی آنکھیں بوڑھی ہو چکی تھیں، ناخوشی سے نہیں بلکہ تھکن سے۔ اس کے باوجود اس کی آواز میں برہمی کا شائبہ تک نہ تھا۔

"قرہ تمہاری محبت میں گرفتار ہے۔" میں نے کسی راز سے پردہ ہٹاتے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔"

"آج اس نے میری ساری باتیں مصوری سے محبت کی بجائے تمہاری محبت کے سبب سنیں۔"

"وہ آپ کی کتاب مکمل کر دے گا، یہی اہم ہے۔"

"تمہارا شوہر شاید کسی روز واپس آ جائے۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم نہیں کیوں، شاید طویل خاموشی کے باعث، لیکن آج رات مجھے ادراک ہوا کہ میرا شوہر کبھی واپس نہ آئے گا۔ میں نے جو خواب دیکھا سچ لگتا ہے: انہوں نے ضرور اسے ہلاک کر دیا ہوگا۔ اسے خاک ہوئے عرصہ ہو چکا ہے۔" اس نے آخری بات سرگوشی میں کہی کہ کہیں سوئے ہوئے بچے نہ سن لیں۔ اور اس نے یہ بات کسی قدر برہمی سے کہی۔

"اگر ایسا ہو کہ وہ مجھے قتل کر دیں۔" میں نے کہا" میں چاہوں گا کہ تم اس کتاب کو مکمل کرو جس کے نام میں سب کچھ منسوب کر چکا ہوں۔ قسم کھاؤ کہ تم ایسا کرو گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔ آپ کی کتاب کون مکمل کرے گا؟"

"قرہ، تم یقین دہانی حاصل کر سکتی ہو کہ وہ ایسا کرے۔"

"آپ پہلے ہی یہ یقین حاصل کر رہے ہیں، بابا۔" اس نے کہا" آپ کو میری ضرورت نہیں۔"

"بالکل، لیکن وہ سب تمہاری وجہ سے کر رہا ہے۔ اگر وہ مجھے ہلاک کر دیں تو شاید وہ اسے جاری

رکھنے پر خائف ہو۔"

"اس صورت میں وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکے گا۔" میری ہوشیار بیٹی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میرے دماغ میں اس کے مسکرانے کی تفصیل کہاں سے در آئی؟ ساری گفتگو میں مجھے اس کی آنکھوں میں کبھی کبھار چمک سی نظر آئی تھی۔ ہم کمرے کے عین درمیان ایک دوسرے کے سامنے کھچاؤ کے عالم میں کھڑے تھے۔

"کیا تم ایک دوسرے سے رابطہ کرتے ہو۔ اشاروں کا تبادلہ؟" میں نے خود پر قابو پانے میں ناکام ہو کر پوچھ ہی بیٹھا۔

"آپ ایسی بات کیسے سوچ سکتے ہیں؟"

طویل تکلیف دہ خاموشی گزر گئی۔ دور کہیں کوئی کتا بھونکا۔ مجھے سردی لگی اور میں تھوڑا سا کپکپایا۔ مگر اب اتنا اندھیرا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کی موجودگی کا صرف احساس ہی تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو پوری قوت سے گلے لگا لیا۔ وہ رونے لگی اور بولی کہ اسے اپنی ماں کی یاد ستاتی ہے۔ میں نے اس کے سر کو چوما اور سہلایا، جس میں واقعی اس کی ماں کی سی خوشبو بسی تھی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی خواب گاہ میں لے گیا اور پہلو بہ پہلو لیٹے بچوں کے ساتھ لٹا دیا۔ پھر پچھلے دو روز کے واقعات پر سوچتے مجھے یقین ہو گیا کہ شکورے اور [illegible] میں خطوں کا تبادلہ ہوا تھا۔

itsurdu.blogspot.com

میرا نام ہے قرمزی

جب اس رات میں مالک مکان کی نظروں سے کامیابی سے چھپ کر گھر واپس پہنچا... جو میری ماں جیسا برتاؤ کرنے لگی تھی... میں اپنے کمرے میں گھسا اور اپنے بستر پر لیٹ کر خود کو شکورے کے خوابوں کے سپرد کر دیا۔

مجھے اجازت دیں کہ انشتے کے گھر سے آتی آوازوں کی مسرت کا ذکر کروں۔ میرے بارہ سال بعد دوسری بار اس کے گھر آنے پر بھی وہ میرے سامنے نہ آئی۔ اس کے باوجود وہ کسی جادوئی طریقے سے مجھے اپنے وجود کا احساس دلانے میں کامیاب رہی کہ مجھے یقین تھا کہ میں متواتر اس کی نگاہوں میں تھا اور وہ مستقبل کے شوہر کے حوالے سے مجھے تول رہی تھی، اس دوران جیسے کسی پہیلی میں خود کو محظوظ کرتے ہوئے۔

یہ جان کر میں نے بھی تصور کیا کہ جیسے میں اسے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ یوں میں ابن عربی کے اس نظریے کو بہتر طور پر سمجھ پایا کہ محبت ایسی اہلیت ہے جو نادیدہ کو دیدہ بنا سکتی ہے اور نادیدہ کو ہمیشہ اپنے درمیان محسوس کرنے کی تمنا کو جان گیا۔

میں یہ اخذ کر سکتا تھا کہ شکورے مجھے مسلسل دیکھ رہی تھی کیوں کہ میں گھر سے آتی آوازوں اور چوبی فرش کی چرچراہٹ سن سکتا تھا۔ ایک موقع پر تو مجھے یقین تھا کہ وہ ملحقہ کمرے میں بچوں کے ساتھ تھی جس کا دروازہ راہداری میں کھلتا تھا۔ میں بچوں کے ایک دوسرے کو دھکیلنے اور مارنے کا شور سن سکتا تھا جب کہ ان کی ماں نے انہیں اشاروں، دھمکاتی نگاہوں، تنی بھنوؤں سے خاموش کرانے کی کوشش کی تھی۔ کبھی کبھی میں انہیں سرگوشی کرتے سنتا، وہ سرگوشی نہیں جو کسی کی نماز میں دخل سے گریز کی خاطر کی جاتی ہے بلکہ وہ سرگوشی جو ہنسی کے دورے سے پہلے کی جاتی ہے۔

ایک بار جب ان کے نانا مجھے روشنی اور سائے کے وضاحت کر رہے تھے، شوکت اور اورحان کمرے میں داخل ہوئے اور محتاط طریقے سے طشت آگے کر کے ہمیں کافی پیش کی۔ یہ کام جو خیریے کا ہونا چاہیے تھا، شکورے نے کیا تا کہ بچے اس آدمی کو دیکھ سکیں جسے جلد ہی ان کا باپ بننا تھا۔ پھر میں نے شوکت کی تعریف کی، "تمہاری آنکھیں کتنی پیاری ہیں!" پھر میں اس کے چھوٹے بھائی اورحان کی طرف یہ محسوس

کرتے ہوئے کہ کہیں وہ حسد کا شکار نہ ہو اور مزید کہا ''اور تمہاری بھی۔'' پھر میں نے اپنے لبادے کی تہوں میں اڑسی ہوئی سرخ رنگت کی کارنیشن کی پتی نکال کر طشت میں رکھی اور دونوں لڑکوں کے رخسار پر بوسہ دیا۔ بعد میں بھی مجھے اندر سے قہقہوں اور دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

میں اکثر تجسس ہوتا کہ دیوار، بند دروازے یا چھت میں کس سوراخ اور کس زاویے سے اس کی نگاہیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ کوئی درز یا گرہ یا جسے میں سوراخ سمجھتا، میں تصور کرتا کہ شکورے عین اس کے پیچھے سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اچانک کسی اور جگہ کا شبہ ہونے پر اور اپنے شک کو درست ثابت کرنے کو... اپنے انشتے کی نہ ختم ہونے والی باتوں پر گستاخی کا مرتکب ہونے کی پروا نہ کرتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوتا۔ اس دوران کسی منہمک شاگرد کا انداز اپنائے، مبہوت اور خیالوں میں گم اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں اپنے انشتے کی کہانی کتنی توجہ سے سن رہا تھا، دیوار کے اس مشکوک سیاہ سوراخ کا جائزہ لینے کے لیے میں کمرے میں ٹہلنے لگتا۔

جب میں شکورے کی آنکھیں وہاں نہ دیکھ پایا جسے میں جھانکنے کا سوراخ فرض کر چکا تھا، مجھ پر مایوسی طاری ہو جاتی اور پھر تنہائی کا عجیب سا احساس، کسی بے صبر آدمی کی بے چینی جسے یقین نہ ہو کہ آئندہ کیا ہوگا، مجھ پر چھا جاتے۔

ہر تھوڑی دیر بعد مجھے اچانک اس شدت سے محسوس ہوتا کہ شکورے مجھے دیکھ رہی تھی، مجھے اس کی نگاہ میں ہونے کا اتنا یقین تھا کہ میں نے کسی زیادہ عقل مند، مضبوط اور زیادہ قابل شخص کا انداز اپنایا تاکہ اس عورت کو متاثر کر سکوں جس کی محبت میں میں گرفتار تھا۔ میں تصور کرتا کہ شکورے اور بچے میرا اس کے شوہر سے موازنہ کر رہے تھے، بچوں کا گم شدہ باپ، بیشتر اس کے کہ میرا ذہن اس مشہور وحشی مصوری کی طرف جاتا جس کی مصوری کی تکنیک پر انشتے اس وقت اپنا فلسفہ بیان کر رہے ہوتے۔ میں ان مشہور منی ایچر فنکاروں کی طرح بننا چاہتا تھا، اس لیے کہ شکورے ان کے متعلق اپنے بابا سے بہت کچھ سن چکی تھی، وہ مصور جنہوں نے اپنا نام کمایا... ولیوں کی طرح کوٹھریوں میں شہادت پا کر نہیں یا مضبوط بازوؤں اور تلوار سے دشمنوں کے سر قلم کر کے نہیں جیسے اس کے گم شدہ شوہر نے کیا... بلکہ ایسی کتاب کے ذریعے جس پر انہوں نے خطاطی یا مصوری کی۔ میں نے نہایت کوشش سے ان عالیشان تصویروں کا تصور کیا جو ان مشہور منی ایچر فنکاروں نے بنائی تھیں جو، جیسا کہ میرے انشتے نے بتایا، دنیا کے اسرار اور مرئی تاریکی سے متاثر تھے۔ میں نے انہیں تصور میں لانے کی بہت کوشش کی، وہ شہکار جو میرے انشتے نے دیکھے تھے اور اب میرے سامنے انہیں بیان کر رہے تھے جس نے انہیں کبھی نہ دیکھا تھا... یہ کہ جب میرا تخیل ناکام رہا تو میں نے خود کو مایوسی اور ذلت میں پایا۔

میں نے اوپر دیکھا تو معلوم ہوا کہ شوکت میرے سامنے تھا۔ وہ میرے قریب آیا اور میں نے خیال کیا... جیسا کہ ماوراالنہر کے بعض عرب قبائل اور کاکیشیا کے پہاڑوں کے سرکیشیائی قبیلوں میں رواج

یہ۔ بڑا پیمانہ صرف مہمان کی آمد پر اس کی دست بوسی کرے گا بلکہ رخصت ہونے پر بھی۔ بے سوچے سمجھے میں بوسے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اسی وقت کہیں قریب ہی سے مجھے اس کی ہنسی سنائی دی۔ کیا وہ مجھ پر ہنس رہی تھی؟ میں سٹپٹا گیا اور صورت حال سنبھالنے کو شوکت کو تھام کر اس کے دونوں رخسار چومے، یوں جیسے مجھ سے یہی توقع تھی۔ پھر میں اپنے انشتے کو دیکھ کر مسکرایا جیسے معذرت کر رہا اور تسلی دلا رہا تھا کہ میرا مقصد گستاخی نہ تھا۔ بچے کو احتیاط سے قریب لاتے ہی پایا اس سے اس کی ماں کی خوشبو آ رہی تھی۔ جب تک میں سمجھ پاتا، مڑا تڑا کاغذ کا چمرمر سا رقعہ میرے ہاتھ میں دے کر مڑا اور دروازے کی طرف چل دیا۔

میں نے اس رقعے کو کسی موتی کی طرح مٹھی میں بند کر لیا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ یہ شکورے کی تحریر تھی تو میں خوشی میں خود کو انشتے کی طرف احمقانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھنے سے روک نہ پایا۔ کیا یہ ثبوت کافی نہیں کہ شکورے کو میری چاہت تھی؟ وہیں انشتے کی موجودگی میں میں نے شکورے کو اپنی قربت میں محسوس کیا۔ کیا شکورے یہ دیکھ چکی تھی؟ میں نے اپنا ارتکاز توڑنے کی خاطر اپنے انشتے کی باتوں پر توجہ مرکوز کی۔

خاصی دیر بعد جب انشتے اپنی کتاب کی ایک اور تصویر دکھانے والے تھے تو میں نے چپکے سے رقعہ کھولا۔ خط سے خوشبو اٹھ رہی تھی، لیکن وہ میری طرح کورا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا اور بے خیالی میں خط الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔

میرے انشتے نے کہا: ''کھڑکی تناظری تکنیک کے استعمال کا مطلب ہے، دنیا کو کسی کھڑکی سے دیکھنا ـــــ تم ہاتھ میں کیا پکڑے ہوئے ہو؟''

''کچھ نہیں، انشتے آفندی۔'' میں نے جواب دیا۔ جب انشتے نے دوسری طرف دیکھا تو میں مڑا تڑا کاغذ اپنی ناک کے قریب لایا اور اس کی خوشبو میں گہری سانس لی۔

سہ پہر کو کھانے کے بعد، چوں کہ میں اپنے انشتے کا پیشاب دان استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا، میں باہر صحن میں چلا گیا۔ سخت سردی تھی۔ خود کو سردی لگوائے بغیر میں اپنے کام میں لگ گیا کہ شوکت کسی رہزن کی طرح پیچھے اور چالاکی سے میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں اپنے نانا کا استعمال شدہ پیشاب دان تھا۔ وہ میرے پیچھے آیا اور برتن خالی کیا۔ جب وہ واپس مڑا تو اس کی خوب صورت آنکھیں مجھ پر تھیں اور وہ پھولے ہوئے گالوں سے پھونک مار رہا تھا۔

''کیا تم نے کبھی کوئی مری ہوئی بلی دیکھی ہے؟'' اس نے پوچھا۔ اس کا ناک بالکل اپنی ماں جیسا تھا۔ کیا وہ ہمیں دیکھ رہی تھی؟ میں نے ارد گرد نگاہ کی۔ دوسری منزل کی اس مسحور کن کھڑکی پہ پردے گرے ہوئے تھے جہاں میں نے کئی برس بعد شکورے کو دیکھا تھا۔

''نہیں۔''

''کیا میں تمھیں پھانسی شدہ یہودی کے گھر مری ہوئی بلی دکھاؤں؟''

وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر گلی میں چلا گیا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا۔ ہم کیچڑ اور

برف سے اٹے رستے پر تیس یا چالیس قدم چل کر ایک ویران باغیچے میں داخل ہوئے۔ یہاں گیلے اور گلے سڑتے پتوں اور کائی کی ہلکی ہلکی سی بو تھی۔ اس بچے کے اعتماد سے چلتے ہوئے جو جگہ سے خوب واقف تھا، مضبوط نپے تلے قدم اٹھاتے، وہ زرد رنگ کے گھر کے دروازے میں داخل ہوا جو انجیر اور بادام کے درختوں کے عقب میں تقریباً چھپا ہوا تھا۔

گھر مکمل طور پر خالی، لیکن خشک اور گرم تھا یوں جیسے وہاں کوئی رہتا ہو۔

"یہ کس کا گھر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہودیوں کا۔ جب یہ آدمی مر گیا تو اس کے بیوی بچے پھل فروشوں کی گھاٹ کے قریب یہودی محلے چلے گئے۔ انہوں نے کپڑا فروش ایستھر کو گھر کی فروخت پر لگا رکھا ہے۔" وہ کمرے کے کونے میں گیا اور واپس آ گیا: "بلی وہاں نہیں ہے، وہ غائب ہو گئی ہے۔" اس نے کہا۔

"مری ہوئی بلی بھلا کہاں جائے گی؟"

"نانا کہتے ہیں کہ مرے ہوئے بھٹکتے پھرتے ہیں۔"

"خود مردے نہیں۔" میں نے کہا، "ان کی روحیں بھٹکتی ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتا؟" وہ بڑی سنجیدگی سے پیشاب دان کو مضبوطی سے گود میں تھامے ہوا تھا۔

"مجھے بس معلوم ہے۔ کیا تم اکثر یہاں آتے ہو؟"

"میری ماں ایستھر کے ساتھ یہاں آتی ہے۔ قبروں سے نکلے مردے راتوں کو یہاں آتے ہیں، لیکن مجھے اس جگہ سے ڈر نہیں لگتا۔ کیا تم نے کبھی کسی کی جان لی ہے؟"

"ہاں۔"

"کتنوں کی؟"

"بہت زیادہ نہیں۔ دو۔"

"تلوار سے؟"

"تلوار سے۔"

"کیا ان کی روحیں بھٹکتی ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ کتابوں میں جیسے لکھا ہے، ضرور بھٹکتی ہوں گی۔"

"چچا حسن کے پاس ایک سرخ تلوار ہے۔ وہ بہت کاٹ دار ہے اور اگر تم اسے ذرا ہاتھ ہی لگاؤ تو وہ تمہیں کاٹ دے گی۔ اس کے پاس یاقوتی دستے والا خنجر بھی ہے۔ کیا تم ہی ہو جس نے میرے بابا کو جان سے مارا ہے؟"

میں نے "ہاں" یا "نہیں" کا اشارہ دیے بغیر سر ہلایا۔ "تم کیسے جانتے ہو کہ تمہارے بابا مر چکے ہیں؟"

"میری ماں نے کل ایسا کہا تھا۔ وہ اب واپس نہیں آئیں گے۔ اس نے انہیں خواب میں دیکھا۔"

اگر موقع ملے تو ہم اپنے عظیم مقصد کے نام پر گھٹیا نتائج حاصل کرنے کو خود کو کچھ بھی کرنے پر تیار پائیں گے، اپنے اندر سنگتی حرص وہوس کے لیے یا اس محبت کے لیے جو ہمارے دل تڑپاتی ہے، اور یوں میں نے ایک بار پھر ان بے چارے بچوں کا باپ بننے کا فیصلہ کیا اور جب میں واپس گھر لوٹا، میں نے شوکت کے نانا کی کتاب کی باتوں کو اور غور سے سنا کہ جس کے متن اور تصویروں کو مجھے مکمل کرنا تھا۔

آیئے میں ان تصویروں سے شروع کروں جو میرے انشٹے نے مجھے دکھائی تھیں، مثال کے طور پر گھوڑے کی۔ اس صفحے پر کوئی انسانی شبیہ نہ تھی اور گھوڑے کے اردگرد جگہ خالی تھی، پھر بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ مکمل طور پر اور خصوصاً گھوڑے ہی کی تصویر تھی۔ ہاں، گھوڑا وہاں تھا، لیکن ظاہر تھا کہ گھڑسوار اتر کر کہیں چلا گیا تھا یا کون جانے وہ قزوین طرز کی طرح جھاڑیوں کے عقب سے ظاہر ہو۔ یہ گھوڑے پر پڑی زین سے ظاہر تھا، زین پر امرا کی طرز کی آرائش تھی۔ شاید کوئی شخص اپنی تلوار کے ہمراہ گھوڑے کے قریب ظاہر ہونے کو تھا۔

یہ عیاں تھا کہ انشٹے نے یہ گھوڑا اسی مصور سے بنوایا تھا جسے انہوں نے کتاب خانے سے چوری چھپے بلوایا تھا۔ چوں کہ رات کو آنے والا اس اپچ [illegible] اپنے ذہن میں نقش گھوڑا بنا سکتا تھا، اگر یہ کہانی کا حصہ ہوتا، اسی طرح اس نے یہ بنایا ہوگا، یادداشت سے [illegible]۔ جب وہ گھوڑے کی تصویر بنا رہا تھا جسے اس نے ہزاروں بار محبت اور جنگ کے مناظر میں دیکھا تھا تو میرے انشٹے نے وینس استادوں کے طریقوں سے متاثر ہو کر، مصور کو شاید ہدایت دی ہوگی، مثال کے طور پر، انہوں نے کہا ہوگا، "گھڑسوار کو بھول جاؤ، اس کی جگہ یہاں کوئی درخت بنا دو۔ لیکن اسے پس منظر میں بنانا، چھوٹے پیمانے پر۔"

مصور جو رات کو آتا اور شمع کی روشنی میں میرے انشٹے کے ہمراہ بیٹھ کر ایسی عجیب، غیر روایتی تصویر بناتا جو ان مناظر سے ذرا بھی نہ ملتی تھی جنہیں بنانے کا وہ عادی تھا اور جو اسے زبانی یاد تھے۔ یقیناً میرے انشٹے نے اسے ہر تصویر کا بھاری معاوضہ دیا تھا، لیکن صاف کہوں تو تصویر کشی کا یہ مخصوص انداز ایک خاص دلفریبی بھی رکھتا تھا۔ تاہم، جہاں تک میرے انشٹے کی بات تھی، مصور کو بعد میں کچھ معلوم نہ ہوتا کہ تصویر کو کس کہانی کو واضح اور مکمل کرنا تھا۔ میرے انشٹے کو مجھ سے جو توقع تھی، یہ کہ میں ان نصف وینسی، نصف ایرانی انداز کی تصاویر کا جائزہ لوں اور پھر ان کے سامنے کے صفحے پر ان سے موزوں کہانی بیان کروں۔ اگر مجھے شکورے کو حاصل کرنے کی امید تھی تو مجھے یہ کہانیاں لکھنا ہی تھیں، لیکن میرے ذہن میں کافی خانے میں داستان گو کی سنائی داستانوں کے سوا کچھ نہ آیا۔

مجھے قاتل کہا جائے گا

ٹک ٹک کرتے میرے چابی بھرے گھڑیال نے مجھے بتایا کہ شام ہو چلی تھی۔ ابھی مغرب کی اذان میں وقت تھا لیکن کافی دیر پہلے ہی میں نے اپنی میز کے قریب رکھی شمع جلا دی۔ میں نے اپنی یادداشت کے بل پر جلدی سے ایک افیون کے عادی کی تصویر مکمل کی، اپنے سرکنڈے کے قلم کو سیاہ حسن پاشا روشنائی میں ڈبوتے اور اسے خوش خط و خوب صورت ورق پر چلاتے ہوئے، ابھی مجھے ہر شب کی طرح گلی میں خود کو پکارتی آواز سنائی دی۔ میں نے خود کو روکا۔ میں نے باہر نہ جانے اور گھر رہ کر کام کرنے کے لیے پُرعزم تھا، میں کچھ دیر کے لیے کیل گاڑ کر اپنا دروازہ بند کرنے کا بھی سوچا۔

یہ کتاب جو میں عجلت میں مکمل کر رہا تھا ایک آرٹسٹ تیار کروا رہا تھا جو آج صبح سویرے گلاتا سے میرے ہاں پہنچا تھا۔ آدمی، ایک مترجم اور رہنما، اگرچہ وہ گلاتا کا تھا، جب بھی کوئی فرنگی یا وحشی سیاح "کتاب لباس" چاہتا تو وہ مجھے ڈھونڈ نکالتا اور اس کے بعد ہم سودے بازی کرنے لگتے۔ اس صبح میں نقرئی سکوں کے عوض ایک سستے معیار کی "کتاب لباس" بنانے پر راضی ہونے کے بعد میں نے مغرب کی اذان تک ہیں استنبولیوں کی تصویریں، ان کے لباس پر توجہ دیتے ہوئے بنانے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک شیخ الاسلام، محل کے دربان، مبلغ، ینی چری، ایک درویش، گھڑسوار سپاہی، قاضی، قلفی فروش، ایک جلاد — تشدد کرتے جلاد کی تصویریں بہت بکتی تھیں — ایک بھکاری، حمام کو جاتی ایک عورت اور ایک عادی افیونی کی تصویریں بنائیں۔ میں نے چند فالتو نقرئی سکوں کے لیے ایسی بہت سی کتابیں تیار کی تھیں کہ انھیں بناتے ہوئے اپنی اکتاہٹ بھگانے کو میں نے کھیل ایجاد کرنے شروع کر دیے، مثال کے طور پر، ورق سے ایک بار بھی قلم اٹھائے بغیر قاضی کی تصویر بنانا یا بھکاری کی تصویر آنکھیں بند کر کے بنانا۔

سارے رہزن، شاعر اور غم کے مارے لوگ واقف ہیں کہ مغرب کی اذان ہوتے ہی ان کے اندر کے جن اور شیطان سرکش اور برہم ہو جائیں گے اور یک زبان ہو کر پکاریں گے: "باہر! باہر نکلو!" یہ مضطرب آواز مطالبہ کرے گی، "دوسروں کی صحبت تلاش کرو، تاریکی، خواری اور رسوائی تلاش کرو۔" میں نے اپنا وقت ان جنوں اور شیطانوں کو خوش کرتے بسر کیا ہے۔ میں نے بدی کی ان روحوں کی مدد سے اکثر

مصوری کی ہے جسے بہت سے لوگ میرے ہاتھوں سے جاری معجزہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اب سے سات روز پہلے سے، جب سے میں نے اس بدبخت کا قتل کیا ہے، غروب آفتاب کے بعد میں اپنے ان جنوں اور شیطانوں پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتا ہوں۔ وہ میرے اندر اتنے شدید غضب میں آ جاتے ہیں کہ میں خود سے کہتا ہوں کہ شاید میری بکھری آوارگی پر یہ پرسکون ہو جائیں۔

یہ سب کہنے کے بعد، ہمیشہ کی طرح یہ جانے بغیر کہ کیسے، میں نے خود کو شب بھر آوارہ گردی کرتے پاتا۔ میں برف آلود، کیچڑ زدہ گلیوں، برفیلی ڈھلانوں اور ویران رستوں پر یوں تیز تیز چلتا رہتا جیسے کبھی نہ رکوں گا۔ رات کی تاریکی میں اترتے میں آگے بڑھتا رہتا شہر کے بالکل ویران مضافاتی علاقوں میں، میں بالکل رفتہ رفتہ اپنی روح بھی پیچھے چھوڑتا چلا آتا اور تنگ گلیوں سے گزرتے میرے قدموں کی چاپ سرائے، مدرسوں اور مسجدوں کی پتھریلی دیواروں سے ٹکرا کر گونجتی، میرے خوف مدھم پڑ جاتے۔

میرے قدم اپنی ہی مرضی سے مجھے شہر کے اس ویران مضافاتی علاقے میں لے جاتے جہاں میں ہر شب آتا تھا اور جہاں بھوت آسیب تک باہر نکلتے ڈرتے تھے۔ سنا تھا کہ اس علاقے کے آدھے مرد فارس کے ساتھ جنگوں میں ہلاک ہو گئے تھے اور باقی اس جگہ کو منحوس قرار دے کر بھاگ گئے تھے لیکن مجھے ان توہمات پر یقین نہیں۔ اس اجڑے علاقے پر مسلسل جنگوں کے سبب آن پڑنے والا واحد سانحہ قلندری خانقاہ کا چالیس برس پہلے بند کر دیا جانا تھا کیوں کہ شبہ تھا کہ وہاں [illegible] چھپتے تھے۔

میں جھاڑیوں کے عقب میں گھوما پھرا، جن سے [illegible] موسم میں بھی خوش گوار مہک اٹھ رہی تھی اور اپنی معمول کی نازک مزاجی سے گری ہوئی چھت اور ٹوٹے ہوئے [illegible] والی کھڑکی کے درمیان دیوار کے تختے سیدھے کیے۔ میں اندر داخل ہوا اور سو سال پرانی منڈلاتی خوشبو اور کائی کی مہک اپنے اندر اتاری۔ مجھے وہاں موجودگی اتنی مبارک لگی کہ محسوس ہوا میرے آنسو بہ نکلیں گے۔

اگر میں نے پہلے نہیں کہا تو، میں بتانا چاہوں گا کہ مجھے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں اور میری دانست میں اس دنیا میں ملی سزا کی کوئی اہمیت نہیں۔ مجھے اس کرب و اذیت کا خوف ہے جو روز حساب میرے جیسے قاتلوں کو بھگتنا پڑے گا، جیسا کہ قرآن کریم میں واضح درج ہے۔ قدیم کتابوں میں جو مجھے کبھی کبھار ہی ملتیں، جب میں تمام رنگوں اور شدت کے ساتھ سزا دیکھتا ہوں، پرانے عرب مخفی اہل مصوروں کے بیل کے چمڑے پر بنائے جہنم کے سادہ، بچگانہ لیکن دہشت خیز مناظر یا کسی سبب سے چینی اور منگول فنکاروں کی جلادوں کے ظلم و ستم کی عکاسی تو میں خود کو ایک مماثلت دیکھنے اور اس منطق پر غور پر مجبور پاتا ہوں: سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 33 کیا کہتی ہے؟ کیا یہ تحریر نہیں کہ کسی آدمی کو بلا جواز کسی دوسرے کی زندگی لینے کا حق نہیں جس کے قتل سے خدا نے منع کیا ہو؟ ٹھیک ہے پھر، میں نے جس شیطان کو جہنم رسید کیا وہ مسلمان نہیں تھا جس کے قتل سے خدا نے منع کیا ہو اور اس کے ساتھ، میرے پاس اس کا سر کچلنے کا اعلیٰ جواز موجود تھا۔

اس شخص نے ہم پر جو سلطان کی کتاب پر خفیہ کام کر رہے تھے، بہتان طرازی کی تھی۔ اگر میں

اسے خاموش نہ کرتا تو وہ انشتے آفندی، سب منی ایچر فنکاروں اور یہاں تک کہ استاد عثمان کو کافر قرار دے کر ارض روم کے خوجا کے دیوانے پیروکاروں کو راہ دے دیتا۔ اگر کسی نے یہ اعلان کر دیا کہ منی ایچر فنکار گستاخی کے مرتکب ہو رہے تھے تو ارض رومی مبلغ کے پیروکار —— جو اپنی طاقت کے مظاہرے کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں تھے —— صرف منی ایچر فنکاروں کا کام تمام کر کے مطمئن نہ ہوں گے، وہ پورے کتاب خانے کو برباد کر دیں گے اور ہمارے سلطان بے بسی سے دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر پائیں گے۔

ہمیشہ کی طرح میں نے وہاں جھاڑو اور پونچھے سے صفائی کی۔ صفائی کرتے ہوئے مجھے خوشی ہوئی اور میں نے خود کو اللہ کا فرمانبردار بندہ محسوس کیا۔ میں نے دیر تک عبادت کی تاکہ وہ مجھے اس مبارک احساس سے محروم نہ کرے۔ خنکی جو کسی لومڑی کی لید کو جمانے کو کافی تھی، میری ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔ مجھے اپنے گلے درد محسوس ہونے لگا۔ میں باہر نکل گیا۔

اس کے بعد اسی عجیب سی ذہنی کیفیت میں، میں نے خود کو ایک بالکل مختلف علاقے میں پایا۔ مجھے معلوم نہیں کیا ہوا تھا، میں نے خانقاہ کی ویران اطراف میں اور اس جگہ کے درمیان جانے کیا سوچا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ دورویہ سرو کے درختوں والے رستوں پر میں کیسے پہنچا۔

میں چلتا ہی چلا گیا۔ ایک عجیب و غریب خیال نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور کیڑے کی طرح میرے دماغ میں کلبلاتا رہا۔ شاید اگر میں آپ کو بتا دوں تو میرا بوجھ کچھ کم ہو جائے: اسے ”ذلیل الزام تراش“ کہیں یا ”بے چارہ نفیس آفندی“ —— جو بھی کہا جائے انجام ایک ہی ہے۔ وہ ہمارے انشتے پر سنگین الزام لگا رہا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ مجھے اس کے اعلان کہ انشتے کافروں کا تناظری طریقہ استعمال کر رہے تھے، کوئی فرق نہیں پڑا تو اس درندے نے انکشاف کیا: ”ایک آخری تصویر ہے۔ اس تصویر میں انشتے نے ہر اس شے کی توہین کی ہے جس پر ہمارا ایمان ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، صرف مذہب کی ہتک نہیں بلکہ کھلا گستاخی اور کفر ہے۔“ مزید یہ کہ اس بدبخت کے اس الزام کے تین ہفتے بعد انشتے آفندی نے مجھے چند چیزوں کی مصوری کا کہا، جیسے کہ گھوڑا، سکہ اور موت، صفحے کی مختلف جگہوں پر اور مختلف پیمانوں میں، بلاشبہ فرنگیوں کی تصویریں ایسی ہی ہوتی تھیں۔ انشتے آفندی ہمیشہ اس ورق جس پر وہ مجھ سے مصوری کروانا چاہتے تھے، کے بڑے حصوں اور بدبخت نفیس آفندی کی طلا کاری والے حصے کو ڈھانپ کر دیتے تھے، جیسے وہ مجھ سے اور دوسری منی ایچر فنکاروں سے کچھ چھپانا چاہتے ہوں۔

میں انشتے سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اس آخری بڑی تصویر میں کیا بنانا چاہ رہے تھے لیکن بہت کچھ تھا جو مجھے روکے ہوئے تھا۔ اگر میں ان سے پوچھوں تو وہ یقیناً مجھ پر شک کرنے لگیں گے کہ میں نے ہی نفیس آفندی کا قتل کیا تھا اور اس شک سے دوسروں کو بھی آگاہ کر دیں گے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ تھا جو مجھے مضطرب کرتا تھا۔ اگر میں ان سے پوچھوں تو ممکن ہے کہ انشتے کہیں کہ نفیس آفندی کے خیالات درست تھے۔ کبھی میں خود سے کہتا کہ مجھے ان سے پوچھ لینا چاہیے، یوں ظاہر کرتے جیسے یہ شبہ مجھ تک نفیس آفندی کے

درمیے نہیں پہنچا بلکہ مجھے یونہی خیال سا تھا۔ آخر میں کسی پہلو سکون نہ تھا۔

میری ٹانگیں جو ہمیشہ میرے دماغ سے تیز رفتار ہیں، مجھے خود بخود ہی انشتے آفندی کی گلی میں لے گئی تھیں۔ میں ایک الگ تھلگ گوشے میں بیٹھ گیا اور تاریکی میں جس قدر غور سے دیکھ سکتا تھا، گھر کو دیکھتا رہا۔ میں دیر تک دیکھتا رہا، درختوں میں گھرا وہ کسی امیر شخص کا ایک بڑا لیکن عجیب سادہ دو منزلہ گھر تھا۔ معلوم نہیں شکورے کا کمرا کس جانب تھا۔ شاہ طہماسپ کے دور میں، تبریز میں بنی کچھ تصویروں کی طرح، میں نے تصور کیا کہ جیسے گھر کو عین درمیان سے چھری سے کاٹ دیا گیا ہو اور تخیل کی آنکھ سے دیکھا کہ میں اپنی شکورے کو کہاں دیکھ سکتا تھا، کس کھڑکی کے کواڑ کے پیچھے۔

دروازہ کھل گیا۔ میں نے تاریکی میں قرہ کو گھر سے باہر نکلتے دیکھا۔ انشتے نے صحن کا دروازہ بند کرنے سے پہلے اس کے پیچھے لیمپ بھر کو لگا دی۔

حتیٰ کہ میرے دماغ نے، جو خود کو اتفاقاً خوش خیالی کے سپرد کر چکا تھا، جو دیکھا تھا اس کی بنیاد پر تیزی اور تکلیف سے تین نتائج اخذ کیے:

اول: چوں کہ قرہ سستا اور بے خطر ہک تھا، انشتے آفندی ہماری کتاب اس سے مکمل کروائیں گے۔

دوم: حسین و جمیل شکورے قرہ سے شادی کر لے گی۔

سوم: بدنصیب نفیس آفندی نے جو کہا تھا، سچ تھا، یوں میں نے اسے بیکار میں قتل کیا۔

اس جیسی صورت حال میں، جیسے ہی ہمارا بے رحم دماغ نتائج نکالتا ہے جنہیں ہمارا دل رد کر دے، سارا جسم دماغ کے خلاف بغاوت پر اتر آتا ہے۔ پہلے، آدھے دماغ نے نتیجہ نمبر تین کی شدید مخالفت کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میں گھٹیا ترین قاتل کے سوا کچھ نہیں۔ میری ٹانگیں ایک بار پھر دماغ کی نسبت تیزی سے حرکت میں آ گئیں اور مجھے قرہ آفندی کے تعاقب میں لگا دیا۔

ہم چند ذیلی گلیوں سے گزرے، میں نے سوچا کہ اسے جو سکون و اعتماد سے میرے آگے چل رہا تھا، قتل کرنا کتنا آسان ہو گا، اور کس طرح یہ جرم مجھے میرے دماغ کے اخذ شدہ پہلے دو نتائج سے بچا لے گا، مزید یہ کہ میں نے نفیس آفندی کا سر بلا سبب نہ کچلا ہو گا۔ اب اگر میں آٹھ دس قدم بھاگ کر اس کے قریب پہنچوں اور اس کے سر پر پوری قوت سے ضرب لگاؤں، تو زندگی تو معمول کے مطابق ہی چلتی رہے گی۔ انشتے آفندی مجھے اپنے گھر ہماری کتاب کی تکمیل کے لیے بلائیں گے۔ لیکن اس دوران میرا زیادہ ایمان دار اور عاقل رخ مجھے بتاتا رہا کہ جس عفریت کا میں نے قتل کر کے اسے کنویں میں پھینکا تھا، وہ واقعی ایک بہتان گو تھا۔ اور اگر یہ معاملہ تھا کہ میں نے اسے بلاوجہ قتل نہیں کیا تھا اور انشتے کو اپنی کتاب کے بارے کچھ چھپانے کی ضرورت نہ تھی، وہ یقیناً مجھے اپنے گھر دوبارہ بلاتے۔

اگرچہ قرہ کو اپنے آگے چلتے دیکھتے، میں یقین سے جانتا تھا کہ ایسا کچھ نہ ہو گا۔ یہ تمام فریب خیال

تھا۔ قرہ آفندی مجھ سے زیادہ حقیقت تھا۔ ایسا ہم سب کے ساتھ ہوتا ہے، ضرورت سے زیادہ منطقی ہونے کے ردعمل میں ہم مسلسل ہفتوں اور برسوں اپنے تخیل اور خیالوں کو پالتے رہتے ہیں اور پھر اچانک کسی روز ہم کوئی شے، کوئی چہرہ، کوئی لباس یا کوئی خوش باش آدمی دیکھتے ہیں اور ہمیں اچانک ادراک ہوتا ہے کہ ہمارے خواب بھی سچ نہیں ہوں گے، یوں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کسی خاص لڑکی کو ہم سے شادی کی اجازت نہ ملے گی یا ہم زندگی میں فلاں فلاں مقام تک کبھی نہ پہنچ پائیں گے۔

میں قرہ کے کندھوں، اس کے سر، اس کی گردن کی اوپر نیچے حرکت کو اس شدید نفرت سے دیکھ رہا تھا جو میرے دل کو کسی شکنجے میں کسے ہوئے تھی — اس کا چلنے کا انتہائی بیہودہ طریقہ، یوں جیسے اس کا ہر قدم دنیا کے لیے نعمت ہو — ضمیر کے کرب سے آزاد اور اپنے سامنے روشن مستقبل لیے قرہ جیسے آدمی خیال کرتے ہیں کہ ساری دنیا اُن کا گھر ہے، وہ اپنے اصطبل میں جاتے کسی سلطان کی طرح کوئی بھی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاتے ہیں اور اندر ہم جیسے بچے کھچے مودب لوگوں کی تحقیر کرتے ہیں۔

ہم ایک ہی عورت کی محبت میں گرفتار دو آدمی تھے، وہ میرے آگے میری موجودگی سے بے خبر استنبول کی بل کھاتی ڈھلوانی گلیوں میں چل رہا تھا، ہم بھائیوں کی طرح ان اجاڑ گلیوں سے گزر رہے تھے جن پر آپس میں لڑتے ہوئے آوارہ کتوں کا راج تھا، ہم آتش زدہ کھنڈروں سے گزرے جہاں جن بھٹکتے تھے، مسجدوں کے صحنوں سے جن کے گنبدوں میں فرشتے خوابیدہ تھے، مردہ روحوں سے سرگوشیاں کرتے سرو کے درختوں سے، بھوت روحوں سے بھرے برف پوش قبرستانوں سے آگے، اپنے شکار کا گلا گھونٹتے رہزنوں کی نظروں سے بچتے ہوئے، لاتعداد دکانوں، اصطبلوں، خانقاہوں، شمع سازوں، چمڑہ سازوں اور پتھریلی دیواروں کے قریب سے گزر کر آگے بڑھتے، اور جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے، مجھے محسوس ہوا کہ میں اس کا تعاقب نہیں بلکہ اس کی بجائے اس کی نقل کر رہا تھا۔

میں موت ہوں

جیسا کہ آپ صاف دیکھ سکتے ہیں کہ میں موت ہوں لیکن خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، میں صرف مصوری کا ایک شاہکار ہوں۔ اگرچہ ایسا ہی ہے، میں آپ کی آنکھوں میں خوف کی تحریر پڑھ سکتی ہوں۔ اگرچہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ میں اصل نہیں — کھیل میں پوری طرح مگن ہو جانے والے بچوں کی طرح — آپ پر پھر بھی خوف طاری ہے جیسے آپ کی ملاقات واقعی موت سے ہوئی ہو۔ مجھے اس بات پر خوشی ہے۔ مجھے دیکھتے ہوئے آپ سوچتے ہیں کہ خوف سے خود کو پاک کر لیں گے جب آپ پر وہ ناقابل گریز آخری لمحہ آئے گا۔ یہ کوئی مذاق نہیں۔ موت کا سامنا ہونے پر لوگ اپنے جسم پر قابو کھو بیٹھتے ہیں خصوصاً ان مردوں کی اکثریت جنہیں بہادر سمجھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے لاشوں سے اٹے میدان جنگ جس کی آپ نے ہزاروں بار تصویر کشی کی، جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے، خون، بارود اور جلتے آہن کی بو ہی نہیں بلکہ فضلے اور گلے سڑے گوشت کا تعفن دیتے ہیں۔

میں جانتی ہوں کہ پہلی بار ہے کہ آپ نے موت کی شبیہ دیکھی ہے۔

ایک سال قبل، ایک لمبے، دبلے پتلے اور پر اسرار بوڑھے نے ایک نوجوان منی ایچر فنکار کو اپنے گھر بلایا تھا جسے جلد ہی میری تصویر کشی کرنی تھی۔ دو منزلہ گھر کی نیم تاریک کارگاہ میں بوڑھے نے فنکار نوجوان کی عنبر کی خوشبو والی عمدہ کافی سے تواضع کی جس نے نوجوان کا ذہن چست کر دیا۔ پھر نیلے دروازے والے اس کمرے میں بوڑھے نے اس فنکار کو ہندوستان کے بہترین کاغذ، گلہری کے بالوں سے بنے موقلم، سونے کے مختلف ورق، ہر طرح کے سرکنڈے کے قلم اور مرجانی دستے والے قلم تراش دکھائے، جو اس بات کا بھی اشارہ تھے کہ وہ معقول معاوضہ دے سکتا تھا۔

"اب پھر، میرے لیے موت کی تصویر بناؤ۔" بوڑھے نے کہا۔

"میں اپنی زندگی بھر میں موت کی کوئی تصویر ایک بار بھی دیکھے بغیر موت کی تصویر نہیں بنا سکتا۔" معجزاتی ہنر کے مالک منی ایچر فنکار نے کہا، جسے درحقیقت تھوڑی دیر میں ہی تصویر بنا دینی تھی۔

"ضروری نہیں کہ ہر بار تم دیکھ کر ہی کسی کی تصویر بناؤ۔" نفیس اور پرعزم بوڑھے نے قطع کلامی

کی۔

''ہاں، شاید ایسا ہی ہے۔'' منی ایچر فنکار بولا۔ ''پھر بھی اگر بے عیب تصویر بنانی ہو جیسی پرانے استاد بناتے، تو اسے بنانے سے پہلے مجھے ہزار بار مشق کرنی ہوگی۔ ایک منی ایچر فنکار چاہے کتنا ہی ماہر ہو جب وہ پہلی بار کوئی تصویر بناتا ہے تو وہ اسے کسی شاگرد کی طرح ہی بنائے گا، اور میں ایسا کبھی نہیں کرسکوں گا۔ موت کی تصویر کشی کرتے ہوئے میں اپنی مہارت کو ایک طرف نہیں رکھ سکتا، یہ تو خود میری موت کے مترادف ہوگا۔''

''ایسی موت سے شاید تم موضوع کو صحیح طرح جان جاؤ۔'' بوڑھے آدمی نے طنزیہ کہا۔

''موضوع کا تجربہ نہیں ہے جو ہمیں استاد بناتا ہے بلکہ کچھ اور تجربہ ہوتا۔''

''ایسی مہارت کے لیے موت سے شناسائی ضروری ہے۔''

یوں انھوں نے ان منی ایچر فنکاروں کی طرح جو نہ صرف پرانے استادوں بلکہ اپنی قابلیت کا بھی احترام کرتے تھے، درمز، انتہائی، دو معنی باتوں، حوالوں کے ساتھ بحث کی۔ چوں کہ زیر بحث میرا وجود تھا، میں نے ساری باتیں غور سے سنیں جس کا لب لباب میں جانتی تھی کہ ہمارے اچھے منی ایچر فنکاروں کو اس کافی خانے میں لے آتا۔ مجھے کہنے دیجیے کہ ایسا مقام آیا جب بحث مندرجہ ذیل پر تھی:

''کیا کسی منی ایچر فنکار کی قابلیت کا پیمانہ ہے کہ وہ کسی چیز کی عکاسی اتنی ہی کاملیت سے کرے جیسے عظیم استاد کرتے تھے یا تصویر میں ایسا مواد متعارف کرانے کی قابلیت جسے اور کوئی نہیں دیکھ سکتا؟'' ماہر ہاتھ، بھبوت کن نگاہیں اور ذہین مصور، اور اگرچہ وہ خود سوال کے مضمرات سے واقف تھا، وہ خاصا محتاط رہا۔

''وحشی، منی ایچر فنکار کی مہارت کا پیمانہ اس کی انوکھے موضوعات اور ایسی تکنیک کو مانتے ہیں جسے پہلے کبھی استعمال نہ کیا گیا ہو۔'' بوڑھے نے غرور سے اصرار کیا۔

''وحشی، وحشیوں کی طرح مرتے ہیں۔'' اس منی ایچر فنکار نے کہا جسے جلد ہی مجھے بنانا تھا۔

''ہماری سب اموات ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔'' بوڑھے نے کہا۔

''اساطیر اور تصویریں بیان کرتی ہیں کہ آدمی کیسے ایک دوسرے سے ممتاز ہیں نہ کہ کیسے ہر کسی کی ایک دوسرے سے مشابہت ہے۔'' عقل مند منی ایچر فنکار نے کہا۔ ''استاد منی ایچر فنکار منفرد داستانوں کی یوں عکاسی کرتا ہے کہ جیسے ہم پہلے ہی ان سے مانوس تھے۔''

اس طور، گفتگو کا رخ اطالویوں اور عثمانیوں کی اموات میں فرق، موت کے فرشتے اور اللہ کے دوسرے فرشتوں اور کیسے کافروں کی فنکاری انھیں صحیح طرح پیش نہ کرسکتی تھی، کی طرف مڑ گیا۔ نوجوان فنکار جو ابھی ہمارے کافی خانے میں اپنی خوب صورت آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا ہے، ان الفاظ پر پریشان ہو گیا، اس کے ہاتھ مضطرب ہو گئے، اسے مجھے بنانے کی آرزو ہوئی، تاہم اسے کچھ خبر نہ تھی کہ میں کیسی ہستی تھی۔ چالاک اور خود غرض بوڑھا، جو نوجوان فنکار کو پہچاننا چاہتا تھا، نوجوان کے شوق کو بھانپ گیا۔

اس پُراسرار کمرے میں بوڑھے نے تیل کے لیمپ کی مدھم روشنی میں اپنی چمکتی آنکھیں اس معجزاتی ہاتھوں والے جوان کی آنکھوں پر جما دیں۔

"موت جسے وحشی والے انسانی صورت دیتے ہیں، ہمارے لیے عزرائیل جیسی ہے۔" اس نے کہا: "ہاں، انسانی صورت میں۔ جبرائیل کی طرح، جو ہمارے نبی پاک ﷺ تک وحی لاتے تھے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟"

میں نے ادراک کیا کہ نوجوان فنکار جسے اللہ نے ہنر سے نوازا تھا مجھے بنانے کو بے چین تھا کیوں کہ شیطانی بوڑھا اس کے دماغ میں یہ شیطانی خیال ڈالنے میں کامیاب رہا تھا۔ "ہم بنیادی طور پر چاہتے ہیں کہ ایسی چیز بنائیں جو ہمیں معلوم نہ ہو، پراسرار ہو، نہ کہ ایسی چیز جس سے ہم بخوبی واقف ہوں۔"

"میں موت سے بالکل بھی واقف نہیں۔" منی ایچر فنکار نے کہا۔

"ہم سب موت سے واقف ہیں۔" بوڑھے نے کہا۔

"ہم اس سے خوف زدہ ہیں لیکن ہم اسے جانتے نہیں۔"

"پھر یہ تم پر ہے کہ تم اس خوف کی تصویر کشی کرو۔" بوڑھا بولا۔

وہ مجھے بھی اسی وقت تخلیق کرنا چاہتا تھا۔ عظیم استاد فنکار کی گردن کے پیچھے جھنجھناہٹ ہی تھی، اس کے بازوؤں کے عضلات میں تناؤ آ رہا تھا اور انگلیاں بنانے کی آرزو میں بے چین۔ لیکن چوں کہ وہ عظیم فنکاروں میں سے تھا، اس نے خود پر قابو پا لیا، یہ جانتے ہوئے کہ تناؤ اس کی روح میں تصویر بنانے کا شوق مزید گہرا کر دے گا۔

چالاک بوڑھا جانتا تھا کہ کیا ہو رہا تھا اور یہ کہ تصویر جلد مکمل ہو جائے گی، اور نوجوان میں مجھے بنانے کا شوق پیدا کرنے کے لیے اس نے اپنے سامنے دھری کتابوں میں سے اقتباس پڑھنا شروع کر دیے۔ ان کتابوں کے نام تھے الجوزی کی "حادی الارواح"، غزالی کی "زادِ آخرت" اور سیوطی۔

اور یوں، جب وہ ماہر منی ایچر فنکار اس تصویر کو بنا رہا تھا اور جسے آپ ڈرتے ڈرتے دیکھ رہے ہیں، اس نے غور سے سنا کہ کیسے موت کے فرشتے کے ہزاروں پر آسمان سے زمین تک پھیلے ہوئے تھے، مشرق کے دور دراز گوشے سے مغرب کے دور افتادہ گوشے تک۔ اس نے سنا کہ کیسے وہ پر اہل ایمان کے لیے باعث تسکین جب کہ گناہ گاروں اور سرکشوں کے لیے گوشت میں گڑے خار کی طرح انتہائی تکلیف دہ ہوں گے۔ چوں کہ منی ایچر فنکاروں کی اکثریت کا ٹھکانہ جہنم ہے، اس نے میری عکاسی میرے پورے وجود پر خار اگا کر کی۔ اس نے سنا کہ کیسے جان نکالنے کے لیے اللہ کا بھیجا فرشتہ اپنے ہمراہ اندراج نامہ لیے ہوگا جس میں تمام انسانوں کے نام درج ہیں اور کیسے چند ناموں کے گرد سیاہ دائرہ ہوگا۔ موت کے لمحے کا علم صرف اللہ کو ہے۔ جب یہ لمحہ آتا ہے تو اس کے تخت کے نیچے موجود درخت سے ایک پتا جھڑ جاتا ہے اور جو بھی اس پتے کو تھام لے، پڑھ سکتا ہے کہ کس کی موت آ پہنچی ہے۔ ان ساری وجوہات کے باعث منی ایچر فنکار

نے مجھے وحشت خیز صورت دی، لیکن متفکر بھی۔ پاگل بوڑھا پڑھتا رہا: جب موت کے فرشتے نے جو انسانی صورت میں ظاہر ہوا تھا، اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس آدمی کی روح قبض کی جس کا روئے زمین پر وقت ختم ہو چکا تھا تو سورج کی طرح ہر طرف روشنی پھیل گئی، اور یوں عقل مند منی ایچر فنکار نے مجھے اس روشنی میں نہائے دکھایا کیوں کہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مرنے والے کے گرد جمع لوگوں کو وہ روشنی دکھائی نہ دے رہی ہوگی۔ بوڑھے نے "ہادی الارواح" سے پرانے زمانے کے ان چوروں کے بارے میں پڑھا جو قبروں کی بے حرمتی کر کے کفن چراتے تھے کہ انہوں نے قبروں میں گل سڑی لاشوں کی بجائے صرف شعلے اور پچھے سے بھری کھوپڑیاں دیکھی تھیں۔ اس طرح اس منی ایچر فنکار نے یہ کہانیاں بغور سنتے ہوئے میری تصویر کشی اس طور کی کہ اس پر نگاہ ڈالنے والا ہر شخص دہشت زدہ ہو جائے۔

بعد میں اسے اپنے کیے پر پچھتاوا ہوا۔ اس خوف کے سبب نہیں جس میں اس نے تصویر کو بجھو دیا تھا بلکہ اس لیے کہ اس نے میری شبیہ بنانے کی جرأت کی تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے اس شخص کی طرح محسوس ہوا جس کا باپ اسے شرمندگی اور ندامت سے دیکھتا ہو۔ باصلاحیت منی ایچر فنکار مجھے بنانے پر پشیمان کیوں ہوا؟

1- کیوں کہ میں، موت کی شبیہ، زیادہ فنکاری سے نہیں بنائی گئی تھی۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، میں وینس فنکاروں یا ہرات کے پرانے استادوں کی بنائی تصویروں کی طرح کامل نہیں۔ میں خود اپنی بے کسی پر خجل ہوں۔ عظیم استاد نے مجھے موت کے شایانِ شان انداز میں نہیں بنایا تھا۔

2- بوڑھے کی مسلسل چالاکی کے بہکاوے میں استاد منی ایچر فنکار جس نے مجھے بنایا تھا، اس نے خود کو، اچانک اور بے ارادہ، فرنگی موسیقاروں کے انداز اور تناظر کی نقل کرتے پایا۔ اس نے اس کی روح کو پریشان کیا کیوں کہ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ پرانے استادوں کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہو رہا تھا۔

3- اس پر یہ بھی عیاں ہوا ہوگا، جیسا کہ اب کچھ ضعیف الدماغوں کو بھی معلوم ہو گیا ہے جو مجھ سے بیزار ہو چکے ہیں اور مکرر کہہ رہے ہیں: موت کوئی ہنسی مذاق کا معاملہ نہیں۔

مجھے بنانے والا منی ایچر فنکار اب ندامت کے دورے میں ہر شب گلیوں میں آوارہ پھرتا ہے، بعض چینی فنکاروں کی طرح، اس کا خیال ہے کہ وہ وہی بن چکا ہے جو اس نے بنایا تھا۔

میں ہوں ایستھر

قرمزی مینارے اور قرہ دروازے کے علاقوں کی خواتین نے بالاجک شہر کے گلابی اور سرخ رنگ کمبلوں کی فرمائش کی تھی، سو میں نے صبح سویرے اپنی گٹھڑی بنالی۔ ایک بڑا سا کپڑا جس میں میں اپنی اشیا ڈال کر باندھ لیتی تھی۔ میں نے سبز چمکتی ریشمی کپڑا نکالا جو بے ہٹالی تاجر حال ہی میں لایا تھا لیکن وہ فروخت نہ ہو رہا تھا اور اس کی جگہ زیادہ پرکشش کپڑا رکھ لیا۔ ختم ہونے والے سرما کی لگاتار برف باری کے سبب میں نے کافی ساری رنگین جرابیں، اونی شف اور بنیانیں احتیاط کے ساتھ تہ کر کے گٹھڑی کے بیچ رکھیں۔ جب میں اپنی گٹھڑی کھولتی تو رنگوں کا گلدستہ سا کھلتا کہ سرد مہر ترین عورتوں کے دل بھی لبھائے جاتے تھے۔ اس کے بعد میں نے کچھ چھپے مگر قیمتی ریشمی رومال، جوتے، ساقیاں رکھیں، خصوصاً ان عورتوں کے لیے جو مجھے خریداری کی بجائے گپ شپ کے لیے بلاتی تھیں۔ میں نے گٹھڑی اٹھائی۔ خدایا، یہ تو بہت بھاری ہے، یہ میری کمر ہی توڑ دے گی۔ میں نے اسے زمین پر رکھ کر کھولا اور دیکھنے لگی کہ کیا نکالا جا سکتا تھا، تبھی مجھے دروازے پر دستک سنائی دی۔ نسیم نے دروازہ کھولا اور مجھے آواز دی۔

یہ وہی کنیز خیریے تھی، سرخ چہرہ لیے شرماتی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔

"شکورے نے بھیجا ہے۔" وہ بولی۔ وہ کنیز اتنی مضطرب تھی کہ آپ خیال کرتے کہ وہی محبت میں گرفتار تھی اور شادی کرنا چاہتی تھی۔

بے دلی سے میں نے اس سے خط جھپٹ لیا۔ میں نے اس احمق سے کہا کہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر فوراً گھر لوٹ جائے۔ نسیم نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے وہ بڑی لیکن قدرے ہلکی گٹھڑی اٹھائی جو میں خطوط پہنچاتے فریب دینے کو ساتھ لے جاتی ہوں۔

"شکورے، استاد انشتے کی بیٹی، محبت کی آگ میں جل رہی ہے۔ بے چاری اپنا ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔" میں نے بتایا۔

میں نے ہنس کر گھر سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ شرمندگی نے مجھے گرفت میں لے لیا۔ اگر سچ کہا جائے تو مجھے شکورے کے پیام ناموں کی ہنسی اڑانے کی بجائے اس کی حالت پر آنسو بہانے چاہئیں۔ میری

سیاہ چشم بچی کتنی اداس ہے!

میں تیزی سے یہودی محلے کے شکستہ حال گھروں سے آگے نکلی جو صبح کی خنکی میں مزید ویران اور خستہ حال دکھائی دے رہے تھے۔ کافی بعد جب مجھے وہ اندھا بھکاری نظر آیا جو ہمیشہ حسن کی گلی کے نکڑ پر کھڑا ہوتا تھا تو میں جتنی اونچی آواز نکال سکتی تھی، اس میں بولی ''کپڑے والی!!!''

''موٹی جادوگرنی!'' وہ بولا، ''اگر تم نہ بھی چیختیں تو میں نے تمہارے قدموں کی چاپ سے تمہیں پہچان لیتا۔''

''تم بیکار اندھے!'' میں نے جواب دیا، ''تم بدبخت تاتاری! تم جیسے اندھوں پر اللہ کا عذاب نازل ہو۔ خدا کرے وہ تمہیں ویسی ہی سزا دے جس کے تم مستحق ہو۔''

ماضی میں ایسی بات مجھے برہم نہ کرتی۔ میں انھیں بالکل سنجیدگی سے نہ لیتی تھی۔ حسن کے باپ نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک ابخازی تھا شریف النفس اور نرم مزاج۔

''آؤ دیکھیں کہ اس بار تم کیا لائی ہو؟'' اس نے کہا۔

''کیا تمہارا سستی مارا بیٹا ابھی تک سو رہا ہے؟''

''وہ کیسے سو سکتا ہے؟ وہ منتظر ہے جیسے تم سے کوئی خبر لانے کی توقع ہے۔''

گھر اس قدر اندھیرا ہے کہ ہر بار یہاں داخل ہونے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی مقبرے میں آ گئی ہوں۔ شکورے نے کبھی نہیں پوچھا وہ کیا کرنے والے ہیں لیکن میں ہمیشہ اس گھر کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہتی تا کہ وہ اس اندھیرے غار سے نکلنے کا کبھی سوچے بھی نہیں۔ یہ تصور بھی محال ہے کہ حسین شکورے بھی اس گھر کی مالکہ تھی اور اپنے شریر بیٹوں کے ساتھ یہاں رہتی تھی۔ اندر، نیند اور موت کی باس تھی۔ مزید تاریکی میں آگے بڑھتی ہوئی میں اگلے کمرے میں داخل ہوئی۔

اپنا ہاتھ تک سجھائی نہیں دیتا تھا۔ مجھے حسن کو خط پیش کرنے کا بھی موقع نہ ملا۔ وہ اندھیرے سے نمودار ہوا اور میرے ہاتھ سے خط جھپٹ لیا۔ ہمیشہ کی طرح میں نے اسے خط پڑھنے اور اپنے تجسس کی پیاس بجھانے کو تنہا چھوڑ دیا۔ جلد ہی اس نے اپنا سر رقعے سے اوپر اٹھایا۔

''اور کچھ نہیں؟'' اس نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ''یہ تو مختصر سا رقعہ ہے۔'' اس نے کہا اور پڑھنے لگا:

''قرہ آفندی! تم ہمارے گھر آتے اور سارا دن یہیں گزارتے ہو۔ تاہم، میں نے سنا ہے کہ تم نے میرے بابا کی کتاب کی اب تک ایک سطر تک نہیں لکھی۔ اس کتاب کو مکمل کرنے سے پہلے زیادہ امیدیں نہ باندھو۔''

خط کو ہاتھ میں لیے اس نے الزام وہ نظروں سے مجھے گھورا، جیسے یہ سب میرا قصور ہو۔ مجھے اس گھر میں ایسی خاموشی پسند نہیں۔

"اس میں اس کی شادی یا اس کے شوہر کی محاذِ جنگ سے واپسی کا کوئی ذکر نہیں۔" اس نے کہا۔

"کیوں؟"

"مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ کیوں؟" میں نے کہا۔ "یہ معاملات تو نہیں الجھتی۔"

"بعض اوقات مجھے اس پر بھی حیرت ہوتی ہے۔" اس نے ہولے کے ساتھ چاندی کے پندرہ سکے دیتے ہوئے کہا۔

"کچھ لوگ زیادہ کمانے لگیں تو زیادہ کنجوس ہو جاتے ہیں۔ تم ایسے نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

اس شخص کی شخصیت کا کوئی مسحور کن اور ذہین پہلو تھا کہ جس باعث اپنی تمام بری اور خبیث عادتوں کے باوجود، کوئی بھی دیکھ سکتا تھا کہ شکورے اب بھی اس کے اطوار قبول کرتی تھی۔

"شکورے کے بابا کی یہ کتاب ہے کیا؟"

"تم جانتے ہو لوگ کہتے ہیں ہمارے سلطان اس منصوبے کے لیے رقم فراہم کر رہے ہیں۔"

"منی ایچر فنکار اس کتاب کی تصویروں پر ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔" اس نے کہا۔ "کیا یہ دولت کا لالچ ہے یا... خدا معاف کرے... کیوں کہ کتاب میں ہمارے مذہب کی توہین کی گئی ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ بصارت کھونے کو اس کتاب کا ایک ورق دیکھ لینا بہت ہے۔"

اس نے یہ سب یوں مسکراتے ہوئے کہا کہ میں جانتی تھی کہ مجھے اسے سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے۔ چاہے یہ معاملہ سنجیدہ ہی تھا تب بھی اس کے پاس سنجیدگی سے لینے کو کچھ نہیں تھا۔ ان متعدد مردوں کی طرح جو قاصد اور ثالث کے طور پر مجھ پر انحصار کرتے ہیں، جب حسن کی انا مجروح ہوئی تو وہ مجھ پر بگڑ گیا۔ میں نے اپنی ذمہ داری کے طور پر، اس کی دلجوئی کے لیے یوں دکھاوا کیا کہ میں پریشان ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس جب لڑکیوں کے جذبات مجروح ہوتے تھے تو وہ مجھے گلے لگا کر رو دیتی تھیں۔

"تم ایک ذہین عورت ہو۔" حسن نے میری انا کی تسلی کی خاطر کہا۔ "اسے فوراً پہنچا دو۔ میں اس احمق کے جواب کے بارے متجسس ہوں۔"

لمحے بھر کو میرا جی چاہا کہ کہوں "قرہ اتنا بھی احمق نہیں۔" ایسی صورت حال میں حریفوں کو باہمی حسد کا شکار کر کے ہی ایستھر زیادہ کمائے گی۔ لیکن میں اس کی برہمی سے خائف تھی۔

"تم گلی کے نکڑ والے تاتاری بھکاری کو جانتے ہو؟" میں نے کہا۔ "وہی جو بہت گنوار ہے۔"

احمق سے بچنے کے لیے میں گلی کے دوسری طرف سے ہوتے ہوئے نکلی اور یوں صبح مرغ فروش بازار سے گزری تھی۔ مسلمان مرغیوں کے سری پائے کیوں نہیں کھاتے؟ کیوں کہ وہ اتنے عجیب ہوتے ہیں؟ میری دادی، خدا اسے جنت نصیب کرے، مجھے بتایا کرتی کہ جب ان کا خاندان پرتگال سے نکال آیا تو مرغی کے پنجے اتنے سستے ہوتے تھے کہ وہ انہیں کھانے کے لیے ابالتے تھے۔

کمارارلک (Kemeraralik) میں میں نے ایک عورت کو اپنے لفافوں کے ساتھ کسی مرد کی

طرح گھوڑے پر سوار دیکھا تھا۔ وہ جتنی مغرور ہو سکتی تھی، اتنی ہی تھی، شاید وہ کسی پاشا کی بیوی یا اس کی دولت مند بیٹی تھی۔ میں نے آہ بھری۔ اگر شکورے کا باپ صرف کتابوں میں ہی اتنا گم نہ ہوتا، اگر اس کا شوہر صفوی جنگ سے مال غنیمت کے ہمراہ واپس لوٹ آیا ہوتا تو شکورے بھی شاید اس مغرور عورت کی طرح رہتی۔ ہر کسی سے بڑھ کر اسے ایسی زندگی گزارنے کا حق تھا۔

قرہ کی گلی میں مڑتے ہی میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ کیا میں چاہتی تھی کہ شکورے اس شخص سے شادی کرے؟ میں شکورے کو حسن کے ساتھ اور اسی دوران الگ رکھنے میں بھی کامیاب تھی۔ لیکن اس قرہ کا کیا ہوگا؟ وہ شکورے کی محبت کے سوا اپنی زندگی کے ہر پہلو پر مکمل اختیار رکھتا تھا۔

''کیرا ہوالی!!!''

تنہائی کے ستائے عاشقوں یا بیوی یا شوہر کے بغیر رہنے والوں کو خط پہنچانے کی خوشی کا کوئی بدل نہیں۔ چاہے انھیں بدترین خبر کا یقین ہی ہو، جب وہ خط پڑھتے کو ہوتے ہیں تو امید بھری کپکپی ان پر طاری ہو جاتی ہے۔

اپنے شوہر کی واپسی کا ذکر کرکے اسے ''زیادہ توقع مت رکھنا'' کی تنبیہ کرکے بیٹھا شکورے نے قرہ کو پرامید رہنے سے زیادہ ہی روک دیا تھا۔ خوشی سے میں اسے خط پڑھتے دیکھتی رہی۔ وہ اتنا خوش تھا کہ مخبوط الحواس ہو گیا تھا، خائف بھی۔ قرہ جب جواب لکھنے لگا تو میں نے عقل مند کپڑا فروش کی طرح اپنی گٹھڑی کھولی اور اس سے ایک جو نکالا جو میں نے ہیگی تجسس مالکہ مکان کو بیچنے کی کوشش کی۔

''یہ عمدہ ایرانی مخمل کا ہے۔''

''میرا بیٹا فارس کی جنگ میں مارا گیا تھا۔'' وہ بولی، ''تم قرہ کے لیے کس کے خط لاتی ہو؟''

میں اس کا چہرہ پڑھ سکتی تھی کہ وہ اپنی بیٹی یا کون جانے وہ کس کی بیٹی تھی، کا رشتہ جواں مرد قرہ سے کرنا چاہتی تھی۔

''کسی کے نہیں۔'' میں نے کہا، ''اس کا ایک غریب رشتے دار بیرام پاشا شفاخانے میں بستر مرگ پر ہے اور اسے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔''

''او خدایا۔'' اس نے بے یقینی سے کہا، ''کون ہے وہ بدقسمت آدمی؟''

''تمہارا بیٹا جنگ میں کیسے مارا گیا؟'' میں نے خود سری سے پوچھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو کینہ توزی سے گھورنے لگیں۔ وہ بیوہ تھی اور بالکل اکیلی۔ اس کی زندگی ضرور بڑی مشکل رہی ہوگی۔ اگر آپ بھی استھر کی طرح کپڑا فروش اور پیغام بر بنیں تو آپ جلدی جان لیں گے کہ صرف دولت، طاقت اور افسانوی محبت ہی لوگوں کے تجسس کو ہوا دیتے ہیں۔ اس کے سوا باقی سب کچھ صرف پریشانی، جدائی، حسد، تنہائی، وحشی، آنسو، افواہیں اور نہ ختم ہونے والی غربت ہے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، گھر کے فرنیچر کی طرح: زنگ آلود علم یا قالین، کفگیر اور تانبے کا چھوٹا سا برتن، چمٹے اور

itsurdu.blogspot.com

چولہے کے پاس رکھا راکھ دان، دو شکستہ الماریاں —— ایک بڑی، ایک چھوٹی —— بیوہ کی تنہائی کو چھپانے کو چوبی تانے کی جگہ اور چوروں کو بھگانے کو ایک پرانی تلوار۔

قرو جلد ہی اپنا بٹوہ لیے واپس آیا۔ "کپڑا فروش عورت!" اس نے میری بجائے دخیل انداز مالک مکان کو سنانے کو کہا۔ "یہ لے جاؤ اور ہمارے مریض کو پہنچا دینا۔ اگر وہ مجھے کوئی جواب دینا چاہے تو میں منتظر ہوں۔ تم مجھے استاد وشتے کے ہاں مل سکتی ہو، جہاں میں باقی دن گزاروں گا۔"

اس سب کھیل کی ضرورت نہ تھی۔ کوئی سبب نہ تھا کہ قرو جیسا بہادر نوجوان اپنی عشقیہ حرکتیں، ملنے والے پیام، رومال اور وہ خط چھپاتا جو وہ اس لڑکی کی جستجو میں بھیجتا ہے۔ یا کیا وہ واقعی اپنی مالک مکان کی بیٹی پر نظر رکھتا ہے؟ مجھے قرو پر ذرا بھی بھروسہ نہ تھا اور خدشہ تھا کہ وہ شکورے کو فریب دے رہا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ شکورے کے گھر میں سارا دن گزارنے کے باوجود وہ اسے کوئی اشارہ دینے کے ناقابل تھا؟

باہر نکل کر میں نے بٹوہ کھولا۔ اس میں چاندی کے بارہ سکے اور ایک خط تھا۔ میں خط کے بارے میں اتنی متجسس تھی کہ میں حسن کے گھر کی طرف بھاگ ہی پڑی۔ سبزی فروشوں نے اپنی دکانوں کے باہر گوبھی، گاجریں اور دوسری سبزیاں لگا رکھی تھیں۔ میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ میں ہری پیاز کو چھو ہی سکوں۔

میں ذیلی گلی کا موڑ مڑی اور مجھے وہ (ایک) چھت داری دکھائی دیا جو میری جیب جھاڑنے وہاں تھا۔ "تھو!" میں نے اس کی سمت تھوکا، یہی کافی تھا۔ یہ سخت مزاج لوگ ایسے آوارہ گردوں کو کیوں نہیں مارتی؟

حسن جب خاموشی سے خط پڑھ رہا تھا تو میں بمشکل صبر کر رہی تھی۔ آخر کار خود پر قابو پانے میں ناکام ہو کر میں نے اچانک کہا: "ہاں؟" اور وہ با آواز بلند خط پڑھنے لگا۔

"عزیز از جان شکورے! تم نے درخواست کی ہے کہ میں تمہارے بابا کی کتاب مکمل کروں۔ تم یقین کرو کہ میرا کوئی اور مقصد ہے بھی نہیں۔ میں تمہارے گھر اسی مقصد کے تحت آتا ہوں، نہ کہ تمہیں تنگ کرنے، جیسا کہ تم نے پہلے ذکر دیا تھا۔ میں بخوبی واقف ہوں کہ تمہیں اپنے لیے میری محبت سے کوئی سروکار نہیں۔ پھر بھی اس محبت کے سبب، میں قلم اٹھا کر وہ نہیں لکھ پا رہا جو تمہارے بابا —— میرے پیارے خالو —— نے اپنی کتاب کے لیے درخواست کی ہے۔ جب بھی مجھے گھر میں تمہاری موجودگی محسوس ہوتی ہے، میں اس کی گرفت میں آ جاتا ہوں اور تمہارے بابا کے کسی کام کا نہیں رہتا۔ میں نے اس پر بڑا غور کیا ہے اور اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے: بارہ برس بعد میں صرف ایک بار تمہارا چہرہ دیکھ پایا ہوں اور وہ بھی تب جب تم کھڑکی میں آئی۔ مجھے اس تصور کے گم ہونے کا ڈر ہے۔ اگر میں تمہیں ایک مرتبہ اور قریب سے دیکھ لوں تو میرا یہ خوف محو ہو جائے گا اور میں با آسانی تمہارے بابا کی کتاب مکمل کر سکوں گا۔ کل شوکت مجھے پھانسی شدہ یہودی کے ویران گھر میں لے گیا تھا۔ وہاں ہمیں کوئی نہ دیکھ پائے گا۔ آج تم جو وقت مناسب سمجھو، میں وہاں جا کر تمہارا انتظار کروں گا۔ کل شوکت نے مجھے بتایا کہ تم نے خواب میں دیکھا کہ تمہارا شوہر مر چکا ہے۔"

حسن نے خط جراحیہ انداز میں پڑھا، کسی جگہ وہ اپنی بلند آواز کسی عورت کی طرح مزید بلند کر لیتا

اور کبھی اس عاشق کی آواز کی نقل کرتا جو لرز رہی ہو۔ قرہ کے فارسی میں اپنی تمنا لکھنے کہ: "یہ شامی یہودی فقط ایک بار (صرف ایک مرتبہ تمہیں دیکھنے کو)" کا بھی حسن نے مضحکہ اڑایا۔ اس نے مزید کہا، "جیسے ہی قرہ نے دیکھا کہ شکورے نے اسے کچھ امید دلائی ہے، وہ فوراً ہی بات بڑھانے پر اتر آیا۔ کوئی اصلی عاشق ایسا معمول قول نہیں کرے گا۔"

"وہ شکورے کی سچی محبت میں گرفتار ہے۔" میں نے بے وقوفی سے کہا۔

"یہ تبصرہ ثابت کرتا ہے کہ تم قرہ کی طرف دار ہو۔ اگر شکورے نے لکھا کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ میرا بڑا بھائی مر چکا ہے تو اس کا مطلب کہ وہ اپنے شوہر کی موت تسلیم کر رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"وہ تو بس ایک خواب تھا۔" میں نے کسی احمق کی طرح کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ شوکت کتنا ہوشیار اور ذہین ہے۔ ہم کئی برس ساتھ رہے ہیں! وہ اپنی ماں کی اجازت اور اس کے اکسانے کے بغیر قرہ کو پھانسی شدہ یہودی کے گھر کبھی نہ لے جاتا۔ اگر شکورے کا خیال ہے کہ اس کا میرے بھائی سے، ہم سے تعلق ختم ہو گیا ہے تو وہ غلطی پر ہے میرا بڑا بھائی ابھی زندہ ہے اور وہ جنگ سے ضرور واپس لوٹ آئے گا۔"

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے وہ دوسرے کمرے میں گیا جہاں اس کا شمع جلانے کا ارادہ تھا لیکن وہ صرف اپنا ہاتھ ہی جلا پایا۔ وہ چیخا۔ جلے حصے کو چاٹتے اس نے شمع روشن کی اور اسے اپنی میز کے ساتھ رکھا۔ اس نے سرکنڈے کا قلم اٹھایا اور اسے دوات میں ڈبو کر تیزی سے کاغذ کے ایک رقعے پر لکھنے لگا۔ میں نے اس کی خوشی کو محسوس کیا کہ میں اسے دیکھ رہی تھی اور یہ دکھانے کو کہ میں ڈری نہیں، مسکرا دی۔

"پھانسی شدہ یہودی کون ہے؟ تمہیں معلوم ہی ہو گا۔" اس نے پوچھا۔

"ان گھروں سے آگے ایک زرد رنگ کا گھر ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ سابق سلطان کے پسندیدہ طبیب اور امیر ترین شخص موشے ہامون (Moshe Hamon) نے برسوں اپنی اماسیا کی یہودی داشتہ اور اس کے بھائی کو وہاں چھپائے رکھا۔ برسوں پہلے اماسیا میں یہودیوں کی عید کے موقع پر جب ایک یونانی نوجوان مفروضہ طور پر یہودی علاقے میں "غائب" ہو گیا، لوگوں کا دعویٰ تھا کہ اسے اس لیے مار دیا گیا کہ اس کے خون سے فطیری روٹی بنائی جا سکے۔ جب جھوٹے گواہ لائے گئے تو یہودیوں کی پھانسیاں شروع ہو گئیں، تاہم سلطان کے پسندیدہ طبیب نے اس عورت اور اس کے بھائی کی فرار میں مدد کی اور سلطان کی اجازت سے انہیں چھپائے رکھا۔ سلطان کی موت کے بعد اس کے دشمن اس خوب صورت عورت کو تو نہ ڈھونڈ سکے، لیکن انہوں نے اس کے بھائی کو پھانسی دے دی جو تنہا رہ رہا تھا۔"

"اگر شکورے میدان جنگ سے میرے بھائی کی واپسی کا انتظار نہیں کرتی تو اسے سزا دی جائے گی۔" حسن نے مجھے خط تھماتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر خفگی یا غم و غصہ تھا، وہاں تو محبت کے مارے کسی شخص کی بدنصیبی اور رنج

تھے۔ مجھے اچانک اس کی آنکھوں میں دکھائی دیا کہ محبت نے اس کی عمر کتنی تیزی سے بڑھا دی تھی۔ محکمہ مال کی نوکری سے ہونے والی آمدنی نے اسے بالکل بھی جوان نہ کیا تھا۔ اس کے غصے بھرے تیوروں اور دھمکیوں کے باوجود مجھ پر عیاں تھا کہ شاید وہ ایک مرتبہ پھر مجھ سے پوچھے کہ شوربے کو پکانے کا طریقہ کیا تھا۔ لیکن وہ بدی کے اتنا قریب تھا کہ پوچھ ہی نہ پایا۔ جب کوئی بدی کو قبول کرے — محبت میں مسترد کیے جانا اس کا اہم سبب ہے — تو وہ تیزی سے بے رحمی پر اتر آتا ہے۔ میں اپنے خیالات پر خوف زدہ ہو گئی اور اس سرخ تلوار سے بھی جس بارے میں لوگ بات کرتے تھے جو ہر چھونے والی شے کو کاٹ دیتی تھی۔ گھبراہٹ کے عالم میں باہر نکلنے کی جلدی میں میں نے گلی میں ٹھوکر کھائی۔

یوں بے خبری میں میں اس تاتاری بھکاری کی لعن طعن کا شکار ہوئی۔ لیکن میں نے فوراً اپنے حواس بحال کیے۔ میں نے زمین سے اٹھایا ایک چھوٹا سا کنکر اس کے رومال میں ڈالا اور بولی: ''یہ لو، خارش زدہ تاتاری!''

بغیر غصے میں نے اس کا ہاتھ [illegible] کی طرف بڑھتے دیکھا، جو اس کے خیال میں سکہ تھا۔ اس کی لعن طعن کو نظر انداز کر کے میں اپنی ایک ''بیٹی'' کی طرف چلی گئی جسے میں نے ایک اچھا شوہر تلاش کر کے دیا تھا۔

میری اس پیاری ''بیٹی'' نے مجھے پالک کی کچوری کھلائی جو ابھی تک خستہ تھی۔ سہ پہر کے کھانے کے لیے وہ پھینٹے ہوئے انڈوں اور ترش آلو بخارے سے بنی چٹنی کے ساتھ بچھڑے کا گوشت بنا رہی تھی۔ اس کو مایوس نہ کرنے کو، میں نے انتظار کیا اور تازہ روٹی کے ساتھ وہ بڑے بیج سالن کھایا۔ اس نے انگور کا میٹھا بھی بنا رکھا تھا۔ جھجکے بغیر میں نے اس سے گل قند مانگی جسے میں نے انگور کے میٹھے میں ڈال کر کھایا۔ اس کے بعد، میں اپنی اور اس شوربے کو خطوط پہنچانے چل دی۔

میں، شکورے

میں ان کپڑوں کو تہ کر کے رکھ رہی تھی جو کل دھو کر خشک ہونے کے لیے پھیلائے گئے تھے جب نیرے نے آکر بتایا کہ ایستھر آئی تھی ...... یا میرا آپ کو یہی بتانے کا ارادہ تھا۔ لیکن میں جھوٹ کیوں بولوں؟ ٹھیک ہے پھر، جب ایستھر آئی تو میں الماری کے سوراخ سے لگی اپنے بابا اور قرہ کو چھپ کر دیکھ رہی تھی اور قرہ اور حسن کے خطوط کا بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہی تھی، اور یوں وہ پہلے ہی میرے ذہن میں تھی۔ جیسے ہی میں نے محسوس کیا کہ میرے بابا کے موت کے خوف باجواز تھے، مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قرہ کی مجھ میں دلچسپی دائمی نہ تھی۔ وہ اس لیے محبت میں گرفتار تھا کہ وہ شادی کرنا چاہتا تھا اور چوں کہ وہ شادی کرنا چاہتا تھا، اس لیے وہ آسانی سے محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اگر میں نہیں، تو وہ کسی اور سے شادی کر لیتا، یہ خیال کرتے کہ وہ پہلے اس سے محبت کرنے لگے۔

نیرے نے مجھے قصوروار نگاہ سے دیکھتے ایستھر کو باورچی خانے میں بٹھا کر عرق گلاب کے شربت کا گلاس دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ چوں کہ نیرے میرے باپ کی داشتہ بن چکی تھی، شاید اس لیے وہ جو دیکھتی ہے، انہیں بتاتی ہوگی۔ مجھے خدشہ ہے کہ یہی معاملہ ہوگا۔

''میری سیاہ چشم بچی، میری بدنصیب حسینہ، حسیناؤں میں مبہوت کن حسن کی مالکہ! مجھے اپنے شوہر نسیم کی وجہ سے دیر ہوئی، اس نے ہر طرح کی حماقتوں سے مجھے مصروف رکھا۔'' ایستھر نے کہا، ''تمہارا کوئی شوہر نہیں جو تمہیں فضول تنگ کرتا رہے اور امید ہے کہ تم اس کی قدر جانتی ہو۔''

اس نے خطوط نکالے اور میں نے انہیں اس سے جھپٹ لیا۔ نیرے ایک ایسے کونے میں چلی گئی جہاں وہ ہمارے درمیان نہ آتی، لیکن ہمارے درمیان ہونے والی تمام باتیں سن سکتی تھی۔ تاکہ ایستھر میرے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ پائے، میں نے رخ دوسری طرف کر کے قرہ کا خط پہلے پڑھا۔ جب میں نے پھانسی شدہ یہودی کے گھر کے بارے میں سوچا تو ایک لمحے کو میرے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ ''دوست شکورے، تم کسی بھی صورت حال کو سنبھال سکتی ہو۔'' میں نے خود سے کہا اور حسن کا خط پڑھنے لگی۔ وہ دیوانگی کے کنارے پر تھا:

''شکورے، میں تمہاری چاہت میں جل رہا ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ تمہیں ذرہ برابر پرواہ نہیں۔ اپنے خوابوں میں میں خود کو پہاڑوں کی ویران چوٹیوں پر تمہارا پیچھا کرتے پاتا ہوں۔ ہر بار جب تم میرے کسی خط... میں جانتا ہوں تم انہیں پڑھتی ہو... کا جواب نہیں دیتیں تو کوئی تیر میرے دل کے آر پار ہو جاتا ہے۔ میں اس امید پر خط لکھ رہا ہوں کہ تم اس بار جواب دو گی۔ یہ بات پھیلی ہوئی ہے، ہر کوئی اس خبر کو پھیلا رہا ہے، حتیٰ کہ تمہارے بچے بھی کہہ رہے ہیں: تم نے خواب میں دیکھا کہ تمہارا شوہر مر گیا ہے اور تم یہ دعویٰ کرتی ہو کہ تم اب آزاد ہو۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سچ ہے یا نہیں۔ میں بس یہ جانتا ہوں کہ تمہاری شادی میرے بڑے بھائی سے ہوئی ہے اور تم اس خاندان کا حصہ ہو۔ اب جب کہ بابا بھی مجھے درست سمجھتے ہیں، ہم قاضی سے رجوع کریں گے تاکہ تمہیں واپس یہاں لے آئیں۔ ہم ان آدمیوں کے ساتھ آئیں گے جنہیں ہم نے جمع کر لیا ہے، سو اپنے بابا کو پیشگی تنبیہ کر دو۔ اپنا سامان جمع کر لو، تمہیں اب اس گھر میں آنا ہے۔ اپنا جواب ایستھر کے ہاتھ فوراً بھیجو۔''

دوسری بار خط پڑھنے کے بعد میں نے خود کو مجتمع کیا اور سوالیہ نظروں سے ایستھر کو دیکھا لیکن اس نے حسن یا قرہ کے بارے میں کوئی نئی بات نہ بتائی۔

میں نے وہ قلم نکالا جو میں نعمت خانے کے کونے میں رکھتی تھی اور روٹیاں بنانے والے چکلے پر کاغذ رکھ کر قرہ کو خط لکھنے والی تھی کہ اپنی جگہ منجمد ہو گئی۔

میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔ میں ایستھر کی طرف مڑی۔ وہ کسی موٹے سے بچے کی خوشی سے شربت کا گلاس پی رہی تھی اور یوں مجھے یہ بات احمقانہ لگی کہ وہ میری سوچ سے آگاہ تھی۔

''دیکھو، تم کیسا میٹھا مسکرا رہی ہو۔'' اس نے کہا، ''فکر نہ کرو، آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ استنبول ایسے امیر شرفا اور پاشاؤں سے بھرا ہے جو تمہاری مبہوت کن حسن کی مالک، جو سلیقہ مند بھی ہے، سے شادی کے لیے اپنی جان بھی دے دیں گے۔''

آپ سمجھ گئے ناں کہ میں کیا سوچ رہی ہوں: بعض اوقات آپ اپنی کہی بات کے قائل ہوتے ہیں، لیکن الفاظ کے زبان سے نکلتے ہی کہ آپ خود سے پوچھتے ہیں: ''میں نے یہ بات اتنی نیم دلی سے کیوں کی، اگرچہ مجھے اس کا مکمل یقین تھا۔'' یہ کہتے میرے ساتھ یہی ہوا تھا:

''لیکن ایستھر، دو بچوں والی بیوہ سے کون شادی کرے گا؟''

''تمہاری جیسی بیوہ؟ بہت سے، قاتل حسینہ۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں اسے پسند نہیں کرتی۔ میں اس قدر خاموش ہو گئی کہ وہ جان گئی کہ میں اسے خط نہیں دینے والی تھی اور حتیٰ کہ بہتر تھا کہ وہ چلی جاتی۔ ایستھر کے جانے کے بعد، میں نے گھر کے اندر اپنے مخصوص گوشے میں پناہ لی یوں جیسے میں خود ..... کیسے کہنا چاہیے ..... اپنی روح میں پھیلی خاموشی محسوس کر سکتی تھی۔

دیوار سے ٹیک لگائے میں دیر تک اندھیرے میں کھڑی رہی۔ میں نے اپنے بارے میں سوچا، کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، اس خوف کے بارے میں جو میرے اندر بڑھ رہا تھا۔ اس دوران، میں شوکت اور اورحان کو اوپری منزل میں باتیں کرتے سن سکتی تھی۔

''تم لڑکیوں کی طرح ڈرپوک ہو۔'' شوکت نے کہا۔ ''تم صرف پیچھے سے حملہ کرتے ہو۔''

''میرا دانت ہل رہا ہے۔'' اورحان نے کہا۔

اسی وقت میرے دماغ کا دوسرا حصہ، بابا اور قرہ کے درمیان ہونے والی باتوں پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔

کتاب خانے یا کارگاہ کا نیلا دروازہ کھلا تھا اور میں ان کی آوازیں با آسانی سن سکتی تھی: ''وینس فنکاروں کی تصویریں دیکھنے کے بعد ہمیں اپنی وحشت کا ادراک ہوا۔'' میرے بابا کہہ رہے تھے، ''یہ کہ تصویر میں آنکھیں چہرے پر صرف سوراخ نہیں ہو سکتیں، ہمیشہ ایک سی، بلکہ وہ بالکل ہماری آنکھوں کی طرح ہونی چاہیے جو آئینے کی طرح روشنی منعکس کرتی ہیں اور اسے کنویں کی طرح جذب کرتی ہیں۔ ہونٹ چہرے کے درمیان کسی کاغذ کی طرح سپاٹ شگاف نہیں ہو سکتے، بلکہ انہیں تاثرات کا ابھار ہونا چاہیے، سب سرخ رنگ کے الگ عکس میں... ہلکی سی نمی سے ہماری خوشیوں، غموں اور جذبوں کا مکمل اظہار کرتے ہوئے۔ ہماری ناک اب اس طرح کی دیوار نہیں لگتی جو ہمارے چہروں کو دو حصوں میں تقسیم کرے بلکہ اسے ہم سب کے چہروں کا ایک منفرد، زندہ اور متجسس حصہ ہونا چاہیے۔''

کیا قرہ میری طرح حیران تھا جب میرے بابا نے ان کا فرشرفا کا حوالہ دیا جنھوں نے اپنی تصویریں ''ہماری'' طرح بنوائیں۔ سوراخ سے قرہ کا چہرہ اتنا دکھائی دیا کہ میں کچھ دیر کو چونکی ہوگی۔ میرے سیاہ رنگ محبوب، مشکل میں گرفتار میرے سورما، کیا تم میرے متعلق سوچتے رات بھر سو نہیں پائے؟ کیا اس وجہ سے تمہارے چہرے کی سرخی غائب ہوگئی ہے؟

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ قرہ دراز قد، دبلا پتلا اور وجیہہ آدمی ہے۔ اس کی پیشانی کشادہ، آنکھیں بادامی اور مضبوط، سیدھی اور نفیس ناک ہے۔ بچپن کی طرح اب بھی اس کے ہاتھ لمبے اور دبلے ہیں اور انگلیاں سراسیمہ اور پھرتیلی ہیں۔ وہ دبلا پتلا ہے اور چوڑے شانوں کے ساتھ سیدھا کھڑا بلند قامت ہے، ستون جتنے چوڑے شانے نہیں۔ جب وہ نوعمر تھا، اس کا جسم اور چہرہ ابھی پوری طرح پروان نہ چڑھے تھے۔ بارہ سال بعد جب میں نے اس پر نگاہ کی تو میں فوراً جان گئی کہ اس کی ایک طرح تکمیل ہوگئی تھی۔

اب جب میں سوراخ کے قریب آنکھ لے جاتی ہوں تو مجھے اس کے چہرے پر دو پریشانی نظر آتی ہے جو اسے کھائے جا رہی ہے۔ مجھے ایک ساتھ ہی احساسِ خطا اور فخر ہوا کہ اس نے میرے سبب اتنی تکلیفیں جھیلیں۔ کتاب کے لیے بنائی گئی تصویر کو بالکل بچوں کی سی معصومیت سے دیکھتے ہوئے وہ میرے بابا کو سنتا رہا۔ اسی وقت، جب میں نے اسے کسی بچے کی طرح اپنا گلابی منہ کھولتے دیکھا، غیر متوقع طور پر، ہاں، میرا ای

چاہا اسے پہنالوں۔ میری انگلیاں اس کی گردن پر اور اس کے بالوں کو سہلاتی ہوئیں۔ قرہ اپنا سر میرے سینے پر رکھے گا۔ یہ جاننے کے بعد کہ صرف میری محبت ہی اسے سکون بخشے گی، وہ میرا پابند ہو کر رہ جائے گا۔

مجھے ہلکا سا پسینہ آ گیا اور میں نے تصور کیا کہ قرہ چاہت سے مجھے دیکھ رہا تھا... بجائے اس شیطان کی تصویر کا جائزہ لینے کے جو میرے بابا اسے دکھا رہے تھے۔ یوں جیسے میرے تصور کے نشے میں مخمور وہ میرے بالوں، گردن بلکہ میرے پورے وجود کو دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے لیے اتنی کشش محسوس کرتا تھا کہ ان باتوں کو زبان دے رہا تھا جو وہ نوعمری میں نہ کہہ پایا تھا۔ اس کی نظروں سے میں نے جان لیا کہ وہ میرے مغرور انداز، اطوار، میری پرورش، جس طرح صبر اور بہادری سے میں اپنے شوہر کی منتظر رہی تھی اور اس خط کی خوب صورتی سے مرعوب تھا جو میں نے اسے لکھا تھا۔

مجھے اپنے بابا پر غصہ آیا جو ایسے حالات پیدا کر رہے تھے کہ میں دوبارہ شادی نہ کر سکوں۔ میں بابا کی وینس کی یادوں اور ان تصویروں سے بھی تنگ تھی جو میرے بابا وینس فنکاروں کی نقل میں منی ایچر فنکاروں سے بنوا رہے تھے۔

جب میں نے دوبارہ آنکھیں بند کیں... اب میری اپنی آرزو نہ تھی..... میرے تصور میں قرہ تاریکی میں میرے قریب آیا کہ میں اسے اپنے برابر میں محسوس کر سکتی تھی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے پیچھے تھا وہ میری گردن اور کانوں کو بوسہ دے رہا تھا اور میں اسے محسوس کر سکتی تھی۔ وہ مضبوط تھا اور میں اس کا سہارا لے سکتی تھی۔ میں نے خود کو محفوظ محسوس کیا۔ میرے بدن میں تناؤ آ رہا تھا۔ وہاں تاریکی میں یوں لگتا تھا جیسے میں اسے اپنے پیچھے، اپنے قریب محسوس کر سکتی تھی۔ میرا سر چکرا گیا۔ قرہ کیسا تھا، اس نے سوچا۔

بعض اوقات میرے خوابوں میں میرا شوہر اپنے کرب میں خود کو مجھ پر ظاہر کرتا ہے۔ مجھے آگاہی ہوتی ہے کہ میرا شوہر میرے قریب آتے ہوئے ایرانی نیزوں اور تیروں سے چھلنی اپنا بدن سیدھا رکھنے کی تگ و دو میں ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے درمیان ایک دریا ہے۔ خون میں لت پت اور تکلیف کے عالم میں جب وہ مجھے دوسرے کنارے سے پکارتا ہے۔

''ماں، شوکت میرا مذاق اڑا رہا ہے۔''

میں الماری کے اندھیرے گوشے سے ہٹ کر خاموشی سے دیوان خانے کے پار کمرے میں چلی گئی جہاں میں نے دراز سے سرخ پوشاک نکال کر پہنی۔ انہوں نے میرا بستر بچھا لیا تھا اور اس پر کھیل اور لڑ رہے تھے۔

''کیا میں تمہیں تنبیہ نہیں کی کہ جب قرہ آیا ہو تم شور نہیں کرو گے؟''

''ماں! تم نے یہ سرخ پوشاک کیوں پہنی ہے۔'' شوکت نے پوچھا۔

''لیکن ماں، شوکت میرا مذاق اڑا رہا تھا'' اور حسن نے کہا۔

''کیا میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ اس کا مذاق مت اڑانا؟ اور یہ گندی چیز یہاں کیا کر رہی

ہے؟" تھوڑا پرے جانور کی کھال کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔

"یہ لاش ہے۔" اورحان بولا "شوکت کو گلی میں ملی تھی۔"

"جلدی، اسے وہیں پھینک آؤ جہاں یہ ملا تھا، ابھی۔"

"شوکت پھینکے گا۔"

"میں نے کہا ابھی!"

جیسا کہ میں پہلے کرتی تھی، میں نے انہیں تھپڑ لگائے، غصے میں میں نے اپنا نچلا ہونٹ کاٹا اور یہ دیکھتے ہوئے کہ میں کتنی سنجیدہ ہوں، وہ ڈر کے مارے بھاگے۔ خدا کرے، وہ جلدی واپس آجائیں تاکہ انہیں سردی نہ لگ جائے۔

سب ہی ایکٹر فنکاروں میں مجھے قرہ سب سے زیادہ پسند تھا۔ وہ مجھے دوسروں سے زیادہ پسند کرتا تھا اور میں اس کی روح کو سمجھ گئی تھی۔ میں نے کاغذ قلم لیے اور ایک ہی نشست میں بغیر سوچے لکھا:

"ٹھیک ہے پھر، مغرب کی اذان سے پہلے میں تمہیں پھانسی شدہ یہودی کے گھر ملوں گی۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے میرے باپ کی کتاب مکمل کرو۔"

میں نے حسن کو جواب لکھا۔ چاہے آج وہ واقعی قاضی کے پاس جا رہا تھا، مجھے یقین نہیں کہ اس کا باپ اور وہ جن آدمیوں کو جمع کر رہے تھے، وہ فوراً ہمارے گھر چھاپہ ماریں گے۔ اگر اس نے واقعی ایسا کوئی اقدام کرنا ہوتا تو وہ مجھے خط لکھے بغیر یا میرے خط کے جواب کا انتظار کیے بغیر کر لیتا۔ وہ یقیناً میرے خط کا انتظار کر رہا ہے اور جب اسے جواب نہیں ملے گا تو وہ پاگل ہو جائے گا۔ تب ہی وہ لوگ جمع کرنے اور مجھے اٹھا لے جانے کی تیاری کرے گا۔ یہ مت سوچیں کہ مجھے کوئی بالکل خوف نہیں۔ لیکن میں اپنی حفاظت کے لیے قرہ پر بھروسا کیے ہوئے ہوں۔ بہرحال پہلے مجھے بتانے دیں کہ اس وقت میرے دل میں کیا ہے: میرے خیال میں، میں حسن سے خوف زدہ نہیں کیوں کہ میں اس سے بھی محبت کرتی ہوں۔

اگر آپ معترض ہو کر سوچیں، "اب یہ کیسی محبت ہے؟" تو میں آپ کو درست سمجھوں گی۔ یہ غلط نہیں کہ ایک ہی چھت تلے رہتے جب ہم میرے شوہر کی واپسی کے منتظر تھے تو میں نے محسوس کیا کہ یہ آدمی کتنا قابلِ رحم، کمزور اور خود غرض تھا۔ لیکن اب ایستھر بتاتی ہے کہ وہ کافی کماتا ہے ...... اور میں ہمیشہ بتا سکتی ہوں کہ جب وہ سچ بولے تو اس کی بھنویں تنی ہوتی ہیں ...... چوں کہ اس کے پاس دولت ہے اور ساتھ ہی خود اعتمادی، دھونس جمانے والا حسن غائب ہو کر میرے سامنے یہ وہ جن جیسا حسن ہے جس کے لیے میں کشش محسوس کرتی ہوں۔ اس کا یہ پہلو میں نے اس کے خطوط سے دریافت کیا جو وہ ڈھٹائی سے مجھے بھیجتا ہے۔

قرہ اور حسن دونوں نے میری محبت میں تکلیفیں اٹھائیں۔ قرہ غائب ہو گیا، بارہ سال سفر میں رہا۔ دوسرا، حسن روز مجھے خط لکھتا رہا جن کے گوشوں میں وہ پرندوں اور غزالوں کی تصویریں بناتا۔ شروع میں، میں اس سے خوف زدہ تھی لیکن پھر مجھے اس کے خطوط بار بار پڑھنا اچھا لگنے لگا۔

جیسا کہ میں بخوبی جانتی تھی کہ حسن میرے ہر معاملے پر بہت متجسس تھا، مجھے حیرانی نہ تھی کہ اسے علم تھا کہ میں نے خواب میں اپنے شوہر کی لاش دیکھی تھی۔ مجھے شک تھا کہ ایسٹھر، قرہ کو لکھے میرے خطوط حسن کو پڑھا رہی تھی۔ اس لیے میں نے قرہ کو ایسٹھر کے ذریعے کوئی جواب نہ بھجوایا۔ آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ آیا میرے یہ شکوک درست ہیں۔

"تم کہاں تھے؟" میں نے بچوں کے واپس آنے پر ان سے پوچھا۔

وہ فوراً سمجھ گئے کہ میرا غصہ اصلی نہ تھا۔ چپکے سے میں شوکت کو ایک طرف، اندھیری الماری کے پاس لے گئی۔ میں نے اسے گود میں اٹھالیا اور اس کے سر اور گردن کو چوما۔

"تمہیں سردی لگ رہی ہے، میرے بچے۔" میں نے کہا، "اپنے پیارے ہاتھ میرے ہاتھوں میں دو تاکہ ماں انہیں گرم کر دے۔"

اس کے ہاتھوں سے بدبو آ رہی تھی لیکن میں نے کچھ نہ کہا۔ میں نے اس کا سر اپنے سینے پر رکھ کر اسے لپٹائے رکھا۔ تھوڑی دیر میں اس کا جسم گرم ہو گیا اور اس نے بلونگڑے کی طرح پرسکون ہو کر آوازیں نکالنی شروع کر دیں۔

"تمہیں اپنی ماں سے بہت پیار ہے۔ ہے ناں؟"

"اامممم ــــ"

"کیا اس کا مطلب ہے، ہاں؟"

"ہاں ــــ"

"سب سے زیادہ؟"

"ہاں۔"

"پھر میں تمہیں کچھ بتانے والی ہوں۔" میں نے یوں کہا جیسے اسے کسی راز میں شریک کر رہی ہوں، "لیکن تم یہ بات کسی کو بھی نہیں بتاؤ گے۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی، "میں تمہیں سب سے زیادہ پیار کرتی ہوں، تم جانتے ہو ناں یہ بات؟"

"اور حان سے بھی زیادہ؟"

"اور حان سے بھی زیادہ۔ اور حان ابھی بچہ ہے، کسی ننھے پرندے جیسا، اسے ابھی کسی بات کی سمجھ نہیں۔ تم ذہین ہو، تم بات سمجھ جاتے ہو۔" میں نے اسے چوما اور اس کے بال سونگھے۔ "سو میں تم سے ایک درخواست کرتی ہوں۔ یاد ہے تم نے کل چپکے سے ایک رقعہ قرہ کو دیا تھا؟ تم آج بھی ایسا کرو گے، ٹھیک ہے؟"

"وہی ہے ناں جس نے بابا کو مارا۔"

"کیا؟"

"اسی نے میرے بابا کو مارا۔ اس نے کل مجھے پھانسی شدہ یہودی کے گھر بتایا تھا۔"

"اس نے کیا کہا؟"

"اس نے بتایا میں نے تمہارے بابا کو مارا ہے۔ میں نے بہت سارے آدمی مارے ہیں۔"

اچانک کچھ ہو گیا۔ شوکت میری گود سے نیچے پھسلا اور رونے لگا۔ یہ بچہ اب کیوں رو رہا تھا؟ ٹھیک ہے میں اعتراف کرتی ہوں کہ مجھے خود پر قابو نہ رہا اور پھر میں نے اسے تھپڑ جڑ دیا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی سوچے کہ میں سنگ دل تھی۔ لیکن وہ ایسے آدمی کے بارے بکواس کیسے کر سکتا تھا جس سے شادی کے لیے میں حالات سازگار کر رہی تھی — وہ بھی ان بچوں کی بہتری مدنظر رکھتے ہوئے۔

میرا ننھا سا بے چارہ بن باپ کا بچہ ابھی تک رو رہا تھا اور اچانک اس نے مجھے بہت پریشان کر دیا۔ میں بھی رونے لگی۔ ہم نے ایک دوسرے کو لپٹا لیا۔ وہ ذرا اور ہچکیاں بھر رہا تھا۔ "کیا اس تھپڑ پر اتنا رونا بنتا تھا؟" میں نے اس کے بالوں کو سہلایا۔

یہ سب یوں شروع ہوا تھا: جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں، کل میں نے اپنے بابا کو باتوں باتوں میں بتایا تھا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میرا شوہر فوت ہو گیا ہے۔ دراصل ان چار برس میں، جب میرا شوہر ایرانیوں کے ساتھ جنگ کے بعد لوٹ کر واپس نہ آیا تو میں اسے کچھ عرصے خوابوں میں دیکھتی رہی جہاں ایک لاش بھی تھی لیکن کیا وہی اس کی تھی؟ یہ میرے لیے ایک اسرار تھا۔

خواب ہمیشہ دوسرے مقاصد کے لیے وضع ہوتے ہیں۔ پرتگال میں جہاں سے ایستھر کی دادی آئی تھی، لگتا ہے وہاں ملحدوں کی شیطان سے ملاقات کے ثبوت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، چاہے ایستھر کے باپ دادا یہودیت سے منحرف ہونے کا اعلان کر دیں کہ "ہم تمہاری طرح کیتھولک ہو گئے ہیں۔" پرتگالی چرچ کے یسوعی ریاکار اذیت رساں و قاتل متحد ہو کر، انہیں اذیت دے کر اپنے خوابوں کے جنوں اور عفریتوں کا بتانے پر مجبور کرتے، ساتھ ساتھ ان پر ایسے خوابوں کا بوجھ ڈالتے جو انہوں نے کبھی دیکھے ہی نہ تھے۔ پھر وہ یہودیوں کو ان خوابوں کے اعتراف پر مجبور کرتے تاکہ بعد میں وہ انہیں زندہ جلا سکیں۔ اس طرح وہاں اپنے مقاصد کے لیے لوگوں کو یہ دکھانے کو خوابوں کا استعمال کیا جاتا کہ یہودی شیطان کے ساتھ قربت رکھتے تھے تاکہ انہیں الزام دیا اور ملامت کی جا سکے۔

خواب تین چیزوں کے لیے ہوتے ہیں:

الف: آپ کوئی چیز چاہتے ہیں مگر طلب نہیں کر سکتے۔ یوں آپ کہیں گے کہ آپ نے اسے خواب میں دیکھا ہے۔ اس طرح آپ حقیقت میں مانگے بغیر، جو چاہتے ہیں، طلب کر سکتے ہیں۔

ب: آپ کسی کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کسی عورت کو بدنام کرنا چاہتے ہیں، اس لیے آپ کہیں گے کہ آپ نے فلاں فلاں عورت کو خواب میں بدکاری کرتے دیکھا یا یہ کہ فلاں شخص شراب پی رہا تھا۔ اس طرح، اگرچہ لوگ آپ کا اعتبار نہیں کریں گے لیکن ان گناہوں کا محض تذکرہ بھی نہیں بھلایا جائے گا۔

ج: آپ کچھ چاہتے ہیں لیکن خود آپ کو معلوم نہیں کہ وہ کیا ہے۔ اس لیے آپ کوئی الجھا ہوا خواب سنائیں گے۔ آپ کے دوست یا خاندان والے فوراً مداخلت کر کے بتائیں گے کہ دراصل آپ کو کیا چاہیے یا وہ آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، وہ کہیں گے کہ آپ کو شوہر، بچے یا گھر کی ضرورت ہے......

جو خواب ہم بیان کرتے ہیں، وہ کبھی وہ نہیں ہوتے جو ہم نیند میں دیکھتے ہیں۔ جب لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے "ایسا دیکھا ہے" تو وہ اس خواب کو بیان کرتے ہیں جو انہوں نے "دن کو خواب" دیکھا اور اس کا ہمیشہ ایک درپردہ مقصد ہوتا ہے۔ صرف کوئی احمق ہی اپنے سوتے کے خواب کو اس طرح سنائے گا جیسا اس نے دیکھا ہو۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو ہر کوئی آپ کا مذاق اڑائے گا یا ہمیشہ کی طرح خواب کو بدشگونی سے تعبیر کرے گا۔ کوئی بھی حقیقی خوابوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتا، بشمول وہ خواب دیکھنے والوں کے۔ یا آپ ہی بتائیں، کیا آپ ایسا کرتے ہیں؟

نیم دلی سے سنائے اپنے خواب کے ذریعے میں نے اشارہ دیا تھا کہ کیا پتا میرا شوہر واقعی مر چکا ہو۔ اگرچہ شروع میں میرے بابا نے اس سچ کی طرف اشارے کے طور پر قبول نہ کرتے لیکن جنازے سے واپسی پر وہ اچانک خواب کو گواہی سمجھنے پر قائل ہو گئے اور نتیجہ نکالا کہ میرا شوہر واقعی دنیا سے گزر چکا تھا۔ اس طرح ہر کسی نے نہ صرف یہ یقین کر لیا کہ میرا شوہر پچھلے چار برس سے ویسے ہی زندہ سمجھا جا رہا تھا، خواب میں مر چکا تھا، بلکہ اگر اس کی موت کا سرکاری اعلان بھی ہو جاتا تو انہیں اس سے بڑھ کر یقین نہ آتا۔ تب ہی تھا کہ میرے بچوں کو احساس ہوا کہ وہ اب بن باپ کے ہیں۔ تب ہی انہیں غم ہونے لگا۔

"تمہیں بھی خواب دکھائی دیتے ہیں؟" میں نے شوکت سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بابا گھر واپس نہیں آتے اور آخر میں آپ سے شادی کر لیتا ہوں۔"

اس کی پتلی سی ناک، سیاہ آنکھیں اور چوڑے شانے اپنے بابا سے زیادہ مجھ جیسے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے احساس خطا ہوتا ہے کہ میں اپنے بچوں کو ان کے باپ کی چوڑی پیشانی نہیں دے پائی تھی۔

"جاؤ پھر اور اپنے بھائی کے ساتھ تلوار سے کھیلو۔"

"کیا ہم بابا کی پرانی تلوار لے سکتے ہیں؟"

"ہاں۔"

کچھ دیر میں چھت کو تکتے ہوئے بچوں کی تلواروں کی جھنکار سنتی رہی، اس دوران میں اپنے خوف اور اضطراب کو پرسکون کرنے کی تگ و دو میں تھی۔ میں نے نیچے باورچی خانے میں جا کر خیریے سے کہا، "بابا کافی روز سے مچھلی کا شوربہ طلب کر رہے ہیں۔ شاید مجھے تمہیں کیلیون بندرگاہ بھیجنا پڑے۔ تم شوکت کا پسندیدہ پھلوں کا خشک گودا جو چھپا کر رکھا ہے، نکالو اور بچوں کو دے دو۔"

شوکت جب باورچی خانے میں کھانے میں مگن تھا تو اورحان اور میں اوپری منزل پر گئے۔

میں نے اسے گود میں اُٹھا کر اس کی گردن پر بوسہ دیا۔

"تم تو پسینے سے بھرے ہو۔" میں نے کہا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"شوکت نے مجھے چچا کی سرخ تلوار سے مارا۔"

"یہاں خراشیں ہیں۔" میں نے کہا اور اس جگہ کو چھوا۔ "کیا تمہیں درد ہو رہا ہے؟ شوکت کتنا بے پرواہ ہے۔ سنو، میری بات غور سے سنو۔ تم بہت ہوشیار اور حساس ہو۔ مجھے تم سے ایک درخواست کرنی ہے۔ اگر تم میرا کہا کرو گے تو میں تمہیں ایسا راز بتاؤں گی جو میں شوکت یا کسی اور کو کبھی نہیں بتاؤں گی۔"

"وہ کیا ہے؟"

"تم نے دیکھا یہ کاغذ کا رقعہ؟ تم اپنے نانا کے پاس جاؤ گے اور ان کی نظروں میں آئے بغیر یہ قرہ آفندی کے ہاتھ میں دے دو گے۔ سمجھ گئے؟"

"سمجھ گیا۔"

"کیا تم یہ کرو گے؟"

"راز کیا ہے؟"

"یہ کاغذ اسے دے آؤ۔" میں نے کہا۔ میں نے اس کی گردن کو ایک بار پھر بوسہ دیا جہاں سے ہلکی سی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اور خوشبو کی بات سے یاد آیا کہ کافی روز ہو گئے کہ خیریے بچوں کو حمام لے کر نہیں گئی۔ وہ تب سے نہیں گئے جب سے وہاں عورتوں کو ان کی موجودگی کا احساس ہونے لگا ہے۔ "میں تمہیں بعد میں راز کی بات بتاؤں گی۔" میں نے اسے بوسہ دیا۔ "تم بہت ذہین اور بہت خوب صورت ہو۔ شوکت تو بس تنگ کرتا ہے۔ اس میں تو اپنی ماں پر ہاتھ اُٹھانے کی جرأت آ گئی ہے۔"

"میں یہ خط نہیں لے جاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "مجھے قرہ آفندی سے ڈر لگتا ہے۔ اسی نے میرے بابا کی جان لی۔"

"تمہیں یہ شوکت نے بتایا ہے۔ ہے ناں؟" میں نے کہا۔ "جلدی نیچے جاؤ اور اسے یہاں آنے کا کہو۔"

اور جان میرے چہرے پر خفگی دیکھ سکتا تھا۔ خوف کے مارے وہ میری گود سے پھسلا اور کمرے سے باہر بھاگ گیا۔ شاید اسے ذرا خوشی بھی تھی کہ شوکت مشکل میں تھا۔ کچھ دیر بعد تمتماتے چہروں کے ساتھ دونوں آ گئے۔ شوکت کے ایک ہاتھ میں خشک پھل تھا اور دوسرے میں تلوار۔

"تم نے اپنے بھائی کو بتایا کہ تمہارے بابا کی جان قرہ نے لی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نہیں چاہتی کہ تم اس گھر میں دوبارہ یہ بات کرو۔ تم دونوں کو قرہ کا احترام اور اس سے محبت کرنی چاہیے۔ سمجھ گئے میری بات؟ میں تم دونوں کو ساری زندگی باپ کے بغیر نہیں رہنے دوں گی۔"

"میں اسے نہیں چاہتا۔ میں ہمارے گھر واپس چلا جاؤں گا جہاں چچا حسن ہیں اور اپنے بابا کا

انکار کروں گا۔'' شوکت نے ڈھٹائی سے کہا۔

اس پر مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں نے اسے تھپڑ جڑ دیا۔ اس نے تلوار نیچے نہیں رکھی تھی بلکہ وہ اس کے ہاتھ سے پھسل گئی تھی۔

''مجھے اپنے بابا چاہئیں۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

لیکن میں اس سے بھی بڑھ کر رو رہی تھی۔

''تمہارے بابا اب نہیں رہے، وہ واپس نہیں آئیں گے۔'' میں نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ ''تم یتیم ہو۔ مجھے کیوں نہیں، حرام زادو۔'' میں اتنا رو رہی تھی کہ مجھے ڈر تھا انہیں میری بات سمجھ ہی نہیں آئی۔

''ہم حرامی نہیں ہیں۔'' شوکت نے روتے روتے کہا۔

ہم دیر تک شدت سے روتے رہے۔ رونے نے میرا دل نرم کر دیا اور مجھے احساس ہوا کہ آنسو بہانے نے مجھے بہتر شخص بنا دیا تھا۔ رونے دھونے کے اس دورے میں ہم ایک دوسرے کو لپٹا کر گدے پر لیٹ گئے۔ شوکت نے اپنا سر میرے سینے سے ایسے لگا دیا جیسے سونا چاہتا ہو۔ کبھی وہ میرے ساتھ یوں لپٹ جاتا تھا لیکن میں محسوس کر سکتی تھی کہ وہ سو نہیں رہا تھا۔ شاید مجھے بھی ان کے ساتھ لیٹے اونگھ آ گئی ہوگی، لیکن میرا دماغ اس پر اٹکا ہوا تھا کہ پچھلی منزل پر کیا ہو رہا تھا۔ میں جلتے لکڑوں کی مہک سونگھ سکتی تھی۔ میں یک دم بستر سے اٹھ بیٹھی اور لڑکوں کو بھی جگا دیا۔

''نیچے جاؤ اور خیریہ سے کہو کہ وہ تمہیں کھانے کو کچھ دے۔''

اب کمرے میں میں اکیلی تھی۔ باہر برف گرنا شروع ہو گئی۔ میں نے اللہ سے مدد کی التجا کی۔ میں نے قرآن پاک کھول لیا اور ایک بار پھر سورۃ آل عمران پڑھی جس میں میدان جنگ میں مارے جانے والوں کا ذکر تھا کہ جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں، اسی سے جا ملیں گے۔ یوں اپنے شوہر کے متعلق مجھے قدرے تسلی ملی۔ کیا میرے بابا نے قرہ کو ہمارے سلطان کی نامکمل شبیہ دکھائی تھی؟ میرے بابا کا دعویٰ تھا کہ یہ شبیہ اتنی حقیقی ہوگی کہ اسے دیکھنے والے مارے خوف کے اس سے نگاہیں چرائیں گے جیسا کہ ہمارے پرشکوہ سلطان کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

میں نے اورحان کو قریب بلایا اور گود میں اٹھائے بغیر دیر تک اس کی پیشانی، سر اور رخسار چومتی رہی۔ ''اب ڈرے بغیر، اور اپنے نانا کی نظر میں آئے بغیر تم یہ خط قرہ کو دو گے۔ سمجھ گئے؟''

''میرا دانت ہل رہا ہے۔''

''جب تم واپس آؤ گے تو چاہو تو میں اسے کھینچ کر نکال دوں گی۔'' میں نے کہا۔ ''تم احتیاط سے اس کے قریب جانا۔ اسے سمجھ نہیں آئے گی کہ کیا کرے اور وہ تمہیں گلے لگائے گا۔ تب پھر تم چپکے سے یہ کاغذ اس کے ہاتھ میں دے دینا۔ سمجھ گئے؟''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

"میں شادی شدہ اور اپنے شوہر کی واپسی کی منتظر ہوں۔"

"اپنا نقاب اُتار دو۔" اس نے اسی لہجے میں کہا۔ "تمہارا شوہر کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

"کیا تم نے مجھے یہ بتانے کو اس ملاقات کا انتظام کیا تھا؟"

"نہیں، بلکہ اس لیے کہ میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں بارہ برس تمہیں سوچتا رہا ہوں۔ میری جان نقاب اتار دو اور مجھے بس ایک بار خود کو دیکھنے دو۔"

میں نے نقاب اتار دیا۔ جب وہ خاموشی سے میرا چہرہ پڑھتا رہا اور میری آنکھوں کی گہرائی میں دیر تک جھانکتا رہا تو مجھے خوشی کا احساس ہوا۔

"شادی اور ماں بننے نے تمہیں اور بھی حسین بنا دیا ہے۔ اور تمہارا چہرہ اس سے بالکل ملتا ہے جیسا مجھے یاد ہے۔"

"تم نے مجھے کیسے یاد رکھا؟"

"بڑا الم ہے۔ کیوں کہ جب میں تمہیں سوچتا تو میں خود کو یہ سوچنے پر مجبور پاتا کہ میں جو کر رہا تھا وہ صرف تخیل تھا۔ کیا تمہیں یاد ہے، بچپن میں ہم باتیں کیا کرتے تھے کہ خسرو و شیریں کو ایک دوسرے کی تصویر دیکھ کر کیسے محبت ہو گئی تھی، ہے ناں؟ کیوں شیریں کو وہ جیسے خسرو سے اس وقت محبت ہوئی جب اس نے خسرو کی تصویر درخت کی شاخ سے لٹکے دیکھی بلکہ اسے محبت میں گرفتار ہونے سے پہلے اسے تین مرتبہ تصویر دیکھنا پڑی؟ تم کہتی تھیں کہ کہانیوں میں ہر چیز تین بار ہوتی ہے۔ میں اس پر بحث کرتا کہ محبت اسی وقت پروان چڑھ جانی چاہیے تھی جب شیریں نے پہلی مرتبہ تصویر دیکھی۔ لیکن اگر حقیقت پسندانہ انداز میں کون اس طرح بنا سکتا تھا کہ شیریں کو اس کی تصویر دیکھتے ہی اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی اور اتنی مکمل تصویر کہ وہ خسرو کو پہچان لیتی؟ ہم نے اس بارے میں کبھی بات نہیں کی۔ ان بارہ برسوں میں اگر میرے پاس تمہارے بے مثال چہرے کی اتنی حقیقت پسندانہ تصویر ہوتی تو شاید مجھے اتنا کرب برداشت نہ کرنا پڑتا۔"

اس نے اس طور بہت اچھی اچھی باتیں کیں، تصویر دیکھنے اور محبت میں گرفتار ہونے کے قصے، کس طرح میری خاطر اس نے تکلیفیں اُٹھائیں۔ میں نے دیکھا کہ کس طرح وہ آہستہ آہستہ موضوع کی طرف آیا اور کس طرح اس کا ہر لفظ میرے شعور سے چھن کر میری یادداشت میں کہیں رقم ہو گیا۔ بعد میں میں ایک ایک کر کے ان باتوں سے لطف لیتی۔ لیکن اس وقت اس کی باتوں کا سحر میرے لیے صرف باطنی تھا اور اس نے مجھے اس سے وابستہ کر دیا۔ بارہ برس اس کے اتنی تکلیف میں رہنے کا سبب بننے پر مجھے گناہ گاری کا احساس ہوا۔ شہد آگیں زبان ایہ قرہ کس قدر اچھا آدمی تھا! کسی معصوم بچے جیسا! میں اس کی آنکھوں سے سب پڑھ سکتی تھی۔ اس حقیقت کے باعث کہ اسے مجھ سے اس قدر محبت تھی، مجھے اس پر بھروسا ہو گیا۔

ہم دونوں ہم آغوش ہو گئے۔ مجھے اس سے اتنی مسرت ملی کہ گناہ کا ہر احساس فراموش ہو گیا۔

میں نے خود کو جذبات کی اس رو کے حوالے کر دیا۔ میں اس سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے بوسہ دیا اور خود بھی اسے بوسہ دیا۔ اس دوران یوں تھا جیسے پوری دنیا کسی مدھم دھندلکے میں چلی ہو گئی ہو۔ میں نے تمنا کی کہ ہر کوئی ہماری طرح ہم آغوش ہو سکے۔ مجھے خیال ہوا کہ محبت کو ایسا ہی ہونا تھا۔ میں نے اس کا لمس محسوس کیا۔ میں جو کر رہی تھی، اس سے اس قدر مطمئن تھی کہ لگتا تھا کہ پوری دنیا کو کسی مبارک روشنی نے نگل لیا تھا، میں کچھ برا نہیں سوچ سکتی تھی۔

مجھے بتانے دیجیے کہ ہرات کے استاد منی ایچر فنکار ہماری ہم آغوشی کی تصویر کشی کیسے کرتے، اگر یہ ایک کہانی کا بیان کسی کتاب میں ہوتا۔ مجھ حیران کن تصویریں جو مجھے میرے بابا نے دکھائی تھیں، ان میں کہانی کی روانی کا لطف پتوں کے جھونٹے سے مماثل تھا، دیواروں کی سجاوٹ حاشیوں کی طلاکاری سے عیاں تھی، اور تصویر کے حاشیے میں بے مثال پروں والے ابابیل کی مسرت، محبت کرنے والوں کی مسرت اور شادمانی کی طرف اشارہ تھی۔ دور سے نگاہوں کا تبادلہ، معنی خیز جملوں سے ایک دوسرے کو کرب آشنا کرتے محبت کرنے والوں کو فاصلے پر چھوٹا دکھایا جاتا کہ لمحے بھر کو لگتا کہ کہانی ان کے بارے میں نہیں بلکہ ستاروں بھری رات اور درختوں، غیر معمولی گل [illegible] ہوئے تھے، اس کے صحن اور حیران کن باغ کے متعلق تھی جس کے ایک ایک پتے کی عکاسی احتیاط اور توجہ سے کی گئی تھی۔ اگر کوئی رنگوں کی خفیہ ترتیب پر غور کرے جسے کسی ایچر فنکار فن کے سامنے مکمل دسترس داری سے ہی دکھایا گیا تھا اور پوری تصویر میں چھائی پراسرار روشنی پر توجہ دیتا تو کوئی زیرک فوراً ان تصویروں کے عقب میں چھپا راز پا جاتا کہ انہیں خود محبت نے تخلیق کیا ہے، یوں جیسے روشنی محبت کرنے والوں سے خارج ہو رہی تھی، تصویر کی [illegible] سے۔ اور جب قرہ اور میں ہم آغوش ہوئے، اسی انداز میں دنیا پر ایک کیفیت حیات، ایک سرخوشی چھا گئی۔

خدا کا شکر ہے کہ اتنی عمر گزار کر اب میں سمجھ گئی ہوں کہ سرخوشی زیادہ عرصہ قائم نہیں رہتی۔ قرہ نے محبت کے ساتھ مجھے چھوا۔ یہ اچھا لگا اور سب کچھ فراموش کر کے میں نے چاہا کہ وہ اور قریب آئے۔ لیکن وہ ایسا کرنے لگا کہ اسے خود معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا تھا، اگرچہ اس کی بے یقینی نے اسے زیادہ کی تمنا سے نہ روکا۔ ہم بھی زیادہ دیر ہم آغوش رہے، رفتہ رفتہ خوف اور شرمندگی نے ہمارے درمیان جگہ بنالی۔ پہلے اس کی اتنی قربت پر میں متجسس تھی، میں خجل یا شرمسار نہ تھی۔ میں نے خود سے کہا کہ ایسی ہم آغوشی کا نتیجہ قدرتی طور پر کچھ لمحوں ہوتا مزید قربت۔ اور اگرچہ میں نے اپنا رخ موڑ لیا تھا، میں اس سے اپنی نگاہ نہ ہٹا سکی تھی۔

بعد میں، جب اس نے اچانک وہ بیہودہ عمل کرنے پر مجھے مجبور کرنا چاہا، جو حماموں پر گھٹیا ملکے الی قپچاق (Kipchak) عورتیں اور کنیزیں بھی نہ کرتیں، میں حیرت اور تذبذب سے منجمد ہو کر رہ گئی۔

"برا مت مانو، میری پیاری۔" اس نے التجا کی۔

میں کھڑی ہو گئی، اسے پرے دھکیلا اور اس کی مایوسی کی ذرہ برابر پروا کیے بغیر اس پر چیخنے لگی۔

میرا نام ہے فترہ

پھانسی شدہ یہودی کے گھر کی تاریکی میں شکورے نے اپنی تیوری پر بل ڈالے اور طیش میں آ کر کہنے لگی کہ میں تفلس میں ملنے والی سرکیشیائی لڑکیوں، قفچاق طوائفوں، کارواں سرائے میں بکنے والی غریب دلہنوں، ترکمان اور فارسی بیواؤں، عام طوائفوں جن کی تعداد استنبول میں بڑھتی جا رہی تھی، بدکار منگریلین، نخرے باز ابخازی، آذر ؟ چ ی عورتوں، یہودی اور شام کی بدشکل بڑھیاؤں، عورتوں کے روپ میں اداکار اور حریص لڑکوں کے ساتھ تو وہ سب کر سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ نہیں۔ غیظ و غضب کے عالم میں اس نے مجھے الزام دیا کہ میں ایران سے بغداد اور چھوٹے چھوٹے عرب قصبوں کی گلیوں سے کیبین کے ساحلوں تک، ہر قسم کی گھٹیا عورتوں سے قربت [illegible] کر خود پر اختیار اور اخلاقیات کھو چکا تھا... اور یہ بھی فراموش کر بیٹھا تھا کہ کچھ عورتیں اب بھی اپنا وقار بحال رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس نے الزام دیا کہ میرے تمام محبت بھرے الفاظ خلوص سے خالی تھے۔

میں نے بصد احترام اپنی محبوبہ کی تلخ و ترش باتیں سنیں اور ان پر میرے مردانہ جذبات ٹھنڈے پڑ گئے اور اگرچہ میں اس صورت حال اور مسترد کیے جانے پر کافی خجل تھا، دو باتوں پر مجھے خوشی ہوئی: 1۔ یہ کہ میں نے شکورے کے ردعمل کے جواب میں اسی طرح جواب دینے سے گریز کیا جیسے کہ دوسری عورتوں کے ساتھ ایسی صورت حال میں اکثر خباثت سے ردعمل دیتا تھا۔ 2۔ یہ کہ مجھے شکورے کی میرے سفروں سے متعلق خصوصی آگہی کا علم ہوا، یہ ثابت کر دہ وہ میری سوچ سے بڑھ کر میرے متعلق سوچتی رہی تھی۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ اپنی آرزو کے تکمیل نہ پانے پر میں کتنا افسردہ دل تھا، اسے مجھ پر ترس آنے لگا۔

"اگر تمہیں مجھ سے سچی محبت تھی، شدید اور بے پناہ۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ خود کو عذر فراہم کرنے کی کوشش میں ہو۔ "تم کسی شریف آدمی کی طرح اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی کوشش کرو گے۔ تم اس عورت کا وقار مجروح نہیں کرو گے جس کی تم سنجیدگی سے تمنا رکھتے ہو۔ تم کوئی واحد آدمی نہیں ہو جو مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کیا کسی نے تمہیں یہاں آتے دیکھا تھا؟"

"نہیں۔"

یوں جیسے اس نے کسی کو تاریک اور برف سے ڈھکے باغ میں چلتے سنا۔ اس نے اپنا حسین چہرہ دروازے کی جانب موڑ لیا جسے میں بارہ سال اپنے ذہن میں نہ لا پایا تھا اور مجھے خود کو دیکھنے کی خوشی بخشی۔ ذرا سا شور سن کر ہم دونوں خاموشی سے منتظر رہے، لیکن کوئی بھی نہ آیا۔ مجھے یاد آیا کہ جب شکورے صرف بارہ برس کی تھی تو وہ میرے اندر عجیب احساس جگا دیتی تھی کیوں کہ وہ مجھ سے زیادہ جانتی تھی۔

''پھانسی شدہ یہودی کی روح یہاں بھٹکتی پھرتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''کیا تم یہاں پہلے بھی آئی ہو؟''

''جن، بھوت، مردے — وہ ہوا کے ساتھ یہاں آتے اور چیزوں پر قابض ہو کر خاموشی میں شور مچاتے ہیں۔ ہر شے بات کرتی ہے۔ مجھے یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں انھیں سن سکتی ہوں۔''

''شوکت مجھے مردہ بلی دکھانے یہاں لایا تھا لیکن وہ جا چکی تھی۔''

''میں سمجھ گئی، تم نے اسے بتایا تھا کہ اس کے بابا کی جان تم نے لی تھی۔''

''نہیں۔ کیا میرے الفاظ کا یہ مطلب نکالا گیا؟ یہ نہیں کہ میں نے اس کے باپ کی جان لی بلکہ یہ کہا تھا کہ میں اس کا باپ بننا چاہوں گا۔''

''تم نے یہ کیوں کہا کہ تم نے اس کے بابا کی جان لی ہے؟''

''اس نے پہلے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا تم نے کبھی کسی کی جان لی ہے۔ میں نے اسے سچ بتایا کہ میں نے دو آدمیوں کو ہلاک کیا ہے۔''

''شیخی بگھارنے کے لیے؟''

''شیخی بگھارنے اور اس بچے پر رعب جھاڑنے کے لیے جس کی ماں سے میں محبت کرتا ہوں کیوں کہ مجھے ادراک ہوا کہ ان کی ماں ان دو ننھے شریروں کو ان کے باپ کی بہادری کے بڑھ چڑھ کر قصے سنا کر اور گھر میں باقی مال غنیمت کا دکھاوا کر کے تسلی دیتی ہے۔''

''بگھارتے رہو پھر شیخی! وہ تمہیں پسند نہیں کرتے۔''

''شوکت نہیں لیکن اورحان مجھے پسند کرتا ہے۔'' میں نے اپنی محبوبہ کی غلطی پکڑنے کی فخریہ خوشی سے کہا: ''پھر بھی، میں ان دونوں کا باپ بنوں گا۔''

ہم نے کپکپی لی اور نیم روشنی میں ایسے کانپ اُٹھے جیسے کسی بے وجود شے کا سایہ ہمارے درمیان سے گزرا ہو۔ میں نے خود مجتمع کیا اور دیکھا کہ شکورے چھوٹی چھوٹی سسکیاں بھر کر رو رہی تھی۔

''میرے بدنصیب شوہر کا حسن نامی ایک بھائی ہے۔ جب میں اپنے شوہر کی واپسی کی منتظر تھی، میں دو برس اسی گھر میں حسن اور اپنے سسر کے ساتھ رہی۔ اسے مجھ سے محبت ہو گئی۔ اسے شک ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ یہ تصور کر کے غصے میں ہے کہ میں شاید کسی اور یا تم سے شادی کر لوں۔ اس نے پیغام بھیجا ہے کہ وہ زبردستی مجھے ان کے گھر لے جانا چاہتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ چوں کہ قاضی کی نگاہ میں، میں بیوہ نہیں، وہ

میرے شوہر کے نام پر مجھے زبردستی گھر لے جائیں گے۔ وہ کسی بھی وقت ہمارے گھر پر حملہ کر سکتے ہیں۔ میرے بابا نہیں چاہتے کہ قاضی میری بیوگی کا فیصلہ دے۔ اگر مجھے طلاق مل گئی تو ان کا خیال ہے کہ میں کوئی نیا شوہر ڈھونڈ لوں گی اور انھیں تنہا چھوڑ دوں گی۔ میرے اپنے بچوں کے ساتھ ان کے گھر آنے پر انھیں تنہائی کے اس عذاب سے چھٹکارا ملا جس میں وہ میری ماں کی وفات کے بعد مبتلا تھے۔ کیا تم ہمارے ساتھ رہنے پر راضی ہو؟"

"تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"اگر ہماری شادی ہو جائے تو کیا تم ہمارے ساتھ میرے بابا کے پاس رہو گے؟"

"معلوم نہیں۔"

"اس متعلق جتنی جلدی ممکن ہو سوچو۔ میرا یقین کرو تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں۔ میرے بابا محسوس کر رہے تھے کہ کوئی بدی ہمارے تعاقب میں ہے، اور میرا خیال ہے وہ درست کہتے ہیں۔ اگر حسن اور اس کا باپ، ینی چری کے ساتھ ہمارے گھر پر چھاپہ ماریں اور میرے بابا کو قاضی کے پاس لے جائیں تو کیا تم یہ شہادت دو گے کہ تم نے واقعی میرے شوہر کی لاش دیکھی تھی؟ تم حال ہی میں ایران سے آئے ہو، وہ تمہارا یقین کریں گے۔"

"میں گواہی دے دوں گا کہ میں نہیں ہوں جس نے اسے ہلاک کیا۔"

"ٹھیک ہے پھر۔ میری بیوگی کے لیے، کیا تم ایک اور گواہ کے ساتھ قاضی کے سامنے یہ گواہی دو گے کہ تم نے ایران کے میدانِ جنگ میں میرے شوہر کی خون آلود لاش دیکھی تھی۔"

"میں نے لاش دیکھی تو نہیں لیکن تمہاری خاطر میں گواہی دے دوں گا۔"

"کیا تمہیں میرے بچوں سے پیار ہے؟"

"ہاں۔"

"تو مجھے بتاؤ کہ تمہیں ان سے کس وجہ سے پیار ہے؟"

"شوکت کی طاقت، قوتِ فیصلہ، ایمان داری، ذہانت اور سرکشی مجھے پسند ہیں۔" میں نے کہا، "اور اورحان کا احساس اور نفیس انداز اور اس کی ہوشیاری پسند ہے۔ مجھے اس حقیقت سے محبت ہے کہ وہ تمہارے بیٹے ہیں۔"

میری سیاہ چشم محبوبہ مسکرائی اور چند آنسو بہائے۔ پھر تھوڑے وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کی امید رکھنے والی عورت کی طرح، اس نے موضوع بدل دیا:

"میرے بابا کی کتاب مکمل کرنی اور ہمارے سلطان کو ضرور پیش کرنی چاہیے۔ یہ کتاب ہم پر چھائی ہوئی بدنصیبی کا سبب ہے۔"

"نفیس آفندی کے قتل کے علاوہ اور کس شر نے ہمیں گھیر رکھا ہے؟"

اس سوال نے اسے خاموش کیا۔ مخلص نظر آنے کی کوشش میں اس کے برعکس دکھائی دیتی، وہ بولی:

''نصرت خوجا کے بیروکار یہ افواہیں پھیلا رہے ہیں کہ بابا کی کتاب میں بے ادبی کی گئی ہے اور اس میں فرنگیوں کے کفر کی نشانیاں ہیں۔ کیا ہمارے گھر آنے جانے والے منی ایچر فنکار ایک دوسرے سے اس وجہ سے حسد کرنے لگے ہیں کہ وہ منصوبے بنا رہے ہیں؟ تم بھی ان ہی میں سے ہو، تم بہتر جانتے ہو!''

''تمہارے مرحوم شوہر کا بھائی۔'' میں نے کہا: ''کیا اس کا ان منی ایچر فنکاروں، تمہارے بابا کی کتاب یا نصرت خوجا کے پیروکاروں سے کوئی تعلق ہے، یا وہ اکیلا ہی ہے؟''

''اس کا ان سب سے کوئی تعلق نہیں لیکن وہ اکیلا بھی نہیں۔'' اس نے کہا۔

ایک پراسرار اور عجیب قسم کی خاموشی کا وقفہ گزرا۔

''جب تم حسن کے ساتھ اسی گھر میں رہتی تھیں، اس سے چھٹکارے کا کوئی طریقہ تھا؟''

''اتنا ہی جتنا کہ دوسرے کے گھر میں ممکن ہو سکتا تھا۔''

کچھ فاصلے پر چند کتے زور و شور سے بھونکنے لگے۔

میں یہ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا کہ شکورے کا شوہر جو بہت سی جنگوں سے فتح مند لوٹا تھا اور ایک جاگیر کا مالک بن گیا تھا، اس نے یہ مناسب جانا کہ اس کی بیوی دوسرے کے گھر میں اس کے بھائی کے ہمراہ رہتی رہے۔ ڈرتے اور ہچکچاتے ہوئے میں نے اپنے چہرے سے پوچھا: ''تم نے اس سے شادی کرنا کیوں مناسب سمجھا تھا؟''

''ظاہر ہے، مجھے کسی کے ساتھ تو شادی کرنی ہی تھی۔'' اس نے کہا۔ یہ سچ تھا اور اس بات نے ہوشیاری اور جامع انداز میں اپنے شوہر کی تعریف اور مجھے پریشان کرنے سے گریز کرتے ہوئے اپنی شادی کی وضاحت کر دی۔ ''تم تو چلے گئے تھے، شاید کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ رنج سے غائب ہو جانا محبت کی علامت تو ہو سکتا ہے، تاہم رنج زدہ عاشق بیزار کن بھی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ مستقبل کی کوئی امید نہیں۔''

یہ بھی سچ تھا لیکن یہ اس بدمعاش سے شادی کا جواز نہیں بن سکتا تھا۔ اس کے صرف شرمگیں تاثر سے ہی یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ میرے استنبول چھوڑنے کے بعد باقی سب کی طرح شکورے نے بھی مجھے بھلا دیا تھا۔ اس نے چاہے تھوڑا ہی سہی میرا ٹوٹا دل جوڑنے کی سعی میں یہ سفید جھوٹ بولا اور میں اسے اس کی اچھی نیت سمجھتا ہوں، جو میرے تشکر کا تقاضا کرتی ہے۔ میں بتانے لگا کہ کس طرح سفر میں میں اسے اپنی سوچوں سے نکال سکا، کیسے راتوں کو وہ کسی آسیب کی طرح اس کا تصور میرے دماغ میں منڈلاتا تھا۔ یہ انتہائی خفیہ، انتہائی گہرا کرب تھا جو میں نے سہا اور میں نے خیال کیا کہ میں کبھی کسی کو اس میں شریک نہ کر پاؤں گا، یہ کرب حقیقی تھا لیکن جیسا کہ اس لیے مجھے حیرت کے ساتھ ادراک ہوا کہ یہ ذرا سا بھی پرخلوص نہ تھا۔

تاکہ میرے جذبات اور چاہتیں صحیح طرح سمجھی جا سکیں، میں سچائی اور خلوص کے درمیان فرق واضح کر دوں، جو مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا ہے: کس طرح اپنی حقیقت کا الفاظ میں اظہار، اتنی سچی جتنی وہ ہو سکتی

ہے، کسی کو ظاہرداری یا غیر مخلصی کی طرف دھکیلتا ہے۔ شاید اس کی بہترین مثال، ہم منی ایچر فنکار ہو سکتے ہیں جو ہمارے درمیان کسی قاتل کی موجودگی پر چڑچڑاہٹ کا شکار ہو گئے۔ کسی مکمل تصویر پر غور کریں... مثال کے طور پر کسی گھوڑے کی تصویر ... چاہے حقیقی گھوڑے، اللہ کے متصورہ گھوڑے یا کسی عظیم استاد منی ایچر فنکار کے بنائے گھوڑے کی کتنی ہی عمدہ ترجمانی کرے، یہ پھر بھی اس قابل منی ایچر فنکار کے خلوص یا سچائی کا ثانی نہیں ہو سکتا جس نے اسے بنایا ہو۔ منی ایچر فنکار یا ہم یعنی اللہ کے عاجز بندوں کا خلوص، قابلیت اور کاملیت کے لمحوں میں ظاہر نہیں ہوتا، اس کے برعکس زبان کے پھسلنے، غلطیوں، تھکن اور مایوسی سے ظاہر ہوتا ہے۔ میں یہ ان لڑکیوں کے لیے کہہ رہا ہوں جن کی آنکھیں اس باعث کھل جائیں گی کہ وہ شدید آرزو جو میں نے اس لمحے شکورے کے لیے محسوس کی۔ جیسا کہ وہ بھی بتا سکتی تھی۔ اور اس حرص میں کوئی فرق نہ تھا، جو میں نے قزوین کی نازک خال و خد، تانبے کی رنگت اور سرخ ہونٹوں والی حسینہ کے لیے محسوس کی تھی۔ اپنی تعداد او سمجھ بوجھ اور جن بھوت جیسے الہام سے شکورے بارہ برس میری محبت سے محرومی برداشت کرنے کی اذیت اور میرا کسی نفس کے غلام جیسا رویہ سمجھتی تھی جس نے ہماری تنہائی میں پہلی ملاقات میں ان تاریک اندھی خواہشوں کی فوری تسکین کے سوا کچھ نہ سوچا۔ نظامی نے اس حسینہ عالم شیریں کے دہن کا موازنہ موتیوں بھری دوات سے کیا تھا۔

جب کتے مزید جوش سے بھونکنے لگے تو مضطرب شکورے بولی: "مجھے اب جانا چاہیے۔" اسی لمحے ہم دونوں نے محسوس کیا کہ یہودی کا آسیب زدہ گھر خاصا تاریک ہو گیا تھا، حالاں کہ رات ڈھلنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ میرا بدن اپنے آپ اسے ایک بار پھر بانہوں میں لینے آگے بڑھا، لیکن کسی زخمی چڑیا کی طرح وہ تیزی سے پھدک کر دور ہٹ گئی۔

"کیا میں اب بھی خوب صورت ہوں؟ مجھے جلدی جواب دو۔"

میں نے اسے بتایا۔ کیسی خوب صورتی سے وہ میری بات پر یقین اور اس سے اتفاق کرتے ہوئے سنتی رہی۔

"اور میرا لباس؟"

میں نے اسے بتایا۔

"کیا مجھ سے اچھی خوشبو آ رہی ہے؟"

یقیناً شکورے بخوبی جانتی تھی کہ نظامی نے جس کا حوالہ "محبت کی شطرنج" سے دیا، محبت کرنے والوں کے درمیان ایسے زبانی کلامی کھیل نہیں بلکہ مخفی جذباتی داؤ اور چالیں تھے۔

"تمہاری روزی کا کیا وسیلہ ہے؟" اس نے پوچھا، "کیا تم میرے بن باپ کے بچوں کی دیکھ بھال کر سکو گے؟"

اپنے بارہ برس سے زائد سرکاری اور معتمد کے تجربے، میدان جنگ میں اور موت و ہلاکت

دیکھنے سے حاصل شدہ علم اور تجربے اور اپنے روشن مستقبل کا بتاتے بتاتے میں نے اسے گلے لگا لیا۔

''ابھی ہم نے کس خوبی سے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوئے تھے۔'' اس نے کہا: ''اور ہر شے نے اپنا اولین اسرار کھو بھی دیا۔''

اپنا اخلاص ثابت کرنے کی خاطر میں نے اسے مزید شدت سے گلے لگا لیا۔ میں نے پوچھا کہ بارہ برس سنبھالے رکھنے کے بعد اس نے وہ تصویر ایستھر کے ہاتھ واپس کیوں بھیجی جو میں نے اس کے لیے بنائی تھی؟ میری قلقلی پر میں نے اس کی آنکھوں میں حیرت کی تحریر دیکھی اور ایک محبت جو اس کے اندر بھر آئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو بوسہ دیا۔ اس مرتبہ میں نے خود کو اپنے نفس کی حرص و ہوس کے باعث بے حرکت نہ پایا، ہم دونوں اس طاقتور محبت کی پھڑ پھڑاہٹ ...... چڑیوں کے جھنڈ جیسی ...... کے سبب مبہوت تھے جو ہمارے دلوں، سینوں اور پیٹ میں داخل ہو گئی تھی۔ کیا وصل محبت کا بہترین تریاق نہیں؟

اسے اپنے قریب کرنے پر شکورے نے مجھے پہلے سے پختہ ارادے مگر نرمی سے پرے دھکیلا۔ اس کی مراد تھی کہ میں ابھی تک اتنا بالغ آدمی نہ تھا کہ اس عورت کے ساتھ شادی کا قابل اعتبار رشتہ قائم کر سکوں جسے میں نے پہلے ہی خفا کر رکھا تھا۔ میں اتنا لاپرواہ تھا کہ یہ بھی بھول گیا کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے اور اتنا ناتجربہ کار کہ نہیں جانتا تھا کہ ایک کامیاب شادی میں کتنا صبر اور قدرے تکلیف درکار ہوتی ہے۔ وہ میری باہوں سے پھسل کر دروازے کی طرف جا رہی تھی، اس کا نقاب اس کی گردن میں جھول رہا تھا۔ میں نے گلیوں میں گرتی برف پر نگاہ کی جو ہمیشہ سب سے پہلے اندھیرے کے سامنے ہتھیار ڈالتی ہے اور یہ فراموش کرتے کہ ہم یہاں سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے، اس لیے کہ پھانسی شدہ یہودی کی روح بے آرام نہ ہو، میں با آواز بلند بولا:

''اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے ''محبت کی شطرنج'' کے اصولوں کا خیال کرتے کہا۔ پرانے باغ سے گزرتے وہ برف پر اپنے نقش پا چھوڑ گئی ... جنہیں یقیناً برف مٹا دیتی ... اور چپکے سے غائب ہو گئی۔

مجھے قاتل کہا جائے گا

بلاشبہ آپ کو بھی ایسا تجربہ ہوگا جو میں بتانے جا رہا ہوں: کبھی کبھی کسی عوامی ڈھابے یا کھوکھے سے سبزی کا پکوان کھاتے یا سرکنڈے کی طرز کی حاشیے کی مصوری پر توجہ مرکوز کیے ہوئے، اجنبیوں کی ختم ہونے والی بل کھاتی گلیوں میں چلتے، مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں حال میں یوں جی رہا ہوں جیسے کہ یہ کوئی ماضی ہو۔ یعنی جب میں برف سے سفید گلی سے گزرتا ہوں تو میرے اندر یہ کہنے کی تمنا ہوگی کہ میں اس سے گزر رہا تھا۔

وہ غیر معمولی واقعات جو میں بیان کروں گا، جو بیک وقت حال اور ماضی دونوں میں رونما ہوئے۔ وہ شام کا وقت تھا، دھندلکا اندھیرے کو جگہ دے رہا تھا اور اس گلی کی طرف جاتے ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی، جہاں انشتے آفندی رہتے تھے۔

دوسری شاموں کے برعکس، میں یہاں بخوبی جان کر آیا تھا کہ میں کیا چاہتا تھا۔ دوسری شاموں میں جب میں غیر حاضر دماغی سے دوسری باتیں سوچتا ہوتا، میری ٹانگیں مجھے خود بخود یہاں لے آتی تھیں: یہ کہ کیسے میں نے اپنی ماں کو بتایا کہ ایک کتاب پر کام کے عوض مجھے چاندی کے سات سو سکے ملے تھے، امیر تیمور کے زمانے کی ہرات کی کتابوں کی جلدیں جن پر طلاکاری کے بغیر آرائشی پھول بنے ہوئے تھے، یہ منسلک جانے کا افسوس کہ دوسرے اب بھی میرے نام سے یا میری بے وقوفیوں یا گناہوں کے بارے میں مصوری کرتے تھے۔ تاہم اس بار میں یہاں سوچ سمجھ کر اور بالارادہ آیا تھا۔

صحن کا بڑا دروازہ — جو مجھے خدشہ تھا کہ میرے لیے کوئی نہ کھولے گا — میرے کھٹکھٹانے سے پہلے خود بخود کھل گیا، مجھے تسلی دینے کو کہ اللہ میرے ساتھ تھا۔ صحن کی پتھریلی روش خالی تھی جس سے میں ان راتوں میں گزرتا تھا، جب میں انشتے آفندی کی عالیشان کتاب کی تصویریں بنانے آتا تھا۔ دائیں طرف کنویں کے پاس بالٹی دھری تھی جس پر سردی سے بظاہر بے نیاز ایک چڑیا بیٹھی تھی۔ تھوڑا آگے پتھر کا کھلا آتش دان تھا جسے اتنی دیر گئے بھی کسی نے نہ جلایا تھا اور بائیں طرف مہمانوں کے گھوڑوں کے لیے اصطبل تھا جو نچلی منزل کا ہی حصہ تھا۔ ہر شے توقع کے عین مطابق تھی۔ میں اصطبل کے ساتھ والے بے قفل دروازے سے داخل ہوا، بن بلائے مہمان کی طرح، جو اپنی موجودگی کی خبر دینا چاہتا ہو، رہائشی حصے میں جانے کے لیے چوبی زینہ چڑھا

چوکھٹے میں نے اپنے پیر بجائے اور کھنکھارا۔ میری کھانسی پر کوئی ردعمل نہ آیا۔ میرے کیچڑ بھرے جوتوں کو جھاڑنے کی آواز نے بھی کسی کو متوجہ نہ کیا جو میں نے بڑے کمرے، جو ڈیوڑھی کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا، کے سامنے اتار کر باقی جوتوں کے ساتھ قطار میں رکھ دیے تھے۔ جیسا کہ میرا معمول تھا، میں نے ان میں شکورے کے خوب صورت سبز جوتے تلاش کیے جو وہاں نہ تھے اور یہ امکان میرے ذہن سے گزرا کہ کوئی بھی گھر نہ تھا۔

میں دائیں طرف کمرے میں گیا —— دوسری منزل پر دائیں بائیں دو کمرے تھے —— جہاں میرے خیال میں شکورے اپنے بچوں کو لیے سوتی تھی۔ میں نے بستر اور گدے ٹٹولے اور کونے میں رکھا ایک صندوق اور لمبی سی الماری کھولی۔ جب میں سوچ رہا تھا کہ کمرے میں چھائی بادام کی ہلکی سی خوشبو شکورے کی ہو گی، ایک تکیہ جو الماری میں ٹھونسا گیا تھا، میرے کم عقل سر پر گر کر تانبے کی صراحی اور پیالوں پر جا گرا۔ آپ کو شور سنائی دیتا ہے اور یکایک احساس ہوتا ہے کہ کمرا اندھیرا ہے۔ خیر، مجھے ادراک ہوا کہ کمرا سرد تھا۔

"خیر ہے؟" انشتے کسی دوسرے کمرے سے پکارے۔ "شکورے؟ تم میں سے کون ہے؟"

میں جلدی سے کمرے سے نکلا اور [illegible] کر دیوان خانے سے گزرتے میں نیلے دروازے والے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں اس سرما میں انشتے آفندی کے ہمراہ ان کی کتاب پر محنت کرتا رہا تھا۔

"یہ میں ہوں، انشتے آفندی۔" میں نے کہا، "میں۔"

اسی لمحے مجھے خبر ہوئی کہ انشتے آفندی نے کتاب خانے میں ہمارے جو نام رکھے تھے، ان کا رازداری سے کچھ لینا دینا نہ تھا بلکہ وہ ہماری مضحکہ اڑانے کے لیے تھے۔ کسی محرر کی طرح جو کسی شان سے تزئین شدہ کتاب کے آخری ورق پر تحریر کرے گا، میں نے آہستہ آہستہ اپنے مکمل نام کے ہجے ادا کیے جس میں میری ولدیت، جائے پیدائش اور یہ جملہ شامل تھے: "آپ کا غریب گناہ گار خادم۔"

"ارے؟" انہوں نے پہلے کہا، اور پھر مزید بولے، "آہ!"

بالکل میری بچپن میں سنی اس آشوری کہانی کے بوڑھے کی طرح جس کی ملاقات موت سے ہوئی تھی، انشتے آفندی ذرا دیر خاموش ہوئے جو ابدی ثابت ہوئی۔ اگر آپ میں سے کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ چونکہ میں نے ابھی "موت" کا ذکر کیا، اس لیے میں خود کو ایسے ہی کسی معاملے میں ملوث کرنے یہاں آیا تھا تو آپ اس کتاب کو بالکل نہیں سمجھے جو آپ نے تھام رکھی ہے۔ کیا ایسے ارادے سے آنے والا کوئی شخص بھی دروازے پر دستک دیتا؟ اپنے جوتے اتارتا؟ کسی چاقو کے بغیر آتا؟

"سو تم آ گئے ہو۔" انہوں نے دوبارہ کہانی والے بوڑھے کی طرح کہا۔ پھر وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولے، "خوش آمدید، میرے بیٹے! بتاؤ، تمہیں کیا چاہیے؟"

تب تک کافی اندھیرا چھا چکا تھا۔ کھڑکی کے موم جامے کے کپڑے سے ڈھکے شیشوں سے اتنی روشنی مدھم آ رہی تھی۔ جنہیں جب بہار میں ہٹایا جائے تو انار اور سرو کے پیڑ دکھائی دیں گے۔ کہ اس

ایک مثال کے طور پر سنائی ہے کہ کوئی منی ایچر فنکار اپنے فن کے سحر میں اپنے عقیدے سے ہٹ جانے پر کیسے
کرب سے گزرتا ہے۔ اس لیے میں نے ذکر کیا کہ کیسے شیخ محمد نے شہزادہ اسماعیل مرزا کا لاتعداد کتابوں پر
مشتمل کتب خانہ نذر آتش کر دیا تھا کہ اتنی زیادہ کتابوں میں وہ اپنی کتابوں کو دوسری سے الگ نہ کر سکتے
تھے۔ اتنی مبالغہ آرائی کے ساتھ، یوں جیسے میں خود اس تجربے سے گزرا تھا، گہرے دکھ اور پچھتاوے
میں میں نے بتایا کہ شیخ محمد خود بھی اس خوف ناک آتش زدگی میں جل کر مر گئے تھے۔

"جو تصویریں ہم نے بنائی ہیں، کیا تم ان کے باعث خوف زدہ ہو، میرے بچے؟" انشتے آفندی
نے ہمدردی سے پوچھا۔ کمرا اب تاریک ہو چکا تھا، میں خود دیکھ تو نہیں سکا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ انہوں نے
مسکراتے ہوئے یہ کہا تھا۔

"ہماری کتاب اب راز نہیں رہی۔" میں نے جواب دیا، "شاید اب یہ اہم بھی نہیں۔ لیکن
افواہیں پھیل رہی ہیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ... پر وہ توہین مذہب کے مرتکب ہوئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ
ہم نے یہ کتاب... ویسے نہیں جیسے سلطان نے ہمیں [...] داری سونپی تھی اور امید کی تھی... بلکہ خود اپنے اوہام کی
خاطر بنائی ہے، ایسی کتاب جس میں توہین و گستاخی اور کافروں کی نقالی کی گئی ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جن کا
خیال ہے کہ اس میں شیطان کی بھی دل آویز تصویر کشی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے ایک ہی جسامت میں
خارش زدہ کتے، گدھے اور مسجد بنانے... اس بہانے سے کہ مسجد پس منظر میں ہے... کے تناظر میں ناقابل معافی
گناہ کی جرات کی ہے اور یوں نمازیوں کی تضحیک کی ہے۔ ان باتوں کو سوچتے ہوئے میں رات کو سو نہیں پاتا۔"

"ہم نے ساتھ مل کر تصویریں بنائیں۔" انشتے آفندی نے کہا، "ایسا جرم سرزد ہوتا تو ایک طرف
کیا ہم ایسا سوچ بھی سکتے تھے؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے کشادہ دلی سے کہا، "لیکن کسی طرح انہوں نے یہ بات سن لی ہے۔ لوگ
کہتے ہیں کہ ایک آخری تصویر ہے جس میں، جو ان کے مطابق، ہمارے مذہب اور ہر اس شے کی کھلے عام
توہین کی گئی ہے جسے ہم مقدس سمجھتے ہیں۔"

"آخری تصویر تو تم خود دیکھ چکے ہو۔"

"نہیں، میں نے تو ایک بڑے ورق کے مختلف گوشوں میں وہ تصویریں بنائی تھیں جو آپ نے
بنانے کو کہا تھا، جسے دو ورقی تصویر ہونا تھا۔" میں نے ایسی احتیاط اور ایسی درستی سے کہا جو انشتے آفندی کو پسند
آئی۔ "لیکن میں نے مکمل شدہ تصویر کبھی نہیں دیکھی۔ اگر میں نے مکمل تصویر دیکھی ہوتی تو میرا ضمیر صاف
ہوتا اور اس تمام الزام دہی کو مسترد کر دیتا۔"

"تم خود کو مجرم محسوس کیوں کرتے ہو؟" انہوں نے پوچھا، "کیا چیز تمہاری روح کو کھا رہی ہے؟
کون تمہارے خود پر شبے کا سبب بنا ہے؟"

"مکمل خوشی خوشی کتاب کے لیے مصوری کرنے کے بعد یہ پریشانی کہ کسی نے اس پر حملہ

کیا ہے جسے وہ مقدس سمجھتا ہے... زندہ رہتے ہوئے جہنم کی اذیتیں سہتا... کاش میں آخری تصویر کو مکمل حالت میں دیکھ سکتا۔"

"کیا تمہیں اس پر پریشانی ہے؟" انھوں نے کہا: "کیا تم اس لیے آئے ہو؟"

اچانک مجھ پر سراسیمگی طاری ہو گئی۔ کیا وہ کوئی ہولناک بات سوچ سکتے تھے، جیسا کہ بدنصیب نفیس آفندی کی جان لینے والا میں ہی تھا؟

"وہ جو چاہتے ہیں کہ ہمارے سلطان کو تخت سے اتار کر شہزادے کو بٹھا دیا جائے۔" میں نے کہا: "ان مکارانہ افواہوں کو پھیلا رہے ہیں، سلطان خفیہ طور پر اس کتاب کے حمایتی ہیں۔"

"کتنے لوگوں کو اس کا واقعی یقین ہے؟" انھوں نے تشویش سے پوچھا: "کوئی بھی ارادہ رکھنے والا کوئی ہو جا جس پر کوئی حماقت ہوئی اور اس کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ نتیجے کے طور پر وعظ کرے گا کہ مذہب کو نظر انداز اور اس کا عدم احترام کیا جا رہا ہے۔ اپنی روزی کمانے کا یہ سب سے قابل بھروسا طریقہ ہے۔"

کیا انھوں نے یہ فرض کر لیا کہ میں انھیں بس اس افواہ کی اطلاع دینے آیا تھا؟

"بے چارہ نفیس آفندی، خدا اس کی مغفرت فرمائے۔" میں نے لرزتی آواز میں کہا: "یا الفرض ہم نے اسے ہلاک کیا کیونکہ اس نے آخری تصویر دیکھ لی تھی اور وہ قائل تھا کہ اس میں ہمارے عقیدے کی توہین کی گئی تھی۔ محل کے کتاب [illegible] سے واقف ایک اہلکار نے مجھے یہ بتایا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ پرانے شاگردوں کو سب ادھر ادھر کی [illegible] سکتے ہیں۔"

اسی دلیل پر قائم رہتے اور زیادہ [illegible] ہوتے ہوئے، میں کچھ دیر بولتا رہا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنی دو باتیں کہیں جو میں نے بلاشبہ خود سنی تھیں، لیکن میں نے اس مکار بہتان کو کے ڈر سے خود گھڑ لیں؛ میں نے کتنی برجستہ بات کی۔ زیادہ تر مبالغہ آرائی سے خوشامد کر کے میں توقع کر رہا تھا کہ استاد آفندی مجھے آخری دو ورق والی تصویر دکھا کر سکون آشنا کر دیں گے۔ وہ مجھے کیوں نہیں کہ صرف اسی طرح ہی میرا گناہ گار ہونے کا خوف ختم ہو سکتا تھا؟

انھیں بالکل حیران کرنے کے لیے میں نے سرکشی سے پوچھا: "کیا کوئی خود آگاہ ہوئے بغیر توہین آمیز فن پارہ بنا سکتا ہے؟"

جواب دینے کی بجائے انھوں نے بڑی تہذیب اور نفاست سے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ یوں جیسے تنبیہ کر رہے ہوں کہ کمرے میں کوئی بچہ سو رہا تھا... اور میں بالکل خاموش ہو گیا۔ "خاصا اندھیرا ہو گیا ہے۔" انھوں نے تقریباً سرگوشی میں کہا: "آؤ شمع جلائیں۔"

انگیٹھی میں جلتے کوئلوں سے، جنھوں نے کمرا گرم کر دیا تھا، شمع جلانے کے بعد مجھے ان کے چہرے پر غرور کا وہ تاثر دکھائی دیا، میں جس کا عادی نہ تھا اور اس سے مجھے بہت ناخوشی ہوئی۔ کیا وہ دم تاثر تھا؟ کیا وہ سب کچھ سمجھ گئے تھے؟ کیا وہ سوچ رہے تھے کہ میں ہی گھٹیا قاتل تھا یا وہ مجھ سے خائف

تھے؟ مجھے یاد ہے کہ کیسے اچانک میری سوچیں میرے قابو سے باہر ہو گئیں اور میں بے وقوفی سے اپنے خیالات یوں سن رہا تھا جیسے میری جگہ کوئی اور سوچ رہا ہو۔ مثال کے طور پر، میرے پیروں تلے قالین پر ایک کونے میں بھیڑیے جیسا ایک نمونہ تھا، لیکن وہ مجھے پہلے دکھائی کیوں نہ دیا؟

"تمام خان، شاہ اور سلطان، تصویروں، مصوری اور اچھی کتابوں کے لیے جو محبت محسوس کرتے تھے اسے تین موسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔" انشتے آفندی نے کہا؛ "شروع میں، وہ جرات مند، شوقین اور تجسس ہوتے ہیں۔ حاکم اپنے احترام، اس پر اثر انداز ہونے کے لیے کہ دوسرے انہیں کیسے دیکھتے ہیں، تصویریں بنواتے ہیں۔ اس دوران وہ خود کو تعلیم دے لیتے ہیں۔ دوسرے مرحلے میں وہ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے کتابیں تیار کروانے کی سرپرستی کرتے ہیں۔ چوں کہ وہ تصویروں سے حظ اٹھانا سیکھ چکے ہوتے ہیں، وہ اپنی عزت و وقار بڑھانے کے ساتھ کتابیں بھی جمع کیے جاتے ہیں جو ان کی موت کے بعد دنیا میں ان کا نام زندہ رکھنے کی یقین دہانی ہوتی ہیں۔ تاہم اپنی زندگی کی خزاں میں کسی سلطان کو اپنی دنیاوی لافانیت کی پروا نہیں رہتی۔ "دنیاوی لافانی پن" سے میری مراد آئندہ نسلوں، اپنے بیٹوں پوتوں کی جانب سے یاد رکھے جانے کی خواہش ہے۔ سی ایچ تصویروں اور کتابوں کو پسند کرنے والے حاکم ہم سے جو ان کتابوں کے سبب پہلے ہی لافانی ہو گئے، جن کے اوراق پر انہوں نے اپنے نام درج کروا لیے تھے اور بعض اوقات تو اپنی تواریخ بھی۔ بعد میں ان میں سے ہر کسی نے محسوس کیا کہ مصوری دوسری دنیا میں اعلیٰ مقام پانے کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ یہی بات ہے جو مجھے پریشان اور خوف زدہ کرتی ہے۔ شاہ طہماسپ نے جو خود ایک استاد منی ایچر فنکار تھے اور اپنی تو جوانی اپنے کتاب خانے میں گزاری تھی، موت کا وقت قریب آنے پر اپنا عالیشان نقاش خانہ بند کروا دیا، اپنے اعلیٰ مصوروں کو تبریز سے نکال باہر کیا، اپنی جوانی تمام کتابیں تلف کر دیں اور ندامت اور پشیمانی کے نہ ختم ہونے والے بحرانوں کا شکار ہو گئے۔ وہ سب یہ کیوں خیال کرتے تھے کہ مصوری ان پر جنت کے دروازے بند کر دے گی؟"

"تم خوب واقف ہو کہ کیوں! کیوں کہ انہیں ہمارے مذہب کی تنبیہ یاد آ گئی کہ روزِ حساب اللہ تعالیٰ مصوروں کو سب سے کڑی سزا دیں گے۔"

"مصور نہیں۔" انشتے آفندی نے تصحیح کی۔ "وہ جو بت تراش ہیں۔ اور یہ قرآن کریم کا فرمان نہیں بلکہ صحیح بخاری میں درج حدیث نبوی ہے۔"

"روزِ حساب بت تراشوں سے اپنے بنائے بتوں میں جان ڈالنے کا کہا جائے گا۔" میں نے محتاط انداز میں کہا، "چوں کہ وہ ایسا کرنے میں ناکام رہیں گے، اس لیے ان سب کو جہنم کا عذاب جھیلنا پڑے گا۔ مت بھولیں کہ قرآن کریم میں "خالق" اللہ کے اوصاف میں سے ہے۔ اللہ ہی تخلیق کرتا ہے، جو غیر موجود کو وجود بخشتا اور مردہ کو زندگی دیتا ہے۔ کسی کو اس کے مقابل نہیں آنا چاہیے۔ ان مصوروں سے گناہ عظیم سرزد ہوتا ہے جو ویسا کرنے کی جسارت کرتے ہیں جو صرف اللہ ہی کر سکتا ہے، جو اس کی طرح تخلیق

کار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔"

میں نے اپنی بات ٹھوس انداز میں یوں کی جیسے میں بھی انھیں الزام دے رہا تھا۔ انھوں نے اپنی نگاہ میری نگاہوں پر جمائی۔

"تمہارا خیال ہے کہ ہم یہی کچھ کرتے رہے ہیں؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اگرچہ نفیس آفندی، خدا اس کی مغفرت کرے، یہی سوچنے لگا تھا جب اس نے آخری تصویر دیکھی۔ وہ کہتا تھا کہ آپ کا تناظر کی سائنس کا استعمال اور روغنی فنکاروں کے انداز شیطان کے بہکاوے کے سوا کچھ نہ تھے۔ آخری تصویر میں آپ نے فرنگیوں کے طریقے کے استعمال سے کوئی فانی چہرہ بنایا جسے دیکھنے پر تصویر پر اس حد تک حقیقت کا گمان ہوتا کہ یوں لگتا جیسے اس تصویر میں اتنی طاقت ہے کہ وہ دیکھنے والوں کو اپنے سامنے جھکنے کی ترغیب دیتی ہے، چرچ کی مقدس شبیہوں کی طرح۔ اس کے مطابق، یہ شیطان کا کام تھا، نہ صرف اس لیے کہ تناظر کا فن تصویر کو خدا کے تصور یا تناظر سے پستی کی طرف لے آتا ہے، کسی آوارہ کتے کی سطح تک بلکہ یوں کہ آپ کا وینس کے طریقوں پر انحصار اور اس کے ساتھ ساتھ طے شدہ روایات کو کافروں کی روایات کے ساتھ ملاتا جلاتا ہمیں اپنے خالص پن سے دور کرے گا اور محض ان کا غلام بنا کر رکھ دے گا۔"

"کچھ بھی خالص نہیں۔" انشٹے آفندی نے کہا۔ "کتابوں کے فن کی کتابوں کی اقلیم میں جب کوئی شاہ پارہ تخلیق ہوتا ہے، جب کوئی شاندار کام دیکھ کر میری آنکھیں خوشی سے نم ہو جاتی ہیں اور میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ جاتی ہے، مجھے اس پر یقین ہو جاتا ہے: دو انداز جو قبل ازیں کبھی ایک جگہ جمع نہ کیے گئے تھے، ایک نئے اور حیران کن فن پارے کی تخلیق میں یکجا ہو گئے ہیں۔ ہم عرب مصوری کی حساسیت اور منگول چینی مصوری کے لیے بہزاد اور عالیشان ایرانی مصوری کے یکجا ہونے کے مقروض ہیں۔ شاہ طہماسپ کی بہترین تصویریں ایرانی اور ترکمانی نزاکت کا امتزاج ہیں۔ آج اگر لوگ ہندوستان کے شہنشاہ اکبر کے کتاب خانوں کی تعریف و تحسین نہیں کر سکتے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے اپنے منی ایچر فنکاروں کو فرنگی فنکاروں کے انداز اپنانے کی ترغیب دلائی تھی۔ مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں۔ خدا ہمیں خالص اور بے آمیزش کی آرزو سے محفوظ رکھے۔"

شمع کی روشنی میں چاہے ان کا چہرہ کتنا ہی نرم خو اور روشن دکھائی دے رہا تھا، ان کا دیوار پر پڑنے والا سایہ انتہائی تاریک اور دہشت خیز تھا۔ ان کی باتوں کو انتہائی معقول اور درست سمجھنے کے باوجود، مجھے ان پر یقین نہ آیا۔ مجھے خیال ہوا کہ انھیں مجھ پر شبہ تھا اور یوں مجھے بھی ان پر شک ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ وہ باہر صحن کے دروازے کی آواز پر کان لگائے ہوئے تھے، یہ کہ انھیں امید تھی کہ کوئی آ کر انھیں میری موجودگی سے چھٹکارا دلا دے گا۔

"خود آپ نے مجھے بتایا تھا کہ کیسے اصفہان کے استاد شیخ محمد نے وہ کتب خانہ جلا ڈالا تھا جس

میں ان کی وہ تصویریں تھیں جنھیں وہ دور کر چکے تھے اور کیسے ضمیر کے بوجھ کے باعث انھوں نے خود کو ہلاک کر ڈالا تھا۔" اس نے کہا: "اب مجھ سے اس داستان کے متعلق ایک اور کہانی سنیں جو آپ نے سنی نہ ہوگی۔ یہ درست ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری تیس برس اپنی تصویروں یا کام کی تلاش میں گزارے۔ تمام جن کتابوں کا انھوں نے بغور مطالعہ کیا، اس میں انھیں جگہ جگہ اپنے اصل کام کی جگہ اس کی نقالی ملی۔ بعد کے برسوں میں انھیں معلوم ہوا کہ فنکاروں کی دو نسلوں نے مصوری کے ان نمونوں کو مثال بنا کر اپنا لیا تھا جو وہ خود مسترد کر چکے تھے، یہاں تک کہ وہ ان کے ذہنوں پر نقش تھیں۔ یا زیادہ درست طور پر ان کی روحوں کا حصہ بن چکی تھیں۔ جب شیخ محمد نے اپنی تصویروں کو ڈھونڈ کر انھیں ضائع کرنے کی کوشش کی، انھیں معلوم ہوا کہ نوجوان مصور لاتعداد کتابوں میں انھیں عقیدت سے نقل کر چکے تھے، دوسری کہانیوں کی تصویر کشی میں وہ ان کے کام پر بھروسا کرتے تھے، اور وہ ان کے باعث وہ تصویریں لوگوں کو ازبر ہو چکی اور دنیا بھر میں پھیل چکی تھیں۔ برسوں ان تصویروں کو ایک سے دوسری کتاب، اور ایک سے دوسری مصوری میں دیکھنے کے بعد ہم نے یہ جانا: کوئی عظیم مصور جسے اپنے شہکاروں سے متاثر کرنے پر ہی مطمئن نہیں ہوتا، وہ ہمارے دماغوں کے منظرنامے کو ہی بدلنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ جب کسی منی ایچر فنکار کا ہنر اس طرح ہماری روح میں نفوذ کر جاتا ہے، یہ ہماری دنیا میں خوب صورتی کا معیار بن جاتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخر میں جب اصفہان کے فنکار نے اپنے فن پاروں کو نذرِ آتش کیا، انھیں نہ صرف یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ ان کا کام غائب ہونے کے باوجود مزید پھیلا تھا اور اس میں اضافہ ہوا تھا بلکہ انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر کوئی دنیا کو اب اسی انداز میں دیکھ رہا تھا جیسا کبھی انھوں نے دیکھا تھا۔ جو چیزیں ان کی جوانی میں ان کی بنائی تصویروں سے مشابہ تھیں، بد صورت سمجھی جاتی تھیں۔"

اپنے اندر ہلکورے لیتے رعب اور انشتے آفندی کو خوش کرنے کی تمنا پر قابو پانے میں ناکام ہو کر میں ان کے سامنے جھک گیا۔ ان کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور میں نے محسوس کیا کہ میں نے انھیں اپنی روح میں وہ مقام دے دیا تھا جو ہمیشہ استاد عثمان کے لیے مخصوص رہا تھا۔

"ایک منی ایچر فنکار،" انشتے آفندی نے خود سے مطمئن کسی آدمی کے لہجے میں کہا، "اپنے ضمیر کی آواز سن کر اور جس پر یقین رکھتا ہے ان اصولوں کی پیروی میں کسی خوف سے بالاتر ہو کر فن کی تخلیق کرتا ہے۔ وہ اپنے مخالفوں، متعصب لوگوں اور حاسدوں کے کہے کی پروا نہیں کرتا۔"

لیکن اپنے آنسوؤں میں ان کا بوڑھا داغ دار ہاتھ چومتے ہوئے مجھے یہ خیال ہوا کہ انشتے آفندی تو منی ایچر فنکار بھی نہ تھے۔ مجھے اپنی سوچ پر شرمساری ہوئی۔ یوں تھا جیسے کسی اور نے یہ شیطانی سا بے شرم خیال میرے دماغ میں ڈالا تھا۔ پھر بھی، آپ بھی آگاہ ہیں کہ میری بات کتنی سچی تھی۔

"میں ان سے خائف نہیں،" انشتے نے کہا، "کیوں کہ مجھے موت کا کوئی خوف نہیں۔"

"ان" کون تھے؟ میں نے سر یوں ہلایا جیسے سمجھ گیا ہوں۔ لیکن میرے اندر بے حسی سر اٹھانے

گی۔ میں نے دیکھا کہ انیشتے کے پاس الجوزی کی ''ہادی الارواح'' کی ایک پرانی جلد رکھی تھی۔ موت کے متلاشی سارے ضعیف سٹھیائے ہوئے بوڑھے اس کتاب کے شوقین ہیں جس میں روح کی منتظر مہمات کا بیان ہے۔ میری پچھلی مرتبہ آمد کے بعد، صندوق پر دھرے طشت میں رکھے قلم دان، قلم تراش، دوات اور موقلم میں ایک نئی شے کا اضافہ ہوا تھا: کانسی کی دوات۔

''آئیں ہم ایک بار ہی ہمیشہ کو طے کرلیں کہ ہم ''ان'' سے نہیں ڈرتے۔'' میں نے بے خوفی سے کہا، ''آخری تصویر نکالیں۔ ہم انہیں یہ دکھا دیتے ہیں۔''

''لیکن کیا یہ اس بات کا ثبوت نہ ہوگا کہ ہم نے ان کے الزام کی پرواہ کی،'' اسے سنجیدگی سے لیا ہے؟ ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا جس باعث ہمیں خوف زدہ ہونا پڑے۔ تمہارے اتنا خوف زدہ ہونے کو کیا بات درست ثابت کرسکتی ہے؟''

انہوں نے کسی باپ کی طرح میرے بال سہلائے۔ مجھے ڈر تھا کہ دوبارہ کہیں میرے آنسو نہ نکلیں، میں نے انہیں گلے لگا لیا۔

''میں جانتا ہوں کہ بدقسمت طلا کار نفیس آفندی کیوں قتل کیا گیا؟'' میں نے جوش سے کہا، ''آپ، آپ کی کتاب اور ہم پر بہتان تراشی کرکے نفیس آفندی منصوبہ بنا رہا تھا کہ ارض روم کے خوبا نفرت کے بیج وکار ہم پر چڑھ دوڑیں۔ اسے یقین تھا کہ ہم شیطان کے بہکاوے میں آگئے ہیں۔ اس نے اس کوشش میں ایسی افواہیں پھیلانا شروع کردیں کہ آپ کی کتاب پر کام کرنے والے دوسرے منی ایچر فنکار آپ کے خلاف بغاوت پر اتر آئیں۔ معلوم نہیں وہ اچانک ایسا کیوں کرنے لگا تھا؟ شاید رشک وحسد کے باعث یا وہ شیطان کا شکار بن گیا تھا۔ اور دوسرے منی ایچر فنکاروں نے بھی سنا کہ وہ ہم سب کو برباد کرنے کے لیے کتنا پرعزم تھا۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہ سب کس طرح خوف زدہ ہوگئے اور کیسے شک و شبہ کا شکار ہوگئے، بالکل میری طرح۔ ان میں سے ایک نے... آپ کے، ہمارے، ہماری کتاب اور اس کے ساتھ ساتھ مصوری اور اس سب کے خلاف جس پر ہمارا یقین ہے... نصف شب کو نفیس آفندی نے جھگڑا کیا تھا، وہ گھبرا گیا، اور اسی میں اس بدمعاش کو قتل کرکے اس کی لاش کنویں میں پھینک دی۔''

''بدمعاش؟''

''نفیس آفندی، ایک بدفطرت، بدنسل غدار تھا۔ بدمعاش!'' میں یوں چلایا جیسے وہ کمرے میں میرے سامنے موجود تھا۔

خاموشی۔ کیا وہ مجھ سے ڈر گئے تھے؟ میں خود اپنے آپ سے خوف زدہ تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی اور کے ارادے اور سوچوں سے مغلوب ہوگیا تھا، تاہم یہ پوری طرح ناخوش گوار نہ تھا۔

''تمہاری طرح سراسیمہ ہونے والا وہ منی ایچر فنکار اور اصفہان کا مصور کون تھے؟ اسے کس نے قتل کیا؟''

"مجھے معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔

پھر بھی میں اپنے تاثر سے بتانا چاہتا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا تھا۔ مجھے ادراک ہوا کہ میں نے وہاں آ کر عظیم غلطی کی تھی، لیکن میں احساس جرم اور پچھتاوے کے سامنے مغلوب ہونے والا نہ تھا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ ایشے آفندی مجھ پر شک کر رہے تھے اور اس بات نے مجھے خوش اور مضبوط کیا۔ اگر وہ قائل ہو جاتے کہ میں ہی قاتل تھا اور یہ علم ان کی روح کو دہشت زدہ کر دیتا تو پھر وہ مجھے آخری تصویر دکھانے کی جرأت نہ کرتے۔ میں اس تصویر کے متعلق اتنا متجسس تھا، اس گناہ کے سبب نہیں جو میں نے اس سلسلے میں کیا تھا۔ بلکہ میں واقعی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیسی بنی تھی؟

"کیا یہ بات اہم ہے کہ اس مردود کو قتل کرنے والا کون ہے؟" میں نے کہا، "جس کسی نے بھی ہمیں اس سے چھٹکارا دلایا، کیا اچھا نہیں کیا؟"

میرا حوصلہ بڑھا کہ وہ اب میری آنکھوں میں براہ راست نہ جھانک رہے تھے۔ بڑے یا عالی حوصلہ آدمی جو خود کو دوسروں سے بہتر اور اخلاقی طور پر برتر سمجھتے ہیں، جب آپ سے شرمندہ ہوں تو آپ کی آنکھوں میں نہیں جھانک سکتے، کہ شاید وہ آپ کی ... کرنے، آپ کو اذیت رسانی اور پھانسی کے نصیب کے حوالے کرنے پر غور کر رہے ہوں۔

باہر، صحن کے دروازے کے عین سامنے کتے شدت سے بھونکنے لگے۔

"برف باری پھر سے شروع ہو گئی ہے۔" میں نے کہا، "آپ کے ... سب کہاں چلے گئے؟ وہ آپ کو بالکل اکیلا کیوں چھوڑ گئے؟ انہوں نے آپ کے لیے شمع تک نہیں روشن کی۔"

"یہ واقعی کافی حیرت کی بات ہے۔" وہ بولے، "میں خود بھی نہیں سمجھ سکا۔"

وہ اس قدر پرخلوص تھے کہ مجھے ان پر پورا یقین ہو گیا اور دوسرے منی ایچر فنکاروں کی طرح ان کا مضحکہ اڑانے کے باوجود، مجھے ایک بار پھر معلوم ہوا کہ میں ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ لیکن انہیں اچانک مجھ میں چھوٹنے والے اپنے احترام اور محبت کا علم کیسے ہوا، جس پر انہوں نے پدرانہ شفقت سے میرے بال سہلائے؟ میں محسوس کرنے لگا کہ استاد عثمان کا انداز مصوری اور ہرات کے پرانے استادوں کی وراثت کا کوئی مستقبل نہ تھا۔ اور اس بدشگون خیال نے مجھے پھر سے خوف زدہ کر دیا۔ کسی سانحے کے بعد ہم سب ایک سا ہی محسوس کرنے لگتے ہیں: اپنی آخری مایوس کن اُمید میں اور یہ پروا کیے بغیر کہ ہم کتنے مضحکہ خیز اور احمق لگ سکتے ہیں، ہم دعا کرتے ہیں کہ سب کچھ پہلے کی طرح ہی جاری رہے گا۔

"اپنی کتاب پر کام جاری رکھیں۔" میں نے کہا، "سب کچھ ویسا چلنے دیں، جیسا ہمیشہ سے تھا۔"

"قاتل منی ایچر فنکاروں میں سے کوئی ایک ہے۔ میں اپنا کام قرہ آفندی کے ساتھ جاری رکھوں گا۔"

"کیا وہ مجھے اکسا رہے تھے کہ میں انہیں قتل کر دوں؟

"اس وقت قرہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا، "آپ کی بیٹی اور اس کے بچے کہاں ہیں؟"

مجھے محسوس ہوا جیسے کسی دوسری قوت نے یہ الفاظ میری زبان سے ادا کروائے تھے، پھر بھی میں خود کو روک نہ پایا۔ میرے لیے خوش اور پرامید ہونے کی اب کوئی وجہ نہ تھی۔ میں صرف ہوشیار اور طنز آمیز ہو سکتا تھا۔ ان دونوں ہمیشہ تفریح دینے والے دو جن ذہانت اور فقرہ بازی ... کے پس پردہ میں نے ان پر قابو پانے والے شیطان کی موجودگی خود پر غالب آتی محسوس کی۔ عین اسی لمحے دروازے کے باہر ملعون کتے دیوانہ وار بھونکنے لگے جیسے انہوں نے خون کی بو سونگھ لی ہو۔

کیا یہی لمحہ میں نے عرصہ پہلے بھی گزارا تھا؟ کسی ذور دراز شہر میں، ایسا وقت جو اب مجھے یوں نظر آتا ہے، جیسا کہ برف جسے میں گرتے نہ دیکھ سکا شمع کی روشنی میں میں ایک کرشیدہ ضعیف کے سامنے میں روتے ہوئے وضاحت دے رہا تھا کہ میں بالکل بے گناہ تھا، جس نے مجھ پر رنگ کی چوری کا الزام لگایا تھا۔ تب، بالکل ابھی کی طرح، کتے بھونکنے لگے تھے جیسے انہوں نے خون کی بو سونگھ لی ہو۔ اور میں انشتے آفندی کی لمبی ٹھوڑی سے جو کسی بر بڑھے کے لیے موزوں تھی اور ان کی نگاہوں سے جو انہوں نے اب پہلی سے میری آنکھوں پر جمائی تھیں، اندازہ لگایا کہ ان کا ارادہ مجھے کچل دینے کا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں کی تصویر جیسا ایک دس سالہ سی ایچ فنکار گر رہا تھا جس کا خاکہ تو واضح ہے لیکن رنگ مدھم پڑ چکے تھے۔ یوں میں حال میں ایسے جی رہا تھا جیسے وہ کوئی میز جو دھندلی یاد تھی۔

سو اٹھ کر میں نے چکر کاٹا اور انشتے کے عقب میں پہنچا وہ تی نکانسی کی بھاری دوات اٹھائی جو میز پر شیشے، پورسلین اور بلوری جالی بیچانی دواتوں میں پڑی تھی، میرے اندر کا مختفی سی ایچ فنکار ... مجھے استاد عثمان نے ہم سب کی روحوں میں جمایا تھا ... وہ مصوری کر رہا تھا جو میں کرتا تھا اور جو میں نے کئی اُڑے ہوئے رنگ میں دیکھی، ایسا نہیں جس کا تجربہ میں اب کر رہا تھا بلکہ یوں جیسے وہ کوئی بہت پرانی یاد تھی۔ آپ جانتے ہی ہیں، خواب میں کیسے ہم خود کو اپنے باہر سے ذور سے دیکھ کر پہچان جاتے ہیں، اسی طرح کے احساس سے، میں نے کانسی کی چھوٹی لیکن بھاری دوات تھامے کہا:

"جب میں دس برس کا تھا، میں نے ایسی ہی ایک دوات دیکھی تھی۔"

"یہ تین سو سال پرانی منگول دوات ہے۔" انشتے آفندی نے بتایا، "قرہ اسے تبریز سے لایا تھا۔ یہ سرخ رنگ کے لیے ہے۔"

عین اس لمحے، شیطان مجھے بھڑکا رہا تھا کہ میں پوری قوت سے اس مغرور بوڑھے کے ناقص دماغ پر دوات دے ماروں۔ لیکن میں نے شیطان کے آگے ہار نہیں مانی اور ایک جھوٹی امید سے میں نے کہا، "میں ہوں، میں ہی ہوں جس نے نفیس آفندی کا قتل کیا۔"

آپ جان گئے ناں کہ میں نے یہ امید سے کیوں کہا تھا؟ مجھے بھروسا تھا کہ انشتے آفندی سمجھ جائیں گے اور مجھے معاف کر دیں گے ... یہ کہ وہ خوف زدہ ہو جائیں گے اور میری مدد کریں گے۔

میں تمہارا انشتے ہوں

جب اس نے اعتراف کیا کہ نفیس آفندی کا قتل اسی نے کیا تھا، کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ مجھے خیال آیا کہ وہ مجھے بھی قتل کر دے گا۔ کیا وہ میری جان لینے آیا تھا یا اعتراف قتل کر کے مجھے خوف زدہ کرنے؟ کیا اسے خود بھی علم تھا کہ وہ چاہتا کیا تھا؟ میں یہ محسوس کر کے خوف زدہ تھا کہ میں اس اعلیٰ فنکار کی اندرونی دنیا سے بالکل واقف نہ تھا جس کے عالیشان لکیروں اور رنگوں کا بہترین استعمال سے برسوں سے شناسا ہوں۔ میں اسے سرخ رنگ کے لیے مخصوص برش اور دوات تھامے اپنے پیچھے کھڑا محسوس کر سکتا تھا، لیکن میں نے مڑ کر اس کا سامنا نہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ میری خاموشی اسے مضطرب کرے گی۔ ”تم ابھی خاموش نہیں ہوئے۔“ میں نے کہا۔

ہم پھر خاموش ہو گئے۔ اس بار میں جانتا تھا کہ میری موت یا میرے اس بدقسمتی سے بچاؤ کا انحصار اس بات پر ہوگا جو میں اسے بتاؤں گا۔ اس کے کام کے سوا میں بس اتنا جانتا تھا کہ وہ خاصا ذہین تھا اور اگر آپ یہ کہیں کہ کسی مصور کو بھی اپنے کام میں اپنی روح کا اظہار کرنا چاہیے تب ذہانت یقیناً ایک اثاثہ ہے۔ جب کوئی بھی گھر نہ تھا تو کیسے اس نے مجھے گھیر لیا؟ میرا بوڑھا دماغ پر یہی سوال حاوی تھا لیکن میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ خود کو اس کھیل سے باہر نہ رکھ سکا۔ شکورے کہاں تھی؟

”آپ جانتے تھے ناں کہ یہ میں ہی تھا؟“ اس نے پوچھا۔

مجھے بالکل معلوم نہ تھا، جب تک کہ اس نے مجھے نہ بتا دیا۔ اپنے دماغ کے کسی گوشے میں میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کیا اس نے نفیس آفندی کو ہلاک کر کے اچھا کیا اور یہ کہ مرحوم منی ایچر فنکار شاید اپنے اضطراب کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا اور باقی ہم سب کے لیے مشکلات کھڑی کر دیتا۔

میں اس قاتل کا کچھ مشکور بھی ہوا جس کے ساتھ میں اپنے خالی گھر میں تنہا تھا۔

”مجھے حیرت نہیں ہوئی کہ اسے تم نے قتل کیا۔“ میں نے کہا۔ ہم جیسے لوگ جن کی زندگیاں کتابوں کے ساتھ گزرتی ہیں اور جو ہمیشہ خواب میں بھی ان کتابوں کے اوراق ہی دیکھتے ہیں، انہیں اس دنیا میں صرف ایک خوف ہوتا ہے۔ مزید، ہم ممنوعہ اور خطرناک چیز میں الجھے ہیں، یعنی ہم مسلمان شہر میں

تصویر کشی کی کوشش کر رہے ہیں۔ اصفہان کے شیخ محمد کی طرح دوسروں کو الزام دینے سے پہلے ہم منی ایچر فنکار خود الزام قبول کر لیتے ہیں، ہم شرمندہ ہوتے ہیں اور ہم خدا اور لوگوں سے معافی مانگتے ہیں۔ ہم شرمسار گناہگاروں کی طرح چوری چھپے اپنی کتابوں پر کام کرتے ہیں۔ خوجا، مبلغین، قاضیوں اور صوفیوں کے ان لاتعداد حملوں کے سامنے جھکنا جو ہم پر توہین یا گستاخی کا الزام لگاتے ہیں، یہ ناتمام احساس گناہ فنکار کے تخیل کو مردہ کرتا اور اسی طرح اسے مہمیز بھی دیتا ہے۔''

''آپ اس احمق منی ایچر فنکار کے قتل پر مجھے غلط قرار نہیں دے رہے، ہے ناں؟''

''ہمیں لکھنے، تزئین کاری اور مصوری کی طرف جو شے متوجہ کرتی ہے، وہ سزا کے اس خوف کی پابند ہے۔ ہم صرف دولت اور تعریف کے لیے صبح سے شام تک، شمع کی روشنی میں تمام رات اپنے کام کے آگے جھکنے اور خود کو کتابوں اور تصویروں کے لیے قربان نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی فضول گوئی اور لوگوں سے بچنے کے لیے بلکہ اس کے برعکس تخلیق کے جنون کے لیے ہم ان سے بھی اپنی تخلیق کردہ تصویریں دیکھنا اور ان کی تعریف اور ان سے متاثر ہونا چاہتے ہیں جنہیں ہم مسترد کر چکے ہیں ــــ اور اگر وہ ہمیں گناہ گار سمجھیں؟ آہ! حقیقی مصور کو اس پر جو اذیت ہوگی اسی میں اصل مصوری اس کرب میں نہاں ہے جسے کوئی نہیں دیکھتا، جسے کوئی تخلیق نہیں کرتا۔ یہ تصویر کے اندر ہوتی ہے جو پہلی نظر میں لوگ بری، ناقص، توہین آمیز کہیں گے۔ ایک حقیقی منی ایچر فنکار جانتا ہے کہ اسے اس نکتے تک ضرور جانا ہوگا، پھر اسی وقت وہ اپنی منتظر تنہائی سے بھی خوف زدہ ہوتا ہے۔ ایسی دہشت خیز، اعصاب شکن موجودگی کون چاہے گا؟ دوسروں سے پہلے خود کو الزام دے کر فنکار سمجھتا ہے کہ وہ اس سے بچ جائے گا جس کا اسے برسوں خوف رہا ہے، دوسرے صرف تبھی اس کی بات سنیں اور مانیں گے جب وہ اعتراف گناہ کر لے، وہ گناہ جس کی سزا جہنم کی آگ ہے ــــ اصفہان کے مصور نے جہنم کی یہ آگ خود بھڑکائی تھی۔''

''لیکن آپ منی ایچر فنکار نہیں ہیں۔'' اس نے کہا: ''میں نے اسے خوف کے سبب قتل نہیں کیا۔''

''تم نے اسے اس لیے قتل کیا کہ تم اپنی مرضی سے، خوف کے بغیر مصوری کرنا چاہتے تھے۔''

اتنی دیر میں پہلی بار منی ایچر فنکار نے جو میرا قاتل بننا چاہتا تھا، پہلی بار عقل کی بات کی: ''میں جانتا ہوں کہ آپ یہ سب میری توجہ ہٹانے، فریب دینے اور خود کو اس صورت حال سے باہر نکالنے کے لیے بیان کر رہے ہیں۔'' پھر اس نے مزید کہا: ''لیکن آپ نے ابھی جو کچھ کہا، سچ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری بات سمجھیں، ہنسیں۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بولتے ہوئے سارے رسمی آداب بالکل بھول گیا تھا۔ وہ اپنے ہی خیالات میں منہمک تھا، لیکن کون سے خیالات؟

''ڈریے مت، میں آپ کا وقار مجروح نہیں کروں گا۔'' اس نے کہا۔ ایک چکر کاٹ کر میرے سامنے آتے وہ ایک تیج فہمی ہنسا: ''اب بھی ...'' اس نے کہا: ''جب میں یہ سب کر رہا ہوں، میں اپنے آپ

میں بھی لگے رہا۔ یوں ہے جیسے میرے اندر کوئی مجھے اس بدی پر اکسا رہا ہے۔ مصوری میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔"

"یہ بڑی بوڑھیوں کی شیطان کے متعلق گھڑی کہانیاں ہیں۔"

"پھر آپ کو لگتا ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

"اس میں مجھے قتل کرنے کا حوصلہ تھا، اس لیے وہ چاہتا تھا کہ میں اسے غصہ دلاؤں۔" "نہیں، تم جھوٹ بھی بول رہے ہو لیکن تم جو محسوس کر رہے ہو، اس کا اعتراف بھی نہیں کر رہے۔"

"میں اس کا بخوبی اعتراف کرتا ہوں جو محسوس کرتا ہوں۔ میں زندہ رہتے ہوئے قبر کے عذاب میں جلتا ہوں۔ ہم اصل میں آپ کی وجہ سے گردن تک گناہ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اب آپ "معزز ہونے" کا ڈرامہ رچا رہے ہیں۔ مجھے قاتل بنانے والے آپ ہیں۔ حضرت موجا کے جوتی ساتھی ہم سب کی جانیں لے لیں گے۔"

جیسے جیسے اس کے احتجاج میں کمی آگئی، اس نے اپنی آواز بلند کر لی اور دوات کو مزید شدت سے تھام لیا۔ کیا برف سے وحشی گلی کا کوئی راہگیر اس کو سن کر گھر میں داخل ہوگا؟

"تم نے اسے کیسے قتل کیا؟" میں نے تجسس کا اظہار کرتے ہوئے وقت حاصل کرنے کو پوچھا۔ "کنویں پر اس سے ملاقات کا اتفاق کیسے ہوا؟"

"وہ رات جب مجھیں آفندی آپ کے گھر سے نکلا، وہ میرے پاس آیا تھا۔" اس نے اعتراف کیا۔ "وہ بالکل غیر متوقع طور پر تھا۔" اس نے بتایا کہ وہ دو ورقی تصویر دیکھ چکا ہے۔ میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ کوئی جھگڑا کھڑا نہ کرے۔ میں اسے ذرا آتش علاقے کی طرف کھینچ لے گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے کنویں کے قریب رقم دبا رکھی ہے۔ اس نے میرا یقین کر لیا۔ اس سے زیادہ بہتر ثبوت کیا ہوگا کہ کوئی مصور حرص و ہوس سے تحریک پائے؟ میرے افسوس نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ وہ قابل تھا لیکن محض ایک اسلوب کا فنکار تھا۔ لالچی گدھا اپنے ناخنوں تک سے زمین کھودنے کو راضی تھا۔ دیکھیں، اگر میں نے واقعی کنویں کے قریب سکے دفن کیے ہوتے تو مجھے اس سے چھٹکارا پانے کی ضرورت نہ تھی۔ ابا آپ نے طلاکاری کے لیے ایک ملعون کی خدمات حاصل کی تھیں۔ مرحوم ہنرمند تھا لیکن اس کا رنگوں کا انتخاب اور رنگ بھرنا بہت معمولی نوعیت کا تھا اور اس کی مصوری کسی کو بھی متاثر نہ کرتی تھی۔ میں نے کوئی کام تشنہ نہ چھوڑا۔۔۔ تو مجھے بتائیں کہ "انداز یا اسلوب" کا جوہر کیا ہے؟ آج فرنگی اور چینی دونوں ہی مصوری قابلیت کی نوعیت کی بات کرتے ہیں جسے وہ "اسلوب" کہتے ہیں۔ کیا انداز یا اسلوب کسی فنکار کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے یا نہیں؟"

"درست۔" میں نے کہا۔ "کوئی نیا اسلوب کسی محض ابھر فنکار کی اپنی تمنا سے نہیں ابھرتا۔ کوئی شہزادہ مر جاتا ہے، کوئی شاہ جنگ ہار جاتا ہے، بظاہر ختم نہ ہونے والا کوئی دور انجام پذیر ہو جاتا ہے، کوئی

کتاب خانہ بند ہو جاتا ہے اور اس کے لوگ بکھر کر دوسرے قدر دان سرپرستوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کسی روز کوئی شوقین سلطان ان جلا وطن لیکن سراسیمہ اور باصلاحیت پناہ گزین منی ایچر فنکاروں اور خطاطوں کو اپنے جیسے پائل میں جمع کرے گا اور اپنا مصور یا کتاب خانہ قائم کرے گا۔ ایک دوسرے سے ناواقف فنکار، چاہے پہلے اپنے اپنے انداز میں کام شروع کریں گے اور وقت کے ساتھ، ان بچوں کی طرح جو گلیوں میں کھیلتے کھیلتے دوست بن جاتے ہیں، جھگڑتے ہیں، ایک دوسرے سے تعلق بناتے اور سمجھوتہ کرنا سیکھتے ہیں، یہ بھی رفتہ رفتہ ایسا ہی کریں گے۔ نیا انداز برسوں کے اختلافات، حسد، عداوت اور رنگ اور مصوری کے مکالمے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ عموماً اس انداز یا قسم کا بانی سب سے باصلاحیت فنکار ہوگا۔ اس انداز کو کمال تک پہنچانے اور نفاست دینے کی ذمے داری باقی منی ایچر فنکاروں کی ہوتی ہے۔''

میری آنکھوں میں جھانکنے پر ناکام ہو کر اس نے غیر متوقع طور پر اپنا رویہ نرم کر لیا اور میری ہمدردی اور اس کے ساتھ ایمان داری کی التجا کرتے، کسی دوشیزہ کی طرح کانپتے اس نے پوچھا:

''کیا میرا اپنا الگ انداز یا اسلوب ہے؟''

مجھے لگا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں گے۔ میں نے اس تمام نرمی، ہمدردی اور مہربانی کے ساتھ جو میں جمع کر پایا اسے وہ بتایا جو میرے خیال میں درست تھا:

''تم ان سب میں باصلاحیت ترین اور قابلیت کے حامل فنکار ہو جو تفصیلات کو دیکھنے میں مہارت رکھتا ہے جنہیں میں نے ساٹھ برس میں دیکھا ہے۔ اگر تم میرے سامنے ایسی کوئی تصویر رکھو جو ایک ہزار منی ایچر فنکاروں نے مل کر بنائی ہو تو میں فوراً تمہارے موقلم کے کام کو پہچان لوں گا۔''

''متفق، لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اتنے ذہین ہیں کہ میری مہارت کے اسرار کی داد دے سکیں۔'' اس نے کہا۔ ''اب آپ جھوٹ بول رہے ہیں کیوں کہ آپ مجھ سے خوف زدہ ہیں۔ ایک بار پھر میرے طریق کار کی خصوصیت بتائیں۔''

''تمہارا قلم جیسے اپنی مرضی سے درست خط کا انتخاب کرتا ہے، یوں جیسے تمہارے بغیر۔ تمہارا قلم جو بناتا ہے وہ حقیقت ہے نہ ہی بے وقعت۔ تم جب لوگوں کے ہجوم کی تصویر کشی کرتے ہو تو نظروں سے ابھرتے تناؤ، ورق پر ان کی جگہ اور متن کے معانی کسی نفیس ابدی سرگوشی میں ڈھل جاتے ہیں۔ میں اس سرگوشی کو سننے کی خاطر بار بار تمہاری تصویریں دیکھتا ہوں اور ہر مرتبہ مسکراہٹ کے ساتھ ادراک کرتا ہوں کہ معانی تبدیل ہو گئے ہیں، اور اب کیسے بیان کروں، میں تصویر کو نئے سرے سے پڑھتا ہوں۔ جب معانی کی یہ پرتیں اکٹھی پڑھی جائیں تو ایک گہرائی ابھرتی ہے جو فرنگی ماہر مصوروں کی تناظری مصوری سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔''

''خوب۔ فرنگی مصوروں کو بھول جائیں۔ ابتدا سے شروع کریں۔''

''تم اتنا شاندار دائرہ اور عالیشان خط رکھتے ہو کہ دیکھنے والا حقیقت کی بجائے تمہاری مصوری کا

پیش کرتا ہے۔ اور تمہاری صلاحیت و ہنر ایسی تصویر تخلیق کر سکتے ہیں جو کسی متقی کو ایمان سے ہٹا دے اور کسی
مایوس کو امید اور توبہ نہ کرنے والے کو اللہ کی راہ پر لے آئے۔"

"درست، لیکن میرا نہیں خیال کہ یہ تعریف ہے۔ دوبارہ کوشش کریں۔"

"ایسا کوئی منی ایچر فنکار نہیں جو تمہاری طرح رنگوں کے میل یا موافق پن اور اس کے اسرار سے
واقف ہو۔ تم بہت انتہائی چمکیلے ورنگارنگ اور سب سے حقیقی رنگ تیار اور استعمال کرتے ہو۔"

"ہاں، اور مزید کیا؟"

"تم جانتے ہو کہ تم بہزاد اور میر سید علی کے بعد عظیم ترین مصور ہو۔"

"ہاں، میں اس سے واقف ہوں۔ اگر آپ بھی یہ جانتے ہیں تو پھر اپنی کتاب قرہ آفندی جیسے
وسط درجے کے مصور کے ساتھ کیوں تیار کر رہے ہیں؟"

"پہلی بات، جو کام وہ کر رہا ہے اس کے لیے منی ایچر فنکار کی مہارت کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا: "دوسری بات یہ کہ وہ تمہاری طرح قاتل نہیں۔"

وہ میرے مذاق پر مسکرایا۔ اس پر میں نے سوچا کہ میں اس نئے بیان پر... یہ لفظ، انداز یا
اسلوب۔ شاید ڈراؤنے خوابوں سے فرار چاہتا ہے۔ میرے اس موضوع کو پھیلانے پر ہم اس کے ہاتھ میں
قاتل کاتبی کی مقبول دوات پر خوشگوار گفتگو کرنے لگے، باپ بیٹے نہیں بلکہ دو متجسس اور تجربہ کار بوڑھوں کی طرح۔
کاتبی کا وزن، دوات کا توازن، اس کی گردن کی گہرائی، ہمارے خطاطی کے پرانے قلموں کی لمبائی اور
سرخ روشنائی کے اسرار، جس کی ثقافت وہ دوات کو ہلاتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا... ہم نے اتفاق کیا کہ اگر
مقبول سرخ روشنائی کے راز... جو انہوں نے چینی فنکاروں سے معلوم کیے تھے... خورستان، بخارا اور ہرات
نہ لاتے تو ہم استنبول والے بالکل بھی یہ مصوری نہ کر پاتے۔ باتیں کرتے ہوئے مصوری کی طرح وقت کی
رفتار بھی بدلتی، زیادہ تیزی سے بیتتے ہوئے محسوس ہوئی۔ اپنے ذہن کے کسی گوشے میں میں سوچ رہا تھا کہ
ابھی تک کوئی بھی گھر واپس کیوں نہیں آیا؟ کاش کہ وہ اس بھاری شے کو رکھ دے۔

اپنے معمول کے انداز میں اس نے مجھ سے پوچھا: "جب آپ کی کتاب ختم ہو جائے گی تو کیا
اسے دیکھنے والے لوگ میری مہارت کی تعریف کریں گے؟"

"اگر خدا کی رضا سے ہم یہ کتاب کسی مداخلت کے بغیر مکمل کر پائے تو پہلے تو ہمارے سلطان
اسے دیکھیں اور معلوم کریں گے کہ کیا ہم نے مناسب جگہوں پر سونے کا کافی استعمال کیا ہے یا نہیں۔ پھر
جب وہ اپنے بارے میں بیان پڑھ رہے ہوں، جس طرح کہ کوئی بھی سلطان کرے گا، ان کی نگاہ اپنی تصویر
کو ڈھونڈے گی اور ہماری عالیشان مصوری پر توجہ دینے کی بجائے وہ اپنی مشابہت تلاش کرنے لگیں گے۔ اگر وہ
اس منظر کو دیکھنے کا وقت نکالیں جو ہم نے اپنی آنکھوں کی بینائی دے کر بنایا ہے۔ تم بھی میری طرح جانتے ہی
ہو کہ کوئی معجزہ ہی ہوگا کہ وہ دریافت کریں کہ حاشیہ کس نے بنایا یا تصویروں کی طلاکاری کس نے کی، یہ آدمی

یا وہ گھوڑا جس نے بنایا، اس کی بجائے وہ کتاب کو خزانے میں مقفل کروا دیں گے... اور ہم ماہر فنکار، مصوری کرتے رہیں گے، اس امید میں کہ کسی روز معجزہ ہوگا اور ہماری مہارت تسلیم کی جائے گی۔"

ہم دونوں کچھ دیر کو خاموش ہو گئے جیسے صبر سے کسی انتظار میں ہوں۔

"وہ معجزہ کب رونما ہوگا؟" اس نے پوچھا، "ان تصویروں کو داد و تحسین کب ملے گی جنھیں بناتے بناتے ہماری نگاہ سیدھا دیکھنے کے بھی قابل نہیں رہی؟ وہ مجھے، ہمیں، وہ احترام کب دیں گے جس کے ہم مستحق ہیں۔"

"کبھی نہیں!"

"ایسا کیوں؟"

"جو تم چاہتے ہو، وہ تمھیں کبھی نہیں دیں گے۔" میں نے کہا، "مستقبل میں تمھیں اس سے بھی کم داد و تحسین ملے گی۔"

"کتابیں صدیوں زندہ رہتی ہیں۔" اس نے تکبر سے کہا لیکن اس میں اعتماد کی کمی تھی۔

"یقین کرو کہ کوئی بھی وینس کا فنکار تم جیسی شاعرانہ سمجھ بوجھ، یقین، حساسیت، تمہارے رنگوں کا خالص پن اور شوخی نہیں رکھتا لیکن اس کے باوجود ان کی تصویریں زیادہ متاثر کن ہیں کیوں کہ وہ زندگی سے قریبی مشابہت رکھتی ہیں۔ وہ بے تاثر کبھی نہیں نظرانداز کرتے ہوئے کسی مینار کی بالکنی سے دنیا کی تصویر کشی نہیں کرتے، وہ کسی گلی کی سطح سے یا پھر کسی امیر کے کمرے سے، اس کے بستر، کمبل، میز، آئینے، اس کا چیتا، اس کی بیٹی اور اس کے سکوں کی تصویر بناتے ہیں۔ وہ سب کچھ شامل کرتے ہیں، تم بھی جانتے ہو۔ مجھے ان کی بنائی ہر تصویر پسند نہیں۔ براہ راست مصوری سے دنیا کی نقالی مجھے باعث ذلت لگتی ہے۔ میں اس پر برہم ہوتا ہوں۔ لیکن ان تصویروں میں جو وہ نئے انداز سے بناتے ہیں، ایک ناقابل تردید کشش ہے۔ آنکھ جو دیکھتی ہے وہ اس کی عکاسی اسی طرح کرتے ہیں بالکل جیسے آنکھ دیکھتی ہے۔ بلاشبہ وہ جو سمجھتے ہیں اس کی عکاسی کرتے ہیں، جب کہ ہمیں جو دکھائی دیتا ہے ہم اس کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان کا کام دیکھتے احساس ہوتا ہے کہ کسی چہرے کو لافانی بنانے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کی تصویر کشی فرنگیوں کی طرح کی جائے۔ اور صرف وینس کے باسی ہی ایسا خیال نہیں رکھتے، فرنگیوں کے تمام علاقوں کے درزی، قصاب، فوجی، پادری اور پنساری... ان سب نے اپنی تصویریں اسی طرح بنوائیں۔ ان تصویروں پر ایک نگاہ ڈالنے پر تم بھی خود کو اسی طرح دیکھنا چاہو گے، تم یقین کرنا چاہو گے کہ تم باقی سب سے مختلف ہو... منفرد، خاص انسان۔ نئے طریقے سے مصوری لوگوں کی تصویر ایسے بنانا ممکن بناتی ہے جیسا کہ وہ آنکھ کو دکھائی دیتے ہوں بجائے جیسے دماغ نے تصور کیا ہو۔ ایک روز سب ان ہی کی طرح تصویریں بنائیں گے۔ "مصوری" کے ذکر پر دنیا کو ان کے کام کا خیال آئے گا، حتیٰ کہ کوئی بے چارہ سا درزی بھی جسے مصوری کی کوئی شد بد نہیں ایسی تصویر بنوانا چاہے گا تاکہ اپنی ناک کے منفرد خم کو دیکھ کر اسے یقین ہو جائے کہ وہ عام شخص نہیں بلکہ

یہ معمولی آدمی ہے۔"

"یعنی ہم بھی ایسی تصویر بنا سکتے ہیں۔" حاضر دماغ قاتل نے بات قطع کی۔

"ہم نہیں بنائیں گے!" میں نے جواب دیا۔ "کیا تم نے اپنے شکار مرحوم ظریف آفندی سے نہیں سیکھا کہ ہم فرنگیوں کی نقالی کا لیبل لگائے جانے سے کتنے خائف ہیں؟ اگر ہم ان کی طرح مصوری کرنے کی جرأت کر بھی لیں تو نتیجہ وہی ہوگا۔ ہمارا طریق کار آخر اپنی موت آپ مر جائے گا اور ہمارے رنگ مدھم ہو جائیں گے۔ کوئی بھی ہماری کتابوں اور مصوری کی پرواہ نہ کرے گا اور وہ جو دلچسپی دکھائیں، بغیر سمجھے طنزاً پوچھیں گے کہ کوئی تناظر کیوں نہیں ... یا انھیں شاید یہ کتابیں ملیں ہی نہیں۔ لاتعلقی، وقت اور آفات و آلام ہمارے فن کو مٹا دیں گے۔ جلد سازی میں استعمال ہونے والی عربی گوند میں مچھلی، شہد اور ہڈیاں شامل ہوتی ہیں اور اوراق کو صیقل کرنے کے لیے انڈوں کی سفیدی اور نشاستہ استعمال ہوتا ہے۔ لالچی، بے حیا چوہے ان اوراق کو کتر جائیں گے، دیمک، کیڑے مکوڑے اور حشرات کی ہزاروں اقسام ہماری کتابوں کو ختم کر دیں گے۔ جلدیں کھل جائیں گی اور صفحے باہر گر پڑیں گے۔ عورتیں ان سے چولہے جلائیں گی، بے چور، بے پرواہ نوکر اور بچے ان اوراق اور تصاویر کو پھاڑیں گے۔ شہزادے قلم سے تصویروں پر لکیریں کھینچیں گے۔ وہ تصویروں کی آنکھوں میں سیاہ رنگ بھریں گے، اوراق سے اپنی ناک صاف کریں گے اور حاشیوں پر سیاہ روشنائی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچیں گے۔ وہ اوراق پھاڑ کر ہماری تصویریں کاٹ لیں گے، نئی تصویریں بنانے کے لیے یا کھیل و تفریح کی خاطر۔ مائیں جہاں ان صفحوں کو ضائع کریں گی جو ان کے خیال میں بے ہودہ ہوں گے، باپ اور بڑے بھائی عورتوں کی تصویروں سے کھیلیں گے۔ کیچڑ، پانی، ناقص گوند، تھوک اور ہر طرح کی گندگی اور کھانے کے سبب صفحے ایک دوسرے سے چپک جائیں گے۔ جہاں اوراق چپکے ہوں گے، پھپھوندی کے داغ اور گرد پھولوں کی طرح کھل اٹھیں گے۔ بارش، ٹپکتی چھتیں، سیلاب اور گرد و غبار ہماری کتابوں کو تباہ کریں گے۔ ظاہر ہے، پھٹے پرانے، رنگ اڑے اور پڑھنے کے ناقابل اوراق جنھیں پانی، نمی، کیڑوں اور بے پرواہی نے کوڑا بنا دیا ہو، معجزانہ طور پر کسی خشک صندوق کی تہ سے صحیح حالت میں ملنے والی کتاب بھی کسی روز آگ کے بے رحم شعلوں کی نذر ہو جائے گی۔ کیا استنبول میں ایسا کوئی علاقہ موجود ہے جو ہر بیس برس میں کم سے کم ایک بار جل کر راکھ نہ ہوا ہو کہ ہم امید رکھیں کہ ایسی کتاب بچ جائے گی؟ اس شہر میں جہاں ہر تیسرے برس اس سے زیادہ کتابیں اور کتب خانے غائب ہو جاتے ہیں جتنے بغداد میں منگولوں نے برباد اور نذر آتش کیے تھے، یہاں کون مصور یہ تصور کر سکتا ہے کہ اس کی تصویریں ایک صدی سے زیادہ عرصہ محفوظ رہیں گی یا کسی روز اس کی تصویروں کو بھی بہزاد کی مصوری کی طرح عقیدت سے دیکھا جائے گا؟ خود ہمارا فن ہی نہیں بلکہ برسوں میں دنیا میں بنائے گئے سب ہی شاہکار آگ کی نذر ہو جائیں گے، حشرات کی خوراک بن جائیں گے یا لاپرواہی کے سبب گم جائیں گے۔ کھڑکی سے خسرو کو تاکتی شیریں؛ چاندنی میں نہاتی شیریں کو چوری چھپے دیکھتا خسرو؛ ایک دوسرے کو [illegible]

سے، دیکھتے عاشق؛ کنویں کی تہ میں سفید دیو کو ہلاک کرتا رستم؛ ریگستان میں سفید چیتے اور پہاڑی بکری سے
ذوق کرتا محبت کا مارا مجنوں؛ اژدہے کے کتے کو پکڑتا اور پھانسی پر لٹکاتا جو اپنے ریوڑ سے ہر رات مادہ بھیڑ
کو قربت کے عوض ایک بھیڑ پیش کرتا تھا؛ پھول، فرشتے، پتوں سے بھری شاخیں، پرندے اور آنسو سے حاشیے
کی تزئین؛ بانسری نواز جس نے حافظ کی دقیق نظموں کی تزئین کی؛ دیواری نقش و نگار جنھوں نے ہزاروں
جنھیں انھوں نے ایچ فنکار شاگردوں کی بصارت برباد کی؛ دروازوں اور دیواروں سے لگی چھوٹی تختیاں؛
مصوری کے تزئین شدہ حاشیوں میں نہاں اشعار؛ دیواروں کی بنیادوں، گوشوں، تزئین کاری، پیڑوں کے
تنوں، جھاڑیوں کے پیچھے اور پتھروں کے بیچ چھپے، حسد اور محبت کرنے والوں کے اوڑھے پھول دار لحاف؛
دشمن قلعے کی طرف فتح مندی سے بڑھتے ہمارے سلطان کے مرحوم دادا کے منتظر المقدور کفار کے کٹے ہوئے
سر؛ توپ، بندوقیں اور خیمے جنھیں بنانے میں تم بھی اپنی نوعمری میں شامل ہوئے اور جو کفار کے بیچ کی
ہمارے سلطان کے پردادا کی قدم بوسی کے پس منظر میں تھیں؛ سینگ والے اور بغیر سینگ کے، دم والے اور
بغیر دم کے، نوکیلے دانتوں اور ناخنوں والے شیطان؛ ہزاروں اقسام کے پرندے جن میں سلیمان کی دانش مند
ہدہد، پھدکتی چڑیا، سیمرغ اور کالے مینا شامل تھے؛ وحشتی بلیاں اور مضطرب کتے؛ تیزی سے اڑتے
بادل؛ ہزاروں تصاویر میں بار بار گھاس اور خوش کن پتیاں؛ پتھروں پر پڑنے والے سائے اور انھوں
سرو، صنوبر، چنار اور انار کے درخت جن کے پتے محنت و توجہ سے بنائے گئے تھے؛ محلات اور ان کی بے
شمار اینٹیں جو امیر تیمور یا شاہ طہماسپ کے زمانے کے انداز میں بنائے گئے تھے لیکن جو اس سے کہیں پرانے
زمانوں کی داستانیں سناتے تھے؛ پھولوں سے لدے درخت، پھولوں سے بھرے میدانوں کے
عالیشان قالینوں پر دراز حسین و جمیل عورتوں اور لڑکوں کی بجائی موسیقی سنتے افسردہ شہزادے؛ مٹی کے برتنوں
اور قالینوں کی غیر معمولی تصویریں جن پر گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں سمرقند سے استنبول تک ہزاروں شاگرد و
ایچ فنکاروں نے محنت کرتے بنائی گئی تھی؛ پرشکوہ باغ اور سیاہ چیلیں جنھیں تم اب بھی پرانے ذوق و شوق
سے بناتے ہو؛ تمہارے بنائے موت اور جنگ کے بھوت کن مناظر؛ تمہارے شکار کرتے باوقار سلطان اور
اسی مہارت و نفاست سے بنائے گئے خوف سے بھاگتے غزال؛ تمہارے جان سے گزرتے شاہ، تمہارے
جنگی قیدی، تمہارے کافروں کے جنگی بحری جہاز اور تمہارے حریف شہر، تمہاری سیاہ راتیں جو یوں چمکتی ہیں
جیسے خود رات تمہارے قلم سے ہی پھسلی ہو، تمہارے ستارے، تمہارے بھوتوں جیسے سرو، تمہاری سرخ رنگ
والی محبت اور موت کی تصویریں، تمہاری اور باقی سب کی، یہ سب صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گی"

دوات ہوا میں بلند کرتے ہوئے اس نے وہ پوری قوت سے میرے سر پر دے ماری۔

اس ضرب کی شدت سے میں آگے کی طرف لڑکھڑایا۔ مجھے ایسی شدید تکلیف محسوس ہوئی جو
میرے بیان سے باہر تھی۔ تمام دنیا میرے درد میں لپٹی تھی اور اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ میرے ذہن کے
ایک حصے نے یہ خیال تھا کہ یہ حملہ عمداً کیا گیا تھا لیکن ضرب کے ساتھ ——— یا شاید اس کے سبب ——— میرے

دماغ کا دو گنا تا حصہ، نیک نیتی کے ایک افسردہ اظہار میں، اس پاگل سے جو میرا قاتل بننے کا متمنی تھا، کہنا چاہتا
تھا: "رحم کرو، تم نے غلطی سے مجھ پر حملہ کر دیا ہے۔"

اس نے دوات دوبارہ بلند کی اور میرے سر پر دے ماری۔

اس مرتبہ میرے دماغ کا دو گنا تا حصہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی غلطی نہ تھی بلکہ ایسا جنون اور غصہ تھا جو
شاید میری زندگی لینے پر ختم ہوتا۔ میں اس حالت پر اتنا دہشت زدہ تھا کہ میری آواز بلند ہونے لگی، میں
پوری قوت اور کرب میں چلانے لگا۔ اس دردناک چیخ کا رنگ زنگار جیسا تھا اور شام کی تاریکی میں ویران
گلیوں میں اس رنگ کو کوئی نہیں سن سکے گا، میں جانتا تھا کہ میں بالکل اکیلا تھا۔

دوسرے وار پہلے سے خائف ہو کر جھکا۔ ہم پھر کو ہم آمنے سامنے آئے۔ میں اس کی آنکھیں
دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ خوف اور شرمندگی کے باوجود وہ اس پر تلا بیٹھا تھا جو وہ کرنے کے در پے تھا۔ اب وہ مزید
استادی اچھو فنکار نہ تھا جسے میں جانتا تھا بلکہ کوئی نامانوس اور بدہیئت اجنبی تھا جو میری زبان نہ سمجھتا تھا اور اس
احساس نے میری تنہائی صدیوں تک پھیلا دی۔ یوں جیسے اس دنیا کو گلے لگانے کو میں اس کا ہاتھ تھامنا چاہتا
تھا، اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے اس سے منتیں کیں یا میرا خیال تھا کہ میں نے ایسا کیا: "میرے بچے،
میرے پیارے بچے، میری زندگی مت لو۔" یوں جیسے میں، لگتا تھا کہ اس نے سنا ہی نہیں۔

اس نے دوات دوبارہ میرے سر کی طرف جھکائی

میری سوچیں، جو کچھ میں نے دیکھا، میری یادیں، میری آنکھیں سب کچھ، ایک دوسرے میں
ضم ہوتے ہوئے خوف بن گئے۔ میں کوئی ایک رنگ نہ دیکھ سکتا تھا اور اور دیکھا کہ سارے رنگ سرخ بن
گئے تھے۔ میں نے جسے اپنا خون سمجھا، وہ سرخ روشنائی تھی اور جسے میں نے اس کے ہاتھوں پر لگی روشنائی
سمجھا وہ میرا بہتا ہوا خون تھا۔

اس طرح مرنا کس قدر غیر منصفانہ، ظلم اور دہشت ناک لگا۔ تاہم، یہی نتیجہ تھا جو میرا بوڑھا اور خون آلود
سر رفتہ رفتہ اخذ کر رہا تھا۔ پھر میں نے یہی دیکھا۔ میری یادیں باہر پڑتی برف جیسی سفید تھیں۔ میرے دل
دھڑکتے ہوئے تکلیف میں تھا یوں جیسے منہ میں آ رہا ہو۔

اب میں اپنی موت کا منظر بیان کروں گا۔ شاید آپ نے بہت پہلے ہی سمجھ لیا ہو: موت انجام
نہیں، یہ یقینی ہے۔ اگرچہ جیسا کہ کتابوں میں ہر جگہ لکھا ہے کہ موت فہم و ادراک سے بڑھ کر تکلیف دہ ہے۔
یوں تھا جیسے نہ صرف میری پسلی کی ہڈی اور دماغ بلکہ جسم کا ہر حصہ ایک دوسرے میں ضم ہو کر جل رہا تھا اور
کرب کا شکار تھا۔ اس بے انتہا تکلیف کو برداشت کرنا اس قدر دشوار تھا کہ میرے دماغ کے ایک حصے نے
کرب و اذیت کو بھلا کر بے ہوشی میں جاتے رد عمل دکھایا ـــــ گویا یہی ایک انتخاب ہو ـــــ

اپنی موت سے پہلے، مجھے اپنے لڑکپن میں سنی ہوئی ایک آشوری داستان یاد آئی۔ ایک بوڑھا
جو اکیلا رہتا تھا، نصف شب بستر سے اٹھ کر ایک گلاس پانی پیتا ہے۔ وہ گلاس میز پر رکھتے اسے معلوم ہوتا ہے

کہ وہاں موجود شمع اب غائب ہے۔ وہ کدھر گئی؟ اندر سے ذرا سی روشنی چھن کر آ رہی ہے۔ روشنی کا پیچھا کرتے وہ دوبارہ اپنے کمرے میں جب پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کے بستر پر کوئی شخص شمع لیے دراز ہے۔ "تم کون ہو؟" وہ پوچھتا ہے۔ "میں موت ہوں۔" اجنبی بتاتا ہے۔ بوڑھے پر ایک پراسرار خاموشی غالب آ جاتی ہے۔ پھر وہ کہتا ہے، "تو تم آ گئے۔" "ہاں۔" موت نے غرور سے جواب دیا۔ "نہیں۔ تم میرے ادھورے خواب کے سوا کچھ بھی نہیں۔" بوڑھا حاتمی سے کہتا ہے اور اجنبی کے ہاتھ میں تھامی شمع اچانک بجھ جاتی ہے اور سب کچھ تاریکی میں گم ہو جاتا ہے۔ بوڑھے اپنے خالی بستر پر لیٹ کر سو جاتا ہے اور اگلے بیس برس زندہ رہتا ہے۔

میں جانتا تھا کہ میرا نصیب یہ نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر دوات سے میرے سر پر ضرب لگائی۔ میں اتنی گہری اذیت میں تھا کہ اس کے اثر کو مبہم سا ہی محسوس کر پایا۔ وہ دوات اور شمع سے ذرا سا روشن کمرا پہلے ہی میرے لیے دھندلانے لگے تھے۔

تاہم، میں ابھی زندہ تھا۔ اس دنیا سے چپکے رہنے، بھاگنے اور اس قاتل سے فرار کی میری آرزو، اپنے چہرے اور خون آلود سر کو بچانے کی کوشش میں میرے ہاتھوں اور بازوؤں کی حرکت، میرا خیال ہے ایک بار تو میں نے اس کی کلائی پر اپنے دانت ہی گاڑ دیئے، اور میرے چہرے پر لگنے والی دوات سے مجھے اس کی خبر ہوئی۔

ہم تھوڑی دیر گتھم گتھا ہوتے رہے [illegible] آپ اسے [illegible]۔ وہ بہت طاقتور اور مشتعل تھا۔ اس نے مجھے پشت کے بل زمین پر گرا دیا، میرے کندھوں پر اپنے گھٹنے جما کر اس نے مجھے فرش سے لگا دیا اور مجھے، یعنی ایک مرتے ہوئے بوڑھے سے [illegible] باتیں کرتا رہا۔ چوں کہ شاید میں اس کی بات سن اور سمجھ نہیں رہا تھا، شاید کیوں کہ مجھے اس کی آنکھوں میں خون اترتے دیکھ کر خوشی نہیں ہو رہی تھی، اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے ضرب لگائی۔ اس کا چہرہ اور اس کا سارا جسم دوات سے اچھل کر بہتی سرخ روشنائی سے سرخ ہو چکے تھے، اور میرا خیال ہے میرے بہتے خون سے۔

اس پر رنجیدہ ہو کر کہ آخری شے جو میں اس دنیا میں دیکھوں گا یہ شخص ہو گا جو میرا دشمن تھا، میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے بعد مجھے نرم سی روشنی دکھائی دی۔ وہ روشنی نیند کی طرح میٹھی اور سکینت طاری کرنے والی تھی۔ مجھے لگا وہ میری ساری تکلیف کا مداوا ہو گی۔ مجھے روشنی کے ہالے میں ایک صورت دکھائی دی اور میں نے کسی بچے کی طرح پوچھا، "تم کون ہو؟"

"یہ میں ہوں، عزرائیل، موت کا فرشتہ۔" اس نے کہا، "میں ہی ہوں جو اس دنیا میں انسان کا سفر انجام پذیر کرتا ہوں۔ میں ہی بچوں کو ان کی ماؤں، بیویوں کو ان کے شوہروں، محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے اور باپوں کو ان کی بیٹیوں سے جدا کرتا ہوں۔ اس دنیا کا کوئی فانی انسان مجھ سے ملاقات مگر یہ نہیں کر سکتا۔"

جب مجھے علم ہو گیا کہ موت ناگزیر تھی، میں رو دیا۔

آنسو بہنے پر مجھے بہت پیاس محسوس ہونے لگی۔ ایک جانب خون میں لتھڑے میرے چہرے اور آنکھوں میں ناقابلِ بیان تکلیف تھی اور دوسری جانب اس جگہ جنونی بین اور سسکیاں تھے۔ تاہم، وہ جگہ اجنبی اور وحشت خیز تھی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ روشن سلطنت مرنے والوں کی سرزمین تھی جس کی طرف اور [illegible] مجھے پکار رہا تھا، میں خوف زدہ ہو گیا۔ چاہے میں جانتا تھا کہ اس دنیا میں زیادہ عرصہ کوئی زندہ نہیں رہ سکتا، میں پیچ و تاب کھا رہا اور واویلا کر رہا تھا۔ اس رنج بھری دنیا میں میرے لیے کہیں بھی سکون نہ تھا۔ زندہ رہنے کے لیے مجھے خود کو ناقابلِ برداشت کرب کے سپرد کرنا تھا جو کہ میری بوڑھی حالت میں ناممکن تھا۔

اپنی موت سے پہلے مجھے حقیقت میں موت کی شدید تمنا تھی اور اس لیے مجھے اس سوال کا جواب مل گیا جسے میں عمر بھر غور و فکر اور کتابوں میں بھی تلاش نہ کر پایا: کیوں کسی استثنا کے بغیر ہر کوئی مرنے میں کامیاب رہتا ہے؟ یہ اگلے جہان میں چلے جانے کی ایک عام سی تمنا کا سبب تھا۔ میں یہ بھی سمجھ گیا کہ موت مجھے دانش مند بنا دے گی۔

اس کے باوجود میں اس آدمی کے سے تذبذب کا شکار تھا جسے کسی طویل سفر پر روانہ ہونا ہو اور اپنے کمرے، اسباب اور گھر پر آخری نگاہ ڈالنے سے قاصر ہو۔ اس سراسیمگی میں مجھے اپنی بیٹی کو ایک آخری بار دیکھنے کی آرزو تھی۔ اس سے ملنے کی میری خواہش اتنی شدید تھی کہ [illegible] کی واپسی کے انتظار میں میں [illegible] اور زندہ رہنے کے لیے نہ صرف تیار تھا بلکہ دانت بھینچے تکلیف اور [illegible] کو برداشت کرنے کو بھی تیار تھا۔

اور یوں میرے سامنے موجود موت کی روشنی مدھم ہونے لگی اور میرے ذہن نے اردگرد کی دنیا کی آوازوں کو سننا شروع کیا جہاں میں مر رہا تھا۔ میں اپنے قاتل کو اپنے اردگرد کمرے میں گھومتے محسوس کر سکتا تھا، وہ دراز کھول رہا تھا، میرے اوراق پھیلا رہا تھا اور پوری توجہ سے آخری تصویر تلاش کر رہا تھا۔ خالی ہاتھ رہنے پر میں نے اسے رنگوں کے ڈبے کھولتے اور الماری، صندوقوں، دواتوں اور میزوں کو لاتیں مارتے سنا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کراہ رہا تھا اور میرے بوڑھے اور تھکن زدہ بازوؤں اور ٹانگوں میں عجیب سی جنبش تھی۔ اور میں منتظر رہا۔

میری تکلیف کسی طرح بھی کم نہ ہو رہی تھی۔ میں بالکل خاموش ہوتا چلا گیا اور میرے لیے دانت گاڑ کر برداشت کرنا بھی مشکل ہوتا جا رہا تھا لیکن میں پھر بھی منتظر رہا۔

تبھی مجھے خیال آیا کہ اگر شکورے آ جائے تو اس کا سامنا میرے بے رحم قاتل سے ہو سکتا تھا۔ میں اس بارے میں کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے مجھے لگا کہ میرا قاتل گھر سے باہر نکل گیا ہے۔ شاید اس نے آخری تصویر تلاش کر لی تھی۔

وہاں میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود میں منتظر رہا۔ میری پیاری

بیٹی، میری حسین وجمیل شکورے، ایک بار اپنا چہرہ دکھا دو۔

وہ نہ آئی۔

مجھ میں اس تکلیف کو مزید برداشت کرنے کی سکت نہ رہی۔ میں جانتا تھا کہ میں اسے آخری مرتبہ دیکھے بغیر ہی دنیا سے چھوڑ جاؤں گا۔ یہ اتنا تلخ تھا کہ میں مر ہی جانا چاہتا تھا۔ پھر ایک چہرہ جسے میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، میرے بائیں جانب ظاہر ہوا اور اس نے مسکراتے ہوئے پانی کا گلاس مجھے پیش کیا۔

باقی سب بھول کر لپکتے ہوئے میں نے پانی کے گلاس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

لیکن اس نے گلاس والا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ "پیغمبر محمد (ﷺ) کو جھوٹا قرار دو۔" اس نے کہا، "اس سب سے انکار کر دو جو انہوں نے کہا ہے۔"

وہ شیطان تھا۔ میں نے جواب نہ دیا، لیکن میں خوف زدہ بھی نہ تھا۔ چوں کہ مجھے اس بات کا بالکل یقین نہ تھا کہ مصوری اس کا پھیلایا جال تھی، میں اعتماد کے ساتھ منتظر رہا۔ میں نے اپنے ازلی و ابدی سفر کے متعلق مستقبل کا خواب دیکھا۔

اس دوران نوری فرشتہ میرے پاس آیا جسے میں نے ابھی دیکھا تھا اور شیطان غائب ہو گیا۔ میرے وجود کا ایک حصہ جانتا تھا کہ یہ فرشتہ جس کی وجہ سے شیطان بھاگ گیا، عزرائیل تھا۔ مگر میرے دوسرے سرکش حصہ کہہ رہا تھا کہ "زاد آخرت" میں درج ہے کہ عزرائیل مشرق سے مغرب تک پھیلے ایک ہزار پروں والا فرشتہ ہے اور یہ کہ وہ پوری دنیا کو اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہے۔

میری الجھن بڑھنے پر نوری فرشتہ میری طرف یوں بڑھا جیسے وہ میری مدد کو آیا ہو۔ امام غزالی نے "جواہر القرآن و درره" میں بیان کیا ہے:

"منہ کھولو تاکہ تمہاری روح قفس عنصری سے پرواز کر سکے۔"

"میرے منہ سے بسم اللہ کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔" میں نے جواب دیا۔

یہ آخری عذر تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں مزاحمت نہیں کر سکتا تھا کہ میرا وقت آ چکا ہے۔ لمحے بھر کو مجھے شرمندگی ہوئی کہ میں اپنی بیٹی کے دیکھنے کے لیے اپنی خون میں لتھڑی لاش چھوڑے جا رہا تھا، بیٹی جسے میں دوبارہ کبھی نہ دیکھ پاؤں گا۔ لیکن میں اس دنیا کو پہننے کے تنگ لباس کی طرح اتار دینا چاہتا تھا۔

میں نے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک ہر طرف رنگ نظر آنے لگے۔ سب کچھ غیر معمولی شوخ رنگوں میں بسا ہوا تھا جیسے ان کی سونے سے ملمع کاری کی گئی ہو۔ میری آنکھوں سے تکلیف بھرے آنسو بہنے لگے۔ میرے منہ سے ایک تھمی ہوئی سانس خارج ہوئی۔ سب کچھ کسی حیرت انگیز خاموشی میں بھیگا ہوا تھا۔

میں اب دیکھ سکتا تھا کہ میری روح میرے جسم کو چھوڑ چکی تھی اور یہ کہ میں عزرائیل کے ہاتھوں کے پیالے میں تھا۔ میری روح، جو کسی شہد کی مکھی جتنی تھی اور نور میں بسی ہوئی تھی، میرے جسم سے نکلتے کپکپائی اور عزرائیل کے ہاتھ میں پارے کی طرح تھرتھرائی۔ تاہم میری سوچ اس نامانوس نئی دنیا کی

طرف مرکوز تھی جس میں میں نے ابھی تازہ جنم لیا تھا۔

اپنے تکلیف دہ کرب کے بعد مجھ پر ایک سکونت طاری ہو گئی۔ مجھے اس تکلیف کا سامنا موت کے باعث نہیں تھا، اس کے برعکس یہ جان کر کہ میری یہ کیفیت دائمی تھی، مجھے سکون مل گیا جب کہ دنیاوی زندگی میں جو پریشانیاں میں محسوس کیا کرتا تھا، عارضی تھیں۔ آج کے بعد، صدی بہ صدی کائنات کے انجام تک مجھے ایسے ہی رہنا تھا۔ اس پر مجھے پریشانی ہوئی اور نہ ہی مسرت۔ واقعات جو میں نے تواتر سے برداشت کیے تھے، اب لامتناہی خلا میں پھیلے ہوئے تھے اور یکے بعد دیگرے ہر جگہ تھے۔ بالکل ایسے جیسے دو ورقی تصویر کے ہر گوشے میں کوئی بذلہ سنج منی ایچر فنکار بہت ہی بے تعلق سی تصویریں بنا دے — ایک ہی وقت میں بہت کچھ ساتھ ساتھ رونما ہو رہا تھا۔

میں، شکورے

اتنی شدید برف باری ہو رہی تھی کہ برف کے گالے کبھی کبھار تو میرے نقاب سے گزر کر میری آنکھوں میں پڑ رہے تھے۔ میں گیلی سبز گھاس، کیچڑ اور ٹوٹی ہوئی شاخوں سے ڈھکے باغ سے اپنا راستہ بناتے باہر آئی اور گلی میں نکلتے ہی میں نے رفتار بڑھا دی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ سوچ رہے ہیں کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ مجھے قرہ پر کتنا بھروسا ہے؟ اچھا میں آپ سے کھل کر بات کرتی ہوں۔ میں تو خود بھی نہیں جانتی کہ کیا سوچوں۔ آپ سمجھتے ہیں ناں؟ میں الجھن میں ہوں۔ مجھے اتنا ضرور معلوم ہے: ہمیشہ کی طرح، میں گھر میں کھانوں، بچوں، اپنے بابا اور دوسرے معمولی کاموں میں مشغول ہو جاؤں گی اور تھوڑی ہی دیر میں میرا دل خود ہی اپنی مرضی سے میرے کان میں حقیقت کی سرگوشی کر دے گا۔ کل دوپہر سے پہلے مجھے معلوم ہو جائے گا کہ مجھے کس سے شادی کرنی ہے۔

گھر پہنچنے سے پہلے میں آپ کو کچھ بتانا کرنا چاہتی ہوں۔ نہیں انھیں، یہ ابھی قرہ سے ملاقات کے بارے میں نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ میں قرہ کی عجلت کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ ایسا نہیں لگتا کہ وہ صرف اپنے نفس کی تسکین کا سوچ رہا تھا۔ ایمان داری سے کہوں تو اگر وہ ایسا کرے بھی تو نامناسب نہیں۔ مجھے صرف اس کی حماقت پر حیرانی ہے! میرے خیال میں اس کے ذہن میں یہ خیال کبھی آیا ہی نہیں کہ وہ مجھے خوف زدہ کر کے اغوا کر سکتا تھا، میری عزت سے کھیل کر مجھے چھوڑ سکتا تھا یا کسی زیادہ خطرناک انجام سے دوچار کر سکتا تھا۔ میں اس کے معصوم تاثرات سے بتا سکتی ہوں کہ اسے مجھ سے کتنی محبت اور میری کتنی چاہت ہے۔ لیکن بارہ برس کے انتظار بعد، وہ اصول کے مطابق کیوں نہیں چل سکتا اور مزید بارہ روز انتظار کیوں نہیں کر سکتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ مجھے احساس سا ہوتا ہے کہ مجھے اس کی نااہلیت اور بچوں سی اداؤں سے محبت ہو گئی ہے؟ ایسے وقت جب زیادہ موزوں اس سے خفا ہونا تھا، مجھے اس پر ترس آیا۔ "او بے چارہ!" میرے اندر کسی نے کہا، "تم نے اتنا کرب سہا اور اس کے باوجود اس قدر نااہل ہو۔" مجھے اس کو اس قدر اپنی آغوش میں لینے کی تمنا ہوئی کہ میں کوئی غلطی بھی کر سکتی تھی...... میں شاید خود کو اس بگڑے بچے کے

گزر دیتی۔

اپنے بدنصیب بے چارے بچوں کا خیال آتے ہی میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ اسی وقت، وحشی تاریکی اور اندھا دھند برف باری میں مجھے لگا کہ کسی شخص کا بھوت مجھ پر چڑھ دوڑے گا۔ جھکائی دیتے ہوئے میں اس سے بچ کر گزر گئی۔

صحن کے دروازے سے داخل ہوتے ہی میں جان گئی کہ خیر ہے اور بچے ابھی تک واپس نہیں لوٹے تھے۔ خوب، میں وقت پر واپس پہنچ گئی، ابھی نماز مغرب کا وقت نہ ہوا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھی، گھر میں بکرے کے مربے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بابا نیلے دروازے والے تاریک کمرے میں تھے، میرے پڑھ رہے تھے۔ میں لیمپ لیے سیڑھیوں کے بالکل ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور جب میں نے دیکھا کہ الماری کھلی تھی، کشن پھیلے ہوئے تھے اور کمرا درہم برہم تھا تو میں نے سمجھا کہ یہ شوکت اور اورحان کا کیا دھرا تھا۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی، جو معمول کے برخلاف نہ تھی، پھر بھی یہ خاموشی معمول جیسی نہ تھی۔ میں نے گھر والا لباس پہنا اور اندھیرے میں بیٹھ کر خود کو دن میں دیکھے جانے والے خوابوں کے حوالے کر دیا جب مجھے نیچے سے آنے والا شور سنائی دیا۔ شور باورچی خانے سے نہیں بلکہ اصطبل کے ساتھ والے اس کمرے سے آ رہا تھا جسے گرمیوں میں مصور خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کیا اتنی شدید سردی میں بابا وہاں تھے؟ مجھے یاد نہیں کہ میں نے آتے ہوئے وہاں لیمپ کی روشنی دیکھی تھی یا نہیں، اچانک مجھے پتھریلی گزرگاہ اور صحن کے درمیان والے دروازے کی چرچراہٹ سنائی دی اور اس کے بعد صحن کے دروازے کے پاٹ اور کتوں کے بھونکنے کا شور...... اور اگر میں نرمی سے بھی کہوں تو میں ڈر گئی ہوگی۔

"پھر بے......" میں چیخی، "شوکت، اورحان......"

مجھے شدید سردی محسوس ہوئی۔ میرے بابا کی انگیٹھی جل رہی ہوگی، خود کو گرم کرنے کے لیے مجھے ان کے پاس بیٹھنا چاہیے۔ لیمپ ہاتھ میں تھامے ان کے پاس جاتے ہوئے میں ڈر نہیں بلکہ اپنے بچوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

دیوان خانے سے گزرتے میں نے سوچا کہ کیوں نہ نچلی منزل کی انگیٹھی پر مچھلی کا شوربہ بنانے کے لیے پانی ابلنے رکھ دوں۔ میں نیلے دروازے والے کمرے میں داخل ہوئی۔ سب کچھ بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ بغیر سوچے سمجھے میں کہنے کو تھی۔ "بابا نے آخر کیا کیا ہے؟"

پھر میں نے انہیں فرش پر گرے دیکھا۔

وحشت کے مارے میں چیخنے لگی۔ دوبارہ چیخی۔ پھر اپنے بابا کو دیکھ کر میں خاموش ہو گئی۔

نہیں، میں آپ کے بھینچے ہونٹوں اور سرد مہر ردعمل کو دیکھ کر جان سکتی ہوں کہ آپ کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کمرے میں کیا ہوا تھا۔ اگر سب کچھ نہیں بھی تو کافی حد تک ضرور معلوم ہے۔ آپ سوچ رہے ہیں کہ اب قاتل نے دیکھا اس پر میرا ردعمل کیا ہوگا اور میں کیا محسوس کر رہی ہوں۔ جیسا کہ بعض اوقات کوئی تصویر

دیکھنے والے لوگ کرتے ہیں، آپ ہیرو کی تکلیف محسوس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان واقعات کا سوچ رہے ہیں جو اس کرب ناک مقام پر منتج ہوئے۔ اور پھر میرے ردعمل پر غور کرنے کے بعد آپ میری تکلیف نہیں بلکہ اس تصور سے لطف اٹھائیں گے کہ اگر آپ کے بابا کو یوں قتل کیا جاتا تو آپ کیا محسوس کرتے؟ میں جانتی ہوں کہ آپ ہوشیاری سے یہی کر رہے ہیں۔

ہاں، جب میں شام کو واپس گھر آئی تو کوئی میرے بابا کو قتل کر چکا تھا۔ ہاں، میں نے اپنے بال نوچ ڈالے۔ ہاں، ایسا کہ میں اپنے بچپن میں کرتی، میں پوری شدت سے ان سے لپٹ گئی اور ان کی خوشبو محسوس کی۔ ہاں، میں کانپ گئی اور میں سانس نہ لے پائی۔ ہاں، میں نے اللہ سے التجا کی کہ انھیں دوبارہ زندہ کر دیں اور وہ اسی طرح خاموشی سے ایک گوشے میں ہمیشہ کی طرح اپنی کتابوں کے درمیان بیٹھے ہوں۔ اٹھیں بابا، ابھی مت جائیں۔ ان کا خون سے لتھڑا سر کچلا ہوا تھا۔ بکھرے ہوئے کاغذوں اور کتابوں سے زیادہ؛ میزوں، رنگوں اور دواتوں کے ادھر ادھر اٹھا کر پھینکے سے زیادہ؛ کشن، تختیوں، میزوں اور ہر شے کی تباہی سے بڑھ کر، اس اشتعال سے بھی زیادہ جس سے میرے بابا کو قتل کیا گیا تھا، مجھے اس نفرت سے خوف آ رہا تھا جس نے کمرے اور اس میں موجود ہر شے کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ میں اب رو نہیں رہی تھی۔ باہر گلی میں اندھیرے میں کوئی باتیں کرتے اور ہنستے گزرا، اس دوران میں اپنے دماغ کی دنیا پر چھائی لامتناہی خاموشی سن سکتی تھی، میں اپنی بہتی ناک اور رخساروں سے آنسو پونچھے۔ دیر تک میں بچوں اور ہماری زندگیوں کے بارے میں سوچتی رہی۔

میں نے خاموشی کو سنا۔ میں بھاگی۔ میں نے بابا کو ٹخنوں سے پکڑا اور کھینچ کر دیوان خانے میں لے لائی۔ جب کچھ بھی رہا ہو، وہ کافی وزنی تھے لیکن اس پر توجہ دیے بغیر میں انھیں سیڑھیوں سے نیچے لانے لگی۔ آدھے راستے میں میری ہمت جواب دے گئی اور میں زینے پر بیٹھ گئی۔ میں دوبارہ آنسو بہانے لگی تھی جب ایک آواز سن کر مجھے خیال آیا کہ شاید مخبر ہے اور بچے آ گئے تھے۔ میں نے اپنے بابا کے ٹخنے پکڑ کر ان کے پیر اپنی بغلوں میں دبائے اور نیچے اترنے لگی۔ میرے پیارے بابا کا سر بری طرح کچل دیا گیا تھا اور وہ خون آلود تھا کہ ہر زینے پر اس سے صفائی والے پوچھے جیسی آواز آ رہی تھی۔ سیڑھیاں اتر کر میں نے ان کی لاش کو موڑا جو اب ہلکی محسوس ہو رہی تھی اور بڑی کوشش سے پتھر بچھے فرش پر گھسیٹتے ہوئے میں انھیں گرمیوں والے مصور خانے میں لے آئی۔ گھور اندھیرے کمرے میں روشنی کے لیے میں باورچی خانے میں گئی۔ جب شمع لے کر میں واپس آئی تو سکتے کے عالم میں رہ گئی کہ کیسے اس کمرے کو بھی بری طرح پھیلایا گیا تھا، جہاں میں اب بابا کو لائی تھی۔ میں بے حس و حرکت کھڑی رہ گئی۔

کون ہے یہ، اوہ خدایا، ان میں سے کون؟

میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ دروازہ سختی سے بند کر کے میں نے بابا کو اس کمرے میں چھوڑ دیا۔ باورچی خانے سے میں نے بالٹی لی اور اسے کنویں سے بھرا۔ پھر میں سیڑھیاں چڑھ گئی اور لیمپ کی روشنی

میں دیوان خانے، سیڑھیوں، فرش کے ہر جگہ سے جلدی جلدی خون صاف کیا۔ پھر میں اوپر واپس اپنے کمرے میں گئی اور خون آلود لباس اتار کر صاف کپڑے پہنے۔ بالٹی اور کپڑا لیے میں نیلے دروازے والے کمرے میں جانے کو تھی جب میں نے صحن کے دروازے کے کھلنے کی آواز سنی۔ مغرب کی اذان شروع ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی ساری ہمت مجتمع کی اور لیمپ ہاتھ میں لیے سیڑھیوں پر ان کے انتظار میں کھڑی ہو گئی۔

''ماں، ہم آ گئے ہیں۔'' اورحان پکارا۔

''خیریے! تم تھیں کہاں!'' میں نے چیخ کر کہا، لیکن میں شاید چیخ نہیں بلکہ سرگوشی کر رہی تھی۔

''لیکن ماں، ہم مغرب کی اذان سے پہلے آ گئے ہیں —'' شوکت نے کہنا شروع کیا تھا۔

''خاموش! تمہارے نانا بیمار ہیں، وہ سو رہے ہیں۔''

''بیمار؟'' خیریے نے کہا۔ وہ میری خاموشی سے جان گئی تھی کہ میں خفا تھی۔ ''شوربے ہم نے کوسٹا کا انتظار کیا۔ جیسے ہی لیٹ مچھلی پہنچی، ور کے بغیر ہم نے تیزپات لیے، پھر میں نے بچوں کے لیے خشک انجیر اور چیری خریدے۔''

میرا جی چاہا کہ نیچے جا کر خیریے کو سرگوشی میں سرزنش کروں لیکن مجھے خدشہ تھا کہ اگر میں نیچے اتری تو لیمپ کی روشنی میں گیلی سیڑھیاں اور خون کے دھبے جو دھلنے سے رہ گئے تھے، بچوں کو نظر آ جائیں گے۔ بچے شور مچاتے سیڑھیاں چڑھے اور پھر اپنے جوتے اتارے۔

میں نے انہیں ہمارے کمرے کی طرف ہانکتے ہوئے کہا، ''اس طرف نہیں۔ تمہارے نانا سو رہے ہیں، وہاں مت جاؤ۔''

''میں آگ تاپنے کے لیے نیلے دروازے والے کمرے میں جا رہا ہوں۔'' شوکت نے کہا، ''نانا کے کمرے میں نہیں۔''

''تمہارے نانا اس کمرے میں سو گئے ہیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

لیکن میں نے دیکھا کہ وہ لمحے بھر کو ہچکچائے۔ ''آؤ یقین رکھیں کہ وہ خبیث جن جس نے تمہارے نانا کو بیمار کر دیا ہے کہیں تم دونوں پر بھی قبضہ نہ جما لے۔'' میں نے کہا، ''اپنے کمرے میں جاؤ۔'' میں نے دونوں کا ہاتھ تھاما اور انہیں ہماری خواب گاہ میں دھکیل دیا۔ ''تم لوگ اتنی دیر تک باہر کیا کر رہے تھے؟'' ''ہم نے کچھ کالے بھکاری دیکھے۔'' شوکت نے کہا۔ ''کہاں؟'' میں نے پوچھا، ''کیا وہ پرچم اٹھائے ہوئے تھے؟'' ''جب ہم پہاڑی پر چڑھ رہے تھے، انہوں نے خیریے کو لیموں دیا۔ خیریے نے انہیں کچھ سکے دیے۔ ان پر برف پڑ رہی تھی۔'' ''اور کیا؟'' ''وہ میدان میں تیر چلانے کی مشق کر رہے تھے۔'' ''اس برف باری میں؟'' میں نے کہا۔ ''ہاں، مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' شوکت بولا، ''میں نیلے دروازے والے کمرے میں جا رہا ہوں۔'' ''تم اس کمرے سے نہیں نکلو گے۔'' میں نے کہا، ''ورنہ تم مر جاؤ گے۔ میں تمہارے لیے یہیں انگیٹھی لے آتی ہوں۔'' ''یہ کیوں کہا کہ ہم مر جائیں گے؟'' شوکت نے

کیا وہ واقعی اتنی احمق تھی یا مجھے گمیر نے کی کوشش میں تھی۔

"اگر میں یہ جانتی، تو میں بھی یہ حقیقت نہ چھپاتی کہ وہ قتل ہو گئے ہیں۔" میں نے کہا، "مجھے معلوم نہیں۔ کیا تمہیں کچھ پتا ہے؟"

"مجھے کیسے معلوم ہوگا؟" اس نے کہا، "اب ہم کیا کریں گے؟"

"تم یوں ظاہر کریں گی کہ جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔ میرا دل آہ و زاری کرنے کو چاہا، دل کھول کر رونے کو چاہا، لیکن میں نے خود کو روکے رکھا۔ ہم دونوں خاموش ہو گئیں۔

میں کافی دیر بعد بولی، "مچھلی کو ابھی بھول جاؤ اور بچوں کے لیے برتن لگاؤ۔"

اس نے اعتراض کیا اور رونے لگی اور میں نے اس کے گرد اپنی باہیں ڈال دیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو شدت سے گلے لگایا۔ تھوڑی دیر کو ترس کھاتے ہوئے، نہ صرف خود پر اور بچوں پر بلکہ ہم سب پر، میں نے پھر اسے پیار کیا، لیکن ایک دوسرے کو باہوں میں لیے ہوئے بھی شک کا کیڑا اپنے ڈنک سے مجھے کھائے چلا جا رہا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں کہاں تھی جب میرے بابا کو قتل کیا جا رہا تھا۔ اپنے منصوبوں کو آگے بڑھانے کے لیے میں نے خیریے اور بچوں کو گھر سے بھیج دیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ بابا کو گھر میں اکیلا چھوڑنا ایک غیر متوقع اتفاق تھا۔ کیا خیریے جانتی تھی؟ کیا وہ سمجھی تھی جو میں نے اسے بیان کیا تھا یا وہ مجھے گیا بلاشبہ ہاں، وہ فوراً ہی سمجھ گئی تھی اور شک میں پڑ گئی تھی۔ میں نے اسے اور زور سے گلے لگایا لیکن میں جانتی تھی کہ اپنے کیڑے جیسے دماغ سے وہ یہی فرض کر رہی تھی کہ میں اپنا اپنے مکر و فریب پر پردہ ڈالنے کے لیے کر رہی تھی اور زیادہ دیر نہ گزری کہ خود میں نے بھی یہ محسوس کیا کہ میں اسے دھوکا دے رہی تھی۔ جب یہاں میرے بابا کو قتل کیا جا رہا تھا، میں اور قرہ ایک دوسرے کی قربت میں تھے۔ اگر صرف خیریے اس بات سے واقف ہوتی تو میں خود کو اس قدر قصوروار محسوس نہ کرتی لیکن میرا خیال ہے کہ آپ بھی اس سے کچھ سمجھے ہوں گے۔ ہم اعتراف کریں کہ آپ کا خیال ہے کہ میں کچھ چھپا رہی ہوں۔ افسوس، بے چاری عورت! کیا میرا نصیب اس سے زیادہ تاریک ہو سکتا تھا؟ میں رونے لگی، پھر خیریے بھی رونے لگی اور ہم نے ایک بار پھر ایک دوسرے کو گلے لگایا۔

ہم نے اوپر کی منزل میں کھانے کی جو میز لگائی تھی، اس پر میں نے دکھاوا کیا کہ میرا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ وقتاً فوقتاً "نانا کو دیکھنے" کے بہانے میں دوسرے کمرے میں جاتی اور آنسو بہاتی رہی۔ بعد میں کھانے کے بچے خوف زدہ اور پریشان تھے، وہ بستر میں مجھ سے لپٹ گئے۔ دیر تک وہ جنوں کے خوف کے باعث سونے میں ناکام رہے اور کروٹیں بدلتے ہوئے وہ بار بار پوچھتے رہے کہ "میں نے شور سنا ہے، کیا سنا آپ نے؟" انھیں سونے کے لیے لوری دیتے ہوئے میں نے انھیں محبت بھری کہانی سنانے کا وعدہ کیا۔ آپ جانتے تھے اندھیرے میں لفظوں کے کیسے پر نکل آتے ہیں۔

"ماں، آپ شادی نہیں کرنے والی ہیں، ہے ناں؟" شوکت نے پوچھا۔

"میری بات سنو۔" میں نے کہا۔ "ایک شہزادہ تھا۔ دور کہیں کا جو ایک بہت ہی حسین لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ یہ کیسے ہوا؟ میں تمہیں بتاؤں گی کہ کیسے۔ اس طرح کہ اس حسین لڑکی کو دیکھنے سے پہلے اس نے اس لڑکی کی تصویر دیکھی تھی۔"

جیسا کہ میں ہمیشہ کرتی تھی، جب میں پریشان یا مشکل کا شکار ہوتی، میں نے یادداشت کے بل پر کہانی نہیں سنائی تھی بلکہ اس وقت میں جیسا محسوس کرتی تھی اس کے مطابق اسے برجستہ سنا رہی تھی۔ اور چونکہ میں نے اسے اپنی یادوں اور پریشانیوں کے رنگ سے بھرا تھا، جو میں نے سنایا، اس سے ایک قسم کی دوہری تصویر بنی۔ اس سب سے جو میرے ساتھ ہوا تھا۔

جب دونوں بچے سو گئے تو میں نے گرم بستر چھوڑا اور خیریے کے ساتھ مل کر بدبخت آسیب کا پھیلاوا صاف کیا۔ ہم نے تباہ حال صندوق، کتابیں، کپڑے، مٹی کے پیالے، چکنی مٹی کے برتن، پلیٹیں اور وہ تمام چیزیں جو ادھر ادھر بکھرے اور ٹوٹے ہوئے تھے، ہم نے کام کی برباد میز، رنگوں کے ڈبے اور اوراق اٹھائے جو شدید نفرت کے عالم میں پھاڑے گئے تھے اور ایسا کرتے ہوئے باری باری ہم میں سے کوئی ایک رک جاتی اور رونے لگتی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم کمروں کی تباہ حالت اور ان کے فرنیچر کی بربادی اور اپنی خلوت میں بے رحمی سے مخل ہونے پر بابا کی موت سے زیادہ پریشان حال تھے۔ میں تجربے سے آپ کو بتا سکتی ہوں کہ وہ بدنصیب جو اپنے پیاروں کو کھو دیتے ہیں، گھر میں چیزوں کی اپنی مخصوص جگہوں پر موجودگی سے تسلی پاتے ہیں، پردوں، کمبلوں اور دن کی روشنی کی یکسانی انہیں لوری سناتے ہیں۔ چیزیں بدلے میں کبھی کبھار انہیں بھلا دیتی ہیں کہ عزرائیل ان کے پیارے یا عزیز رشتے دار کو لے جا چکا ہے۔ گھر جس کی میرے والد نے صبر اور محبت سے دیکھ بھال کی تھی جس کے دروازے اور گوشے انہوں نے باریک بینی اور نفاست سے سجائے تھے، بے رحمی سے غارت کیے گئے تھے، یوں وہ نہ صرف سکون و آرام اور خوش گوار یادوں سے خالی ہو گئے تھے بلکہ مجرم کی ملعون روح کی سنگ دلی کی بھی یاد دلاتے تھے، ہم دہشت زدہ بھی تھے۔

جب ہم میرے اصرار پر نچلی منزل پر گئے، کنوئیں سے تازہ پانی نکالا، وضو کیا اور جب ہم سورۃ آل عمران کی تلاوت کر رہے تھے —— جو میرے پیارے مرحوم بابا کا کہنا تھا کہ انہیں بے حد پسند تھی کہ اس میں امید اور موت کا تذکرہ تھا —— ان کے سب سے پسندیدہ ہرات سے مجلد قرآن پاک سے، ہم اس دہشت کے اثر میں تھے اور چونکے اور ہوشیار کہ صحن کا دروازہ چرچرانے لگا تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن یہ دیکھ لینے کے بعد کہ چٹخنی چڑھی ہوئی تھی، اور مل جل کر ریحان یا نیازبو کے پودے کا وہ بھاری گملا دروازے کے آگے رکھنے کے بعد جسے میرے بابا بہار کی صبحوں میں کنوئیں سے نکالا تازہ پانی دیا کرتے تھے، ہم رات کے سکوت میں دوبارہ گھر کے اندر آ گئے اور اچانک یوں لگا جیسے تیل کے لیمپ کی روشنی سے ہم جو طویل سائے بنا رہے تھے وہ کسی اور کے تھے۔ سب سے زیادہ وہ دہشت خیز وہ خوف تھا جو ہم پر کسی خدا ترسی کے خاموش اقدام کے طور پر چھا گیا تھا، جب ہم نے خاموشی اور اداسی سے ان کا خون آلود چہرہ دھویا اور ان کے کپڑے تبدیل کیے تاکہ

میں خود کو یہ دھوکا دے سکوں کہ میرے بابا اپنا وقت آنے پر فطری موت مرے تھے۔ "مجھے نیچے سے ان کا بازو پکڑا دیں۔" فجریہ نے مجھ سے سرگوشی کی۔

جب ہم نے ان کے خون آلود کپڑے اور زیریں کپڑے اتارے، شمع کی روشنی میں بابا کی جلد کی سفید رنگت اور قوت حیات دکھائی دی تھی۔ چوں کہ ہمیں خوف زدہ کرنے کو اور بہت باتیں تھیں، اس لیے ہم میں سے کوئی بھی میرے بابا کے زخموں بھرے برہنہ بدن کو چھلنی دیکھ کر جھجک نہ رہا تھا۔ جب فجریہ صاف کپڑے اور ان کی سبز ریشمی قمیص لانے کے لیے واپس اوپر گئی، خود پر قابو پانے میں ناکام، میں نے ان کا عریاں بدن دیکھا اور پھر فوراً ہی اپنے دیکھنے پر شرم سار ہو گئی۔ اپنے بابا کو صاف کپڑے پہنانے کے بعد اور احتیاط سے ان کی گردن، چہرے اور بالوں سے خون پونچھنے کے بعد میں نے انہیں اپنی پوری قوت سے گلے لگایا اور ان کی ڈاڑھی میں اپنی ناک دفن کر دی۔ میں نے ان کی خوشبو اپنے اندر اتاری اور دیر تک روتی رہی۔

آپ میں سے کئی مجھے احساس سے عاری ہونے کا الزام دیں گے یا حتیٰ کہ قصوروار ہونے کا۔ دو مزید باتوں کے بارے میں مجھے بتانے دیں۔

1۔ جب میں اوپر کا کمرا درست کر رہی تھی تاکہ بچوں کو معلوم نہ ہو سکے کہ کیا ہوا تھا اور جب میں نے اس سیپی کو کان سے لگایا جسے وہ ورق کی صفائی کے لیے استعمال کرتے تھے، جیسا کہ میں بچپن میں کیا کرتی تھی، صرف یہ معلوم کرنے کو کہ سمندر کی آواز کم یا ختم ہو گئی تھی۔

2۔ جب میں نے وہ سرخ [illegible] دیکھی جس پر پچھلے تیس برسوں میں بابا اکثر بیٹھا کرتے تھے — اس قدر کہ وہ گویا ان کی پیٹھ کا حصہ بن گیا تھا — وہ چیر پھاڑ دیا گیا تھا۔

جب گھر کی ہر شے، سوائے اس نقصان کے جس کی اب تلافی نہ ہو سکتی تھی، کو دوبارہ ترتیب دے دی گئی، میں نے فجریہ کی اس کا بستر ہمارے کمرے میں بچھانے کی درخواست یہ کہہ کر سنگ دلی سے رد کر دی۔ "میں نہیں چاہتی کہ بچے صبح تمہیں دیکھ کر شک میں پڑیں۔" میں نے اسے وضاحت دی، لیکن ایمان داری سے کہوں تو میں بچوں کے ساتھ اکیلے رہنے کی بھی اسی قدر مشتاق تھی جتنا میں اسے سزا دینا چاہتی تھی۔ میں بستر میں لیٹ گئی لیکن دیر تک سو نہ پائی، اس لیے نہیں کہ جو کچھ ہوا تھا، مجھ پر اس کا خوف طاری تھا بلکہ میں اس سب کا سوچ رہی تھی جو ابھی ہونا باقی تھا۔

سرخ میرا نام

میں غزنی میں ظاہر ہوا جب ''شاہنامہ'' کے شاعر فردوسی نے نہایت دشوار قافیے کے ساتھ رباعی کا آخری مصرع مکمل کیا، جب شاہ محمود کے درباری شاعروں میں سے ایک نے اس کا مضحکہ اڑایا تھا کہ وہ ایک دہقان کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں ''شاہنامہ'' کے ہیرو رستم کی ترکش پر تھا جب اس نے اپنے کھوئے ہوئے گھوڑے کی تلاش میں دور دراز کا سفر کیا، میں وہ لہو بن گیا جو [illegible] جب اس نے اپنی حیرت انگیز تلوار سے رسوائے زمانہ آدم خور کو دو ٹکڑے کیا اور میں اس کوشک کی تہوں میں تھا [illegible] اس نے بادشاہ کی حسین و جمیل بیٹی سے از خود رفتہ وصل کیا تھا جس نے اس کا مہمان کے طور پر خیر مقدم کیا تھا۔ [illegible] سے اور حقیقت میں، میں ہر جگہ تھا اور ہر کہیں ہوں۔ جب داستانوی افواج کسی خواب کی طرح شاندار میدانوں میں رزم آرا ہوئیں، اور جب لو لگنے سے سکندر کی نکسیر پھوٹی۔ ہاں، شاہ بہرام گور ہفتے کی ہر رات مختلف رنگ کے گنبدوں تلے دور دراز سرزمینوں کی ہر نئی حسینہ کے ساتھ بسر کرتا تھا، اس کی کہانی سنتے ہوئے اور میں اس جاذب نظر [illegible] کے لباس پر تھا جس سے وہ منگل کے روز ملنے جاتا تھا، جس کی تصویر کے عشق میں وہ گرفتار ہوا، بالکل ویسے ہی خسرو کے کفتان پر ظاہر ہوا جو شیریں کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ حقیقت میں، میں قلعوں کا محاصرہ کرنے والی افواج کے پھریروں پر نمودار ہوا، دعوتوں کے لیے تیار میزوں کے میز پوش پر، سلطانوں کی قدم بوسی کرتے سفیروں کے مخملیں کفتانوں پر اور جہاں کہیں تلوار، جس کی داستانیں بچوں کو پسند تھیں، کی عکاسی کی گئی تھی۔ ہاں، وجیہ بادامی آنکھوں والے شاگردوں نے ہندوستان اور بخارا کے دبیز کاغذوں پر خوب محنت سے قلم سے میرا استعمال کیا تھا، میں نے اوشاک کے قالینوں، دیواری سجاوٹوں، لڑنے والے اصیل مرغوں کی کلغیوں، اناروں، افسانوی سرزمینوں کے پھلوں، شیطان کے دہن، تصویر کے حاشیوں کے اردگرد کی لکیروں، خیموں پر کشیدہ کاری، فنکاروں کی اپنی خوشی کے لیے بمشکل دکھائی دیتے پھولوں، کھلی کھڑکیوں سے گردن نکال کر گلی میں جھانکتی تعجب خیز عورتوں کی پوشاکوں، چینی سے بنے پرندوں کے جسموں [illegible] آنکھوں، چرواہوں کی جرابوں، داستانوں میں بیان کی جانے والی صبحوں اور ہزاروں [illegible] تھیں، ہزاروں محبوبوں، جنگجوؤں اور شاہوں کی [illegible] میں شامل ہوتا

پسند تھا جہاں خون گل لالہ کی طرح کھلتا تھا، جہاں حسین لوکے اور شاعرے سرخ کی دعوت اڑاتے، وہاں مضافات میں موسیقی سنتے انتہائی ماہر گویوں یا بھاٹ کے کافتان پر ظاہر ہوتے ہوئے، مجھے فرشتوں کے پروں کی تصویر کشی سے محبت ہے، دوشیزاؤں کے ہونٹوں سے، لاشوں کے مہلک زخموں سے اور خون سے لتھڑے سر بریدہ لاشوں سے۔

میں نے تمہارے ہونٹوں پر سوال سنا، رنگ ہونا کیسا ہوتا ہے؟

رنگ آنکھوں کا لمس ہے، بہروں کے لیے موسیقی، تاریکی سے ابھرتا کوئی لفظ۔ کیوں کہ میں نے روح کی سرگوشیاں سنی ہیں ...... ہوا کی سرسراہٹ کی طرح ...... ہزاروں برس سے، کتاب سے کتاب اور شے سے شے، مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ میرا لمس فرشتوں کے لمس سے مشابہ ہے۔ میرا ایک جزو سنجیدہ نصف، آپ کی بینائی کو پکارتا ہے جب کہ خوش باش نصف آپ کی نگاہوں کے ساتھ ہوا میں پرواز کرتا ہے۔

میں خوش نصیب ہوں کہ سرخ ہوں! میں آتشیں ہوں۔ میں طاقت ور ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں مردوں کی توجہ کھینچتا ہوں اور یہ کہ میرے خلاف مزاحمت نہیں کی جا سکتی، کوئی مجھے جھٹک نہیں سکتا۔

میں خود کو چھپاتا نہیں ہوں: میرے نزدیک نزاکت و نفاست، اپنا اظہار کمزوری میں کرتی ہے نہ ہی لطافت اور باریکی میں بلکہ یہ عزم و ارادے کا مظہر ہے۔ سو میں متوجہ کرتا ہوں۔ میں دوسرے رنگوں، سایوں، ہجوم یا حتیٰ کہ اکیلے پن سے خائف نہیں۔ اس سطح کو ڈھانپ لینا کس قدر شان دار ہے جو خود میرے فاتح وجود کی منتظر ہوتی ہے! میں جہاں کہیں پھیلتا ہوں، میں آنکھوں کو چمکتے، جوش و جذبے کو بڑھتے، بھنوؤں کو اٹھتے اور دل کی دھڑکن تیز ہوتے دیکھتا ہوں۔ سنو، زندہ رہنا اور جینا بصارت ہے۔ میں ہر کہیں ہوں۔ زندگی مجھ سے آغاز ہوتی اور میری طرف پلٹتی ہے۔ میں جو کچھ تمہیں بتاؤں، اس کا یقین رکھو۔

خاموش ہو جاؤ اور سنو کہ میں نے کیسا عالیشان سرخ روپ دیا ہے۔ ایک استاد ماہر مصوّر، ایک فنکار رنگوں کا ماہر، جس نے ہندوستان کے گرم ترین خطوں کے مختلف قسم کے سرخ خشک بہترین بھنوروں کو ہاون دستے میں کوٹ کر بے حد باریک سفوف بنا لیا۔ اس نے قدیم یونان کے پانچ سکوں (ڈریکما) کا سرخ سفوف لیا، ایک ڈریکما کا سدا بہار پودے Soapwort کا اور نصف ڈریکما کا Lotor۔ اس نے ایک برتن میں تین اوقہ (پیمائش کا ترکی پیمانہ) میں Soapwort میں ابالا۔ بعد میں اس نے Lotor کو پانی میں ملایا۔ اس نے اسی دیر اسے خوب ابلنے دیا جب تک کہ اس نے کافی کا ایک کپ پیا۔ جب وہ کافی سے لطف لے رہا تھا دنیا میں آنے کو بے تاب کسی بچے کی طرح میں بے چین ہو گیا۔ کافی نے استاد کے دماغ کو بشاش کر دیا تھا اور اسے جناتی سی بصارت دے دی تھی۔ اس نے کیتلی میں اب سرخ سفوف چھڑکا اور اجزا کو اسی کام کے لیے مخصوص پتلی اور صاف چھڑیوں سے ملایا۔ میں حقیقی اور اصلی سرخ بننے کے لیے تیار تھا لیکن میرے گاڑھے پن کا معاملہ سب سے زیادہ اہم تھا۔ مائع کو صرف ابلتے رہنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔ وہ اس کو اپنی کنگلیر کوا[illegible] رنگ مجھ [illegible] تک لایا (کوئی بھی دوسری انگلی قابل قبول نہ تھی)۔ اور وہ سرخ ہونا کس قدر اچھا

ہے! میں نے انگوٹھے کے اس ناخن کو نفاست و خوبی سے بغیر پھیلے رنگ دیا۔ مختصر یہ کہ میں بالکل درست حالت میں تھا لیکن مجھ میں ابھی بھی رسوب یا تلچھٹ تھی۔ اس نے برتن چولہے سے اتارا اور مجھے مزید صاف کرنے کو ایک صاف باریک کپڑے سے چھان لیا۔ اس کے بعد اس نے مجھے دوبارہ گرم کیا، دو بار ابالا۔ پسی ہوئی پھٹکری کی چٹکی ملانے کے بعد اس نے مجھے ٹھنڈا ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔

کچھ روز گزرے اور میں وہیں اس برتن میں خاموشی سے بیٹھا رہا۔ صفحوں پر استعمال کیے جانے کی خواہش اور توقع میں، ہر طرف پھیلنے اور ہر شے پر پھیلنے کے انتظار میں، وہاں ساکت بیٹھے رہنے نے میرے دل کو توڑ دیا اور جذبوں کو ماند کر دیا۔ خاموشی کے اس دورانیے میں میں نے غور کیا کہ سرخ ہونے سے کیا مراد تھی۔

ایک مرتبہ کسی ایرانی شہر میں جب مجھے ایک شاگرد کے موقلم سے گھوڑے کے زین کے کپڑے کی کشیدہ کاری کے نمونے پر لگایا جا رہا تھا جسے کسی نابینا منی ایچر فنکار نے محض اپنی یادداشت کے بل پر بنایا تھا، میں نے دو نابینا فنکاروں کو بحث کرتے سنا:

''چوں کہ ہم نے اپنی ساری زندگیاں مستعدی اور ایمان داری سے مصور کے طور پر کام کرتے گزاری ہیں، فطری طور پر ہم جو اب نابینا ہو چکے ہیں، سرخ سے واقف ہیں اور یاد کرتے ہیں کہ وہ کیسا رنگ اور کس قسم کا احساس ہے۔'' اس نے کہا جس نے یادداشت سے گھوڑے کی تصویر بنائی تھی۔ ''لیکن کیا ہوتا اگر ہم پیدائشی نابینا ہوتے؟ ہم اس سرخ کو حقیقت میں کس طرح سمجھ پاتے جسے ہمارا وجیہہ شاگرد استعمال کر رہا ہے؟''

''شان دار معاملہ ہے۔'' دوسرا بولا، ''لیکن یہ مت بھولو کہ رنگوں کو جانا نہیں جاتا بلکہ محسوس کیا جاتا ہے۔''

''میرے پیارے فنکار، کسی ایسے شخص کے لیے سرخ رنگ کو بیان کریں جس نے سرخ رنگ کبھی نہ دیکھا ہو۔''

''اگر ہم اسے انگلی کی نوک سے چھوئیں تو یہ لوہے اور تانبے کے درمیان کچھ محسوس ہوگا۔ اگر ہم اسے ہتھیلی میں لے لیں تو یہ جلنے لگے گا۔ اگر ہم اسے چکھیں تو یہ زوردار اور صحت بخش ہوگا، نمکین گوشت کی طرح۔ اگر ہم اسے اپنے ہونٹوں کے درمیان رکھیں تو یہ ہمارے منہ کو بھر دے گا۔ اگر ہم اسے سونگھیں تو اس کی خوشبو گھوڑے جیسی ہوگی۔ اگر یہ پھول ہوتا تو ڈیزی جیسی مہک دیتا، سرخ گلاب جیسی نہیں۔''

ایک سو دس سال قبل وینس کا طرزِ فنکاری ابھی ایسا خطرہ نہ تھا کہ ہمارے حکمران اس بارے میں خود کو زحمت دیتے اور داستانوی استاد فنکاروں کو اپنے طریقوں پر اس قدر شدت سے یقین تھا جیسے انہیں اللہ کا یقین تھا، اس لیے وہ وینس کے گنوار کے ہر عام زخم اور حتیٰ کہ عام ٹاٹ کے کپڑے کو بھی مختلف قسم کے رنگ دینے کو ایک قسم کی بے ادبی اور گنوار پن سمجھتے تھے جو ہنسی اڑانے کے قابل بھی نہ تھی۔ ان کا دعویٰ

تھا۔ صرف کمزور اور متذبذب فنکار ہی کافتان کے سرخ رنگ کی عکاسی کے لیے سرخ رنگ کی مختلف اقسام استعمال کرتے تھے۔۔۔ سائے یا ایک ہی رنگ کے کئی عکس کوئی عذر نہ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ، ہم صرف ایک ہی سرخ رنگ کو مانتے تھے۔

"سرخ کا مطلب کیا ہے؟" اُس نابینا منی ایچر فنکار نے دوبارہ پوچھا جس نے یادداشت کے سہارے گھوڑا بنایا تھا۔

"رنگ کے معنی یہ ہیں کہ یہ وہاں ہمارے سامنے ہے اور ہم اسے دیکھتے ہیں۔" دوسرا بولا، "سرخ رنگ کو ایسے کسی شخص کو بیان نہیں کیا جا سکتا جو اسے نہیں دیکھ سکتا۔"

"خدا کی موجودگی سے انکار کرنے کی خاطر، شیطان کے شکار کہتے ہیں کہ خدا ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔" گھوڑے کی تصویر بنانے والے منی ایچر فنکار نے کہا۔

"تاہم، وہ انہیں دکھائی دیتا ہے جو دیکھ سکتے ہیں۔" دوسرا فنکار بولا، "یہی سبب ہے کہ قرآن فرماتا ہے کہ نابینا اور بینا برابر نہیں ہیں۔"

خوبرو شاگرد نے بے حد نفاست سے مجھے گھوڑے کی زین کے کپڑے میں بھرا۔ پوری مکمل تصویر یا خاکے کے سیاہ و سفید میں اپنی بھرپور حرکات، طاقت اور قوت کو بھرنا کس قدر شاندار احساس تھا: جب بلی کے بالوں کے موقلم نے مجھے مختصر ورق پر پھیلایا، میں خوشی سے گدگدی محسوس کرنے لگا۔ اس کے بعد جب میں نے اپنا رنگ صفحے کو دیا، یوں تھا جیسے میں نے سارے جہان کو حکم دیا تھا: "کُن!" ہاں، وہ جو دیکھ نہیں سکتے، اس سے انکار کریں گے لیکن سچ یہی ہے کہ میں ہر جگہ پایا جاتا ہوں۔

میں، شکورے

بچوں کے جاگنے سے پہلے، میں نے قرہ کو ایک مختصر رقعہ لکھا جس میں اسے پھانسی شدہ یہودی کے گھر پہنچنے کا کہا اور اسے خیریے کے ہاتھ تھما دیا تاکہ وہ اسے جلدی سے ایستھر کو پہنچا سکے۔ جب خیریے نے لا کر دیا تو اس کی فکر کرنے کے باوجود کہ ہمارا کیا ہونا تھا، اس نے معمول سے زیادہ بے خوفی سے میری آنکھوں میں جھانکا اور میں نے جس کا اب باپ نہ رہا تھا، خوف سے میں ڈر گئی، اس کے گھورنے کا جواب ایک بے ڈر پن سے دیا۔ نگاہوں کا یہ تبادلہ مستقبل میں ہمارے تعلق کے انداز کا تعین کرتا۔ پچھلے دو برس سے مجھے شبہ تھا کہ خیریے کا میرے بابا سے بچہ بھی ہو سکتا تھا اور کنیز کے طور پر اپنی حیثیت بھولتے ہوئے وہ گھر کی مالک بننے کی چال چل سکتی تھی۔ میں اپنے بدنصیب بابا کے پاس گئی اور ان کے اکڑے ہوئے ہاتھ کو احترام سے بوسہ دیا جو عجیب طور پر اب اپنی نرمی سے محروم ہو چکا تھا۔ میں نے بابا کے جوتے، پگڑی اور چوغہ چھپا دیے تاکہ بعد میں بچوں کے جاگنے پر انہیں یہ بتا سکوں کہ ان کے نانا بہتر ہو گئے تھے اور صبح ہوتے ہی صقلی پاشا محلے چلے گئے تھے۔

خیریے اپنی صبح کی پیغام رسانی کے بعد واپس لوٹ آئی۔ جب وہ ناشتے کے لیے نچلی میز لگا رہی تھی اور میں اس پر مکھن اور درمیان میں نارنجی کا مربہ رکھ رہی تھی، میں نے تصور کیا کہ کیسے ایستھر اب قرہ کے دروازے پر اسے پکار رہی ہوگی۔ برف باری رک گئی تھی اور سورج چمکنے لگا تھا۔

پھانسی شدہ یہودی کے باغ میں میں میرا سامنا ایک مانوس منظر سے ہوا۔ چھت کے چھجے اور کھڑکیوں کے پٹ سے لٹکتی برف کی قلمیں اب تیزی سے پگھل رہی تھیں اور باغ جس سے کائی اور گلے سڑے پتوں کی بو اٹھتی تھی اب سورج کی دھوپ کو اشتیاق سے جذب کر رہا تھا۔ میں نے قرہ کو اسی جگہ انتظار کرتے پایا جہاں میں نے اسے گزشتہ رات پہلی بار دیکھا تھا — یہ اتنی پرانی بات لگتی تھی، جیسے ہفتوں گزر گئے ہوں۔ میں نے اپنا نقاب اٹھایا اور بولی: ''اگر تم چاہو تو خوش ہو سکتے ہو۔ میرے بابا کے شکوک اور اعتراضات اب مزید ہمارے درمیان حائل نہیں ہوں گے۔ جب گزشتہ شب تم یہاں دھوکے بازی سے مجھ پر ڈورے ڈال رہے تھے، کوئی شیطان صفت آدمی ہمارے گھر میں داخل ہوا اور میرے بابا کو قتل کر دیا۔''

قرہ کے ردعمل کے بارے میں سوچنے کی بجائے آپ غالباً اس بات پر الجھن میں ہوں گے میں نے اس قدر سرد مہری اور کچھ بے رخی سے بات کیوں کی۔ مجھے خود بھی اس کا جواب نہیں معلوم۔ شاید میرا خیال تھا کہ دوسری صورت میں میں رو دیتی، جس پر قرہ مجھے گلے لگا لیتا اور میں اپنی خواہش سے پہلے اس سے زیادہ جلد اس کے قریب ہو جاتی۔

''اس نے ہمارے گھر کو اس طرح مکمل طور پر تباہ کیا ہے جو اس کے غصے اور نفرت کو عیاں کرتا ہے۔ میرا انہیں خیال کہ اس کا کام مکمل ہوا ہے۔ مجھے توقع نہیں کہ یہ شیطان اب کسی گوشے میں سکون سے جا بیٹھے گا۔ اس نے آخری تصویر چرا لی۔ میں تمہیں اپنی حفاظت کے لیے بلا رہی ہوں — ہماری حفاظت کرو — اور میرے بابا کی کتاب کو اس سے بچاؤ۔ اب بتاؤ مجھے کہ کن انتظامات اور شرائط کے تحت تم ہمارا تحفظ کرو گے؟ ہمیں اسے طے کرنا ہوگا۔''

اس نے بولنا شروع کیا لیکن میں نے اسے آسانی سے ایک نگاہ سے ہی خاموش کروا دیا۔ جیسے یہ کچھ ایسا تھا جو میں نے لاتعداد بار پہلے کیا ہو۔

''قاضی کی نگاہ میں میرے بابا کے بعد میرے سرپرست کی حیثیت سے، میرا شوہر اور اس کا میرے خاندان جگہ لے گا۔ حتیٰ کہ ان کی وفات سے پہلے بھی یہی معاملہ تھا کیوں کہ قاضی کے مطابق میرا شوہر ابھی زندہ ہے۔ صرف اس لیے کہ حسن اپنے بڑے بھائی کی غیر موجودگی میں مجھ پر دست درازی کی کوشش کی، ایک ناکام حملہ جس نے میرے سر کو ... کر دیا جس سے مجھے، اگرچہ میں قانونی طور پر بیوہ نہیں لیکن، اپنے بابا کے گھر واپس آنے کی اجازت مل گئی لیکن اب جب کہ میرے بابا فوت ہو چکے ہیں اور میرا کوئی بھائی بھی نہیں، اس کا کوئی سوال نہیں کہ میرے واحد قانونی سرپرست میرے شوہر کا بھائی اور میرے سسر ہیں۔ وہ پہلے ہی بابا پر دباؤ ڈال کر اور مجھے دھمکا کر مجھے گھر لے جانے کے منصوبے بناتے رہے ہیں۔ ایک بار انہیں معلوم ہو گیا کہ میرے بابا وفات پا گئے ہیں تو وہ قانونی قدم اٹھانے میں نہیں جھجکیں گے۔ اس سے بچنے کی واحد امید میرے لیے بابا کی وفات کو چھپانا ہے۔ شاید بے فائدہ ہی کیوں کہ ہو سکتا ہے اس جرم کے پیچھے وہی ہوں۔''

عین اسی لمحے روشنی کی ایک پتلی سی لکیر ٹوٹے ہوئے کواڑوں سے چھن کر آئی اور کمرے کے اندر موجود قدیم گرد و غبار کو روشن کرتے ہوئے میرے اور قرہ کے درمیان اتر گئی۔

''یہ واحد سبب نہیں کہ جس باعث میں اپنے بابا کی موت چھپا رہی ہوں۔'' میں نے اپنی آنکھیں قرہ کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے کہا، جن میں میں محبت سے زیادہ اس کا انہماک دیکھ کر خوش ہوئی۔ ''میں بابا کی وفات کے وقت کہاں تھی، میں یہ بھی ثابت کرنے کے ناقابل ہونے سے خائف ہوں۔ اگرچہ وہ غلام ہے اور اس کی بات نظرانداز تو کی جا سکتی ہے لیکن مجھے خدشہ ہے کہ خیریے ساری سازباز میں ملوث ہے، اگر میرے خلاف نہیں تو بابا کی کتاب کے خلاف۔ اور جب تک میں کسی محافظ کے بغیر ہوں میرے بابا کے قتل کا

اعلان، اگرچہ ابتدا میں گھر کے معاملے آسان کرے گا صرف ان وجوہات کے سبب جو میں نے بتائیں، لیکن پہ اس کے ہاتھوں میری بدقسمتی کا باعث بھی بن سکتا ہے، کیا ہو اگر خیر بے جا تی ہو کہ بابا نہیں چاہتے تھے کہ میں تم سے شادی کروں؟''

''تمہارے بابا نہیں چاہتے تھے کہ تم مجھ سے شادی کرو؟'' قمرہ نے پوچھا۔

''نہیں، وہ نہیں چاہتے تھے۔ انہیں فکر تھی کہ تم مجھے ان سے دور لے جاؤ گے۔ چوں کہ اب تمہاری جانب سے ان کے ساتھ ایسی کوئی برائی کرنے کا مزید خطرہ نہیں، فرض کرو کہ میرے پیارے بدنصیب باپ کو مزید کوئی اعتراض نہیں، کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''

''بالکل بھی نہیں، میری جان شکورے۔''

''ٹھیک ہے پھر۔ میرے سرپرست کا تم پر کسی رقم یا سونے کا کوئی دعویٰ نہیں۔ برائے مہربانی، ایک بے محل موقع پر میرے خود سے اپنی شادی کے معاملات طے کرنے کو معاف کر دو لیکن میری کچھ خاص پیشگی شرائط ہیں جو بدقسمتی سے مجھے تمہیں بتانی ہوں گی۔''

جب میں کچھ دیر کو خاموش ہوئی تو وہ بولا ''ہاں''۔ ایسے انداز میں جس میں اپنی ہچکچاہٹ پر معذرت کا اظہار تھا۔

میں نے بات شروع کی: ''پہلے تو تمہیں دو گواہوں کے سامنے قسم اٹھانی ہوگی کہ اگر تم نے ہماری شادی کے بعد میرے ساتھ برا سلوک کیا، اس حد تک کہ میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا یا اگر تم دوسری بیوی لے آئے تو تم مجھے نان نفقہ کے ساتھ طلاق دے دو گے۔ دوسرے، تمہیں دو گواہوں کے سامنے حلف اٹھانا ہو گا کہ اگر کسی بھی وجہ سے تم مہینے سے زیادہ عرصے گھر سے مسلسل غائب رہے تو تب بھی مجھے نان نفقہ کے ساتھ طلاق یا خلع مل جائے گی۔ تیسرے، ہماری شادی کے بعد یقیناً تم میرے گھر آ جاؤ گے، پھر بھی جب تک میرے بابا کا قاتل پکڑا نہیں جاتا یا تم اسے ڈھونڈ نہیں لیتے — میں کس قدر چاہتی ہوں کہ اسے اپنے ہاتھوں سے اذیت دوں! — اور جب تک تمہاری صلاحیتوں اور فن اور کوششوں کی رہنمائی میں مکمل کی گئی ہمارے سلطان کی کتاب انہیں باوقار طریقے سے پیش نہیں کر دی جاتی، تم میرے قریب بھی نہیں آؤ گے۔ چوتھے یہ کہ میرے بیٹے جو میرے بستر پر میرے ساتھ سوتے ہیں، تم ان سے ویسی ہی محبت کرو گے جیسے وہ تمہارے اپنے بچے ہوں۔''

''مجھے قبول ہے۔''

''خوب۔ اگر ہماری راہ میں موجود تمام رکاوٹیں اسی طرح جلدی سے ختم ہو جائیں تو ہم جلد ہی شادی کر لیں گے۔''

''ہاں، شادی، لیکن قربت نہیں۔''

''پہلا قدم شادی ہے۔'' میں نے کہا: ''آؤ پہلے اسی کو دیکھیں۔ محبت شادی کے بعد آتی ہے۔

مت بھولو، شادی محبت کے شعلے کو پانی سے بجھا دیتی ہے، اپنے پیچھے بنجر اداس تاریکی کے سوا کچھ نہیں چھوڑتی۔ یقیناً شادی کے بعد محبت خود بہر حال ختم ہو جائے گی لیکن اس خلا کو خوشی سے بھر دے گی۔ پھر بھی یہاں ایسے قلت پسند بے وقوف ہیں جو شادی سے پہلے محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور جذبات میں جلتے ہوئے اپنے تمام احساسات کو بھسم کر دیتے ہیں، یہ خیال کرتے ہوئے کہ محبت زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔"

"پھر اصل سچ کیا ہے؟"

"سچ، اطمینان ہے۔ محبت اور شادی اسے حاصل کرنے کے صرف ذریعے ہیں: ایک شوہر، ایک گھر، بچے، ایک کتاب۔ کیا تم دیکھ نہیں سکتے، گم شدہ شوہر اور مرحوم باپ کے ساتھ اس حالت میں بھی میں تم سے تمہاری تنہائی کی نسبت بہتر ہوں؟ اپنے بیٹوں کے بغیر میں مر جاؤں گی جن کے ساتھ میں نے اپنے دن جنتے، اوجھا عشق اور محبت کرتے گزارے ہیں۔ مزید یہ، چوں کہ تم میری موجودہ مشکل صورت حال میں بھی میری چاہ کرتے ہو، کیوں کہ تم میرے قرب کے لیے اندر ہی اندر تڑپتے ہو —— میرے باپ کی میت اور میرے سرکش بچوں کے ساتھ ایک ہی چھت تلے، تم پورے دل سے وہ سب جننے کے لیے مجبور ہو جو مجھے کہنا ہے۔"

"میں سن رہا ہوں۔"

"طلاق حاصل کرنے کے کئی ایک طریقے ہیں۔ جھوٹے گواہ قسم کھا سکتے ہیں کہ انہوں نے میرے شوہر کو جنگی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے مشروط طلاق دیتے دیکھا تھا، مثال کے طور پر یہ کہ اس نے قول دیا تھا کہ اگر وہ دو سال کے اندر واپس نہ آیا تو یہ طلاق سمجھا جائے گا یا زیادہ سادہ، وہ حلف اٹھا سکتے ہیں کہ انہوں نے میدان جنگ میں میرے شوہر کی لاش دیکھی، مختلف قاتل کرنے والی اور مفصل باتیں بنا کر۔ لیکن میرے بابا کی میت اور میرے سسرال والوں کے اعتراضات پر غور کیا جائے تو جھوٹی گواہیوں پر انحصار کا مطلب ایک کمزور طریقے سے آگے بڑھنا ہوگا، جس پر کوئی بھی ذہین یا محتاط قاضی قائل نہ ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ میرا شوہر مجھے بغیر نان نفقہ کے چھوڑ گیا تھا اور چار برس سے جنگ سے واپس نہ آیا تھا، حتیٰ کہ ہمارے حنفی فقہ کے قاضی بھی مجھے طلاق نہیں دلوا سکتے تھے۔ اسکودر قاضی جانتے ہیں کہ مجھ جیسی عورتوں کی تعداد آئے روز بڑھ رہی تھی، اور زیادہ بھدر دے اور یوں ...... ہمارے عالی مقام سلطان اور شیخ الاسلام کی رضا سے ...... قاضی کبھی کبھار اپنی جگہ شافعی فقہ کے اپنے نائب کو فیصلہ کرنے کی اجازت دیتے تھے، یوں مجھ جیسی عورتوں کو نان نفقہ کی شرائط کے ساتھ طلاق دلوا دیتے ہیں۔ اب تم میری تکلیف دہ صورت حال کی کھلے عام گواہی دینے کے لیے دو گواہ تلاش کرو، انہیں ادائیگی کرو، ان کے ساتھ باسفورس پار کر کے اسکودر کی طرف جاؤ، قاضی کا انتظام کرو، اس بات کی یقین دہانی کرو کہ ان کی جگہ ان کا نائب بیٹھے تا کہ گواہیوں کے باعث طلاق مل سکے، قاضی کے رجسٹر میں طلاق کا اندراج کرواؤ، اس کارروائی کی شہادت دینے والی دستاویز حاصل کرو اور میری فوری دوسری شادی کی تحریری اجازت حاصل کرو اور اگر تم اس سب میں کامیاب رہے اور سہ پہر تک باسفورس کے اس پار پہنچ گئے تو پھر ...... یہ فرض کرتے ہوئے کہ نکاح خواں کی تلاش میں کوئی

مشکل نہ ہو گی جو آج شام ہماری شادی کروا سکے — شوہر کی حیثیت سے تم یہ رات میرے اور میرے بچوں کے ساتھ بسر کر سکتے ہو۔ اس طرح تم ہمیں گھر میں ہر سرسراہٹ پر شیطان صفت قاتل کے قدموں کا گمان کرتے ہوئے، ایک بے خواب رات سے بچا لو گے۔ مزید یہ کہ صبح جب ہم میرے بابا کی وفات کا اعلان کریں گے تم مجھے ایک بے چاری غیر محفوظ عورت ہونے کی بدبختی سے بچا لو گے۔"

آپ کو یاد ہے کہ کیسے حال ہی میں میں نے کہا تھا کہ مجھے معلوم نہیں کہ میں قرہ سے اس قدر بے رُخی اور سرد مہری سے کیوں بات کر رہی تھی۔ اب میں جانتی ہوں: مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ صرف ایسا لہجہ اختیار کر کے ہی میں قرہ کو قائل کر سکتی تھی — جسے ابھی اپنے بچپن کے احمق پن کو چھوڑ کر بڑے ہونا تھا — اسے واقعات کے امکان پر قائل کر سکتی تھی جن کے بارے میں مجھے بھی یہ ماننے میں مشکل ہو رہی تھی کہ وہ گزر جائیں گے۔

"ہمیں اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لیے بہت کچھ کرنا ہے جو میرے بابا کی کتاب کی تکمیل میں رکاوٹ ڈالیں گے اور وہ جو میری طلاق اور ہماری شادی کے خلاف جھگڑا کر سکتے ہیں — جو خدا نے چاہا تو آج رات ہو گی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے تمہیں مزید نہیں الجھانا چاہیے کیوں کہ تم پہلے ہی مجھ سے بھی زیادہ الجھے ہوئے ہو۔"

"تم بالکل بھی الجھی ہوئی نہیں۔" قرہ نے کہا۔

"شاید، لیکن صرف اس لیے کہ یہ صرف میرے خیالات نہیں تھے، میں نے انہیں برسوں میں بابا سے سیکھا ہے۔" میں نے یہ اس لیے کہا تاکہ وہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ سارے منصوبے میرے نسوانی دماغ نے تیار کیے تھے، انہیں مسترد نہ کر دے۔

اس کے بعد قرہ نے وہی کہا جو میں نے ہر ایسے مرد سے سنا تھا جو یہ تسلیم کرنے سے خائف نہ تھا کہ اسے میں بے حد ذہین لگی تھی: "تم بہت خوب صورت ہو۔"

"ہاں۔" میں نے کہا، "مجھے اپنی ذہانت کی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے۔ جب میں بچی تھی تو بابا اکثر ایسا کہا کرتے تھے۔"

میں مزید یہ کہنے والی تھی کہ میرے بڑے ہونے کے بعد بابا نے میری ذہانت کی تعریف کرنی چھوڑ دی تھی لیکن میں رونے لگی۔ روتے ہوئے یوں تھا جیسے میں نے اپنی ذات کو چھوڑ دیا اور کوئی دوسری، بالکل مختلف عورت بننے لگی تھی۔ کسی کتاب کے اوراق پر کوئی اداس تصویر دیکھ کر پریشان قاری کی طرح، میں نے اپنی زندگی کو دور کھڑے ہو کر دیکھا اور جو کچھ دیکھا اس پر تاسف کیا۔ اپنی مشکلات پر یوں رونا جیسے وہ اور کسی کی ہوں، اس میں کچھ بڑی معصومانہ سی بات ہے۔ اک جب قرہ نے مجھے گلے لگایا تو ہم دونوں پر اطمینان و سکون کا ایک احساس چھا گیا۔ پھر بھی، اس وقت، جب ہم نے ایک دوسرے کو گلے لگایا، اطمینان کا یہ احساس ہمارے، ہم دونوں کے درمیان ہی رہا، اس نے ہمارے گرد گھومنے والے حریفوں پر کوئی اثر نہ کیا۔

میرا نام ہے فترہ

بیوہ، اکیلی اور غم زدہ میری محبوبہ شکورے اپنے پروں جیسے بے آواز قدموں سے چلی گئی اور میں وہاں پھانسی شدہ یہودی کے گھر کے سکوت میں باداموں کی مہک اور شادی کے ان خوابوں کے درمیان جو وہ پیچھے چھوڑ گئی تھی، مبہوت کھڑا رہ گیا۔ میں حیران تھا لیکن میرا دماغ اس قدر تیزی سے کام کر رہا تھا کہ تقریباً تکلیف ہو رہی تھی۔ اپنے انشتے کی وفات کا پوری طرح غم منانے کا موقع ملے بغیر، میں جلدی سے گھر واپس آ گیا۔ دوسری جانب مجھے شک کا کیڑا کھا رہا تھا: کیا شکورے مجھے کسی بڑی سازش میں مہرے کے طور پر استعمال کر رہی تھی؟ کیا وہ مجھے دھوکا دے رہی تھی؟ دوسری جانب بابرکت شادی کے تصورات مسلسل میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔

اپنی مالکہ مکان کے ساتھ بات کرنے کے بعد، جس نے مرکزی دروازے پر ہی مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دی تھی کہ میں کہاں گیا تھا اور اتنی صبح سویرے کہاں سے آ رہا تھا، میں اپنے کمرے میں گیا اور اس پٹی کی تہوں میں سے وینس کے وہ 22 سونے کے سکے نکالے جنہیں میں نے اپنے گدے میں چھپا رکھا تھا۔ میں نے وہ سکے اپنی کپکپاتی انگلیوں سے اپنے بٹوے میں رکھے۔ جب میں گلی میں واپس آیا تو میں جان گیا کہ آج سارا دن مجھے شکورے کی گہرے رنگ کی آنسوؤں بھری پریشان آنکھیں نظر آتی تھیں۔

میں نے مسلسل مسکراتے یہودی صراف سے وینس کے پانچ سکے تبدیل کروائے۔ بعد میں گہری سوچ کے عالم میں میں اس علاقے میں داخل ہوا جس کے نام کا ذکر مجھے ابھی کرنا ہے کیوں کہ وہ مجھے زیادہ پسند نہیں: یاقوتلر (Yakutlar) جہاں میرے مرحوم انشتے اور شکورے، اپنے بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں میرے منتظر تھے۔ جب میں تقریباً بھاگتے ہوئے اس راستے سے گزرا تو چنار کے ایک طویل قامت درخت نے عین اسی روز جب میرے انشتے اس جہان سے گزرے تھے، میرے شادی کے خوابوں اور منصوبوں پر اس قدر خوش ہونے پر مجھے ملامت کی۔ پھر، جیسے برف پگھل گئی تھی، سرزنش کے لیے فوارہ میرے کان میں چہکارا۔ "معاملوں کو اتنی سنجیدگی سے مت لو، اپنے کام دیکھو اور اپنی خوشی۔" ایک گوشے میں اپنے بدن کو چاٹتی ایک بدشگون کالی بلی نے درمیان میں اعتراض کیا۔ "سب کچھ اچھا اور ٹھیک ہے۔ لیکن جیسے

تمہارے ، یہ کسی کو شک ہے تمہارے الشتے کے قتل میں خود تمہارا ہاتھ ہے۔"

لی خود کو چاٹ رہی تھی جب اچانک میں نے اس کی مسحور کن آنکھوں کو دیکھا۔ مجھے آپ کو بتانا نہیں پڑے گا کہ استنبول کی بلیوں کو مقامی لاڈ پیار سے پکار دیتے ہیں تو یہ کس قدر شوخ اور بے باک ہو جاتی ہیں۔

مجھے امام آفندی ملے جن کے گرے ہوئے بھنوئے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں انہیں ہمیشہ ایک نیم خوابیدہ سا تاثر دیتی تھیں۔ ان کے گھر پر نہیں بلکہ قریبی مسجد کے صحن میں اور وہاں میں نے ان سے ایک غیر اہم سا قانونی سوال پوچھا: "کوئی عدالت میں گواہی دینے کا پابند کب ہوتا ہے؟" میں نے اُن کے مغرور اور خود پسند سے جواب کو سنتے ہوئے اس طرح بھنویں اُچکائیں جیسے یہ معلومات میں پہلی بار سن رہا تھا۔ "اگر دوسرے گواہ موجود ہوں تو گواہی دینا مرضی پر موقوف ہے۔" امام آفندی نے کہا، "لیکن ایسی صورت حال میں جب صرف ایک ہی گواہ ہو تو یہ خدا کی منشا ہے کہ وہ شخص ضرور گواہی دے۔"

"میں اس وقت بالکل اسی مشکل میں گرفتار ہوں۔" میں نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا، "ایسی صورت حال میں جسے ہر کوئی جانتا ہے، تمام گواہوں نے اپنی ذمے داریوں سے پہلو تہی کی اور اس بہانے سے عدالت جانے سے گریز کیا کہ 'یہ اختیاری یا رضاکارانہ کام ہے۔' اور اس کے نتیجے میں، میں جن لوگوں کی مدد کی کوشش کر رہا ہوں، ان کے ساتھ ان کے حقوں سے بالکل غفلت ہو رہی ہے۔"

"اچھا تو تم اپنے بٹوے کی ڈوری ذرا اور ڈھیلی نہیں کرتے؟" امام آفندی بولے۔

میں نے اپنی ہتھیلی کھولی اور انہیں اس میں موجود وینس سونے کے سکے دکھائے۔ مسجد کا کھلا صحن اور وجا کا چہرہ، ہر شے جیسے اچانک سونے کی چکاچوند سے روشن ہو گئی۔ ... نے پوچھا کہ میری اُلجھن تھی کیا۔

میں نے بیان کیا کہ میں کون تھا۔ "الشتے آفندی بیمار ہیں۔" میں نے رازداری سے بتایا، "وہ اپنی موت سے پہلے، اپنی بیٹی کی بیوگی کی توثیق اور یہ چاہتے ہیں کہ اس کے نان نفقہ کا بندوبست ہو جائے۔"

مجھے اسکودر قاضی کے نائب کا ذکر بھی نہ کرنا پڑا۔ امام آفندی فوراً سمجھ گئے اور بولے کہ سارا علاقہ ہی عرصے سے بے چاری شکورے کی قسمت پر پریشان تھا، مزید یہ کہ یہ صورت حال لمبے عرصے سے تھی۔ اسکودر قاضی سے قانونی علیحدگی کی توثیق کے لیے ضروری، دوسرے گواہ کی تلاش کی بجائے، امام آفندی نے اپنے بھائی کو گواہ کے طور پر پیش کرنے کا مشورہ دیا۔ اب اگر میں بھائی کو اضافی سونا دیتا، جو قریب ہی رہتا تھا اور شکورے اور اس کے پیارے بچوں کی مشکل سے واقف تھا تو میں نیکی کا کام کرتا۔ آخر کو سونے کے صرف دو سکوں کے بدلے امام آفندی مجھے دوسرا گواہ بھی فراہم کر رہے تھے۔ ہم فوراً راضی ہو گئے۔ امام آفندی اپنے بھائی کو لینے چلے گئے۔

ہمارا باقی ہشتروں "چوبے لی" کی ان کہانیوں جیسا تھا کہ جو میں نے حلب کے کافی خانے میں

داستان کو سناتے دیکھا تھا۔ ساری مہم جوئی اور فریب کاری کے باعث، ریاضیہ نقشوں کی طرح لکھی گئی ایسی
کہانیاں کبھی بھی سنجیدگی سے نہیں لی جائیں، چاہے انہیں بڑی عمدہ خطاطی میں پیش کیا جائے، یعنی ان کی بھی
تصویر کشی نہ کی جاتی تھی۔ دوسری جانب، میں اپنے دن بھر کی مہم کو چار مناظر میں تقسیم اور ہر کسی کو اپنے دماغ
میں تصویر کشی کے لیے اوراق میں تصور کر کے بہت خوش تھا۔

پہلے منظر میں، منی ایچر فنکار کو بھاری مونچھوں والے بٹے کٹے ملاحوں کے درمیان تصویر کشی کرنی
تھی جو ہمیں چار چپوؤں والی سرخ لمبی کشتیوں میں جن پر ہم انکاپانی (Unkapani) سے سوار ہوئے تھے،
باسفورس کو عبور کر کے اسکودر (Uskudar) لے جا رہے تھے۔ حوبا اور اس کا دبلا پتلا سانولا بھائی، اس اچانک
سفر پر مسرور اور ملاحوں سے دوستانہ گپ شپ میں مصروف تھے۔ اس دوران، شادی کے خوش کن خواب
میری آنکھوں کے سامنے رقصاں تھے، جب میں باسفورس کے پانیوں کو دیکھ رہا تھا جو موسم سرما کی دھوپ
بھری صبح میں معمول سے زیادہ شفاف دکھائی دیتے تھے، اس کی لہروں کے درمیان کسی بدشگون نشانی دیکھے
پر چونکا۔ مثال کے طور پر، مجھے خدشہ ہے کہ مجھے نیچے کسی قزاق جہاز کی باقیات دکھائی دے جائیں گی۔ یوں
چاہے منی ایچر فنکار، سمندر اور ملاحوں کو کیسا ہی خوش باش رنگ دے دے، اسے میرے خوف وخدشوں کے برابر
تاریک اور مسرت کے میرے خوابوں کے برابر شدید بھی کچھ شامل کرنا پڑے گا ___ مثال کے طور پر پانی کی
گہرائیوں میں کوئی خوف ناک سی مچھلی ___ قاری میری مہم جوئی کو صرف گل رنگ اور پر امید ہی نہ فرض
کر لے۔

دوسری تصویر میں سلاطین کے محلات، دریا کی دیوان کونسل کی مجالس، یورپی سفیروں کے
خیر مقدم اور بیزار کن سی نفاست اور باریکی سے پر ہجوم داخلی حصوں کو تفصیل اور احتیاط سے دکھانا ہوگا، یعنی
تصویر میں زندہ دلی سے معمور چالیں اور وہ معنویت ہوگی۔ اس طرح جب قاضی آفندی ہاتھ اٹھا کر رکنے کا
اشارہ کرتے ہوئے میری رشوت کو "نہیں" یا "ابھی نہیں" کہہ رہے ہوں گے تو دوسرے ہاتھ سے وہ مہربانی
سے احسان کرتے ہوئے میرے دیئے وینس سونے کے سکے جیب میں ڈال رہے ہوں گے اور اسی تصویر میں
اس رشوت کے نتیجے کی عکاسی بھی ہوگی: شباب آفندی، اسکودر قاضی کی جگہ نائب کے فرائض ادا کرتے شافعی
قاضی۔ سلسلہ وار واقعات کی ایک کے بعد ایک عکاسی صفحات کی تزئین کاری کرنے والا کوئی ماہر منی ایچر فنکار
ہی کر سکتا تھا۔ یوں، جب دیکھنے والا جو پہلے مجھے رشوت دیتے دیکھتا ہے، بعد میں تصویر میں قاضی کی جگہ اس
کے نائب کو آلتی پالتی مارے بیٹھے دیکھتا ہے، پھر چاہے اس نے کہانی نہ بھی پڑھی ہو وہ جان جائے گا کہ قابل
احترام قاضی نے عارضی طور پر اپنی جگہ اپنے نائب کو دے دی ہے تا کہ شکورے کو طلاق کی سند دی جا سکے۔

تیسری تصویر یہی منظر دکھائے گی لیکن اس بار حاشیے کی سجاوٹ گہری اور رنگین انداز میں کی جائے
گی، بیل دار شاخیں زیادہ نازک اور گہری ہوں گی اور قاضی کے نائب کے سر پر رنگ برنگے بادل ظاہر ہوں
گے تا کہ کہانی کی فریب کاری واضح ہو۔ اگرچہ امام آفندی اور ان کے بھائی نے قاضی کے سامنے الگ الگ

گواہی دی، تصویر میں انہیں اکٹھے دکھایا گیا ہے جس میں وہ بیان کر رہے ہیں کہ کیسے بے چاری مظلوم شکورے کا شوہر چار سال سے جنگ سے واپس نہیں لوٹا اور کیسے وہ اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں مفلسی کی حالت میں ہے جس کا خیال کرنے والا کوئی نہیں، کیسے اس کے بن باپ کے بچے ہمیشہ افسردہ اور بھوکے رہتے ہیں، کیسے دوبارہ شادی کا کوئی امکان نہیں کیوں کہ وہ ابھی بھی شادی شدہ سمجھی جاتی ہے اور کس طرح اس حالت میں وہ اپنے شوہر کی اجازت کے بنا قرض تک نہیں لے سکتی۔ وہ اس قدر قائل کرنے والے دلائل دے رہے تھے کہ پتھر کی طرح بہرہ شخص بھی آنسوؤں کی برسات میں شکورے کو طلاق دلوا دیتا۔ تاہم، بے حس نائب قاضی نے شکورے کے قانونی سرپرست کے بارے میں پوچھا۔ لمحے بھر کی ہچکچاہٹ کے بعد میں نے فوراً مداخلت کی اور بتایا کہ اس کے عزت دار والد، جو شاہی پیغام رساں اور سفیر کے طور پر ہمارے سلطان کی خدمت میں رہ چکے ہیں، ابھی حیات ہیں۔

"جب تک کہ وہ عدالت میں شہادت نہیں دیتے، میں اسے طلاق کا حق بالکل نہیں دے سکتا!" نائب قاضی نے کہا۔

اس پر بالکل گھبراہٹ سے میں نے بیان کیا کہ کس طرح ہمارے انشتے آفندی بیمار اور بستر پر دراز ہیں اور زندگی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں کیسے ان کی خدا سے آخری تمنا یہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی طلاق ہوتے دیکھ لیں اور یہ کہ کیسے میں ان کا ترجمان ہوں۔

"وہ طلاق کے ساتھ کیا چاہتی ہے؟" نائب قاضی نے پوچھا، "کوئی لب مرگ آدمی اپنی بیٹی کی اس کے شوہر سے طلاق کیوں چاہتا ہے جو پہلے ہی ایک عرصے سے غائب ہے؟ سنو، بات مجھے سمجھ آجاتی اگر داماد کے طور پر کوئی اچھا، قابل اعتماد امیدوار موجود ہوتا، کیوں کہ پھر بھی وہ اپنی ناتمام خواہش کے ساتھ فوت نہ ہوتے۔"

"ایسا امکان ہے جناب۔" میں نے کہا۔

"وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"وہ میں ہوں!"

"آہ پھر! تم سرپرست کے ترجمان ہو!" قاضی کے نائب نے کہا، "تم کام کیا کرتے ہو؟"

"میں مشرقی صوبوں میں معتمد، معتمد اعلیٰ اور نائب خزانچی کے طور پر مختلف پاشاؤں کے ساتھ خدمت انجام دیتا رہا ہوں۔ میں نے ایرانی جنگوں کی تاریخ مکمل کی جو میں ہمارے سلطان کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں مصوری اور کتابوں کی تزئین کاری کا ذوق رکھتا ہوں۔ میں پچھلے بیس برس سے اس خاتون سے محبت کرتا چلا آرہا ہوں۔"

"کیا تم اس کے رشتے دار ہو؟"

میں اس قدر اچانک اور غیر متوقع طور پر قاضی کے نائب کے سامنے زمین پر ریختی مسکینی کا شکار

ہونے پر بے حد شرمندہ تھا، اپنی زندگی کو یوں ہر طرح کے اسرار سے محروم کوئی بے رنگ شے بنا دینے پر میں بالکل خاموش ہو گیا۔

"چقندر کی طرح سرخ پڑنے کی بجائے مجھے جواب دو نوجوان، کہیں میں اسے طلاق کا حق دینے سے انکار نہ کر دوں۔"

"وہ میری خالہ کی بیٹی ہے۔"

"آہم، اچھا، کیا تم اسے خوش رکھ پاؤ گے؟"

اس نے یہ سوال کرتے ہوئے ایک بیہودہ اشارہ کیا۔ مٹی ایچر فنکار کو اس ناشائستگی کو شامل نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے لیے اتنا دکھانا ہی کافی ہوگا کہ میں کس قدر سرخ پڑ گیا تھا۔

"میں قابل عزت روزی کما لیتا ہوں۔"

"چوں کہ میں شافعی فقہ سے تعلق رکھتا ہوں، مجھے اس بدنصیب شکورے کے خلع لینے کے خلاف مقدس کتاب اور ہمارے فقہ میں کچھ نہیں ملتا جس کا شوہر پچھلے چار برس سے محاذ سے بھی غائب ہے۔" نائب آفندی نے کہا۔ "میں طلاق تفویض کرتا ہوں اور میں حکم دیتا ہوں کہ اس کے شوہر کے تمام حقوق منسوخ کیے جاتے ہیں، اگر وہ لوٹ کر آ بھی جائے تو بھی۔"

اگلی یعنی چوتھی تصویر میں، نائب قاضی کے اندراج نامے میں طلاق کے اندراج کی تصویر کشی ہوگی، سیاہ روشنائی میں حروف کی تابع دار افواج کو ابھارتے ہوئے، میرے سامنے وہ دستاویز رکھنے سے پہلے جس میں لکھا تھا کہ شکورے اب بیوہ ہے اور اس کی فوراً دوبارہ شادی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس وقت میں جو بابرکت اور مسرور باطنی روشنی محسوس کر رہا تھا، اس کا عکاس عدالتی کمرے کو سرخ رنگ دینے سے ہو سکتا تھا نہ ہی تصویر کو سرخ رنگ کے حاشیے دینے سے۔ جھوٹے گواہوں اور قاضی کے دروازے کے سامنے کھڑے اُن دوسرے لوگوں کے ہجوم میں سے راہ بناتے واپس بھاگتے ہوئے، جو وہاں اپنی بہنوں، بیٹیوں یا حتیٰ کہ خالہ پھوپھیوں کے لیے طلاق حاصل کرنے کے لیے جمع تھے، میں واپسی کے سفر پر روانہ ہوا۔

باسفورس پار کرنے کے بعد اور سیدھا یا قوتلر کے علاقے کا رخ کرتے ہوئے میں نے روادار اور بامروت امام آفندی اور ان کے بھائی دونوں کو رخصت ہونے کی اجازت دی، جو کسی شادی کی تقریب میں شرکت چاہتے تھے۔ چوں کہ مجھے راستے میں دکھائی دینے والے ہر شخص پر شبہ تھا کہ وہ اس حیران کن خوشی پر حسد میں جو میں حاصل کرنے کو تھا، کوئی شرارت کرے گا، میں سیدھا شکورے کی گلی کی طرف بھاگ اٹھا۔ منحوس کوؤں کو گھر میں کسی میت کی موجودگی کا الہام کیسے ہو گیا تھا جو سرخ مٹی کی چھت کی نگر پر جوش میں چکر کاٹ رہے تھے؟ مجھ پر ایک احساسِ گناہ وسا چھا گیا کیوں کہ میں اپنے انشتے کا غم نہ کر پایا تھا یا حتیٰ کہ ایک آنسو بھی نہ بہا پایا تھا۔ پھر بھی گھر کے بخی سے بند کواڑوں اور دروازے سے، خاموشی سے اور حتیٰ کہ انار کے درخت کو دیکھنے سے میں جانتا تھا کہ سب کچھ منصوبے کے عین مطابق ہو رہا تھا۔

میں بے حد عجلت میں وجدانی طور پر کام کر رہا تھا۔ میں نے صحن کے دروازے پر پتھر اچھالا لیکن وہ وہاں نہ لگا۔ دوسرا پتھر میں نے کھڑکی پر مارا۔ وہ چھت پر جا گرا۔ پریشانی میں میں کھڑکی پر پتھر برسانے لگا۔ ایک کھڑکی کھلی۔ وہ دوسری منزل کی کھڑکی تھی جہاں چار روز پہلے بدھ کے روز میں نے انار کے درخت کی شاخوں سے شکورے کی جھلک دیکھی تھی۔ اور حسان نظر آیا اور کواڑوں کے بیچ دروازے میں شکورے کو اسے ڈانٹتے سن سکتا تھا۔ پھر مجھے وہ دکھائی دی۔ لمحے بھر کو ہم امید و بیم کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، میری عزیز از جان اور میں۔ وہ اس قدر حسین و جمیل اور پیاری تھی۔ اس نے اشارہ کیا جس سے مجھے سمجھ آئی کہ "انتظار کرو" اور کھڑکی بند کر دی۔

ابھی شام میں خاصا وقت تھا۔ میں خالی باغ میں دبیا درختوں اور انجیر زرد گلی کے حسن پر مرعوب امید کے عالم میں کھڑا رہا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ شکورے آئی۔ اس کا لباس گھر کی کسی خادمہ جیسا نہیں بلکہ اس کی بجائے گھر کی مالکہ جیسا تھا۔ ایک دوسرے کے قریب آئے بغیر ہم انجیر کے درختوں کی آڑ میں چلے گئے۔

"سب کچھ منصوبے کے مطابق ہو رہا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ میں نے اسے وہ دستاویز دکھائی جو میں نے نائب قاضی سے حاصل کی تھی۔ "شکورے کو طلاق ہو چکی ہے۔ جہاں تک دوسرے مولوی کی بات ہے ——" میں کہنے والا تھا کہ "میں اسے لا دوں گا" لیکن اس کی بجائے میں کہہ اٹھا، "وہ آ رہا ہے۔ شکورے کو تیار رہنا چاہیے۔"

اپنے جوش و خروش میں وہ لگتا تھا کہ مجھے سب بتانے والی تھی کہ اس نے اور کیا کچھ بچایا تھا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اگر شادی اس قدر کھلے عام ہوئی۔" میں نے کہا، "تو حسن اور اس کے آدمیوں کو اس کی بھنک مل جائے گی، وہ گھر پر حملہ کر دیں گے، ہماری بے عزتی کریں گے، شادی کو منسوخ کروا دیں گے اور ہم اس سلسلے میں کچھ نہ کر پائیں گے۔ ہماری ساری کوششیں بیکار جائیں گی۔ ہمیں خود کو نہ صرف حسن اور اس کے باپ سے بلکہ اس شیطان سے بھی بچانا ہے جس نے انشٹے آفندی کا قتل کیا ہے۔ کیا تم خوف زدہ نہیں ہو؟"

"کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم خوف زدہ نہ ہوں؟" اس نے کہا اور رونے لگی۔

"تم کسی کو کوئی بات نہیں بتاؤ گی۔" میں نے کہا، "انشٹے کو رات کا سونے کا لباس پہنا دو، ان کا بستر بچھاؤ اور انہیں اس پر لٹا دو، کسی مردہ شخص کی طرح نہیں بلکہ یوں جیسے وہ بیمار ہوں۔ ان کے سرہانے گلاس اور دوا کی بوتلیں رکھ دینا اور کھڑکیاں بند کر دینا۔ خیال رکھنا کہ ان کے کمرے میں کوئی لیمپ نہ ہوں تاکہ وہ تقریب کے دوران شکورے کے سرپرست کا کردار ادا کر سکیں، ان کے بیمار باپ کا۔ بارات کا کوئی موقع نہیں ہے۔ تم آخری لمحے چند ایک ہمسایوں کو بلا سکتی ہو اور بس۔ جب تم انہیں دعوت دو تو کہنا کہ یہ انشٹے آفندی کی آخری خواہش ہے —— یہ کوئی خوشیوں بھری شادی نہیں ہو گی بلکہ اداس اور افسردہ۔ اگر ہم نے خود کو اس معاملے کے اس رخ سے نہ دیکھا تو ہم برباد ہو جائیں گے اور وہ تمہیں بھی سزا دیں گے۔ تم سمجھ گئی ہو نا؟"

اس نے روتے ہوئے سر ہلا دیا۔ اپنے سفید گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے میں نے کہا کہ میں گواہ لے کر جلدی ہی آجاؤں گا لیکن شکورے کو تیار رہنا چاہیے کہ اس کے بعد میں گھر کا مالک ہوں گا اور میں حجام کے پاس جا رہا تھا۔ اس سے پہلے اس سب کا مجھے خیال نہ آیا تھا۔ بات کرتے ہوئے خصوصیات میرے دماغ میں آتی گئیں اور بالکل جیسے میں وقتاً فوقتاً جنگوں میں محسوس کرتا تھا، مجھے یقین ہو گیا کہ میں خدا کا پیارا اور پسندیدہ بندہ تھا اور وہ میری حفاظت کر رہا تھا، یوں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ جب آپ یہ بھروسا محسوس کرتے ہیں، جو بھی دماغ میں آئے کرتے ہیں تو بے وجہ ان کی پیروی کر رہے ہوتے ہیں آپ کے عمل یا اقدام درست ثابت ہوتے ہیں۔

میں باقر حمر کے علاقے سے آگے شاہ زریں کی طرف قریبی علاقے کی پاکیزہ مسجد کے سیاہ داڑھی اور روشن چہرے والے مولوی صاحب کو ڈھونڈنے گیا۔ وہ ہاتھ میں جھاڑو لیے گرد آلود مسجد سے بے حیا کتوں کو بھگا رہے تھے۔ میں نے انہیں اپنی مشکل کے بارے میں بتایا۔ خدا کی مرضی سے میں نے بتایا کہ کیسے میرے انشتے کا وقت قریب تھا اور ان کی آخری خواہش کے مطابق مجھے ان کی بچی سے شادی کرنی تھی جسے استنبول کے قاضی کے فیصلے کے مطابق اپنے جنگ میں گمشدہ شوہر سے طلاق مل چکی تھی۔ مولوی نے اعتراض کیا کہ اسلامی قوانین کے مطابق ایک مطلقہ عورت کی دوبارہ شادی سے پہلے اس کا عدت گزارنا ضروری تھا۔ لیکن میں نے اس کے جواب میں بتایا کہ شکورے کا شوہر چار برس سے غائب تھا اور یوں اس کے حاملہ ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ میں نے جلدی سے مزید بتایا کہ استنبول کے قاضی نے آج ہی طلاق تفویض کرتے ہوئے اسے دوبارہ شادی کی اجازت دے دی تھی اور میں نے اسے تحریری دستاویز دکھائی۔

"عالی حضرت امام آفندی، آپ تسلی کر سکتے ہیں کہ شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں۔" میں نے کہا۔ کیے کہ اس سے خون کا رشتہ تھا لیکن خالہ زاد بہن ہونے سے شادی میں کوئی رکاوٹ نہ آتی تھی۔ اس کی پچھلی شادی منسوخ ہو چکی تھی اور ہمارے درمیان کوئی سماجی، مذہبی یا مالی اختلاف نہ تھا اور اگر وہ طلائی سکے کو قبول کر لیتا جو میں نے اس کو پیش کیا تھا، اگر وہ سب ہمسایوں کے سامنے ہونے والی شادی میں نکاح پڑھا دیتا تو وہ اس نیک بیوہ عورت کے بن باپ کے بچوں کے ساتھ خدا کی راہ میں نیکی کرتا۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا اسے حلوہ بادام اور خشک خوبانی والا پسند تھا؟

اسے پسند تھا لیکن اس کے دماغ پر ابھی تک دروازے کے سامنے بیٹھے کتوں کا خیال حاوی تھا۔ اس نے طلائی سکے لے لیے۔ اس نے کہا کہ وہ اپنا جبہ پہن کر، حلیہ درست کر کے اور دستار باندھ کر وقت پر نکاح پڑھانے پہنچ جائے گا۔ اس نے گھر کا رستہ پوچھا جو میں نے اسے بتا دیا۔

شادی چاہے کتنی ہی جلدی میں ہو رہی ہو — چاہے دلہا 12 برس تک اس کا خواب دیکھتا رہا ہو — اس کے اپنی پریشانیاں اور مسئلے بھلا دینا اور شادی سے پہلے شیو اور حجامت کے لیے خود کو حجام کے مہربان ہاتھوں اور شوخ چھیڑ چھاڑ کے سپرد کر دینے سے زیادہ فطری کیا ہوگا؟ حجام، جس کے پاس میں

لے گئے، بازار کے قریب تھا، اک سرائے کے ویران گھر کی گلی میں، جہاں میرے مرحوم انشے، میری خالہ اور حسین شکورے ہمارے بچپن کے بعد کے دنوں میں رہنے چلے گئے تھے۔ یہ وہی حجام تھا جس سے میرا سامنا پانچ روز قبل، میری واپسی کے پہلے روز ہوا تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو اس نے مجھے گلے لگایا اور جیسا کہ استنبول کا کوئی بھی اچھا حجام کرتا۔ یہ پوچھنے کی بجائے کہ پچھلے بارہ برس کہاں گئے تھے، ادھر ادھر کی تازہ ترین گپ شپ کرنے لگا، بات کو اس جگہ کے کنارے پر ختم کرتے ہوئے کہ جہاں ہم سب کو زندگی ناس بے معنی سفر کے اختتام پر جانا تھا۔

استاد حجام بوڑھا ہو چکا تھا۔ استرا وہ اپنے جھریوں بھرے ان ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا، جو میرے رخسار پر حرکت کرتے ہوئے کانپ رہے تھے۔ وہ مے نوشی کا عادی ہو چکا تھا اور اس نے ایک گلابی رنگت، بھرے ہونٹوں، سبز آنکھوں والا لڑکا شاگرد رکھ لیا تھا — جو اپنے استاد کو مرعوبیت سے دیکھتا تھا۔ بارہ برس پہلے کے مقابلے میں دکان صاف اور باترتیب تھی۔ لٹکے بیسن کو ابلتے پانی سے بھر کر جو ایک نئی زنجیر کے ساتھ چھت سے لٹک رہا تھا، اس نے احتیاط سے میرے بال دھوئے اور بیسن کے نیچے لگے ٹونٹے کے پانی سے میرا چہرہ صاف کیا۔ پرانے چوڑے بیسن جن کی جو قلعی کی گئی تھی، ان میں زنگ کا کوئی نشان نہ تھا۔ انگیٹھی صاف ستھری تھی اور عقیق کے دستے والے استرے چمکتے، وہ ایک بے داغ ریشمی صدری پہنے ہوئے تھا، جو وہ بارہ برس قبل پہننے سے گھن کھاتا تھا۔ میں نے سوچا، شاگرد نے، جو قد میں اپنی عمر سے بڑا اور دبلا پتلا تھا، دکان اور اس کے مالک کی صفائی اور ترتیب میں مدد کی تھی اور خود کو جھاگ بھری، گلاب کی مہک والی اور بھاپ دار شیو کی خوشی کے سپرد کر دیا۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ پایا کہ کیسے شادی کی کنوارے کے نہ صرف گھر میں خوش حالی اور زندگی لاتی تھی بلکہ اس کے کام اور اس کی دکان میں بھی۔

مجھے معلوم نہیں کہ کتنا وقت گزر گیا۔ میں اس انگیٹھی کی گرمی میں پگھل گیا جس نے چھوٹی سی دکان اور حجام کی ہنرمند انگلیوں کو گرمائش دی۔ زندگی نے آج مجھے سب سے بڑا تحفہ پیش کیا تھا، یوں جیسے مفت میں اور اس قدر مشکلوں کے بعد، اس پر میں اللہ تعالیٰ کے حضور شکر بجا لانا چاہتا تھا۔ مجھے یہ سوچتے ہوئے بڑا تجسس محسوس ہوا کہ اس کے اس جہان کا پراسرار توازن کس سے ابھرا تھا اور مجھے انشے کے لیے اداسی اور ترحم محسوس ہوا، جو اس گھر میں مردہ پڑے تھے جس کا کچھ دیر بعد میں مالک بننے والا تھا۔ میں اٹھنے کو تیار تھا جب حجام کی دکان کے دروازے پر جو ہمیشہ کھلا رہتا تھا، شور سنائی دیا: شوکت!

گھبراتے ہوئے لیکن اپنے معمول کی خود اعتمادی سے اس نے ایک رقعہ آگے بڑھایا۔ بولنے لگا قاتل اور بدترین کی توقع رکھتے ہوئے، رقعہ پڑھتے ہوئے میرا اندر جیسے سرد ہو گیا:

"اگر کوئی بارات نہیں آئے گی تو میں شادی نہیں کروں گی۔ شکورے۔"

شوکت کو بازو سے کھینچ کر میں نے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ میں شکورے کو یہ لکھ کر جواب دینا چاہتا، "مجھے تمہاری مرضی، میری محبوبا!" لیکن کسی ان پڑھ حجام کی دکان میں قلم دوات کا کیا کام تھا؟ یوں نپے تلے

انداز میں میں نے لڑکے کے کان میں سرگوشی کی: "ٹھیک ہے۔" ایک بار پھر سرگوشی میں میں نے اس سے
اس کے بابا کا حال پوچھا۔

"وہ سو رہے ہیں۔"

اب میں محسوس کر سکتا ہوں کہ شوکت، حجام اور حتیٰ کہ آپ بھی، میرے اور میرے انشتے کی موت
کے بارے میں مشکوک ہو گئے ہیں (شوکت کو یقیناً اور باتوں کا بھی شبہ ہے)۔ افسوس! میں نے اسے [illegible]
بوسہ دیا اور وہ ناخوش سا تیزی سے چلا گیا۔ شادی کے دوران، اپنے کسی تہوار کے سے کپڑوں میں وہ بچہ
رہا اور مجھے عداوت سے گھورتا رہا۔

چوں کہ شکورے کو اپنے بابا کے گھر سے رخصت نہیں ہونا تھا اور میں دلہا کے طور پر اس گھر میں
ہی منتقل ہو جاتا، بارات کی رسم صرف نام کی تھی۔ قدرتی طور پر میں اپنے امیر دوستوں اور رشتے داروں کو
تیار کرنے اور شکورے کے دروازے کے سامنے انہیں اپنے گھوڑوں پر انتظار کروانے کی حالت میں نہ تھا۔
پھر بھی میں نے اپنے بچپن کے دو دوستوں کو بلا لیا جن سے میں استنبول واپسی کے ان پانچ تھکے دنوں میں ملا
تھا (ایک میری طرح کا منشی بن چکا تھا اور دوسرا ایک حمام چلا رہا تھا)، اس کے ساتھ ساتھ اپنے
پیارے حجام کو جس کی آنکھیں میرے گیسوؤں اور حجامت کے دوران مجھے خوشیوں کی دعا دیتے نم ہو گئی تھیں۔ اپنے
سفید گھوڑے پر سوار ہو کر، جسے میں پچھلے دنوں سے استعمال کر رہا تھا، میں نے اپنی محبوبہ شکورے کے دروازے
پر یوں دستک دی جیسے میں اسے کسی دوسرے جہاں دوسری زندگی میں لے جانے کے لیے تیار تھا۔

خیریے کو جس نے دروازہ کھولا میں نے انعام بخشش دی۔ شکورے اپنے شوخ سرخ رنگ کے
شادی کے لباس میں اپنے سر سے پیروں تک پہنچتے گلابی دوپٹے کے ساتھ سسکیوں اور آہوں (ایک عورت
نے بچوں کو ڈانٹا)، چیخوں اور "خدا اس کی حفاظت کرے" کی پکاروں میں نمودار ہوئی اور خوب صورتی سے
اس دوسرے سفید گھوڑے پر سوار ہو گئی جو ہم اس کے لیے لائے تھے۔ جب ڈھول اور تیز زرنا پھپ جس کا
بندوبست حجام نے آخری لمحے میرے لیے کیا تھا، شادی کی دھن بجانے لگے، ہمارا بے چارہ سا مختصر و مفلس
مختصر جلوس اپنی راہ پر روانہ ہوا۔

جب ہمارے گھوڑے ٹہلنے لگے تو مجھے سمجھ آئی کہ شکورے نے اپنی معمول کی ذہانت کے ساتھ
اس نظارے کا انتظام شادی کی حفاظت کی خاطر کیا تھا۔ چاہے آخری لمحے ہی سہی، ہمارے جلوس نے پورے
آس پڑوس میں ہماری شادی کا اعلان کر دیا تھا اور یوں ہر کسی کی رضامندی حاصل کرتے ہوئے ہماری
شادی کے مستقبل کے اعتراضات کی راہ روک دی تھی۔ اس کے باوجود، یہ اعلان کرتے ہوئے کہ ہم شادی
کرنے والے تھے اور سب کے سامنے شادی..... یوں جیسے ہمارے دشمنوں، شکورے کے سابق شوہر
اس کے خاندان کو چیلنج کرتے ہوئے —— اس نے ہمارے معاملے کو مزید خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اگر میری بات
مانی جاتی تو میں اس شادی کو بالکل خفیہ طریقے سے کرتا، کسی ایک شخص کو بھی بتائے بغیر، شادی کا جشن منائے

بغیر، میں اس کا شوہر بننے کو پہلی ترجیح دیتا اور شادی کا دفاع بعد میں کرتا۔

میں اپنے داستانوں کے سے سفید گھوڑے پر سوار جلوس کے آگے آگے تھا اور جب ہم آس پڑوس سے گزرے، میں نے گھبراہٹ سے حسن اور اس کے ساتھیوں کو تلاش کیا جن کی مجھے توقع تھی کہ کسی ذیلی گلی یا تاریک صحن کے دروازے کے ساتھ گھات لگائے ہوں گے۔ میں نے غور کیا کہ کس طرح ہمسائے کے نوجوان، بوڑھے اور اجنبی رک گئے اور جو کچھ ہو رہا تھا، اسے پوری طرح سمجھے بغیر دروازوں پر کھڑے ہو کر ہاتھ ہلائے۔ چھوٹے سے بازار کے علاقے میں ہم بلا ارادہ داخل ہو گئے، میں نے جانا کہ شکورے نے مہارت سے خبر پھیلا دی تھی اور یہ کہ اس کی طلاق اور شادی دونوں آس پڑوس میں تیزی سے قبولیت حاصل کر رہے تھے۔ یہ پھل اور سبزی فروش کے جوش و خروش سے ظاہر تھا جو اپنی بہی، ناشپاتی، گاجریں اور سیب زیادہ دیر چھوڑے بغیر ہمارے ساتھ شامل ہو کر چند قدم چلا اور نعرہ لگایا: "سبحان اللہ، خدا تم دونوں کو قبول کرے" اور غم زدہ دکان دار کی مسکراہٹ سے اور نانبائی کی تحسین آمیز نگاہوں سے جو اپنے شاگرد سے برتنوں میں جمی تلچھٹ صاف کروا رہا تھا، پھر بھی کسی اچانک حملے کے خلاف چوکس رہتے ہوئے میں مضطرب تھا یا حتیٰ کہ کسی فحش کلامی کے لیے بھی۔ لیکن ہاتھ لیے میں پیسے مانگتے ان بچوں کے ہجوم کے شور و غل پر بالکل پریشان نہ تھا جو بازار سے نکلتے ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ میں کھڑکیوں، سلاخوں اور کواڑوں کے پیچھے سے جھانکتی عورتوں کی مسکراہٹیں دیکھ کر سمجھ گیا کہ ان بچوں کا پُرشور ہجوم ہماری حفاظت اور حمایت کر رہا تھا۔

جب میں نے اس سڑک پر نگاہ دوڑائی جس پر ہم آگے بڑھ رہے تھے اور اب شکر خدا کا واپس گھر کی طرف مڑ رہے تھے، میرا دل شکورے اور اس کے دکھ کے ساتھ تھا۔ دراصل یہ اس کی عین اپنے بابا کے قتل کے روز مجھ سے شادی کرنے کی بدنصیبی نہ تھی جس نے مجھے افسردہ کر دیا بلکہ یہ کہ شادی اس قدر سادہ اور کم مایہ تھی۔ میری پیاری شکورے تو نقرئی لگاموں اور سجی ہوئی زین والے گھوڑوں، سونے کی کشیدہ کاری والے ریشم اور سمور کی پوشاک میں ملبوس گھڑسواروں اور تحائف اور جہیز سے لدی سینکڑوں گاڑیوں کی مستحق تھی، وہ حق دار تھی کہ پاشاؤں کی بیٹیوں، سلاطین کی شہزادیوں اور حرم کی بوڑھی خواتین سے بھری گھوڑا گاڑیوں کا ایک جلوس اس کے عقب میں ہوتا۔ گزرے دنوں کی شان و شوکت کی باتیں کرتا، لیکن شکورے کی شادی میں تو چار کہار بھی نہ تھے جو سرخ ریشم کا خیمہ اس پر تانے رکھتے کہ جو امیر دوشیزاؤں کو کھوجتی نگاہوں سے بچانے کے لیے عام استعمال ہوتا تھا، اس صورت میں جلوس کے آگے شادی کی شمع اور پھل، سونے اور چاندی کے پتوں اور چمکائے گئے پتھروں سے بنی درخت کی صورت والی کوئی سجاوٹ اٹھائے ایک خادم بھی نہ تھا۔ شرمندگی سے زیادہ مجھے اداسی محسوس ہوئی کہ جس نے ہر مرتبہ جب ڈھول اور زرنا کا بجنا بند ہوا، میری آنکھیں نم کر دیں جب ہمارا جلوس بازار آنے جانے والے ہجوم یا چوک میں موجود فوارے سے پانی بھرتے خادموں میں پھنس کر رکا کیوں کہ یہ پکار کر ہمارا راستہ صاف کرنے والا کوئی نہ تھا کہ "دیکھو، دلہن آ رہی ہے۔" جب ہم اپنے گھر کے قریب پہنچے تو میں نے باگ موڑ کر اس کی طرف دیکھنے کی ہمت مجتمع کی اور اس

کے دلہنوں کے گلابی جھلمل کرتے دوپٹے اور سرخ نقاب تلے یہ دیکھ کر پرسکون ہوا کہ ان تمام قابلِ ترس کمی یا خامیوں پر اداس ہونے کی بجائے وہ یہ جان کر خاصی حوصلہ افزا دکھائی دیتی تھی کہ ہمارا جلوس مکمل ہوا تھا اور ہمارے سفر کا خاتمہ بغیر کسی ناگوار حادثے یا ناگہانی کے ہو گیا تھا۔ سو سب دلہا کی طرح، میں نے اپنی خوب صورت دلہن کو گھوڑے سے اتارا، جس سے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے شادی کی تھی، اس کا بازو تھاما اور مٹھیاں بھر بھر کر اس کے سر پر سے چاندی کے سکے نچھاور کرتے ہوئے خوش باش ہجوم کی طرف لٹاتے اور ہتھیلی کو خالی کر دیا۔ جب وہ بچے جو ہمارے چھوٹے سے جلوس کا پیچھا کر رہے تھے، سکے لوٹنے جمع ہوئے تو شکورے اور میں صحن میں داخل ہو گئے، پتھریلے راستے کو عبور کیا اور جیسے ہی ہم گھر میں داخل ہوئے، ہمارا سامنا نہ صرف گرمی سے ہوا بلکہ تعفن کی بو کی دہشت سے بھی۔

جب جلوس کا اژدحام گھر میں جمع تھا اور شکورے اور ہجوم میں شامل بڑے، عورتیں اور بچے (اور حسن ایک گوشے میں مجھے شک بھری نگاہوں سے گھور رہا تھا) یوں ظاہر کرتے رہے جیسے کچھ بھی غلط نہ تھا، لمحے بھر کو مجھے اپنی حیا پر شک ہوا لیکن مجھے معلوم تھا کہ جنگ کے بعد کیسے لاشیں دھوپ میں چھوڑ دی جاتی ہیں، ان کے کپڑے چیتھڑوں میں، جوتے اور کمر بند چرا لیے جاتے ہیں اور ان کے چہرے، آنکھیں اور ہونٹ بھیڑیوں کے کھائے ہوئے اور کتے بو سونگھتے پھرتے ہیں۔ یہ وہی بو تھی جو اکثر میرے منہ اور پھیپھڑوں کو دم گھونٹنے کی حد تک بھر دیتی، میں اسے پہچاننے میں غلطی نہ کر سکتا تھا۔

نچلی منزل پر باورچی خانے میں، میں نے ہیریے سے انشتے آفندی کی میت کے بارے میں پوچھا، اس بات سے باخبر کہ گھر کے مالک کی حیثیت سے میں اس سے بات کر رہا تھا۔

"جیسا کہ آپ نے کہا تھا، ہم نے ان کا بستر بچھایا، ان کو سونے کا لباس پہنایا، ان پر ان کا کمبل ڈالا اور دوا کی بوتلیں ان کے سرہانے رکھ دی تھیں۔ اگر ان سے کوئی ناخوش گوار بو اٹھ رہی ہے تو یہ تانبا کمرے میں موجود انگیٹھی کی حرارت کے سبب ہے۔" اس عورت نے آنسو بہاتے ہوئے بتایا۔

اس کی آنکھوں سے ایک دو آنسو اس برتن میں جا گرے جس میں وہ بکرے کا گوشت بھون رہی تھی۔ وہ جس طرح سے رو رہی تھی، مجھے خیال ہوا کہ انشتے آفندی اس سے کچھ زیادہ ہی قربت رکھتے رہے تھے۔ استھر نے، جو خاموشی اور فخر سے باورچی خانے کے ایک کونے میں بیٹھی تھی، جو کچھ بھی چبا رہی تھی، اسے نگلا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اس کی خوشی کو اپنی اولین فکر بناؤ۔" وہ بولی، "اس کی قدر پہچانو۔"

اپنے خیالوں میں میں نے بانسری کی وہ صدا سنی جو میں نے استنبول آنے کے پہلے روز سنی تھی۔ اداسی سے زیادہ اس کی دھن میں زندگی کی تاثیر تھی۔ میں نے موسیقی کی وہ دھن بعد میں دوبارہ سنی تھی، اسی نیم تاریک کمرے میں جہاں میرے انشتے اپنے سونے کے سفید لباس میں لیٹے تھے، جب امام آفندی نے ہمارا نکاح پڑھوایا۔

چوں کہ تجریے نے پہلے ہی چوری چھپے کرا کھول دیا تھا اور ایک کونے میں لیمپ جلا دیا تھا جس کی روشنی مدھم تھی، اس لیے شاید ہی کوئی کہہ سکتا کہ میرے انشتے بیمار تھے یا کہ مردہ۔ یوں انھوں نے تقریب کے دوران شکورے کے قانونی سرپرست کا کردار نبھایا۔ میرے دوست حجام نے ہمسائے کے ایک ہرفن مولا بزرگ کے ساتھ نکاح کی گواہی دی۔ پُرامید مبارک کے ساتھ تقریب کے اختتام اور مولوی کی نصیحت اور تمام حاضرین کی دعاؤں سے پہلے، میرے انشتے کی صحت کے بارے میں فکرمند ایک بڑی سی ناک والا بوڑھا، اپنا شک بھرا سر مرحوم کی طرف جھکانے ہی والا تھا، لیکن جیسے ہی مولوی نے نکاح پڑھوا دیا، میں اچھل کر کھڑا ہوا، اپنے انشتے کا سخت اکڑا ہوا ہاتھ تھاما اور با آواز بلند بولا:

"میرے پیارے انشتے، اپنی پریشانیاں بھول جائیں۔ شکورے اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے مجھ سے جو کچھ ہو سکا، میں کروں گا، یہ کہ ان کے لباس اور خوراک کا خیال رکھوں، انھیں محبت دوں اور مسئلوں سے بچاؤں گا۔"

اس کے بعد، یہ تاثر دینے کی خاطر کہ میرے انشتے اپنے بستر مرگ پر مجھ سے سرگوشی میں کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے، میں نے احتیاط اور احترام سے اپنا کان ان کے منہ سے لگا دیا اور یوں ظاہر کیا جیسے میں آنکھیں کھول کر توجہ سے ان کو سن رہا تھا، جیسا کوئی نوجوان اس وقت کرتا ہے جب اس کا کوئی قابل احترام بڑا بزرگ اپنی عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ ایک دو الفاظ میں نصیحت کی صورت اسے بتانے کی کوشش کرتا ہے، ایسی نصیحت جو پھر اس میں کسی جادوئی اکسیر کی طرح سرایت کر جاتی ہے۔ امام آفندی اور ہمسایہ بزرگ میری اس تابع داری اور ابدی اخلاص کی تعریف میں اٹھ کھڑے ہوئے جو میں نے اپنے سسر کو پیش کیے تھے۔ مجھے امید ہے کہ اب مزید کسی کا خیال نہیں کہ اس قتل میں میرا ہاتھ تھا۔

ابھی تک کمرے میں موجود شادی کے مہمانوں کے سامنے میں نے اعلان کیا کہ بیمار شخص کی خواہش تھی کہ اسے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ وہ فوراً ہی وہاں سے دوسرے کمرے میں چلے گئے جہاں آدمی قیمے کے بنے پلاؤ اور گوشت سے دعوت اڑانے کے لیے جمع تھے (اس موقع پر جنگلی پودینے، زیرے اور بھنی ہوئی بھیڑ کی مہک اور لاش کے تعفن میں میں بہ مشکل ہی فرق کر سکتا تھا)۔ میں چوڑی راہداری میں داخل ہوا اور اپنے ہی گھر میں غور و فکر کرتے اور غیر حاضر دماغی سے گھومتے کسی زود رنج بوڑھے کی طرح، میں نے تجریے کے کمرے کا دروازہ کھولا اور اپنے درمیان کسی غیر مرد کو پا کر دہشت زدہ عورتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اور محبت سے شکورے کو دیکھتے ہوئے جس کی آنکھیں مجھے دیکھ کر خوشی سے چمک اٹھی تھیں، بولا:

"تمہارے بابا تمہیں بلا رہے ہیں شکورے۔ اب ہماری شادی ہو چکی ہے، تمہیں ان کے ہاتھ کو بوسہ دینا چاہیے۔"

چند ایک ہمسائے کی عورتیں جنھیں شکورے نے آخری لمحے میں دعوت دی تھی اور نوجوان لڑکیاں جو میرے خیال میں رشتے دار تھیں، خود کو سنبھالنے اور اپنے چہروں پر نقاب ڈالنے لگیں۔ اس دوران

جی بھر کر وہ میرا جائزہ بھی لیتی رہیں۔

نمازِ مغرب کے ساتھ ہی اخروٹ، بادام، میووں اور مٹھائی سے خوب حصہ بنا کر مہمان جانے لگے۔ زنانہ حصے میں شکورے کے مسلسل رونے دھونے اور ضدی بچوں کی چیخ و پکار نے ساری خوشیوں کو ماند کر دیا تھا۔ مردانے میں، ہمسایوں کے شب عروسی کے بارے میں مذاق اور دل لگی کے جواب میں میرے پتھریلے چہرے کی خاموشی کو میرے سر کی بیماری سے منسوب کیا گیا۔ اس ساری پریشانی میں وہ منظر جو میری یادداشت پر سب سے زیادہ نقش رہا، وہ تھارات کے کھانے سے پہلے میرا شکورے کو نشستے کے کمرے میں لے جانا۔ آخر کار ہم تنہا تھے۔ جب ہم دونوں مردہ شخص کا سرد اور اکڑا ہوا ہاتھ اخلاص بھرے احترام سے چوم چکے تو ہم کمرے کے ایک تاریک گوشے میں چلے گئے اور ایک دوسرے کو بوسہ دیا، یوں جیسے شدید پیاس سے جاں بلب ہوں۔ میں ان مٹھائیوں کا ذائقہ محسوس کر سکتا تھا جو بچوں نے خوب حرص سے کھائی تھیں۔

میں، شکورے

ہماری غم زدہ شادی کی آخری مہمانوں نے اپنے نقاب اوڑھے اور جوتے پہنے، اپنے بچوں کو گھسیٹا جو مٹھائی کے آخری ٹکڑے اپنے منہ میں ڈال رہے تھے اور ہمیں اس بڑھتی ہوئی خاموشی میں چھوڑ کر چلی گئیں۔ ہم سب صحن میں تھے، آدھی بھری بالٹی سے پانی پیتی چڑیوں کے مدھم شور کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ یہ چڑیا جس کے ننھے پر پتھر کے تندور کی روشنی میں چمک رہے تھے، اچانک تاریکی میں غائب ہوگئی اور مجھے ہمارے خالی گھر میں اپنے بابا کے بستر میں ایک لاش کی مسلسل موجودگی محسوس ہوئی، خالی گھر جسے اب رات نے نگل لیا تھا۔

''بچو۔'' میں نے اس لہجے میں کہا جس سے اور حان اور شوکت فوراً جان جاتے تھے کہ میں کچھ بتانے کو تھی: ''یہاں آؤ، دونوں۔''

وہ آ گئے۔

''قمرو اب تمہارے بابا ہیں۔ آؤ ان کی دست بوسی کرو۔''

انہوں نے خاموشی اور تمیز سے ایسا ہی کیا۔ ''یہ کسی باپ کے سائے کے بغیر پروان چڑھے ہیں، اس لیے میرے بدنصیب بچے، باپ کی فرمانبرداری، اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کی بات سننے اور اس پر اعتبار کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' میں نے قمرو سے کہا: ''اس طرح اگر وہ تم سے برا، بچگانہ، بدتمیز رویہ اختیار کریں تو میں جانتی ہوں کہ تم ان سے پہلے تحمل کا برتاؤ کرو گے، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ اپنے اس باپ کی فرمانبرداری کے بغیر پروان چڑھے ہیں، جو انہیں یاد بھی نہیں۔''

''مجھے اپنے بابا یاد ہیں۔'' شوکت بولا۔

''بحث ــــ اور سنو۔'' میں نے کہا: ''اب سے قمرو کی بات میری بات سے بھی زیادہ اہم ہوگی۔''
میں قمرو کی طرف مڑی: ''اگر یہ تمہاری بات نہ سنیں، اگر یہ نافرمان ہوں یا ذرا سی بھی بدتمیزی، سرکشی یا بدسلوکی دکھائیں، پہلے انہیں تنبیہ کرنا لیکن انہیں معاف کر دینا۔'' میں نے مار پٹائی کا ذکر روکتے ہوئے کہا جو میری زبان کی نوک پر تھا۔ ''میری تمہارے دل میں جتنی بھی جگہ ہے، یہ بھی اتنی ہی جگہ رکھیں گے۔''

"میں نے صرف تمہارا شوہر بننے کے لیے تم سے شادی نہیں کی۔" قرہ نے کہا۔ "بلکہ ان پیارے بچوں کا باپ بننے کے لیے بھی کی ہے۔"

"کیا تم دونوں نے سن لیا؟"

"اے میرے خدا، میری دعا ہے کہ تیری روشنی اور رحمت ہم سے کبھی خفا نہ ہو۔" ایک کونے سے نخریے نے مداخلت کی۔ "میرے پیارے خدا، میری دعا ہے کہ تو ہماری نگہبانی کرے، میرے خدا۔"

"سنا تم دونوں نے، ہے ناں؟" میں نے کہا۔ "تمہارے لیے اچھا ہے، میرے خوب صورت نوجوانو۔ تمہارے یہ بابا تم سے اتنی محبت کرتے ہیں، اس لیے اگر تم اچانک خود پر قابو کھو دو گے اور ان کے الفاظ کا مان نہ رکھو گے تو وہ تمہیں اس کے لیے پہلے ہی معاف کر چکے ہیں۔"

"اور میں انہیں بعد میں بھی معاف کر دوں گا۔" قرہ نے کہا۔

"لیکن اگر تم نے ان کی تنبیہ سے تیسری بار انکار کیا...... تو پھر انہیں مارنے پیٹنے کا حق حاصل ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا سب سمجھ گئے؟ تمہارے نئے بابا قرہ بدترین اور بے رحم جنگوں میں سے ایک سے واپس آئے ہیں، ان جنگوں میں جو خدا کا غضب تھیں اور جن سے تمہارے مرحوم بابا واپس نہ آ سکے۔ ہاں یہ ایک سخت کوش بے حس آدمی ہیں۔ تمہارے نانا نے تمہیں لاڈ پیار سے بگاڑ دیا ہے۔ تمہارے نانا اب بہت بیمار ہیں۔"

"میں ان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔" شوکت نے کہا۔

"اگر تم بات نہیں مانو گے تو قرہ تمہیں بتائے گا کہ [illegible] ہوتی کیا ہے۔ تمہارے نانا تمہیں قرہ سے اس طرح نہیں بچا پائیں گے جیسے وہ تمہیں مجھ سے بچا لیتے تھے۔ اگر تم اپنے بابا کے غصے کا شکار بننا نہیں چاہتے تو تمہیں چاہیے کہ اب لڑنا مت، تمہیں ہر چیز بانٹنی ہوگی، جھوٹ نہیں بولنا ہوگا، نماز پڑھنی ہوگی، اپنا سبق یاد کر کے سونا ہوگا اور تم نخریے سے بدتمیزی سے بات کرو گے نہ اسے تنگ کرو گے...... سمجھ گئے؟"

اچانک قرہ جھکا اور رحان کو اپنی بانہوں میں اٹھا لیا۔ شوکت فاصلے پر رہا۔ میرا جی اسے گلے لگا کر آنسو بہانے کو چاہا۔ میرا بے چارہ، تنہا اور بن باپ کا بیٹا، میرا بے چارہ اکیلا شوکت، تم اتنی بڑی دنیا میں اس قدر اکیلے ہو۔ میں خود کو ایک چھوٹا بچہ خیال کیا، شوکت کی طرح، دنیا میں بالکل اکیلا بچہ اور مجھے یاد آیا کہ کیسے کبھی میں اپنے بابا کی بانہوں میں ہوتی تھی جس طرح اب قرہ نے اور رحان کو لے رکھا تھا۔ لیکن اور رحان کے برعکس میں اپنے بابا کی گود میں پریشان نہ تھی، اپنے درخت سے ٹوٹا سا کسی پھل کی طرح۔ میں خوش تھی، مجھے یاد آیا کہ کیسے میں اور بابا ایک دوسرے کے گلے لگتے اور ایک دوسرے کی خوشبو سونگھتے تھے۔ میرے آنسو بہنے کو تھے لیکن میں نے خود پر قابو پا لیا۔ اگرچہ میں نے ایسا کچھ کہنے کا سوچا تو نہیں تھا لیکن میں بولی:

"اب آؤ، سنتے ہیں کہ تم قرہ کو کیسے "بابا" کہتے ہو۔"

رات بے حد سرد تھی اور ہمارے صحن میں بہت خاموشی تھی۔ فاصلے پر کتے دردمندی اور غم

دی سے جھونک رہے تھے۔ چند منٹ اور گزر گئے۔ خاموشی مکمل اٹھی اور کسی سیاہ پھول کی طرح چپکے سے چاروں طرف پھیل گئی۔

''ٹھیک ہے بچو۔'' میں نے خاصی دیر بعد کہا، ''آؤ اندر چلیں، کہیں ہمیں باہر سردی نہ لگ جائے۔''

وہ صرف میں اور قریبی نہیں تھے جنہوں نے ان دلہا دلہن کی سی جھجک محسوس کی جو شادی کے بعد اب تنہا تھے بلکہ خیر یے اور بچے بھی۔ ہم سب ہی گھر میں اس طرح جھجکتے ہوئے داخل ہوئے جیسے وہ کسی اجنبی کا تاریک سا گھر ہو۔ گھر میں ہمیں میرے بابا کی لاش کی بُو محسوس ہوئی، لیکن بظاہر کوئی اس سے واقف نہ تھا۔ ہم خاموشی سے سیڑھیاں چڑھے اور تیل کے لیمپ سے بننے والے ہمارے سائے چھت پر پڑے، ہمیشہ کی طرح گھومتے اور ایک دوسرے میں ملے جلے، ابھی پھیلتے ابھی سکڑتے ہوئے۔ پھر بھی یوں لگتا تھا جیسے پہلی بار ایسا ہو رہا ہو۔ اوپر جب ہم دیوان خانے میں جوتے اتار رہے تھے، شوکت بولا: ''سونے سے پہلے کیا میں نانا کے ہاتھ کو بوسہ دے سکتا ہوں؟''

''میں نے ابھی انہیں جا کر دیکھا تھا۔'' خیر یے نے کہا، ''تمہارے نانا اتنی تکلیف اور بے آرامی میں ہیں کہ صاف ظاہر ہے کہ بدروحیں ان کا تعاقب کر رہی ہیں۔ بیماری کا بخار انہیں کھا رہا ہے۔ اپنے کمرے میں چلو تاکہ میں تمہارا بستر تیار کروں۔''

خیر یے اسے ہانک کر کمرے میں لے گئی۔ بستر لگاتے اور اس پر چادریں اور کمبل رکھتے، وہ یوں بات کرتی رہی جیسے اس کے ہاتھ میں موجود ہر شے دنیا کا منفرد عجوبہ ہو اور بڑبڑاتی رہی کہ کیسے یہاں اس گرم کمرے میں صاف چادروں اور گرم کمبلوں میں سونا کسی سلطان کے محل میں رات بسر کرنے جیسا ہوگا۔

''خیر یے ہمیں کہانی سناؤ۔'' اورحان نے رفع حاجت کے لیے بیٹھتے کہا۔

''ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک نیلا آدمی تھا۔'' خیر یے کہنے لگی، ''اور اس کا سب سے قریبی ساتھی ایک جن تھا۔''

''آدمی نیلا کیوں تھا؟'' اورحان نے پوچھا۔

''خدا کے واسطے خیر یے۔'' میں نے کہا، ''کم سے کم آج رات تو جنوں بھوتوں کی کوئی کہانی مت سناؤ۔''

''کیوں نہ سنائے؟'' شوکت بولا، ''ماں، ہمارے سونے کے بعد کیا تم بستر سے اُٹھ کر نانا کے پاس بھی جاؤ گی؟''

''تمہارے نانا، خدا ان کی حفاظت کرے، بہت بیمار ہیں۔'' میں نے کہا، ''یقیناً میں رات کو ان کی دیکھ بھال کے لیے ان کے سرہانے جاؤں گی۔ لیکن پھر میں واپس آ جاؤں گی۔ ٹھیک؟''

''خیر یے سے کہیں کہ نانا کا خیال رکھے۔'' شوکت نے کہا، ''کیا ویسے بھی رات کو خیر یے ہی

میرے نانا کا خیال نہیں رکھتی؟"

"کیا تم فارغ ہو گئے ہو؟" ثمیرے نے اور حان سے پوچھا۔ اس نے گیلے کپڑے سے اور حان کو صاف کیا جس کے چہرے پر غنودگی سی تھی۔ اس نے پیشاب دان دیکھا اور اس کا منہ بن گیا ہو جیسے کی وجہ سے نہیں بلکہ یوں جیسے اسے وہ کافی نہ لگا ہو۔

"ثمیرے۔" میں نے کہا، "اسے خالی کر کے واپس آؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ شوکت آدھی رات کو کمرے سے باہر نکلے۔"

"مجھے کمرے سے باہر کیوں نہیں نکلنا چاہیے؟" شوکت نے پوچھا، "ثمیرے کو ہمیں جنوں اور پریوں کی کہانی کیوں نہیں سنانی چاہیے؟"

"کیوں کہ گھر میں جن ہیں، بے وقوف۔" اور حان نے کہا، خوف سے نہیں بلکہ اس بے زبان خوش امیدی سے جو میں ہمیشہ اس کے تاثرات میں اس کے فارغ ہونے کے بعد دیکھتی تھی۔

"ماں، کیا یہاں جن ہیں؟"

"اگر تم کمرے سے نکلے، اگر تم نے اپنے نانا سے ملنے کی کوشش کی، جن تمہیں پکڑ لیں گے۔"

"تو وہ پا نانا کہاں بیٹھے گا؟" شوکت نے پوچھا، "وہ آج رات کہاں سوئے گا؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" میں نے کہا، "ثمیرے اس کا بستر تیار کرے گی۔"

"ماں آپ اب بھی ہمارے ساتھ سوئیں گی، ہے ناں؟" شوکت نے پوچھا۔

"مجھے تمہیں کتنی بار بتانا پڑے گا؟ پہلے کی طرح تم دونوں کے ساتھ ہی سوؤں گی۔"

"ہمیشہ؟"

ثمیرے باہر نکل گئی۔ الماری سے، جہاں میں نے انہیں چھپا رکھا تھا، میں نے باقی تصویریں نکالیں جو، معلوم تھا کل پیچھے چھوڑ گیا تھا اور بستر پر بیٹھ گئی۔ شمع کی روشنی میں، میں ان کا راز سمجھنے کی کوشش میں دیر تک انہیں گھورتی رہی۔ یہ تصویریں اس قدر خوب صورت تھیں کہ آپ کو ان پر اپنی بھولی بسری یادوں کا شبہ ہونے لگتا تھا اور جب آپ انہیں متن یا تحریر کے ساتھ دیکھتے تو وہ بولنے لگتی تھیں۔

میں ان تصویروں میں کھو گئی۔ اور حان کے خوب صورت بالوں کی خوشبو جس پر میں نے اپنی ناک رکھی تھی، مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھی اس عجیب اور مشکوک مرغ کو دیکھ رہا تھا۔ جیسا کہ کبھی کبھار ہوتا تھا، مجھے آرزو ہوئی کہ اسے دودھ پلاؤں۔ بعد میں، جب وہ موت کی وحشت خیز تصویر دیکھ کر ڈر گیا اور اپنے سرخ ہونٹوں سے گہرے سانس لینے لگا تو میرا اچانک جی چاہا کہ اسے کھا جاؤں۔

"میں تمہیں کھا جاؤں گی، سمجھے تم؟"

"ماں، مجھے گدگدی کرو۔" اس نے کہا اور مجھ پر گر گیا۔

"اٹھو، اٹھو میرے اوپر سے۔" میں چلائی اور اسے تھپڑ دے مارا۔ وہ تصویروں کے پاس گرا

پھر میں نے تصویروں کو دیکھا، بظاہر انہیں کوئی نقصان نہ ہوا تھا۔ سب سے اوپر والی تصویر میں گھوڑے کے پیٹ میں ہلکی سی سلوٹیں تھیں۔

پھر یہ خالی پیشاب دان لے کر اندر آئی۔ میں نے تصویریں اٹھائی تھیں اور کمرے سے نکلنے والی تھی جب شوکت چیخ پڑا: "ماں؟ کہاں جا رہی ہو؟"

"میں آتی ہوں واپس۔"

میں نے سرور اور راہداری کو عبور کیا۔ قمرو میرے بابا کی خالی مسند کے سامنے بیٹھا تھا، اسی حالت میں جس میں اس نے ان کے ساتھ مصوری پر بات کرتے چار روز گزارے تھے۔

میں نے تصویریں اس کے سامنے کشتی اور فرش پر پھیلا دیں۔ رنگ نے اچانک شمع سے روشن کمرے کو گرمی اور ایک حیران کن زندہ دلی سے بھر دیا، یوں جیسے ہر شے حرکت میں آ گئی ہو۔

ہم خاموشی اور احترام سے بالکل ساکت دیر تک تصویریں دیکھتے رہے۔ جب ہم ذرا بھی حرکت کرتے، ساکت ہوا جس میں وحشت پیدا کرنے سے آتی موت کی بو تھی، شمع کی لو کو پھڑپھڑا دیتی اور میرے بابا کی پراسرار تصویریں بھی حرکت کرتی نظر آنے لگتیں۔ کیا وہ تصویریں میرے لیے اس لیے اتنی اہمیت اختیار کر گئی تھیں کہ وہ میرے بابا کی موت کا سبب تھیں؟ کیا میں گھوڑے کے انوکھے پن یا سرخ کی افراط کے باعث مسحور تھی، درخت کی بدحالی سے یا دو درویشوں کی اداسی سے؟ یا کیا مجھے اس قاتل کا ڈر تھا جس نے میرے بابا اور شاید دو دوسروں کو ان تصویروں کے سبب پر قتل کیا تھا؟ کچھ دیر بعد قمرو اور میں پوری طرح جان گئے کہ ہمارے درمیان خاموشی جہاں ان تصویروں کے باعث تھی، وہیں اس لیے بھی کہ ہم ہماری شادی کی اولیں رات ایک ہی کمرے میں تنہا تھے۔ ہم دونوں یہ جانتے تھے۔

"جب کل صبح ہم جائیں گے تو ہمیں سب کو بتا دینا چاہیے کہ میرے بے چارے بابا اپنی نیند میں ہی وفات پا گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ اگرچہ میں نے جو کہا وہ درست تھا لیکن یوں لگا جیسے میں [illegible] ہو رہی تھی۔

"صبح سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" قمرو نے اسی مخصوص انداز میں کہا، جو کچھ اس نے کہا تھا وہ خود اس کی سچائی پر یقین کرنے کے ناقابل تھا۔

جب اس نے مجھے قریب کرنے کا تقریباً غیر محسوس سا اشارہ دیا، مجھے اسے گلے لگا لینے کی خواہش ہوئی اور ویسا کرنے کی جیسا کہ میں اپنے بچوں کے ساتھ کرتی تھی۔ اس کا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لینے کی۔

عین اسی لمحے میں نے بابا کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور دہشت سے اچھل کر کھڑے ہوتے ہوئے، میں بھاگ کر گئی، ہمارا دروازہ کھولا اور باہر جھانکا: راہداری میں چھن کر آنے والی روشنی میں، میں اپنے بابا کے کمرے کا دروازہ نیم وا دیکھ کر رہ گئی۔ میں نے برفیلی راہداری میں قدم رکھا۔ ابھی تک جلتی انگیٹھی کے گرم میرے بابا کا کمرہ جس سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ کیا شوکت یا کوئی اور یہاں آیا تھا؟ ان کا جسم،

رات کے لباس میں ملبوس، انگیٹھی کی مدھم روشنی میں نہایا ہوا سکون سے پڑا تھا۔ مجھے یاد آیا کیسے کبھی راتوں کو میں کہا کرتی تھی، "شب بخیر پیارے بابا۔" جب وہ سونے سے پہلے شمع کی روشنی میں "ہادی الارواح" پڑھ رہے ہوتے تھے۔ ہلکے سے اٹھتے ہوئے وہ میرے ہاتھ سے گلاس لیتے اور کہتے "پانی لانے والی کو خدا کبھی کوئی طلب نہ دے۔" میرے دونوں رخساروں پر بوسہ دیتے اور میری آنکھوں میں جھانکتے سے پہلے جیسا کہ وہ تب کیا کرتے تھے جب میں بچی تھی۔ میں نے پیچھے اپنے بابا کے وحشت انگیز چہرے کو دیکھا اور مختصر یہ کہ میں خوف زدہ تھی۔ میں ان کی جانب دیکھنے سے گریزاں تھی جب کہ اسی دوران شیطان کے زیر اثر میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کس قدر ڈراؤنے بن چکے تھے۔

میں جھجکتے ہوئے اس نیلے دروازے والے کمرے میں لوٹ آئی جہاں قرہ نے میری جانب پیش قدمی کی۔ میں نے غصے سے زیادہ بے خیالی میں اسے دور دھکیل دیا۔ شمع کی تھرتھراتی روشنی میں ہم نے جدوجہد کی، اگرچہ وہ واقعی جدوجہد نہیں بلکہ اس کی نقل تھی۔ ہم ایک دوسرے سے ٹکرا کر، ایک دوسرے کی بانہوں، ٹانگوں اور سینوں کو چھو کر لطف لے رہے تھے۔ مجھے جو الجھن محسوس ہوئی وہ اس جذباتی کیفیت سے ملتی جلتی تھی جسے نظامی نے خسرو اور شیریں سے متعلق بیان کیا تھا: کیا قرہ جس نے نظامی کو اتنی تفصیل سے پڑھا تھا، محسوس کر سکتا تھا کہ شیریں کی طرح جب میں نے کہا کہ "اتنی شدت سے بوسہ دے کر مجھے تکلیف نہ دو" تو اس کا مطلب تھا کہ "جاری رکھو"؟

"میں تمہارے قریب آنے سے انکار کرتی ہوں جب تک کہ تمہیں وہ شیطان صفت مل نہیں جاتا، جب تک کہ میرے بابا کا قاتل پکڑا نہیں جاتا۔" میں نے

کمرے سے نکلتے ہوئے مجھ پر خجالت طاری تھی۔ میں اتنی تیز آواز میں بولی تھی کہ ضرور لگا ہوگا کہ بچے اور خیریہ میری کہی بات سن لیں ـــ شاید حتیٰ کہ میرے بے چارے بابا اور میرا مرحوم شوہر، جس کا بدن عرصہ ہوا گل سڑ کر خاک ہو چکا تھا، کون جانے زمین کے کس بنجر اور ویران علاقے میں۔

جیسے ہی میں بچوں کے پاس واپس پہنچی، اورحان بولا، "ماں، شوکت باہر ابدارّی میں گیا تھا۔"

"کیا تم باہر گئے تھے؟" میں نے پوچھا اور یوں آگے بڑھی جیسے اسے تھپڑ لگانے کو تھی۔

"خیریہ۔" شوکت نے کہا اور بھاگ کر اس کے گلے جا لگا۔

"یہ باہر نہیں گیا۔" خیریہ نے کہا، "یہ سارا وقت کمرے میں ہی تھا۔"

میں کھسیا سی گئی اور اس کی آنکھوں میں نہ جھانک پائی۔ میں جان گئی کہ میرے بابا کی وفات کے اعلان کے بعد بچے خیریہ میں پناہ ڈھونڈیں گے، اسے ہمارے سارے راز بتائیں گے اور یہ ہیچ خادمہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھ پر غالب آنے کی کوشش کرے گی۔ وہ اسی پر بس نہیں کرے گی بلکہ میرے بابا کے قتل کی ذمہ داری مجھ پر ڈالنے کی کوشش کرے گی، پھر وہ بچوں کی سرپرستی حسن کو منتقل کر دے گی! ہاں، بے شک وہ ایسا ہی کرے گی! یہ ساری بے شرم منصوبہ بندی، کیوں کہ وہ بابا کی قربت میں رہی

ہے۔ خدا انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے! مجھے آپ سے یہ سب مزید کیوں چھپانا چاہیے؟" وہ در حقیقت یقیناً یہی کر رہی تھی۔ میں نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ پھر میں نے شوکت کو گود میں اٹھایا اور چوم لیا۔

"میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ شوکت راہداری میں گیا تھا۔" اورحان نے کہا۔

"بستر میں آؤ تم دونوں۔ مجھے اپنے درمیان میں آنے دو تا کہ میں تمہیں لمبی دم والے گیدڑ اور کالے سیاہ جن کی کہانی سناؤں۔"

"لیکن آپ نے خیریے سے کہا تھا کہ ہمیں جنوں کی کہانی نہ سنائے۔" شوکت نے کہا، "خیریے آج رات ہمیں کہانی کیوں نہیں سنا سکتی؟"

"کیا وہ "لاوارث شہر" جائیں گے؟" اورحان نے پوچھا۔

"ہاں، وہ جائیں گے!" میں نے کہا، "اس شہر میں کسی بچے کے ماں باپ نہیں۔ خیریے نیچے جاؤ اور دروازے ایک بار پھر دیکھ لو۔ ہم شاید کہانی کے درمیان ہی سو جائیں گے۔"

"میں نہیں سوؤں گا۔" اورحان بولا۔

"آج رات قرہ کہاں سوئے گا؟" شوکت نے پوچھا۔

"کتاب خانے میں۔" میں نے کہا، "وہاں سے چپٹ جاؤ تا کہ ہم کمبل کے نیچے خوب گرم ہو سکیں۔ یہ کس کے برف جیسے ٹھنڈے پیر ہیں؟"

"میرے۔" شوکت بولا، "خیریے کہاں سوئے گی؟"

میں کہانی سنانی شروع کر چکی تھی اور ہمیشہ کی طرح، سب سے پہلے اورحان سویا، جس کے بعد میں نے اپنی آواز دھیمی کر لی۔

"میرے سونے کے بعد آپ بستر چھوڑ کر نہیں جائیں گی، ہے ناں ماں؟" شوکت نے کہا۔

"نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔"

میرا جانے کا واقعی کوئی ارادہ تھا بھی نہیں۔ شوکت کے سو جانے کے بعد میں لطف اٹھا رہی تھی کہ اپنی دوسری شادی کی رات اپنے بیٹوں کے ساتھ لپٹ کر یوں سونا کس قدر باعث مسرت تھا — جہاں میرا وجیہہ، ذہین اور عاشق شوہر ساتھ والے دوسرے کمرے میں موجود تھا۔ مجھے انہی خیالوں میں اونگھ آ گئی تھی لیکن میری نیند بے سکون سی تھی۔ بعد میں نیند اور بیداری کے درمیان عجیب بے چینی کے عالم میں مجھے یہ یاد ہے: پہلے میں نے اپنے مرحوم باپ کی برہم روح سے حساب بے باق کیا، پھر میں اس گھٹیا قاتل کے بھوت سے فرار ہوئی جو مجھے بابا کے ساتھ بھیجنا چاہتا تھا۔ جب اس نے میرا پیچھا کیا، وحیت قاتل، میرے بابا کی روح سے زیادہ وحشت ناک، وہ اور زیادہ جھگڑا فساد کرنے لگا۔ میرے خواب میں، اس نے ہمارے گھر پر پتھر برسائے۔ وہ کھڑکیوں پر لگے اور چھت پر جا پڑے۔ بعد میں اس نے دروازے پر بڑا سا پتھر دے مارا، ایک بار تو اسے زبردستی کھولنے کی کوشش کی۔ بعد میں جب وہ بدروح کسی بدکار جانور کی طرح رونے

چلانے لگی تو میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

میں پسینے میں نہاتی ہوئی جاگی۔ کیا میں نے وہ آوازیں اپنے خواب میں سنی تھیں یا گھر کے اندر کہیں سے آتی آوازوں سے جاگی تھی؟ میں فیصلہ نہ کر پائی، بچوں کے ساتھ لپٹ گئی اور بغیر حرکت کیے منتظر رہی۔ میں نے خود کو تقریباً یقین دلا دیا تھا کہ وہ شور صرف نیند کے عالم میں سنا تھا جب میں نے وہی رونا پیٹنا دوبارہ سنا۔ تبھی ایک دھماکے سے صحن میں کوئی بڑی سی چیز آ گری۔ کیا وہ بھی پتھر تھا، شاید؟

میں خوف سے مفلوج تھی۔ لیکن صورت حال فوراً ہی بدتر ہو گئی۔ مجھے گھر کے اندر سے شور سنائی دیا۔ تیمر بے کہاں تھی؟ قمر وکس کمرے میں سویا تھا؟ میرے بابا کی قابل رحم لاش کس حالت میں تھی؟ میں نے دعا کی، میرے خدایا، ہماری حفاظت فرما۔ بچے گہری نیند میں تھے۔

اگر یہ سب میری شادی سے پہلے ہوا ہوتا تو میں بستر سے اٹھتی اور گھر کے مردوں کی طرح صورت حال کو اپنے ہاتھ میں لے لیتی، میں اپنے خوف کو دبا لیتی اور جنوں اور روحوں کو بھگا دیتی۔ میری موجودہ حالت میں گھر میں بے خوف سے جھک کر بچوں کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ یوں تھا جیسے دنیا میں کوئی اور تھا ہی نہیں۔ کوئی بھی بچوں اور میری مدد کے لیے آنے والا نہیں تھا۔ کچھ برا ہونے کی توقع میں، میں نے اللہ سے حفاظت کی دعا کی۔ اپنے خوابوں کی طرح، میں اکیلی تھی۔ میں نے صحن کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ وہ صحن کا ہی دروازہ تھا، ہے ناں؟ ہاں، بالکل۔

میں اچانک اٹھی، اپنا لبادہ اٹھایا اور خود بھی یہ جاننے سے پہلے کہ میں کیا کر رہی تھی، کمرے سے باہر نکل آئی۔

"قمرو!" میں نے سیڑھیوں پر سے سرگوشی کی۔

جلدی سے جوتے پہننے کے بعد میں سیڑھیاں اتر گئی۔ شمع جو میں نے انگیٹھی پر جلا رکھی تھی میرے صحن کی پتھریلی گزرگاہ پر قدم رکھتے ہی بجھ گئی۔ اگرچہ آسمان صاف تھا، تیز ہوا چلنے لگی تھی۔ جیسے جیسے میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوئیں، میں نے دیکھا کہ نصف چاند صحن کو چاندنی میں نہلا رہا تھا اور میرے خدایا! صحن کا دروازہ کھلا تھا۔ میں سردی میں ٹھٹھرتی ساکت کھڑی رہ گئی۔

میں اپنے ساتھ چاقو کیوں نہ لائی تھی؟ میرے پاس شمع دان تھا نہ کوئی لکڑی کی چھڑی۔ تاریکی میں لمحہ بھر کو میں نے دروازے کو خود بخود ہلتے دیکھا۔ بعد میں جب لگا کہ وہ ساکت ہو چکا تھا، مجھے اس کی چرچراہٹ سنائی دی۔ مجھے یہ سوچنا یاد ہے، یہ خواب سا لگتا ہے۔

جب میں نے گھر سے آتا شور سنا، یوں جیسے چھت کے نیچے سے، میں جان گئی کہ میرے بابا کی روح ان کے جسم کو چھوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ جان کر کہ میرے بابا کی روح ایسی تکلیف میں تھی مجھے سکون ملا اور میں کرب و اذیت کا شکار بھی ہو گئی۔ میں نے سوچا، اگر اس شور و غل کی وجہ بابا ہیں تو پھر میرے ساتھ کچھ برا نہ ہو گا۔ دوسری جانب ان کی یہاں وہاں پھڑپھڑاتی، نکلنے اور اوپر جانے کی کوشش کرتی کرب

ہوشیار روح نے مجھے اتنا پریشان کر دیا کہ میں نے اللہ سے ان کے سکون اور آسانی کی دعا کی۔ لیکن جب مجھ پر کھلا کہ ان کی روح میری اور بچوں کی حفاظت کرے گی، مجھ پر بے پناہ سکون کا احساس چھا گیا۔ اگر واقعی دروازے کے پار شر پھیلا تا کوئی آسیب تھا تو اسے میرے بابا کی بے چین روح سے ڈرنے دو۔

تبھی مجھے فکر ہوئی کہ وہ غالباً قرہ تھا جو میرے بابا کو اس قدر پریشان کر رہا تھا۔ کیا میرے بابا، قرہ کو نقصان پہنچائیں گے؟ وہ تھا کہاں؟ تبھی صحن کے دروازے سے باہر سڑک پر مجھے وہ دکھائی دیا اور میں جم کر رہ گئی۔ وہ کسی سے بات کر رہا تھا۔

سڑک کے دوسرے کنارے پر موجود خالی احاطے میں لگے درختوں سے کوئی شخص قرہ سے بات کر رہا تھا۔ میں یہ نتیجہ نکال سکتی تھی کہ بستر پر لیٹے میں نے جو چلانے کی آوازیں سنی تھیں، وہ اسی آدمی کی تھیں جسے میں فوراً پہچان گئی کہ وہ حسن تھا۔ ایک ماتمی سا تناؤ تھا، اس کی آواز میں آنسو، لیکن ایک دھمکاتا ہوا لہجہ۔ میں نے دور سے انہیں بات کرتے سنا۔ خاموش رات میں وہ جھگڑا کر رہے تھے۔

میں سمجھ گئی کہ میں اپنے بچوں کے ساتھ دنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ مجھے قرہ سے محبت تھی، لیکن سچ بتاؤں تو، میں صرف قرہ سے محبت کرنا چاہتی تھی — جب حسن کی غم زدہ آواز نے میرے دل کو جھلسایا۔

"کل میں قاضی، ینی چری اور گواہوں کے ساتھ واپس آؤں گا، جو گواہی دیں گے کہ میرا بڑا بھائی زندہ ہے اور ابھی بھی ایران کے پہاڑوں میں لڑ رہا ہے۔" اس نے کہا۔ "تمہاری شادی غیر قانونی ہے۔ تم یہاں زنا کاری کر رہے ہو۔"

"شکورے تمہاری نہیں تمہارے مرحوم بھائی کی بیوی تھی۔" قرہ بولا۔

"میرا بڑا بھائی ابھی زندہ ہے۔" حسن نے یقین سے کہا، "گواہ موجود ہیں جنہوں نے اسے دیکھا ہے۔"

"آج صبح، اس حقیقت کی بنا پر کہ وہ چار برس سے جنگ سے واپس نہیں آیا، اسکودر کے قاضی نے شکورے کو طلاق جاری کر دی۔ اگر وہ زندہ بھی ہے تو اپنے گواہوں سے کہو کہ اسے بتا دیں کہ اب اسے طلاق ہو چکی ہے۔"

"شکورے عدت تک دوبارہ شادی نہیں کر سکتی تھی۔" حسن نے کہا، "ورنہ یہ قرآن کی بے حرمتی ہوگی۔ شکورے کے باپ نے ایسی ذلت آمیز حماقت کی اجازت کیسے دے دی؟"

"انشتے آفندی۔" قرہ نے کہا، "وہ بہت بیمار ہیں۔ وہ بستر مرگ پر ہیں...... اور قاضی نے ہماری شادی کو جائز قرار دیا ہے۔"

"کیا تم دونوں نے مل کر تمہارے انشتے کو زہر دیا ہے؟" حسن نے کہا، "کیا تم نے تجربے کے ساتھ مل کر یہ منصوبہ بنایا؟"

"جو کچھ تم نے شکورے کے ساتھ کیا، میرے سسر اس پر بے حد پریشان تھے۔ تمہارا بھائی، اگر وہ واقعی ابھی زندہ ہے تو، وہ بھی تم سے اس رسوائی و ذلت پر تم سے جواب طلب کر سکتا ہے۔"

"یہ سب جھوٹ ہیں، سب!" حسن نے کہا، "یہ سب شکورے کے گھڑے ہوئے بہانے ہیں تاکہ وہ ہمیں چھوڑ کر جا سکے۔"

گھر کے اندر سے چیخ کی آواز آئی، یہ خیریے تھی جو چیخی تھی، پھر شوکت چیخا۔ وہ ایک دوسرے پر چیختے چلائے۔ بغیر جانے بوجھے اور خوف میں، خود پر قابو پانے کے ناقابل، میں بھی چیخ اٹھی اور یہ جانے بغیر کہ میں کیا کر رہی تھی گھر کے اندر بھاگی۔

شوکت بھاگ کر سیڑھیاں اترا اور صحن میں آ گیا۔

"نانا برف کی طرح ٹھنڈے ہیں۔" وہ چیخا، "میرے نانا مر گئے۔"

ہم نے ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔ میں نے اسے اوپر اٹھا لیا۔ خیریے ابھی تک چیخ رہی تھی۔ قرہ اور حسن نے چیخیں سنیں اور وہ سب کچھ بھی جو کہا گیا تھا۔

"ہاں، انہوں نے ان کو مار ڈالا ہے۔" اس مرتبہ شوکت نے یہ کہا۔

ہر کسی نے یہ بھی سن لیا۔ کیا حسن نے سنا تھا؟ میں نے شوکت کو سختی سے بھینچ لیا اور سکون سے اس کے ساتھ واپس اندر آ گئی۔ سیڑھیوں کے اوپر خیریے پریشان تھی کہ کیسے بچہ جاگ گیا اور باہر نکل گیا۔

"آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ ہمیں چھوڑ کر نہیں جائیں گی۔" شوکت نے کہا اور رونے لگا۔

میرے ذہن پر قرہ کا خیال حاوی تھا۔ چوں کہ وہ حسن کے ساتھ مصروف تھا، اسے دروازہ بند کرنے کا خیال نہ آیا۔ میں نے شوکت کے دونوں رخساروں پر بوسہ دیا اور اسے زیادہ زور سے بھینچ کر گلے لگا لیا، اس کی گردن کی خوشبو سونگھتے، اسے تسلی دیتے اور آخر اسے خیریے کے حوالے کرتے میں نے سرگوشی کی، "تم دونوں اوپر جاؤ۔"

وہ دونوں اوپر چلے گئے۔ میں واپس آئی اور دروازے کی آڑ میں چند قدم چلی۔ میرا خیال تھا کہ حسن مجھے نہ دیکھ سکتا تھا۔ شاید سڑک کے کنارے لگے درختوں کی قطار کے پیچھے حرکت کرتے ہوئے کیا اس نے تاریک باغ میں اپنی جگہ بدل لی تھی؟ تاہم، جب یہ سب کچھ ہوا، وہ مجھے دیکھ سکتا تھا اور جب وہ بولا تو اس نے مجھے بھی مخاطب کیا۔ کسی ایسے شخص کے ساتھ تاریکی میں موجودگی نے مجھے گھبرا اور بوکھلا دیا، حسن کا چہرہ میں دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن اس سے بدتر یہ تھا کہ جب حسن نے مجھے الزام دیا، ہمیں الزام دیا تو اندر کہیں میں نے ادراک کیا کہ وہ با جواز تھا۔ اس کے ساتھ، جیسا کہ اپنے بابا کے ساتھ، میں ہمیشہ خود کو قصوروار محسوس کرتی تھی، ہمیشہ غلط۔ اور اب مزید یہ کہ میں بڑی اداسی کے ساتھ واقف تھی کہ میں اس شخص کی محبت میں گرفتار تھی جو مجھے الزام دے رہا تھا۔ میرے پیارے اللہ، میری مدد کریں۔ محبت، محبت کی خاطر تکلیف کا نام نہیں بلکہ یہ آپ تک رسائی کا ذریعہ ہے، ہے ناں؟

حسن کا دعویٰ تھا کہ میں نے قرہ کے ساتھ مل کر اپنے بابا کا قتل کیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس نے سن لیا تھا جو شوکت نے کہا، یہ کہ ہر بات سامنے آ گئی تھی اور یہ کہ ہم نے جہنم کی اذیتوں کا سزاوار ناقابلِ معافی گناہ کیا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ قاضی کے پاس جا کر سب کچھ بتا دے گا۔ اگر میں بے گناہ تھی، اگر میرے ہاتھ اپنے بابا کے خون سے نہ رنگے ہوئے، تو وہ قسم کھاتا ہے کہ مجھے اور بچوں کو اپنے گھر واپس لے جائے گا، وہ اپنے بڑے بھائی کی واپسی تک ان سے باپ کا سا سلوک رکھے گا۔ تاہم، اگر میں مجرم ہوئی تو میری جیسی عورت جس نے بے رحمی سے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا ——— اعلیٰ ترین قربانی کے لیے تیار شخص کو ——— میرے لیے جو بھی سزا ہوتی کم تھی۔ ہم صبر و تحمل سے اس کے غیظ و غضب کو سنتے رہے، اور پھر غور کیا کہ درختوں میں اچانک خاموشی چھا گئی تھی۔

"اب اگر تم اپنی مرضی سے اپنے اصل شوہر کے گھر واپس لوٹ آؤ۔" حسن نے بالکل مختلف لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا، "اگر تم کسی کی بھی نظروں میں آئے بغیر خاموشی کے ساتھ بچوں کو لے کر گھر آ جاؤ تو میں تمہاری اس جعلی شادی کی چال بازی کو بالکل بھلا دوں گا، جرم جو تم نے کیا ہے، سب کچھ، میں سب کچھ معاف کر دوں گا اور ہم دونوں مل کر میرے بھائی کی واپسی کا انتظار کریں گے شوکت، برس ہا برس، میرے۔"

کیا وہ نشے میں تھا؟ اس کے لہجے میں کچھ بہت انوکھا پن تھا اور اب وہ مجھے جو پیشکش کر رہا تھا میرے شوہر کے سامنے، اس پر مجھے ڈر تھا کہ اسے اپنی زندگی کی صورت میں قیمت چکانی پڑ سکتی تھی۔

"کیا تم سمجھ گئی ہو؟" وہ درختوں کے بیچ سے پکارا۔

میں طے نہ کر پائی کہ اس تاریکی میں وہ تھا کہاں۔ میرے پیارے خدا ہماری مدد کریں، ہم گناہ گار بندوں کی۔

"کیوں کہ تم اس شخص کے ساتھ ایک گھر کی چھت تلے نہ رہ پاؤ گی شوکت، جس نے تمہارے باپ کا قتل کیا ہے۔ یہ میں جانتا ہوں۔"

میں نے ذرا دیر کو خیال کیا کہ میرے بابا کا قاتل وہی ہو سکتا تھا اور یہ کہ وہ شاید ہمارا مذاق اڑا رہا تھا۔ یہ حسن شیطان کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ لیکن میں کچھ بھی یقین سے نہ کہہ سکتی تھی۔

"میری بات سنو، حسن آفندی۔" قرہ نے تاریکی کو پکار کر کہا: "میرے سسر کا قتل کیا گیا تھا، اتنی بات سچ ہے۔ انہیں کسی انتہائی ذلیل شخص نے قتل کیا ہے۔"

"ان کا قتل شادی سے پہلے ہوا، کیا یہی بات نہیں ہے؟" حسن نے کہا، "تم دونوں نے ان کی جان لے لی کیوں کہ وہ اس شادی کے دھوکے کے خلاف تھے، اس جعلی طلاق، جھوٹے گواہوں اور تمہارے سارے جھوٹوں کے۔ اگر وہ قرہ کو مناسب جانتے تو برسوں پہلے ہی اپنی بیٹی اس سے بیاہ دیتے۔"

برسوں مرحوم شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے، ہمارے ساتھ، حسن ہمارے ماضی سے ہماری طرح واقف تھا۔ دھتکارے ہوئے عاشق کی طرح اسے ہر اس بات کی ہر تفصیل یاد تھی جو میں نے گھر میں کبھی

اپنے شوہر کو بتائی تھی، لیکن کچھ ہی دیر میں بھول گئی تھی، یا اب بھول جانا چاہتی تھی۔ برسوں میں ہم نے اتنی یادیں پائی تھیں ..... وہ، اس کے بھائی اور میں نے ..... کہ مجھے فکر تھی کہ اگر حسن نے ماضی کو دہرانا شروع کر دیا، تو قرہ مجھے کس قدر اجنبی، نیا اور دور لگے گا۔

''تمہیں شبہ ہے کہ انہیں قتل کرنے والے تم ہو'' قرہ نے کہا۔

''اس کے برعکس تم ہو جنہوں نے ان کو جان سے مار ڈالا تاکہ تم دونوں شادی کر سکو۔ یہ واضح ہے۔ جہاں تک میری بات ہے، میرا کوئی محرک قتل نہیں۔''

''تم نے انہیں قتل کیا تاکہ ہماری شادی نہ ہو پائے۔'' قرہ نے کہا، ''جب تمہیں معلوم ہوا کہ انہوں نے شکورے کو طلاق لینے کی اجازت دے دی ہے اور ہماری شادی کی، تم غصے سے بے قابو ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہیں انشتے آفندی پر اس لیے بھی غصہ تھا کہ انہوں نے شکورے کی گھر واپس آ کر ان کے ساتھ رہنے کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ تم انتقام چاہتے تھے۔ جب تک کہ وہ زندہ تھے، تم جانتے تھے کہ تب تک تم شکورے پر ہاتھ ڈال سکتے تھے۔''

''تم اپنی یاری کر لو۔'' حسن نے فیصلہ کن انداز میں کہا، ''میں یہ فضول بکواس سننے سے انکار کرتا ہوں۔ یہاں بہت سردی ہے۔ میں پتھروں سے تمہاری توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے یہاں ٹھہر گیا ہوں ..... کیا تم نے ان کا شور سنا تھا؟''

''قرہ میرے بابا کی تصویر وں میں مگن تھا۔'' میں نے کہا۔

کیا میں نے یہ کہہ کر غلطی کی تھی؟

حسن اسی جھوٹے لہجے میں بولا جو میں نے بھائی قرہ سے روا رکھی تھی: ''شکورے چونکہ تم میرے بھائی کی بیوی ہو، اب تمہارا بہترین طرز عمل یہ ہو گا کہ تم اپنے بچوں کے ساتھ جواں مرد سپاہی گھوڑ سوار کے گھر واپس آ جاؤ، قرآن کے مطابق جس کے نکاح میں تم اب تک ہو۔''

''میں انکار کرتی ہوں۔'' میں نے جیسے رات کے دل میں پھنکارتے ہوئے کہا، ''میں انکار کرتی ہوں حسن۔ نہیں۔''

''تب میری ذمے داری اور اپنے بھائی سے میرا خلوص و عقیدت مجھے مجبور کرتے ہیں کہ جو کچھ میں نے یہاں سنا ہے، میں کل صبح ہوتے ہی قاضی کو اس سے آگاہ کروں۔ دوسری صورت میں وہ مجھ سے جواب پرسی کریں گے۔''

''وہ ہر صورت تم سے جواب پرسی تو کریں گے۔'' قرہ نے کہا، ''جس لمحے تم قاضی کے پاس جاؤ گے میں بتا دوں گا کہ تم ہی ہو جس نے ہمارے سلطان کے پیارے خادم انشتے آفندی کا قتل کیا ہے۔ اسی صبح۔''

''بہت خوب۔'' حسن سکون سے بولا، ''یہ انکشاف بھی کر دیکھو۔''

میں چلائی، ''وہ تم دونوں پر تشدد کریں گے!''

میں چیخی، ''قاضی کے پاس مت جاؤ۔ انتظار کرو۔ سب کچھ واضح ہو جائے گا۔''

''مجھے تشدد کا کوئی ڈر نہیں۔'' حسن نے کہا، ''مجھ پر پہلے دو مرتبہ تشدد ہو چکا ہے اور دونوں مرتبہ میں سمجھ گیا کہ یہ واحد طریقہ ہے جس سے قصوروار کو بے گناہ سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ الزام لگانے والوں کو تشدد کرنے دو۔ میں قاضی کو، ینی چری کے کماندار، شیخ الاسلام، ہر کسی کو بے چارے انشتے آفندی کی کتاب اور اس کی تصویروں کے بارے میں بتاؤں گا۔ ہر کوئی ان تصویروں کی بات کر رہا ہے۔ ان کے بارے میں ایسی کیا بات ہے؟ ان تصویروں میں کیا ہے؟''

''ان میں کچھ نہیں ہے۔'' قرہ نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ پہلا موقع ملتے ہی تم ان کا جائزہ لے چکے ہو۔''

''انشتے آفندی چاہتے ہیں کہ کتاب کو میں مکمل کروں۔''

''بہت خوب۔ مجھے امید ہے خدا نے چاہا تو وہ ہم دونوں پر تشدد کریں گے۔''

دونوں خاموش ہو گئے۔ پھر [illegible] اور میں نے خالی احاطے میں قدموں کی چاپ سنی۔ کیا وہ جا رہے تھے یا ہمارے قریب آ رہے تھے؟ ہم [illegible] کہہ سکتے تھے نہ بتا سکتے تھے کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ یہ اس کی بے وقوفی ہوتی اگر وہ گھور تاریکی میں باغ کے دوسرے [illegible] میں کانٹوں، جھاڑیوں اور خاردار پودوں میں سے نکل کر جانے کی کوشش کرتا۔ اگر وہ درختوں میں سے [illegible] ہمارے سامنے سے راستہ بناتے نکل جاتا تو بھی وہ نظروں میں آئے بغیر آسانی سے جا سکتا تھا۔ لیکن ہم نے قریب آتی قدموں کی کوئی چاپ نہ سنی۔ میں بہادری سے چیخی، ''حسن!'' کوئی جواب نہ آیا۔

''بس۔'' قرہ نے کہا۔

ہم دونوں سردی سے کانپ رہے تھے۔ زیادہ دیر جھجکے بغیر ہم نے دروازہ بند کیا اور اپنے پیچھے سارے دروازے سختی سے بند کر دیے۔ بچوں سے گرم اپنے بستر پر آنے سے پہلے، میں نے دوبارہ بابا کو دیکھا۔ اس دوران قرہ ایک بار پھر تصویروں کے سامنے جا بیٹھا تھا۔

میں، ایک گھوڑا

اس حقیقت کو نظر انداز کر دیں کہ میں یہاں مطمئن اور ساکت کھڑا ہوں، اگر سچ کہا جائے تو میں صدیوں سے سرپٹ دوڑ رہا ہوں۔ میں میدانوں سے گزرا، جنگوں میں لڑا، شاہوں کی افسردہ و اداس بیٹیوں کو شادی کے لیے لے گیا۔ میں ورق بہ ورق، کہانی سے تاریخ، تاریخ سے داستان اور کتاب سے کتاب ابھرتے سرپٹ دوڑتا چلا گیا۔ میں لاتعداد کہانیوں، افسانوں، کتابوں اور جنگوں میں ظاہر ہو چکا ہوں۔ میں نے ناقابل شکست سورماؤں کا ساتھ دیا، [illegible] عاشقوں اور شان دار فوجوں کا۔ میں ہمارے فتح مند سلاطین کے ہمراہ ایک سے دوسری مہم میں شامل ہوا نتیجے میں میں لاتعداد تصویروں میں ظاہر ہوا۔

آپ پوچھتے ہیں، اپنی اس قدر [illegible] تصویر کشی سے کیا محسوس ہوتا ہے؟

یقیناً مجھے خود پر فخر ہے۔ تاہم، میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ کیا تمام معاملوں میں اس کی تصویر کشی ہوئی ہے۔ یہ ان تصویروں سے عیاں ہے کہ ہر کسی نے مختلف طریقے سے میرا تصور باندھا ہے، پھر بھی مجھے ایک طاقت ور سا احساس ہے کہ تمام تصویروں میں ایک بات مشترک ہے، ایک اتفاق ہے۔

میرے کئی اچھے فنکار دوست حال ہی میں ایک کہانی بیان کر رہے تھے اور اس سے مجھے یہ معلوم ہوا: فرنگی کافروں کا بادشاہ، وینس کے ڈیوک کی بیٹی سے شادی کا سوچ رہا تھا۔ وہ اس پر سوچ رہا تھا لیکن پھر وہ اس خیال کے طاعون کا شکار ہوا کہ "کیا ہو اگر وینسی ڈیوک غریب ہو اور اس کی بیٹی بدصورت؟" خود کو تسلی دلانے کو اس نے اپنے بہترین فنکار کو وینسی ڈیوک کی بیٹی، اثاثوں، جائیداد اور متعلقہ چیزوں کی تصویر کشی کا حکم دیا۔ وینس والے غیر مہذب پن کی زیادہ پروا نہ کرتے تھے، وہ نہ صرف اپنی بیٹیوں کو فنکار کی کھوجتی نگاہوں کے سامنے لے آتے بلکہ اپنے گھوڑوں اور محل سراؤں کو بھی۔ ماہر کار فنکار کسی دوشیزہ یا کسی گھوڑے کی اس طرح تصویر کشی کر سکتا تھا کہ آپ کسی کو بھی ہجوم میں سے پہچان لیں۔ اپنے محل میں جب فرنگیوں کے بادشاہ نے وینس سے آنے والی تصویر کو دیکھا، سوچتے، غور کرتے ہوئے کہ کیا اسے اس دوشیزہ کو بیوی بنانا چاہیے، اس کا نر اسپ اچانک اٹھا اور تصویر میں موجود پرکشش گھوڑی کی طرف بڑھا اور گھوڑے کے سائیس کو غضب ناک جانور کو خاصی کوشش کر کے قابو میں لانا پڑا، لیکن اس سے پہلے ہی"

تصویر اور اس کے بڑے سے فریم کو برباد کر چکا تھا۔
لوگوں کا کہنا ہے کہ فرنگیوں کے نر گھوڑے کو وینس کی گھوڑی کی خوب صورتی نے نہیں بہکایا تھا۔۔۔ اگرچہ وہ واقعی خوب صورت تھی۔۔۔ بلکہ ایک خاص طرح کی گھوڑی نے کر اس کی درست تصویر کشی کرنے نے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا اس گھوڑی کی ہو بہو تصویر بنانا گناہ ہے، یعنی اصل گھوڑی جیسی؟ میرے معاملے میں، جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، میری تصویر اور گھوڑوں کی دوسری تصویروں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔

دراصل آپ میں سے وہ جو میرے درمیانی حصے کو خصوصی توجہ دیتے ہیں، میری ٹانگوں کی حرکات اور میرے انداز کا غرور سمجھا دے گا کہ میں بلاشبہ منفرد ہوں۔ لیکن یہ عمدہ خدوخال، گھوڑے کے طور پر میری انفرادیت کی جانب نہیں بلکہ اس منی ایچر فنکار کی انفرادیت کی طرف اشارہ ہیں جس نے مجھے بنایا تھا۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ بالکل مجھ جیسا کوئی گھوڑا وجود نہیں رکھتا۔ میں بس اس گھوڑے کی تصویر کشی ہوں جو منی ایچر فنکار کے تخیل میں موجود ہے۔

مجھے دیکھنے والے اکثر کہتے ہیں، "خدایا، کس قدر خوب صورت گھوڑا ہے!" لیکن وہ درحقیقت میری نہیں فنکار کی تعریف کر رہے ہوتے ہیں۔ سب گھوڑے درحقیقت ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر منی ایچر فنکار کو یہ جاننا چاہیے۔

ذرا قریب سے غور سے دیکھیں، اس نر گھوڑے کے اعضا بھی کسی دوسرے سے ملتے جلتے نہیں۔ ڈریں مت، آپ قریب سے ان کا جائزہ لے سکتے ہیں اور اسے ہاتھ میں بھی لے سکتے ہیں: خدا کے عطا کردہ اس عضو کی صورت اپنی ہی ہے۔

اب، تمام منی ایچر فنکار اپنی یادداشت میں موجود گھوڑوں کو ایک ہی طرح سے بناتے ہیں۔ اگر ہم میں سے ہر کسی کو سب سے بڑے تخلیق کار اللہ نے الگ طرح سے بنایا ہے، تو وہ بغیر ہمیں دیکھے ہزاروں، لاکھوں گھوڑوں کو ایک ہی طرح بنانے پر فخر کیوں کرتے ہیں؟ میں بتاتا ہوں کہ کیوں، کیوں کہ وہ اس جہان کی عکاسی کی کوشش کرتے ہیں جو خدا تصور کرتا ہے نہ کہ اس کی جسے وہ دیکھتے ہیں۔ کیا یہ خدا کی وحدت کو چیلنج کرنا نہیں، یعنی۔۔۔ خدا معاف کرے۔۔۔ کیا اس کا مطلب یہ کہنا نہیں کہ میں خدا کا کام کر سکتا ہوں؟ فنکار جو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر عدم اطمینان رکھتے ہیں، فنکار جو ایک ہی گھوڑا ہزاروں بار یہ دعویٰ کرتے ہوئے بناتے ہیں کہ بہترین گھوڑا وہ ہے جو نابینا منی ایچر فنکار اپنی یادداشت کے بل پر بناتے ہیں، کیا وہ سب ہی اللہ سے مقابلے کا گناہ سرزد نہیں کر رہے؟

فرنگی فنکاروں کے نئے انداز توہین آمیز نہیں ہیں، اس کے برعکس وہ ہمارے ایمان اور عقیدے کے مطابق ہیں۔ میری دعا ہے کہ میرے ارض روم کے بھائی مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں اس پر ناخوش ہوں کہ فرنگی کھلے عام اپنی عورتوں کو شرم و حیا سے بیگانے ہو کر نیم برہنہ گھماتے ہیں، یہ کہ انہیں کافی اور حسین لڑکوں سے لطف اٹھانے کا کچھ پتا نہیں اور یہ کہ وہ داڑھی منڈے چہرے لیے پھرتے ہیں، البتہ ان کے بال عورتوں کی طرح

لیے ہیں، وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عیسیٰ بھی خدا ہیں (اللہ ہماری حفاظت فرمائے)۔ میں ان فرنگیوں پر اس قدر غصہ ہو گیا ہوں کہ اگر میرا ان میں سے کسی کے پاس سے گزر ہوا تو ایک اچھی سی دولتی تو جھاڑ ہی دوں گا۔

پھر بھی میں سخت تنگ ہوں اس سے کہ کئی ایچر ڈنکار جو عورتوں کی طرح گھر بیٹھے رہتے ہیں اور کبھی جنگ پر نہیں جاتے، میری غلط تصویر کشی کرتے ہیں۔ وہ مجھے سرپٹ دوڑتے یوں دکھاتے ہیں کہ میری اگلی دونوں ٹانگیں ایک ہی وقت میں ہوا میں معلق ہوتی ہیں۔ اس دنیا میں ایسا کوئی گھوڑا نہیں جو خرگوش کی طرح بھاگتا ہو۔ اگر میری ایک اگلی ٹانگ اٹھی ہوئی اور آگے ہو تو دوسری ذرا پیچھے ہو گی۔ جنگوں کی تصویروں میں جو عکاسی کی جاتی ہے، اس کے برعکس، اس دنیا میں ایسا کوئی گھوڑا نہیں جو اپنی ایک اگلی ٹانگ کسی قینچی کی طرح بڑھائے اور دوسری مضبوطی سے زمین پر جمائے رکھے۔ ایسا کوئی سپاہی گھڑسوار رسالے کا وجود نہیں جس کے گھوڑے مل کر اکٹھے ٹہلتے پھریں، یوں جیسے ایک ہی نقش کو ۲۰ مرتبہ آگے پیچھے بنا دیا گیا ہو۔ ہم گھوڑے اس وقت ادھر ادھر گھومتے اور سبز گھاس چرتے ہیں جب ہمیں کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ ہم کسی مجسمے کے انداز میں کھڑے ہو کر شائستگی سے انتظار بھی نہیں کرتے، جس طرح ہمیں تصویروں میں دکھایا جاتا ہے۔ ہر کوئی ہمارے کھانے، پیشاب کرنے اور سونے کے بارے میں اتنا بخیل کیوں ہے؟ وہ ہمارے اس حیران کن اور منفرد نازک حصے کی تصویر بنانے سے خائف کیوں ہیں؟ دزدیدہ نگاہ سے عورتیں اور بچے اسے خصوصاً دیکھنا پسند کرتے ہیں اور اس میں برا کیا ہے؟ کیا ارض روم کا مولا اس کے بھی خلاف ہے؟

لوگ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں چین میں ایک ضعیف اور مراسیمہ شاہ تھا۔ اسے یہ خوف تھا کہ اس کے دشمن اسے معزول کر کے اس کے بیٹے کو تخت پر بٹھا دیں گے۔ شہزادے کو گورنر بنا کر اصفہان بھیجنے کی بجائے اس نے اسے اپنے محل کے ایک الگ تھلگ کمرے میں قید کر دیا۔ شہزادہ بڑا ہوا اور ۱۸ برس تک اس قید خانے میں رہتا رہا، جہاں سے کوئی صحن دکھائی دیتا تھا نہ باغ۔ جب اس کے باپ کا وقت آخر آن پہنچا تو شہزادہ جو اپنی کتابوں کے ساتھ تنہا رہتا آیا تھا، تخت پر بیٹھا اور اعلان کیا کہ "میں حکم دیتا ہوں کہ میرے لیے ایک گھوڑا لایا جائے۔ میں نے ہمیشہ کتابوں میں ان کی تصویریں دیکھی ہیں اور ان کے بارے میں متجسس ہوں۔" وہ اس کے لیے محل کا سب سے خوب صورت سرمئی جنگی گھوڑا لائے لیکن جب نئے بادشاہ نے دیکھا کہ گھوڑے کے نتھنے کٹے ہوئے تھے، اس کا رنگ تصویروں کی نسبت ہلکا اور کولہے غیر مہذب سے تھے، اس کا سحر اور تخیل اس طرح ٹوٹا کہ اس نے اپنی سلطنت میں موجود تمام گھوڑوں کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ چالیس روز جاری رہنے والے اس سفاک قتل عام کے بعد، سلطنت کے تمام دریاؤں کا رنگ گہرا سرخ ہو گیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے عدل و انصاف سے گریز نہ کیا: بادشاہ کے پاس اب کوئی گھڑسوار فوج نہ تھی اور اپنے شدید دشمن، قرہ قویونلو قبیلے کے ترکمان بے سے سامنا ہونے پر اسے شکست فاش ہوئی اور آخر میں اسے دو ٹکڑے کر دیا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہ رہے، جیسا کہ تمام تواریخ انکشاف کریں گی، گھوڑوں کی قوم نے اپنا انتقام لے لیا تھا۔

میرا نام ہے قرمزی

شکورے نے خود کو اپنے بچوں کے ساتھ ایک کمرے میں بند کرلیا اور میں دیر تک گھر کے اندر کی آوازیں اور متواتر چہ چہاہٹ سنتا رہا۔ شکورے اور شوکت ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے تھے اور اس نے شوکت کو اچانک ''شش!'' کہہ کر خاموش کروادیا۔ میں نے کنویں کے قریب پتھر جڑے حصے کی جانب کھڑکھڑاہٹ سنی مگر وہ زیادہ دیر نہ رہی۔ میں ایک کرخت آواز میں چلاتے بگلے نے میری توجہ حاصل کرلی جو چھت پر آن بیٹھا تھا۔ پھر وہ بھی باقی سب کچھ کے ساتھ خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد مجھے راہداری کی دوسری جانب سے ایک ہلکی سی سسکی سنائی دی: کوئی نیند میں رورہی تھی۔ اس کی سسکیاں کھانسی میں تحلیل ہوئیں جو دوبارہ اسی گہری اور بھیانک خاموشی کو جگہ دیتے ہوئے اسی طرح اچانک ختم ہوگئی جیسے شروع ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے تصور کیا کہ جس کمرے میں میرے مرحوم انشتے دراز تھے، وہاں کوئی مداخلت کار گھوم رہا تھا اور میں پوری طرح منجمد ہوگیا۔

خاموشی کے ہر دورانیے میں، میں نے اپنے سامنے رکھی تصویروں کا جائزہ لیا، یہ غور کرتے ہوئے کہ کیسے تند خو زیتون، خوب صورت تتلی اور مرحوم طلا کار نے اس صفحے پر رنگ پھیلائے تھے۔ میرا دل چاہا کہ ہر تصویر سے ''شیطان!'' یا ''موت!'' کہتے ہوئے جھگڑ پڑوں جیسا کہ میرے انشتے کسی کسی رات کیا کرتے تھے لیکن خوف نے مجھے روک لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان تصویروں نے مجھے بہت پریشان کیا تھا کیوں کہ میں انشتے کے اصرار کے باوجود ان سے متعلق کوئی کہانی نہ لکھ پایا تھا۔ چوں کہ مجھے آہستہ آہستہ یقین ہوتا جارہا تھا کہ موت کا تعلق ان تصویروں سے تھا، مجھے جھنجھلاہٹ اور بے چینی محسوس ہوئی۔ میں پہلے ہی انشتے کی کہانیاں سنتے ہوئے تصویروں کی چھان بین کرچکا تھا، یہ سب شکورے کے قریب رہنے کے بہانے تھے۔ اب جب کہ وہ قانونی طور پر میری بیوی تھی، مجھے ان پر سوچنے کا تردد کیوں کرنا چاہیے تھا؟ ایک بے رحم اندرونی آواز نے جواب دیا: ''کیوں کہ اپنے بچوں کے سونے کے بعد بھی شکورے نے بستر سے اٹھ کر تمہارے پاس آنے سے انکار کردیا ہے۔'' میں شمع کی روشنی میں دیر تک تصویروں کو دیکھتے ہوئے انتظار کرتا رہا اس امید میں کہ وہ سیاہ چشم حسینہ میرے پاس آجائے گی۔

صبح تحریے کی چیخوں سے بیدار ہو کر میں نے شمع دان اٹھایا اور راہداری کی طرف بھاگا۔ مجھے خیال ہوا کہ حسن نے اپنے آدمیوں کے ساتھ گھر پر حملہ کر دیا تھا اور مجھے تصویریں چھپانے کا خیال آیا لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ تحریے، شورے کے حکم پر چیخ چلا رہی تھی تا کہ بچوں اور ہمسایوں کے سامنے انشٹے آفندی کی وفات کا اعلان کیا جائے۔

جب میں دیوان خانے میں شورے سے ملا، ہم نے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ بچے جو تحریے کی چیخیں سن کر بستر سے نکل آئے تھے، بے حس و حرکت کھڑے تھے۔

"تمہارے نانا فوت ہو گئے ہیں۔" شورے نے انہیں بتایا، "میں نہیں چاہتی کہ کسی بھی صورت تم ان کے کمرے میں جاؤ۔"

اس نے خود کو میری بانہوں سے آزاد کروایا اور اپنے بابا کے سرہانے جا کر رونے لگی۔

میں نے بچوں کو دوبارہ ان کے کمرے میں بھیج دیا۔ "اپنے سونے کے لباس تبدیل کرو، تمہیں سردی لگ جائے گی۔" میں نے کہا اور بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

"نانا آج صبح نہیں مرے۔ وہ کل رات ہی مر گئے تھے۔" شوکت بولا۔

شورے کا ایک لمبا سا خوبصورت بال "و" کی صورت بنائے اس کے تکیے پر پڑا تھا۔ تکیے کے نیچے اس کے بدن کی حدت ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ ہم اسے تحریے کے ہمراہ سسکیاں بھرتے اور روتے ماتم کرتے سن سکتے تھے۔ اس کی اس طرح چیختے چلانے کی قابلیت کہ جیسے اس کے بابا اسی صبح غیر متوقع طور پر فوت ہوئے تھے، اس قدر فریبی اور زمانہ ساز تھی کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں اس شورے کو بالکل نہیں جانتا، جیسے اس پر کسی جن کا سایہ ہو گیا تھا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اورحان نے ایسی نگاہوں سے کہا جو رونے کی اجازت کی ایک طرح کی التجا بھی تھیں۔

"ڈرو مت۔" میں نے کہا، "تمہاری ماں اس لیے رو رہی ہیں تا کہ ہمسایوں کو تمہارے نانا کی وفات کا علم ہو جائے اور وہ آ جائیں۔"

"اگر وہ آ جائیں تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟" شوکت نے پوچھا۔

"اگر وہ آ گئیں تو وہ ہمارے ساتھ مل کر ان کی وفات پر افسردہ ہوں گے اور ماتم کریں گے۔ اس طرح ہم اپنے دکھ کا بوجھ بانٹ سکیں گے۔"

"کیا تم نے میرے نانا کی جان لی ہے؟" شوکت چیخا۔

"اگر تم اپنی ماں کو پریشان کرو گے تو مجھ سے کسی شفقت کی امید نہ رکھنا!" میں اس پر چیخا۔

ہم کسی سوتیلے باپ بیٹے کی طرح ایک دوسرے پر نہیں چیخے چلائے تھے بلکہ تیز رفتار دریا کے کنارے دو مردوں کی طرح۔ شورے باہر راہداری میں آ گئی تھی اور اب کھڑکی کی کھڑکیوں کے بھاری کواڑ

کھول رہی تھی تاکہ اس کی چیخیں آس پڑوس میں صحیح طرح سنی جا سکیں۔

میں کمرے سے نکل کر اس کے پاس آ گیا۔ ہم دونوں نے مل کر کھڑکی کھولنے کی کوشش کی۔ مل کر کی جانے والی آخری کوشش میں، کواڑ ڈھیلے ہوئے اور باہر صحن میں کھل گئے۔ ہمارے چہروں سے دھوپ اور ٹھنڈک ٹکرائی اور لمحہ بھر کو ہم ششدر رہ گئے۔ شکورے جی بھر کر روتے ہوئے چلائی۔

ایک بار اس کے رونے چلانے سے اعلان شدہ انشتے آفندی کی موت ایک بے حد المیہ اور کرب ناک تکلیف میں ڈھل گئی۔ چاہے دل سے یا فریبی، میری بیوی کی آہ وزاری نے مجھے کرب زدہ کر دیا۔ غیر متوقع طور پر میں بھی رونے لگا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں خلوص دل سے غم کے سبب رو رہا تھا یا محض اپنے انشتے کی موت کا ذمہ دار ٹھہرائے جانے کے خوف سے دکھاوا کر رہا تھا۔

"وہ چلے گئے، چلے گئے، چلے گئے، میرے پیارے بابا چلے گئے۔" شکورے چیخی۔

میری سسکیاں اور گریہ وزاری اسی کی نقل تھے، اگرچہ مجھے نہیں معلوم کہ میں کہہ کیا رہا تھا۔ مجھے فکر تھی کہ اپنے گھروں سے دروازوں کی درزوں اور کھڑکیوں کے شگافوں سے جھانک کر دیکھتے ہمسایوں کو میں کیسا لگ رہا تھا، اور سوچا کہ میرا رونا کتنا مناسب تھا۔ روتے ہوئے مجھے اس پر شک محسوس ہوا کہ آیا میرا کرب اصلی تھا، یا وہ خدشے تھے کہ مجھے قتل کا الزام دیا جائے گا اور یا پھر یہ حسن اور اس کے آدمیوں کے باعث تھا۔

شکورے میری تھی اور یوں جیسے میں اس بات کا جشن آہوں اور آنسوؤں سے منا رہا تھا۔ میں نے سسکیاں بھرتی اپنی بیوی کو اپنے قریب کر لیا اور اپنے قریب آتے آنسوؤں بھرے بچوں کی پروا کیے بغیر اس کے رخسار پر محبت سے بوسہ دیا اور ہماری نوجوانی کے بادام کے درختوں کی خوشبو اپنے اندر اتاری۔

بچوں کے ساتھ ہم میت کے پاس گئے۔ میں نے یوں جیسے دو روز پرانی متعفن ورتی لاش سے نہیں بلکہ اس مرتے ہوئے آدمی سے جس سے میں اس شہادت کے الفاظ کی دوبارہ تصدیق چاہتا تھا، کہا، "لا الٰہ الا اللہ۔" میں چاہتا تھا کہ میرے انشتے اپنے ہونٹوں پر ان الفاظ کے ساتھ جنت میں داخل ہوں۔ ہم نے یوں ظاہر کیا جیسے انہوں نے یہ الفاظ دہرائے ہوں اور ان کے تقریباً مسخ چہرے اور کچلے ہوئے سر کو دیکھ کر لمحہ بھر کو مسکرائے۔ میں نے ہاتھ اٹھائے اور سورہ یٰسین کی تلاوت کی جب کہ باقی سب خاموشی سے سنتے رہے۔ ایک صاف پٹی سے جو شکورے لائی تھی، ہم نے احتیاط سے انشتے کا منہ باندھا، نرمی سے ان کی آنکھیں بند کیں اور آہستگی سے ان کے چہرے کا رخ مکہ مکرمہ کی طرف کرتے ہوئے انہیں دائیں کروٹ دی۔ شکورے نے اپنے بابا پر سفید صاف چادر ڈال دی۔

میں خوش تھا کہ بچے آہ وزاری کے بعد پھیلی خاموشی میں سب کچھ غور سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے کسی ایسے شخص کی طرح محسوس ہوا جس کے واقعی بیوی، بچے اور گھر گرہستی تھی۔

ایک ایک کر کے میں نے تصویریں اکٹھی کیں، اپنا بھاری کافتان پہنا اور جلدی سے گھر سے

باہر نکل گیا۔ میں سیدھا قریبی مسجد گیا، یوں ظاہر کرتے جیسے میں نے کسی ہمسائے کو نہیں دیکھا تھا — ایک بوڑھی عورت جو بہتی ناک والے اپنے پوتے کو لیے کھڑی تھی، واضح طور پر اس اچانک سرگرمی پر مسرور تھی، وہ ہمارا دوبارہ ماتم سن چکے تھے اور شوق سے ہمارے دکھ سے حظ اٹھا رہے تھے۔

ان مساجد کی مخصوص شاندار عمارت اور بڑے بڑے گنبدوں اور وسیع صحن کی طرح تعمیر، جو بعد میں بنائی گئی تھیں، مسجد کے ساتھ شرمندگی کی حد تک چھوٹا سا مولوی کا اپنا "گھر" تھا۔ میرے مشاہدے کے مطابق روز بہ روز بڑھتی روایت کے مطابق، وہ اپنے چوہے کے بل جیسے گھر کی حدود کو مسلسل وسیع کر رہا تھا اور پوری مسجد پر گویا قابض ہو چکا تھا۔ صحن کے کونے میں اُگے اخروٹ کے درختوں کے درمیان لٹکی ڈوری پر اپنی بیوی کے رنگ اڑے کپڑوں کو دھلائی کے بعد لٹکانے سے بالکل بے پرواہ۔ ہم ان دو وحشی کتوں کے حملے سے بچے جو بالکل امام آفندی اور اس کے خاندان کی طرح صحن میں آ گھسے تھے اور جب مولوی کے لڑکوں نے جانور کو چھڑیوں سے بھگا دیا اور چلے گئے تو مولوی اور میں ایک نسبتاً تنہا گوشے میں آ بیٹھے۔

گزشتہ روز کی طلاق کی کارروائی اور اس حقیقت کی روشنی میں کہ ہم نے اسے نکاح پڑھوانے کا نہیں کہا تھا، جس نے میرے خیال میں اسے ناراض کیا تھا، میں اس کے چہرے پر پڑھ سکتا تھا: "خدا کے واسطے، اب بھلا تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"آج صبح انشتے آفندی کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"خدا ان پر رحم کرے۔ خدا انہیں جنت میں جگہ دے!" انہوں نے مہربانی سے کہا۔ میں نے بے سوچے سمجھے اپنی بات میں "آج صبح" کے الفاظ کیوں شامل کیے تھے؟ میں نے سونے کا ایک اور سکہ اس کے ہاتھ میں دیا۔ میں نے درخواست کی کہ وہ اذان سے پہلے فاتحہ پڑھا دے اور اپنے بھائی کو ذمے داری سونپے کہ پورے آس پڑوس میں اس موت کا اعلان کر دے۔

"میرے بھائی کا ایک عزیز دوست ہے جو تقریباً نابینا ہے، وہ دونوں مرنے والوں کی تجہیز و تکفین میں ماہر ہیں۔" اس نے کہا۔

اس سے زیادہ مناسب اور کیا ہو سکتا تھا کہ ایک نابینا اور ایک قاتر العقل شخص انشتے آفندی کی میت کو غسل دیں؟ میں نے اسے بتایا کہ نماز جنازہ کی رسم سہ پہر کو ہو گی اور معززین اور محلے کے لوگ، گلڈ اور مذہبی مدرسے والے شریک ہوں گے۔ میں نے انشتے آفندی کے چہرے اور کچلے ہوئے سر کی حالت بیان کرنے کی کوشش نہ کی، پہلے ہی میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس معاملے کو اعلیٰ سطح پر دیکھا جاتا تھا۔

چوں کہ ہمارے سلطان نے جس کتاب کی ذمے داری میرے انشتے کو دی تھی، اس کے سلسلے میں مالی امداد کی ذمے داری سربراہ خزانچی کو سونپی گئی تھی، مجھے باقی سب سے پہلے انہیں اس موت کی خبر دینی تھی۔ اس کے لیے میں نے اپنے مرحوم بابا کے ایک رشتے دار قالین فروش کو تلاش کیا جو میرے بچپن کے زمانے سے سر دو دروازے کے سامنے خیاطوں کی دکانوں میں کام کرتا تھا۔ جب مجھے وہ مل گیا، میں نے ان

کے دوات دار ہاتھوں کو بوسہ دیا اور التجائیہ انداز میں بتایا کہ مجھے سربراہ خزانچی سے ملنا تھا۔ اس نے مجھے اپنے بیٹھے ہوئے شاگردوں کے درمیان انتظار کروایا جو اپنی گود میں پھیلے رنگے برنگے ریشم سے پردے سی رہے تھے۔ پھر اس نے مجھے سربراہ خیاط کے نائب کے ساتھ جانے کو کہا جو مجھے معلوم ہوا کہ ناپ لینے نکل جا رہا تھا، جب ہم سرو فوارہ دروازے سے پریڈ میدان میں داخل ہوئے، مجھے معلوم تھا کہ میں آیا صوفیہ کے سامنے کتاب خانے سے بچ کر گزرنے میں کامیاب رہوں گا اور یوں، میں دوسرے منی ایچر فنکاروں کے سامنے اس جرم کے اعلان سے بچ گیا۔

پریڈ میدان میں اب رش تھا، جب کہ عام طور پر مجھے وہ خالی دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ سائلین کے دروازے پر ایک بھی شخص نہ تھا، جس پر دیوان کے دنوں میں درخواست گزار قطاریں بنائے کھڑے ہوتے تھے۔ نہ ہی اناج گودام کے قرب و جوار میں کوئی نظر آتا تھا، یوں تھا جیسے طبیب خانے کی کھڑکیوں سے، بڑھئی کی کارگاہ، بیکری، اصطبل، دوسرے دروازے پر دلہنوں کے گھوڑوں (جن کی آرائشی دم کو میں مرعوب ہو کر دیکھ رہا تھا) اور سرو و صنوبر کے درختوں سے معمول شور کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے اپنے اس چوکنے ہونے کے احساس کو سلام لیک (یا دوسرے دروازے) کے سامنے سے گزرنے کے خوف سے منسوب کیا، جہاں سے میں تھوڑی دیر میں اپنی زندگی میں پہلی بار گزر رہا تھا۔

دروازے پر میں اس جگہ پر توجہ مرکوز کر پایا، جہاں کہا جاتا تھا کہ جلاد ہمیشہ تیار رہتے تھے نہ ہی دربان سے اپنا ہیجان چھپایا یا جو تیکھی نگاہ سے جانچ رہا تھا جو میں فرنیچر سازی کے غلاف کے کپڑے مددگار کے طور پر اٹھائے ہوئے تھا تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ میں اپنے سربراہ کی مدد کر رہا تھا۔

جیسے ہی ہم دیوان میدانی میں داخل ہوئے، ہم پر ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ مجھے اپنی پیشانی اور گردن کی رگوں میں بھی اپنے دل کی تیز دھڑکن محسوس ہو رہی تھی۔ ہر جگہ جس کا بیان اکثر اٹھتے اور نکل آنے والے دوسرے لوگ کرتے تھے، میرے سامنے جنت کے کسی باغ کی مانند کھلا تھا۔ تاہم، مجھے جنت میں داخل ہونے والے آدمی کی سی فرحت و شادمانی محسوس نہ ہوئی، صرف اضطراب اور ایک عقیدت، میں نے خود کو سلطان کا ایک ادنیٰ خادم محسوس کیا جو اب پوری طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ اس دنیاوی بادشاہت کی بنیاد تھے۔ میں نے سبزے پر گھومتے موروں کو دیکھا، چھینٹے اڑاتے فواروں کے ساتھ زنجیر سے بندھے سونے کے پیالے، اور ریشم کے لبادے پہنے وزیر اعظم کے نقیب (جو لگتا تھا زمین کو چھوئے بغیر ہوا ہی میں گھوم رہے تھے) اور مجھے اپنے بادشاہ کی خدمت کا انبساط محسوس ہوا۔ اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ ہمارے سلطان کی خفیہ کتاب کو میں مکمل کرتا، جس کی نامکمل تصویریں میں اپنی بغل میں دبائے ہوئے تھا۔ پوری طرح یہ جانے بغیر کہ میں کیا کر رہا تھا، میں خیاط کے عقب میں چلتا گیا، میری نظریں دیوان کے مینار پر جمی تھیں، میں اس قرب باب مرعوبیت کی بجائے خوف کے حصار میں تھا۔

شاہی خدمت گار کے ہمراہ جو ہمارے ساتھ نتھی ہو گیا تھا، ہم یوں جیسے خواب میں، خوف اور

خاموشی سے دیوان اور خزانے کی عمارتوں سے گزرے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں جیسے یہ جگہ پہلے بھی دیکھ چکا ہوں اور اسے بخوبی جانتا تھا۔

ہم ایک چوڑے دروازے سے کمرے میں داخل ہوئے جسے قدیم دیوان تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے بڑے سے گنبد تلے میں نے ماہر کاریگروں کو کپڑا، چمڑے کے ٹکڑے، چاندی کی نیام اور سیپ کے صندوق لیے بیٹھے دیکھا۔ میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ یہ آدمی ہمارے سلطان کے کاریگروں میں سے تھے: جلد ساز، چاندی کا کام کرنے والے، عصا بنانے والے، ہاتھی دانت کے نقاش اور رباب ساز۔ وہ سب سربراہ خزانچی کے دروازے کے باہر اجرتوں کی درخواستیں، مواد کے حصول اور سلطان کے ممنوعہ ذاتی حرم میں پیمائش کے لیے داخلے کی اجازت کے منتظر کھڑے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان میں کوئی مصور یا طلا کار نہ تھا۔

ہم بھی ایک طرف کھڑے ہو گئے اور انتظار کرنے لگے۔ کبھی کبھار ہمیں خزانچی کے کاتب یا منشی کی اونچی آواز سنائی دیتی، کھاتے میں کسی غلطی کا شک کرتے، وضاحت کی درخواست کرتے ہوئے، اس کا نرمی سے جواب دیا جاتا۔ مثال کے طور پر، قفل ساز کی طرف سے۔ آوازیں بمشکل ہی کسی سرگوشی سے بلند تھیں، صحن کی کبوتروں کی پھڑپھڑاہٹ جو ہمارے اوپر موجود گنبد میں گونجتی، عاجز کاریگروں کی معمولی درخواستوں سے زیادہ بلند آواز تھی۔

جب ہماری باری آئی، میں سربراہ خزانچی کے بڑے سے گنبد والے چیمبر میں داخل ہوا، وہاں صرف ایک کاتب بیٹھا تھا۔ میں نے جلدی سے وضاحت کی کہ سربراہ خزانچی کو توجہ میں ایک اہم معاملہ لانا ضروری تھا: ایک کتاب کا منصوبہ جس کی ذمے داری ہمارے سلطان نے دی تھی اور جو ان کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ دلچسپی لیتے ہوئے کہ میں کیا اٹھائے ہوئے تھا، کاتب نے اپنی نگاہیں اٹھائیں۔ میں نے اسے ہمارے انشتے کی کتاب کی تصویریں دکھائیں۔ میں نے دیکھا کہ تصویروں کا انوکھا پن، ان کا جاذب نظر نرالا پن، اس کو چونکا گیا۔ میں نے اسے جلدی سے اپنے انشتے کا نام بتایا، ان کی عرفیت اور ان کا پیشہ، مزید یہ کہ وہ ان تصویروں کے معاملے پر قتل کر دیے گئے تھے۔ میں نے تیزی سے بات کی، پوری طرح آگاہ کہ اگر ہمارے سلطان تک رسائی کے بغیر میں محل سے واپس لوٹ گیا تو خود مجھ پر انشتے کو اس خوفناک حالت میں پہنچانے کا الزام عائد ہوگا۔

جب کاتب، سربراہ خزانچی کو آگاہ کرنے گیا، مجھے ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ کیا سربراہ خزانچی جسے جیسا کہ میرے انشتے نے ایک بار مجھے مطلع کیا تھا، ہمیشہ ہمارے سلطان کے ساتھ رہتا تھا، جو بعض اوقات سلطان کے لیے جائے نماز بچھاتا تھا اور جو سلطان کا محرم راز تھا ـــ کیا وہ بھی مجھ سے ملنے کی خاطر محل کے اندرونی حصے سے باہر نکلے گا؟ یہ حقیقت کہ محل کے اندر میری خاطر ایک قاصد بھیجا گیا تھا، ناقابل یقین تھی۔ میں نے سوچا کہ عالی مقام ہمارے سلطان خود کہاں ہوں گے۔ کیا وہ ساحل کے قریب کسی کوشک میں ہوں

کہ کیا وہ حرم میں تھے؟ کیا سربراہ خزانچی ان کے پاس تھا؟

خاصی دیر بعد، مجھے طلب کیا گیا۔ مجھے اس طرح بیان کرنے دیں: میں اس طرح بے خبری میں تھا کہ میرے پاس خوف زدہ ہونے کا کوئی وقت نہ تھا۔ اگر تھا بھی، میں تب گھبرایا جب میں نے دروازے پر کھڑے جلد ساز ماہر کے چہرے پر احترام اور حیرت کے تاثرات دیکھے۔ میں نے اندر قدم رکھا اور یک دم دہشت زدہ ہو گیا، میرا خیال تھا کہ میں بولنے کے قابل نہ تھا۔ وہ سونے کی کشیدہ کاری والی دستار پہنے تھے جو صرف وہ ان کے وزیر اعظم ہی زیب تن کرتے تھے، وہاں میں سربراہ خزانچی کے سامنے حاضر تھا۔ وہ تصویروں کو دیکھ رہے تھے جو ان کے سامنے اس میز پر دھری تھیں جہاں کاتب نے مجھ سے لینے کے بعد رکھی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے ان تصویروں کو بنانے والا میں تھا۔ میں نے ان کے لبادے کی سنجاف کو بوسہ دیا۔

"میرے پیارے بچے۔" وہ بولے، "میں غلط نہیں سمجھا ہوں، ہے نا، کہ تمہارے انشتے کی وفات ہو گئی ہے؟"

میں گھبراہٹ میں یا شاید احساس کمتری میں جواب نہ دے پایا اور بس سر ہلا دیا۔ اس دوران ایک بالکل غیر متوقع بات ہوئی۔ وہیں سربراہ خزانچی کی [illegible] اور حیران نگاہوں میں، میری آنکھ سے ایک آنسو گر کر میرے رخسار پر پھسل گیا۔ میں عجیب طور پر [illegible] موجودگی، سربراہ خزانچی کے ہمارے سلطان سے رخصت لے کر مجھ سے بات کرنے اور ان کے اس قدر قریب ہونے کے اثر میں تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن مجھے ذرا سی بھی شرمندگی یا خجالت محسوس نہ ہوئی۔

"دل کھول کر رو لو، میرے پیارے بچے۔" سربراہ خزانچی نے کہا۔

میں سسکیاں بھر کر روتا رہا۔ اگرچہ میرا خیال تھا کہ پچھلے بارہ برس نے مجھے بڑا کر دیا تھا، سلطان کی اتنی قربت میں، سلطنت کے مرکز میں، کوئی جلد ہی سمجھ لیتا ہے کہ وہ بچہ ہی ہے۔ مجھے پروا نہ تھی کہ باہر کھڑے چاندی کے کاریگر یا جلد ساز میری سسکیاں سن لیں گے۔ میں جانتا تھا کہ میں سربراہ خزانچی کے سامنے اعتراف کر چکا تھا۔

ہاں، میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا، بالکل جیسے میرے ساتھ ہوا تھا۔ جب میں دوبارہ اپنے مرحوم انشتے سے ملا، میری شکورے سے شادی، حسن کی دھمکیاں، میرے انشتے کی کتاب سے متعلق مشکلات اور تصویروں کا راز، میں نے اپنے حواس بحال کیے۔ مجھے یقین محسوس ہوا کہ خود کو اس پھندے سے جس میں پھنس چکا تھا، بچانے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ خود کو ہمارے سلطان عالم پناہ کے عدل اور شفقت و مہربانی کے سامنے پیش کر دوں اور یوں میں نے کچھ بھی نہ چھپایا۔ وہ سب جو میں نے کہا تھا، اسے ہضم کرنے اور مجھے جلادوں کے حوالے کرنے سے پہلے کیا سربراہ خزانچی میری روداد سلطان تک پہنچائیں گے؟

"تاخیر کے بغیر انشتے آفندی کی وفات کا اعلان کتاب خانے میں کر دیا جائے۔" سربراہ خزانچی نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تمام فنکار ان کے جنازے میں شرکت کریں۔"

انہوں نے اس تصدیق کے لیے میری طرف دیکھا کہ آیا مجھے کوئی اعتراض تو نہ تھا۔ ان کی حوصلہ افزائی سے ہمت پا کر میں نے مجرم سے متعلق اپنی فکر کا اظہار کیا اور میرے انشتے اور طلاکار تحسین آفندی کی اموات کے پیچھے موجود ممکنہ مقصد کا۔ میں نے اشارہ دیا کہ ارض روم کے مبلغ کے پیروکار، اور ان خانقاہوں کو بند کرانے والے ملوث ہو سکتے تھے جہاں موسیقی بجائی جاتی تھی اور رقص ہوتا تھا۔ جب میں نے سربراہ خزانچی کے شک بھرے تاثرات دیکھے، میں نے اپنے دوسرے شبہات میں بھی انہیں شریک کیا: میں نے انہیں مطلع کیا کہ انشتے آفندی کی کتاب کی طلاکاری اور مصوری کے لیے مدعو کیے جانے پر انعام اور اعزاز بھی فنکاروں میں ناقابل گریز مسابقت اور حسد کا نتیجہ بن سکتا تھا۔ منصوبے کو راز میں رکھنے سے بھی نفرت، بغض اور سازشوں کو ہوا مل سکتی تھی۔ جب الفاظ میری زبان سے ادا ہو چکے، میں نے گھبراہٹ سے محسوس کیا کہ سربراہ خزانچی کو کسی طور مجھ پر شک ہو چکا تھا —— جیسا کہ آپ کو بھی ہو چکا ہے۔ میرے اللہ! انصاف کریں کہ میں بس یہی چاہتا ہوں، اور کچھ نہیں۔

اس کے بعد کی خاموشی میں، سربراہ خزانچی نے مجھ سے اپنی نظریں ہٹائیں، یوں جیسے میری جانب سے میرے الفاظ اور میرے مطلب پر شرمسار تھے اور اپنی توجہ میز پر رکھی تصویروں پر مرکوز کر لی۔

"یہاں 9 تصویریں ہیں۔" انہوں نے کہا، "کتاب میں 10 تصویروں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ انشتے آفندی نے ہم سے یہاں استعمال شدہ سے زیادہ مقدار میں سونا لیا تھا۔"

"قاتل کافر نے ضرور آخری تصویر چوری کی ہو گی، جس پر خاصا سونا استعمال کیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تم نے ہمیں بتایا نہیں کہ کاتب، خطاط کون ہو سکتا تھا۔"

"میرے مرحوم انشتے نے ابھی کتاب کا متن مکمل نہیں کیا تھا۔ وہ اس کی تکمیل میں میری معاونت کی توقع کر رہے تھے۔"

"میرے پیارے بچے، تم نے ابھی بتایا کہ تم استنبول حال ہی میں آئے ہو۔"

"ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔ میں تحسین آفندی کے قتل کے تین روز بعد آیا تھا۔"

"تمہارے کہنے سے مراد یہ ہے کہ تمہارے انشتے آفندی سال بھر سے ایک غیر تحریری —— بے وجود —— مسودے کی مصوری پر کام کر رہے تھے؟"

"جی، جناب۔"

"کیا تب انہوں نے تمہیں بتایا کہ کتاب کیا کہانی بیان کرنے والی تھی؟"

"بے شک، جو ہمارے سلطان نے بیان کیا کہ وہ چاہتے تھے: ایک کتاب جو اسلامی ہجری کیلنڈر کے ہزارویں برس کی عکاسی کرے، جس میں فوجی طاقت اور اسلام کے فخر و غرور کی ایسی عکاسی ہو کہ وہ وینس کے ڈوگے کے دل پر دھاک بٹھا دے اور خاندان عثمانیہ کی طاقت اور امارت کی بھی۔ کتاب کو ہماری سلطنت

ہے اتنی قابل قدر اور انتہائی اہم پہلوؤں کی عکاسی کرتی تھی اور بالکل Treatises on Physiognomy کی طرح ہمارے سلطان کی ایک تصویر کتاب کے عین درمیان بنائی جاتی تھی۔ مزید یہ کہ چوں کہ تصاویر فرنگیوں کے طریق کار پر فرنگیوں کے انداز میں بنائی گئی تھیں، وہ وینس کے ڈیوک کو مرعوب کر دیتیں اور اس کے دل میں دوستی کی خواہش کو پروان چڑھاتیں۔"

"میں اس سب سے آگاہ ہوں لیکن کیا یہ کتے اور درخت، خاندان عثمانیہ کے قابل قدر اور اہم پہلو ہیں؟" انہوں نے شوریدہ سری سے تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے انشتے، خدا انہیں جنت نصیب کرے، ان کا اصرار تھا کہ کتاب کو صرف سلطان کی دولت وامارت کی ہی عکاسی نہیں کرنی چاہیے بلکہ ان کے در پردہ رنج وملال کے ساتھ ساتھ ان کی روحانی اور اخلاقی طاقت کی بھی تصویر کشی کرنی چاہیے۔"

"اور ہمارے سلطان کی تصویر؟"

"میں نے وہ نہیں دیکھی۔ شاید وہی ہے جسے قاتل نے چھپا لیا ہے۔ کون جانتا ہے، وہ اس وقت اسی کے گھر میں ہو۔"

میرے انشتے ایک ایسے شخص کے رستے پر چکے تھے جنہیں ان عجیب سی تصویروں کے انتظام کی ذمے داری سونپی گئی تھی جو سربراہ خزانچی کے نزدیک تھیں، بجائے ایسے شخص کے جو ایسی کتاب کی تشکیل کر رہا تھا جو ان کے اوکے گئے بیش قیمت سونے کی حق دار... کیا سربراہ خزانچی یہ سوچ رہے تھے کہ میں نے انشتے کی بیٹی سے شادی کے لیے ایک نااہل اور ناقابل اعتبار... قتل کیا تھا، یا کسی اور وجہ سے — شاید سونے کے ورق فروخت کرنے کے لیے؟ ان کی نگاہ سے میں پڑھ سکتا تھا... مقدمہ بعد ہونے والا تھا، سو گھبراہٹ اور اپنی ہچکی آخری سکت سے بات کرتے ہوئے، میں نے اپنا نام صاف کرنے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے انشتے نے مجھے اس راز میں شریک کیا تھا کہ انہوں نے جن منی ایچر فنکاروں کی خدمات لی تھیں، انہی میں سے کسی ایک نے غالباً نفیس آفندی کا قتل کیا تھا۔ اپنی بات کو مختصر رکھتے ہوئے، میں نے انہیں بتایا کہ کیسے انشتے آفندی کو زیتون، بگلے یا تتلی پر شک تھا۔ میرے پاس کافی ثبوت تھا نہ ہی میں خود اعتماد تھا۔ بعد میں میں نے محسوس کیا کہ سربراہ خزانچی کے خیال میں میں ایک کمینے بہتان گو اور احمق باتونی کے سوا کچھ نہ تھا۔

آخر کار، مجھے خوشی محسوس ہوئی جب سربراہ خزانچی نے کہا کہ ہمیں انشتے کی پراسرار موت کی تفصیلات کو کتاب خانے سے چھپانا ہوگا، میں نے اسے یہ علامت سمجھا کہ انہیں میری کہانی پر یقین آ گیا تھا۔ تصویریں سربراہ خزانچی نے رکھ لیں اور میں سلام لیک کے دروازے سے گزرا — جو پہلے مجھے جنت کے دروازے کی طرح لگا تھا۔ محافظوں کی متجسس جانچتی نگاہوں میں باہر نکلنے کے بعد، میں برسوں کی غیر حاضری کے بعد واپس گھر پہنچنے والے کسی سپاہی کی طرح، فوراً ہی پرسکون ہو گیا۔

بالکل مختلف حالت میں ہوں اور میری روح برسوں زمین پر تکلیف میں رہنے کے بعد اپنی سابقہ روحانی طلعت کو واپس پہنچنے پر قدرے سکون میں ہے۔

میری روح نے عارضی طور پر میرے بدن کو چھوڑ دیا جو دوات کی ضربوں پر خون میں لتھڑا ہوا تکلیف کے عالم میں پڑا تھا اور ایک شدید روشنی میں کچھ دیر کو وہ لرزی، اس کے بعد سورج جیسے روشن چہروں والے دو خوب صورت اور مسکراتے فرشتے ..... جیسے میں نے لاتعداد بار "ہادی الارواح" میں پڑھے تھے ..... ملکوتی روشنی میں میرے قریب آئے اور مجھے میری بانہوں سے تھام لیا، جیسے میں ابھی تک کوئی وجود تھا اور اوپر اٹھنے لگے۔ بے حد سکون اور نرمی سے، بے حد تیزی سے ہم نے پرواز کی، جیسے کسی مبارک خواب میں ہم آگ کے جنگلوں، روشنی کے پایاب دریاؤں اور تاریک سمندروں اور برف کے پہاڑوں پر سے گزرے۔ ہر کسی کو عبور کرتے ہمیں ہزاروں برس لگے، اگرچہ وہ پلک جھپکنے سے زیادہ محسوس نہ ہوئے تھے۔

ہم ساتوں آسمانوں پر سے بلند ہوئے مختلف قسم کے ہجوم، انوکھی مخلوقات، دلدلوں اور لاتعداد اقسام کے حشرات الارض اور پرندوں کے جھنڈ کے بادلوں سے گزرتے ہوئے۔ ہر آسمان پر وہ فرشتہ جو رہنمائی کر رہا تھا، پھاٹک پر دستک دیتا اور جب دور سے کہیں سوال پوچھا جاتا، "کون ہے؟" فرشتے میرے ناموں اور نسبتوں کو بیان کرتے، یہ کہتے ہوئے خلاصہ کرتے کہ "اللہ تعالیٰ کا ایک فرمانبردار بندہ!" ..... جس پر میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر جاتے۔ تاہم میں جانتا تھا کہ ابھی روزِ حساب میں ہزاروں برس باقی تھے جب جنتیوں کو دوزخیوں سے الگ کیا جائے گا۔

میرا اٹھایا جانا، چند معمولی سے فرق کے ساتھ، بالکل ویسا تھا جیسا غزالی، الجوزی اور دوسرے عالموں نے موت پر اپنی تحریروں میں بیان کیا تھا۔ ابدی معمے اور تاریک پہیلیاں جو صرف مردے ہی بوجھ سکتے تھے، ہزاروں رنگوں میں ایک ایک کر کے سامنے آتے ہوئے اب مجھ پر آشکار اور روشن ہو رہے تھے۔

او وہ میں درست طور پر ان رنگوں کو کس طرح بیان کر سکتا ہوں جو میں نے اس غیر معمولی سفر کے دوران دیکھے؟ پورا جہان رنگوں سے بنا تھا، ہر شے رنگ تھی، بالکل جب مجھے احساس ہوا کہ مجھے باقی تمام وجود اور چیزوں سے الگ کرنے والی قوت رنگ پر مشتمل تھی، میں اب جانتا تھا کہ وہ خود رنگ تھا جس نے شفقت سے مجھے گلے لگا لیا اور دنیا سے جوڑ لیا۔ میں نے نارنجی رنگوں کے آسمان، خوب صورت سبز رنگ کے جسم، بھورے انڈے اور داستانوی آسمانی رنگ کے گھوڑے دیکھے۔ دنیا ان تصویروں اور داستانوں سے استوار تھی جن کا میں برسوں شوق سے جائزہ لیتا رہا تھا۔ میں نے تخلیق کو مرعوبیت اور حیرت سے دیکھا یوں جیسے پہلی مرتبہ، بلکہ اس طرح بھی جیسے اس نے میری یادداشت سے ظہور کیا تھا۔ جسے میں "یادداشت" کہتا تھا اس میں پورا جہان تھا: میرے سامنے دونوں سمتوں میں لامتناہی پھیلے وقت کے ساتھ، میں سمجھ گیا کہ کیسے وہ جہان جس کا میں نے پہلے تجربہ کیا، وہ بعد میں یادداشت کے طور پر قائم رہ سکتا تھا۔ جب میں رنگ کے اس جشن میں گھرا فوت ہوا، میں نے یہ بھی دریافت کیا کہ میں اس قدر پرسکون کیوں تھا، یوں جیسے میں کس

جکڑ بندی سے آزاد ہو گیا تھا۔ اب کے بعد کچھ بھی پابند نہ تھا اور میرے پاس الاحمد دورِ ماں و مکاں تھا جس
میں مجھے تمام ادوار اور تمام جگہوں کا تجربہ کرنا تھا۔

جیسے ہی مجھے اس آزادی کا ادراک ہوا، خوف اور سرخوشی سے میں جان گیا کہ میں "اس" کے
قریب تھا۔ اس دوران میں نے انتہائی لاتعلق سرخی کی موجودگی کو عاجزی سے محسوس کیا۔

ذرا سی دیر میں سرخی نے سب کو بھگو دیا۔ اس رنگ کا حسن مجھ پر اور پوری کائنات پر چھا گیا۔
جب میں "اس" کے حضور اس انداز میں حاضر ہوا، مجھے حسرت کے عالم میں رو دینے کی آرزو ہوئی۔ میں
اچانک "اس" کے حضور لائے جانے پر شرمسار تھا، جیسا کہ میں خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ میرے دماغ کے
ایک دوسرے حصے نے یاد کیا کہ میں نے کتابوں میں موت کے بارے میں پڑھا تھا، یہ کہ "وہ" عزرائیل
اور اپنے دوسرے فرشتوں کو اپنے حضور لانے کی ذمے داری سونپے گا۔

کیا میں "اسے" دیکھ پاؤں گا؟" میں جوش و ہیجان کے عالم میں سانس بھی لینے کے قابل نہ تھا۔

میرے قریب آتا سرخ — ہر جگہ موجود سرخ جس کے درمیان کائنات کے تمام عکس اور
تصویریں کھیلتے تھے — اتنا عالی شان اور خوب صورت تھا کہ اس نے میرے آنسوؤں کے بہنے کی رفتار
بڑھا دی، یہ سوچ کر کہ میں اس کا حصہ بن جاؤں گا اور "اس" کے قریب ہو جاؤں گا۔

لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ "اس" سے زیادہ میرے قریب نہ آئے گا جتنا کہ وہ پہلے ہی تھا۔
اس نے میرے متعلق اپنے فرشتوں سے دریافت کیا تھا اور انہوں نے میری تعریف کی تھی۔ اس نے مجھے
اپنے احکامات اور ممنوعات کے پابند بندے کے طور پر پایا تھا اور اسے مجھ سے محبت تھی۔

بڑھتی ہوئی خوشی اور بہتے ہوئے آنسو اچانک ایک تکلیف دیتے شبے کے زہر کا شکار ہو گئے۔
احساسِ خطا کے شکار اور اپنے تذبذب سے بے چین، میں نے "اس" سے پوچھا:

"اپنی زندگی کے پچھلے تیس برسوں میں، میں ان کافرانہ تصویروں کے زیرِ اثر رہا ہوں جو میں
نے وینس میں دیکھیں۔ حتیٰ کہ ایسا بھی وقت تھا جب میں اسی طریقے اور انداز میں اپنی تصویر بھی چاہتا تھا
لیکن میں خائف تھا۔ اس کی بجائے، میں بعد میں آپ کے جہان، آپ کے بندوں اور ہمارے سلطانِ ظلِ
الٰہی کی تصویر کشی کا فرض فرنگیوں کے انداز میں کرتا رہا۔"

مجھے "اس" کی آواز یاد نہیں لیکن مجھے اپنے خیالوں میں "اس" کا دیا گیا جواب یاد آیا۔

"مشرق و مغرب میرے ہی ہیں۔"

میں بہ مشکل ہی اپنے جوش اور ہیجان پر قابو پا سکا۔

"ٹھیک ہے پھر، اس سب کا کیا مطلب ہے، اس سب — اس دنیا کا؟"

"اسرار"، میں نے اپنے خیالوں میں سنا یا شاید "رحم"۔ لیکن مجھے ان دونوں کا یقین نہیں تھا۔

جب فرشتے میرے قریب آئے، میں جانتا تھا کہ آسمانوں کی اس بلندی پر میرے متعلق کوئی

فیصلہ کیا جا چکا تھا لیکن مجھے بے شمار دوسری ارواح کے جو پچھلے ہزاروں برسوں میں اس دنیا سے گزر گئی تھیں، اس روز حساب تک برزخ کے الہامی توازن میں انتظار کرنا تھا، جب ہمارے بارے میں حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔ یہ کہ سب کچھ اس صورت ظہور میں آیا جیسا کتابوں میں لکھا تھا، اس نے مجھے مسرور کر دیا۔ جب میں پیچھے آیا تو مجھے اپنے مطالعے سے یاد آیا کہ میری تدفین کے وقت مجھے میرے بدن میں دوبارہ ڈالا جائے گا۔

لیکن میں جلد ہی سمجھ گیا کہ "میرے بے روح بدن میں دوبارہ روح داخل ہونے" کا مظہر صرف کہنے کی بات تھی، شکر خدایا۔ جب انہوں نے نماز کے بعد میرے تابوت کو کندھوں پر اٹھایا اور مسجد کے ساتھ چھوٹی سی پہاڑی پر موجود قبرستان پہنچے، باوجود ان کے رنج و غم کے باوجود، جنازے کا با احترام اہتمام حیرت انگیز طور پر منظم تھا، جس پر مجھے فخر ہوا۔ اوپر بلندی سے جنازے کا جلوس نازک سی باریک تار کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

مجھے صورت حال کی وضاحت کرنے دیں: جیسا کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کی معروف حدیث سے اخذ کیا جا سکتا ہے — جس میں بیان ہے کہ "تابع دار بندے کی روح وہ پرندہ ہے جو جنت کے درختوں سے دانہ چگتا ہے" — موت کے بعد روح گنبد افلاک میں گھومتی ہے۔ جیسا کہ ابو عمر بن عبدالبر کا کہنا ہے، اس حدیث سے یہ مراد نہیں کہ روح پرندے میں حلول کر جائے گی یا حتیٰ کہ خود پرندہ بن جائے گی، لیکن جیسا کہ معروف عالم الجوزی نے مناسب وضاحت کی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ روح وہاں مل سکتی ہے جہاں پرندے اکٹھے ہوتے ہیں۔ مقام جہاں سے میں مشاہدہ کر رہا تھا، جسے نظارے یا تناظر کو پسند کرنے والے وینس کے فنکار، میرا "نقطۂ نظر" کہتے، اس نے الجوزی کی اس تعبیر کی تصدیق کی۔

مثال کے طور پر، جہاں میں تھا، وہاں سے میں جنازے کے دھاگے جیسے جلوس کو قبرستان میں داخل ہوتے دیکھ سکتا تھا اور کسی تصویر کے تجربے کی سی مسرت سے اس بادبانی کشتی کو رفتار پکڑتے بھی دیکھ سکتا تھا جس کے بادبان ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے جب وہ اس مقام کی طرف رواں تھی، جہاں شاخ زریں، باسفورس سے ملتی تھی۔ مینارے کی بلندی سے نیچے دیکھتے ہوئے، پوری دنیا کسی عالی شان کتاب سے مشابہ تھی جس کے اوراق میں ایک ایک کر کے پلٹ رہا تھا۔

پھر بھی میں اس شخص سے کہیں زیادہ کچھ دیکھ سکتا تھا جس کی روح ابھی اپنے بدن سے آزاد ہوئی ہو اور وہ اس بلندی کو پہنچ جائے اور مزید یہ کہ میں یہ سب ایک ہی وقت میں دیکھ سکتا تھا: باسفورس کے دونوں جانب، اسکودر سے آگے، خالی احاطے میں قبر کے کتبوں کو؛ مینڈک پھاند کھیلتے بچوں کو؛ بارہ سال اور سات مہینے پہلے ملاحوں کے سات جوڑوں کو سفارتی معاملات کے وزیر کے دلفریب جلوس کی کشتی کو چپو سے چلاتے، جب ہم سمندر کنارے وینس کے سفیر کے محل سے اس کے ہمراہ آئے تھے اور ہمارا مرحوم مقدم وزیر اعظم رجب پاشا نے کیا تھا؛ نئے لانگا بازار میں ایک عظیم جسیم عورت کو بڑی سے گو بھی کو کسی ایسے بچے کی طرح اٹھائے ہوئے تھے وہ دودھ پلانے والی ہو؛ دیوان قاصد رمضان آفندی کے مرنے پر میری ترقی کی

راہ کھلنے پر میری سرخوشی؛ کیسے جب میری ماں دھلے کپڑے صحن میں سوکھنے کے لیے پھیلاتی تھی، میں اپنی دادی کی گود میں بیٹھا سرخ قمیصوں کو دیکھتا تھا؛ کیسے میں دایہ کی تلاش میں دور دراز کے علاقوں دوڑا گیا جب شکورے کی ماں، خدا اسے جنت نصیب کرے، دردِ زہ میں تھی؛ اس سرخ کمربند کی جگہ جسے میں نے چالیس برس پہلے کھو دیا تھا (اب مجھے معلوم ہے کہ اسے وصفی نے چرایا تھا)؛ دور فاصلے پر ایک شان دار قلعہ اور باغ جس کا میں نے ایک بار اکیس برس پہلے خواب دیکھا تھا، جو میری اللہ سے دعا ہے کہ ایک روز تصدیق ہوگی کہ جنت ہے؛ کٹے ہوئے سر، ناکیں اور کان جو جارجیا کے گورنر جنرل علی پے نے استنبول بھیجے جس نے گور کے قلعے میں باغیوں کو کچلا تھا اور میری حسین پیاری شکورے، جو گھر میں میری موت کا ماتم کرتے ہوئے ہمسائے کی عورتوں سے دور الگ جا بیٹھی اور ہمارے صحن میں بنے اینٹوں کے چولہے کے شعلوں کو دیکھنے لگی۔

جیسا کہ کتابوں میں تحریر ہے اور عالموں نے توثیق کی، روح چار مملکتوں میں رہتی ہے: 1۔ کوکھ 2۔ عارضی فانی دنیا۔ 3۔ برزخ یا اعراف جہاں اب میں روزِ حساب کا منتظر ہوں اور 4۔ دوزخ یا جنت جہاں میں حساب کے بعد پہنچوں گا۔

برزخ کی درمیانی حالت سے، ماضی اور حال کا وقت ایک ساتھ دکھائی دیتا ہے اور جب تک روح اپنی یادوں کے درمیان رہتی ہے، مکان یا جگہ کی حد بندی یا قید حائل نہیں ہوتی۔ صرف تب ہی جب کوئی زمان اور مکان کے عقوبت خانوں سے فرار ہوتا ہے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ زندگی ایک تنگ لباس یا قید خانہ ہے۔ تاہم، مُردوں کی مملکت میں وجود یا بدن کے بغیر ایک روح ہونا مبارک ہے، اس طرح زندوں کے درمیان روح کے بغیر ایک وجود یا بدن ہونا، افسوس کی بات ہے کہ کسی کو بھی موت کے بغیر اس کا ادراک نہیں ہوتا۔ اس لیے میرے خوب صورت جنازے کے دوران، جب میں نے شکورے کو بے کار میں رو رو کر بے حال ہوتے دیکھا، میں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ جنت میں ہمیں اجسام کے بغیر روحیں اور اس جہان میں روحوں کے بغیر اجسام عطا کرے۔

یہ میں ہوں، استاد عثمان

آپ ان بگڑی شکل والے بدمزاج بڈھوں کو جانتے ہی ہیں جنھوں نے اپنی زندگیاں نیک دلی سے فن کے لیے وقف کر دیں۔ وہ اپنی راہ میں آنے والے ہر کسی شخص پر حملہ کر دیں گے۔ وہ عام طور پر دبلے پتلے، لاغر اور دراز قد ہوتے ہیں۔ اپنے پیچھے چھوڑے طویل عرصے کی طرح، وہ اپنے سامنے بتدریج گھٹتے ہوئے بہت سے دن چاہیں گے۔ وہ مزاج کے تیز ہوتے ہیں اور ہر کسی شے کی شکایت کرتے ہیں۔ وہ ہر طرح کی صورت حال میں بالیں اپنے ہاتھ میں چاہیں گے کہ ان کے گرد موجود ہر کوئی مایوسی کے عالم میں اپنے ہاتھ جھاڑ دے، انھیں کچھ بھی یا کوئی بھی پسند نہیں ہوتا۔ میں یہ سب جانتا ہوں کیوں کہ میں ان ہی میں سے ایک ہوں۔

استادوں کے استاد، نصراللہ سلیم چلیبی جن کے ساتھ مجھے ایک ہی کتاب خانے میں اکٹھے کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا، اسی طرح اپنی عمر کی آٹھویں دہائی میں تھے جب میں سولہ برس کا ایک شاگرد تھا (اگرچہ وہ اتنے تند خو نہیں تھے جتنا میں اب ہوں)۔ عظیم اساتذہ میں سے آخری، جمال علی جو چھتیس سال قبل وفات پا گیا تھا، ایسا ہی تھا (اگرچہ وہ میرے جتنا دبلا پتلا اور طویل قامت نہیں تھا)۔ چوں کہ ان داستانوی استادوں پر تنقید کے تیراب مجھے اپنی پشت پر لگتے ہیں جنھوں نے اپنے وقت کے کتاب خانوں میں کام کیا تھا، میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہم پر لگائے جانے والے گھٹیا الزامات بے بنیاد ہیں۔ حقائق یہ ہیں:

1۔ یہ سب کہ ہمیں جدت پسند نہیں، ایسا کچھ نیا ہے ہی نہیں، جو پسند کے قابل ہو۔

2۔ ہم اکثر آدمیوں سے یوں سلوک کرتے ہیں جیسے وہ احمق ہوں کیوں کہ بلاشبہ بیشتر آدمی ہیں ہی احمق، اس لیے نہیں کہ ہم برہمی، ناخوشی یا اپنے کردار میں کسی خامی کا شکار ہیں۔ (بے شک کہ ان لوگوں سے بہتر برتاؤ زیادہ نفیس و مہذب اور باعقل ہوگا)۔

3۔ میں بہت سے ناموں اور چہروں کو بھلا دیتا اور بھول جاتا ہوں ——— ماسوائے ان ننھی اچھے فنکاروں کے جنھیں میں پسند کرتا ہوں اور شاگردی کے زمانے سے ان کی تربیت کی ہے...... اس کا سبب سٹھیا جانا نہیں بلکہ کیوں کہ نام اور چہرے اس قدر بے رنگ اور بے چمک ہیں کہ بمشکل ہی یاد رہ پاتے ہیں۔

تکلیف تھی۔ میں نے اپنا محدب عدسہ جیب میں رکھا اور لڑکے کے ساتھ چل دیا۔

وقفہ لیے بغیر دیر تک کام کرنے کے بعد سڑکوں پر چلنا کیسا اچھا لگتا ہے! ایسے وقتوں میں پورا جہان بالکل قدیم اور مبہوت کن لگتا ہے، یوں جیسے اللہ نے اسے ایک روز پہلے ہی تو بنایا ہو۔

میں نے کتوں کی ان تمام تصویروں سے جو میں نے کبھی دیکھی تھیں، زیادہ بامعنی ایک کتا دیکھا۔ میں نے ایک گھوڑا دیکھا، اس سے ایک کمتر مخلوق جو میرے استاد منی ایچر فنکار بناتے تھے۔ میں نے ہپوڈروم میں صنوبر کے ایک درخت کا جائزہ لیا۔ وہی درخت جس کے پتوں کو میں نے ابھی ابھی ارغوانی رنگ دیا تھا۔

ہپوڈروم یا میدان میں چہل قدمی کرنا، جس کی پریڈوں کی میں نے گزشتہ دو برس میں تصویر کشی کی تھی، خود اپنی مصور کردہ تصویر پر قدم رکھنے کے مترادف تھا۔ کہہ لیجیے کہ ہمیں ایک گلی کا موڑ مڑنے والے تھے: فرنگی انداز کی تصویر میں اس کا نتیجہ ہمارے فریم اور تصویر دونوں سے باہر نکلنے کی صورت نکلتا، ہرات کے عظیم فنکاروں کے طریقے پر بنائی گئی تصویر میں یہ ہمیں اس مقام پر لے آتی جہاں سے اللہ ہمیں دیکھتا ہے، چینی مصوری میں ہم پھنس جاتے کیوں کہ چینی مصوری لامتناہی ہے۔

مجھے معلوم ہوا کہ اگر خدمت گار مجھے دیوان چیمبر میں نہیں لے جا رہا تھا جہاں میں درج ذیل موضوعات پر بات چیت کے لیے سربراہ خزانچی سے ملتا تھا، مسودے اور شتر مرغ کے تزئین شدہ انڈے یا دوسرے تحائف جو میرے منی ایچر فنکار ہمارے سلطان کے لیے تیار کر رہے تھے، مصوروں کی صحت یا خود سربراہ خزانچی کا دستور اور ذہنی سکون، رنگ، سونے کے ورق اور دیگر مواد کا حصول، عمومی شکایات اور درخواستیں، ہمارے سلطان عالم پناہ کی خواہشیں، خوشیاں، مطالبے اور طبع، میری بینائی، میری عینک یا محدب عدسے یا گٹھیا کا درد یا سربراہ خزانچی کا بیکار داماد یا اس کی چقندری کی صحت۔ خاموشی سے ہم سلطان کے ذاتی باغ میں داخل ہوئے۔ یوں جیسے کسی جرم کا ارتکاب کرتے لیکن بڑے مہذب انداز میں احتیاط سے ہم درختوں میں سے ہوتے ہوئے سمندر کی طرف اترے۔

''ہم سمندر کنارے کوشک کے قریب جا رہے ہیں۔'' میں نے سوچا ''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں سلطان سے ملاقات کروں گا۔ ضرور عالی حضرت یہیں ہوں گے۔'' لیکن ہم نے راستہ بدل لیا۔ ہم کشتیوں اور قائق (چپو سے چلنے والی کشتی) کے چھپروں کے عقب میں پتھر کی عمارت کے محرابی راستے سے چند قدم آگے گزرے۔ اپنے سرخ یونیفارم میں ملبوس شاہی محافظوں کو دیکھنے سے قبل میں محافظوں کی تندور میں پکتی روٹی کی مہک سونگھ سکتا تھا۔

سربراہ خزانچی اور شاہی محافظوں کا کمان دار ایک ہی کمرے میں موجود تھے: فرشتہ اور شیطان! کمان دار جس نے محل کے میدانوں میں ہمارے سلطان کے نام پر پھانسیاں دیں ...... جس نے تشدد کیا، تفتیش کی، زدوکوب کیا، اندھا کیا اور درے لگائے ...... مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ یوں تھا جیسے کوئی غیر اہم تجارتوں کا کاروباری شخص جس کے ساتھ میں کسی کارواں سرائے کے کمرے میں رہنے پر مجبور تھا، کوئی دلوں کو

گر مار دیے والی کہانی سنانے کو تھا۔

سربراہ خزانچی نے جھجکتے ہوئے کہا، ''ہمارے سلطان نے ایک سال قبل انتہائی خفیہ رکھنے کی شرط کے ساتھ مجھے ایک مسودہ تیار کروانے کی ذمے داری سونپی تھی، ایک کتاب جو سفارتی وفد کے لیے تحائف میں شامل کی جانی تھی۔ کتاب کو خفیہ رکھنے کی روشنی میں، خود سلطان عالی مقام نے یہ مناسب نہ جانا کہ شاہی مورخ استاد عثمان اس مسودے کو تحریر کرنے میں حصہ لیں۔ اسی طرح انہوں نے آپ کو بھی اس معاملے میں شریک نہ کیا جن کی فنکارانہ صلاحیت کی خود سلطان تحسین و تعریف کرتے ہیں۔ بلاشبہ ان کا خیال تھا کہ آپ پہلے ہی ''سرنامۂ ہمایوں'' میں بہت مصروف ہیں۔''

کمرے میں داخل ہوتے ہی، میں اچانک یہ خیال کر چکا تھا کہ کسی بدبخت نے مجھے ہلاک کروا لیا ہے، یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ میں فلاں فلاں تصویر میں الحاد کا مرتکب ہو رہا ہوں اور یہ کہ میں نے کسی دوسری تصویر میں سلطان کی ہجو کی ہے۔ میں نے دہشت سے تصور کیا کہ یہ مخبر، سلطان کو میرے جرم کا قائل کر چکا ہے اور مجھے ابھی میری عمر کا لحاظ کیے بغیر تشدد کے لیے لے جایا جائے گا اور یوں سربراہ خزانچی سے بس یہ سنا کہ وہ بس ہمارے سلطان کے حکم پر ایک مسودے پر باہر کسی سے کام کروانے کی کوشش کر رہا تھا ـــــ یہ الفاظ یقیناً شہد سے زیادہ شیریں تھے۔ کچھ بتائے جانے بغیر، میں نے کتاب کی روداد، جس سے میں پہلے ہی بخوبی واقف تھا۔ میں ارض روم سے ... ہو جانے کے متعلق افواہوں کا رازدار تھا اور قدرتی طور پر کتاب خانے کی اندرونی سازشوں سے بھی واقف تھا۔

''کتاب کی تیاری کا ذمے دار کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''انشتے آفندی، جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔'' سربراہ خزانچی نے بتایا۔ اپنی نگاہیں میری آنکھوں میں ڈالتے ہوئے اس نے مزید کہا، ''آپ واقف ہیں کہ وہ بے وقت موت مرے، یعنی یہ کہ انہیں قتل کیا گیا تھا، ہے ناں؟''

''نہیں۔'' میں نے کسی بچے کی طرح سادگی سے کہا اور خاموش ہو گیا۔

''ہمارے سلطان خاصے برہم ہیں۔'' سربراہ خزانچی نے کہا۔

وہ انشتے آفندی تو بدھو تھا۔ استاد منی ایچر فنکار ہمیشہ اس کا مذاق اڑاتے کہ وہ صاحب علم ہونے سے زیادہ وہم باطل کا شکار تھا، ذہین ہونے سے زیادہ پرعزم۔

جنازے پر مجھے یہ علم بہر حال ہو گیا تھا کہ کچھ گڑبڑ تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اسے کیسے ہلاک کیا گیا تھا؟

سربراہ خزانچی نے وضاحت کی کہ کیسے۔ ہکا بکا۔ خدایا ہماری حفاظت کر۔ لیکن کون ہو سکتا تھا اس کا ذمے دار؟

''سلطان نے حکم دیا ہے۔'' سربراہ خزانچی نے کہا، ''کہ مذکورہ کتاب کو جلد سے جلد مکمل کرو۔

ہوگا، ''سرماہہ اماہون'' کے ساتھ۔۔۔''

''انہوں نے ایک دوسرا فرمان بھی جاری کیا ہے۔'' شاہی محافظوں کے سربراہ نے کہا، ''اگرچہ بلاشبہ یہ ناقابل بیان قاتل منی ایچر فنکاروں میں سے ایک ہے، سلطان اس بیاہ دل شیطان کو تلاش کروانا چاہتے ہیں۔۔۔ وہ اسے ایسی سزا دینا چاہتے ہیں جس سے باقی سب کو ہمیشہ عبرت حاصل رہے۔''

کمان دار کے چہرے پر ایسے جوش و خروش کا تاثر ابھرا جیسے اسے پہلے ہی سلطان کی طرف سے فرمان کردہ اس عبرت انگیز سزا کی خبر تھی۔

میں جانتا تھا کہ ہمارے سلطان نے حال ہی میں ان دونوں آدمیوں کو یہ ذمے داری سونپی تھی۔ یوں ان دونوں کو ایک دوسرے سے تعاون پر مجبور کرتے ہوئے۔۔۔ جس پر وہ دونوں اب بھی اپنی بدمزگی کو چھپا نہ پائے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے اندر سلطان کی محبت بیدار ہوئی جو خوف اور مرعوبیت سے آگے بڑھ گئی۔ خدمت گار لڑکے نے کافی پیش کی اور ہم کچھ دیر ساتھ بیٹھے رہے۔

مجھے بتایا گیا کہ انشتے آفندی کو ایک قرہ آفندی نامی بھانجا تھا، جسے اسی نے پروان چڑھایا تھا، ایک ایسا آدمی جو مصوری اور کتابوں کے فن کی تربیت رکھتا تھا۔ کیا میں اس سے ملا تھا؟ میں خاموش رہا۔ کچھ دیر پہلے، قرہ اپنے انشتے کی دعوت پر ایرانی محاذ سے واپس لوٹ آیا تھا جہاں وہ سرحد پاشا کی کمانڈ میں تھا۔۔۔ کمان دار نے مجھے شک بھری نگاہ سے دیکھا۔ یہاں استنبول میں وہ انشتے کے قریب آگیا اور اسے کتاب کی کہانی معلوم ہوئی جس کی تخلیق کی نگرانی انشتے کر رہا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ جس آفندی کے قتل ہو جانے کے بعد، انشتے کو ان استاد منی ایچر فنکاروں میں سے کسی پر شبہ ہوا جو مسودے پر کام کے لیے رات کو اس کے پاس آتے تھے۔ اس نے ان استادوں کی بنائی تصویریں دیکھ رکھی تھیں اور کہا کہ انشتے کا قاتل۔۔۔ بالکل وہی مصور جس نے سونے کے اوراق کے بڑے بڑے سلطان کی تصویریں چرائی تھیں۔۔۔ ان میں سے ایک تھا۔ اس نوجوان قرہ آفندی نے انشتے کے قتل کی خبر دو روز تک کل اور سربراہ خزانچی سے چھپائے رکھی۔ ان دو روز کے دوران، اس نے جلدی میں انشتے کی بیٹی سے شادی کی، ایک اخلاقی اور مذہبی طور پر مشتبہ معاملہ، اور انشتے کے گھر میں رہائش پذیر ہو گیا۔ یوں میرے ساتھ موجود دونوں آدمیوں کو قرہ پر ہی شبہ تھا۔

''اگر ان کے گھروں اور کام کی جگہوں کی تلاشی لی جائے اور گم شدہ صفحات میرے استاد منی ایچر فنکاروں میں سے کسی ایک کے پاس سے نکل آئیں، تو قرہ کی بے گناہی ثابت ہو جائے گی۔'' میں نے کہا، ''اگرچہ صاف گوئی سے میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ میرے عزیز ترین بچے، میرے اعلیٰ منی ایچر فنکار، جنہیں میں ان کے شاگردی کے ایام سے جانتا ہوں، کسی دوسرے انسان کی جان لینے کے نا قابل ہیں۔''

''جہاں تک زیتون، بگلے اور تتلی کی بات ہے۔'' کمان دار نے معنی خیز لہجے میں وہ عرف نام لیتے ہوئے کہا جو میں نے انہیں محبت میں دے رکھے تھے، ''ہم ان کے گھروں، جانے پہچانے اور کام کی

جنھوں کی تلاشی لینا چاہتے ہیں اور اگر ممکن ہو سکے تو کتاب خانوں کی بھی، مکمل تلاشی اور ان میں قرہ بھی شامل ہے۔" اس کے تاثرات میں دست برداری تھی۔" ایسے مصیبت انگیز حالات کے باعث، خدا کا شکر ہے کہ قاضی نے ہمیں قرہ آفندی سے پوچھ گچھ کے دوران تشدد کی اجازت بخش دی ہے۔ قانونی طور پر تشدد جائز ہے کیوں کہ دوسرا قتل شاگرد سے استاد تک سب کو مشتبہ بناتے ہوئے منی ایچر فنکاروں کے حلقے کے ساتھ رابطہ میں کسی اور شخص کا کیا گیا ہے۔"

میں نے خاموشی سے اس پر غور و فکر کیا: 1۔ "قانونی طور پر جائز" کے الفاظ واضح کرتے تھے کہ تشدد کی اجازت دینے والے ہمارے سلطان نہ تھے۔ 2۔ چوں کہ قاضی کی نگاہ میں تمام منی ایچر فنکار، دوہرے قتل کے سلسلے میں مشکوک تھے اور کیوں کہ میں، یعنی سربراہ مصور، ہمارے درمیان موجود مجرم کی نشان دہی میں ناکام رہا تھا، میں بھی مشتبہ تھا۔ 3۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے عزیز از جان تتلی، زیتون، بگلے اور دوسروں پر تشدد کے لیے میری واضح یا در پردہ اجازت چاہتے تھے، وہ سب جنھوں نے حالیہ برسوں میں مجھے دغا دیا تھا۔

"چوں کہ ہمارے سلطان "سرنامۂ ہمایوں" اور اس کتاب، دونوں کی اطمینان بخش تکمیل چاہتے ہیں — جو کہ واضح طور پر صرف نصف ہی مکمل ہو پائی ہے۔" سربراہ خزانچی نے کہا، "ہم فکر مند ہیں کہ تشدد سے فنکاروں کے ہاتھوں اور آنکھوں کو نقصان پہنچے گا اور ان کی پھرتی برباد ہو جائے گی۔" اس نے مجھے دیکھا: "کیا ایسا ہی ہے؟"

"حال ہی میں ایک اور واقعے پر بھی ایسی ہی [illegible] ہے۔" کمان دار نے درشت لہجے میں کہا، "ایک ستار اور جوہری جو مرمت کا کام کرتا تھا، شیطان کے بہکاوے میں آ گئے۔ وہ ہمارے سلطان کی ہمشیرہ خورد نجمی سلطان کے ملکیتی یاقوتی دستے والے پیالے کو دیکھ کر بچوں کی طرح مسرور اور مسحور ہو گئے اور آخر کار اسے چرا ہی لیا۔ پیالے کی چوری نے ہمارے سلطان کی بہن کو غم زدہ کر دیا — جنھیں وہ خاصا پسند تھا — چوں کہ یہ چوری اسکودر محل میں ہوئی تھی، اس لیے عالی جاہ نے تفتیش کی ذمے داری مجھے سونپی۔ یہ واضح ہو گیا کہ ہمارے سلطان اور نجمی سلطان ان جوہریوں کے ہاتھوں اور آنکھوں کو کوئی نقصان نہ پہنچانا چاہتے تھے کہ مبادا ان کا ہنر متاثر ہو جائے۔ سو میں نے تمام ماہر جوہریوں کے کپڑے اتروا کر انھیں برف اور مینڈکوں سے بھرے تالاب میں ڈلوا دیا۔ ایک ایک کر کے میں نے انھیں تالاب سے نکلوایا اور دُرّے لگوائے لیکن خیال رکھا کہ ان کے ہاتھوں اور چہروں کو نقصان نہ پہنچے۔ تھوڑی ہی دیر میں اس جوہری نے جسے شیطان نے بہکایا تھا، اعتراف کر لیا اور اپنی سزا قبول کر لی۔ یخ بستہ پانی، منجمد کر دینے والی ہوا اور دُرّوں کے باوجود، ماہر جوہری کی آنکھوں اور انگلیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔ کیوں کہ وہ دل کے خالص تھے۔ حتیٰ کہ خود سلطان نے تذکرہ کیا کہ ان کی بہن میری کارکردگی سے خاصی خوش تھی اور یہ کہ جوہری اب زیادہ جوش و خروش سے کام کر رہے تھے کہ ان کے درمیان سے گندی مچھلی نکل چکی تھی۔"

مجھے یقین تھا کہ کمان دار میرے منی ایچر فنکاروں سے اس سے زیادہ برا سلوک کرے گا جتنا کہ

اس نے اس جوہری سے کیا تھا۔ اگرچہ وہ ہمارے سلطان کے تزئین شدہ کتابوں کے جوش و خروش اور نوابش کا احترام کرتا تھا، لیکن اس کے خیال میں صرف خطاطی ہی واحد باعزت فن تھا، تزئین کاری اور مصوری کی وہ تحقیر کرتے ہوئے کہتا کہ وہ عورتوں کے لیے موزوں تھیں اور الحاد سے پُر تھیں اور سزا کے سوا کسی بھی مستحق نہ تھیں۔ مجھے اشتعال دلانے کی خاطر، اس نے کہا، "جب آپ اپنے کام میں منہمک تھے، آپ کے عزیز منی ایچر فنکار پہلے ہی یہ منصوبے بنانے لگے تھے کہ آپ کی موت کے بعد سربراہ مصور کون بنے گا؟"

کیا یہ باتیں میں نے پہلے ہی سن نہیں رکھی تھیں؟ کیا اس نے مجھے کسی نئی بات کی اطلاع دی تھی؟ خود پر قابو پاتے ہوئے میں نے کوئی ردعمل نہ دکھایا۔ سربراہ خزانچی اس اشتعال سے بخوبی واقف تھا جو میں اس بچہ مرحوم کو کتاب کی تزئین کاری کی ذمے داری سونپے جانے پر محسوس کرتا تھا، جس نے منظور نظر بننے اور چند اضافی سکے پانے کی خاطر وہ تصویریں بنائی تھیں۔

میں نے خود کو تشدد کے ان طریقوں کو سوچتے پایا جو اختیار کیے جا سکتے تھے۔ وہ تفتیش کے دوران کسی کی کھال نہ کھینچتے کیوں کہ ناگزیر طور پر اس کا نتیجہ موت ہوتا۔ وہ کسی کو میخیں بھی نہ گاڑتے جیسا کہ وہ باغیوں کے ساتھ کرتے تھے کیوں کہ وہ حوصلہ شکنی کے طور پر کیا جاتا تھا۔ ان منی ایچر فنکاروں کی انگلیاں، بازو یا گھیں کھینچنا، چٹخانا اور توڑنا اس کا بھی کوئی سوال نہ تھا یقیناً ایک آنکھ نکال دینا — جو میں نے اندازہ لگایا کہ ان دنوں بہت زیادہ ہو رہا تھا کیوں کہ میں نے استنبول کی گلیوں میں ایسے بہت سے کانے لوگ دیکھے تھے — ماہر فنکاروں کے لیے غیر موزوں تھا۔ سو میں نے شاہی باغ کے ایک سنسان الگ تھلگ گوشے میں اپنے پیارے منی ایچر فنکاروں کو تصور کیا، وہیں آبی نرگس والے یخ بستہ تالاب کے پاس وحشت سے کپکپاتے اور ایک دوسرے کو نفرت سے گھورتے ہوئے، میرا ہنسنے کا جی چاہا۔ اس کے باوجود مجھے یہ سوچ کر اذیت محسوس ہوئی کہ جب زیتون کو گرم استری سے داغا جائے گا تو وہ کیسے چیخے چلائے گا اور جب پیارے تتلی کو شکنجے میں کسا جائے گا تو کیسے اس کی رنگت زرد پڑ جائے گی۔ میں اپنے پیارے تتلی کے اس تصور کو برداشت نہ کر پایا — جس کی مصوری کی مہارت اور محبت میری آنکھیں نم کر دیتی تھی ...... اور اسے چوری کرنے والے عام شاگردوں کی طرح بیدزنی سہنی پڑی تھی۔ میں وہاں گم صم اور کھوکھلا کھڑا رہا۔

میرا بوڑھا دماغ اپنی ہی باطنی خاموشی کے سحر میں گونگا تھا۔ ایسا بھی وقت تھا جب ہم دونوں ایسے جوش و جذبے سے مل کر مصوری کرتے تھے کہ جو ہمیں باقی سب کچھ بھلا دیتا۔

"یہ لوگ ہمارے سلطان کی خدمت کرنے والے انتہائی ماہر منی ایچر فنکار ہیں۔" میں نے کہا، "خیال رکھنا کہ انھیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

خوش باش سربراہ خزانچی اٹھے، کمرے کے دوسرے گوشے میں موجود میز سے کئی ایک کاغذات اٹھائے اور انھیں میرے سامنے ترتیب سے رکھ دیا۔ اس کے بعد، یوں جیسے کمرا تاریک تھا، اس نے میرے قریب دو بڑے شمع دان رکھ دیے جن میں شمع پھڑپھڑاتے اور لپکتے شعلوں سے جل رہی تھیں تا کہ میں مذکورہ

تصویروں کا جائزہ لے سکوں۔

ان پردے کو حرکت دیتے ہوئے میں نے جو دیکھا، میں کیسے بیان کروں؟ میرے اندر پہلے کوئی چاہا۔۔۔ اور اس لیے نہیں کہ وہ مضحکہ خیز تھے۔ میں برہم تھا۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے الشیخ آفندی نے میرے فنکاروں کو یوں ہدایت دی تھی: ''اپنی طرح مصوری نہ کرو، یوں مصوری کرو جیسے تم کوئی اور ہو۔'' اس نے انہیں مستقبل کا تصور کرنے اور مصور کرنے کے لیے، ایسی غیر موجود یادیں ذہن میں لانے پر مجبور کیا، جو وہ کبھی بھی جینا نہیں چاہتے تھے۔ اس سے بڑھ کر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ اس بکواس پر ایک دوسرے کو ہلاک کر رہے تھے۔

''کیا آپ ان تصویروں کو دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ کس فنی ایچر فنکار نے کس تصویر پر کام کیا تھا؟'' سربراہ خزانچی نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے خفگی سے کہا: ''یہ تصویریں ملیں کہاں سے؟''

''قرہ انہیں اپنی مرضی سے لایا تھا اور میرے پاس چھوڑ گیا۔'' سربراہ خزانچی نے بتایا: ''وہ یہ ثابت کرنے لگا تھا کہ وہ اور اس کے مرحوم الشیخ بے گناہ تھے۔''

''تفتیش کے دوران اس پر غور کریں۔'' میں نے کہا: ''اس طرح ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے مرحوم الشیخ اور کون سے راز رکھتے تھے۔''

''ہم نے اس کو لانے بھیجا ہے۔'' شاہی محافظوں کے کمان دار نے کہا: ''اس کے بعد ہم اس نئے نویلے دولہا کے گھر کی اچھی طرح تلاشی لیں گے۔''

ان دونوں کے چہرے عجیب طرح روشن ہوئے، خوف اور مرعوبیت کی جھلک ان پر غالب آ گئی اور انہوں نے اپنے سر جھکائے۔

پلٹے بغیر میں جانتا تھا کہ ہم ہمارے سلطان، عالی جاہ، عالم پناہ کے حضور تھے۔

میں ہوں ایستھر

اوہ، ان سب کے ساتھ مل کر رونا چلانا کس قدر شاندار ہے! جب آدمی میری عزیز شکورے کے والد کے جنازے پر چلے گئے تھے، خواتین، رشتے دار، بیویاں اور دوست، گھر میں جمع ہوئے اور آنسو بہائے اور میں نے بھی ان کے ہمراہ سینہ کوبی کی اور خوب روئی دھوئی۔ اب اپنے قریب موجود حسین دوشیزہ کے ساتھ مل کر آہ و زاری کرتے ہوئے، آگے پیچھے جھولتے ہوئے اور پھر آگے پیچھے جھولتے ہوئے اور ابھی بالکل مختلف احساسات کے ساتھ روتے ہوئے، میں خود اپنے رنج و الم اور قابل رحم زندگی پر بے حد جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا، اگر میں بیٹھے میں ایک بار اس طرح رو لوں تو میں یہ فراموش کر سکتی تھی کہ مجھے گزر بسر کے لیے سارا دن گلیوں میں گھومنا پڑتا تھا، اپنے وزن کے باعث اپنا مذاق اڑایا جانا بھول سکتی تھی اور اپنے یہودی ہونے کو اور ایک زیادہ با توفیق خوش باش ایستھر کے طور پر دوبارہ دنیا میں آ سکتی۔

[itsurdu.blogspot.com]

مجھے سماجی اجتماع پسند ہیں کیوں کہ ان میں میں جی بھر کر کھا سکتی ہوں اور اسی دوران یہ بھلا سکتی ہوں کہ میں اس ہجوم کی کالی بھیڑ ہوں۔ مجھے بکلاوا بے حد پسند ہے، مٹھائی، مرزیپان بریڈ، گوشت کا پلاؤ اور ختنے کی تقریبات میں چائے کے ساتھ پیسٹریاں، ہپوڈروم میں سلطان کے جشن میں ترش چیری کا شربت پینا، شادیوں میں سب کچھ کھانا پینا اور ہمسایوں کی طرف سے تعزیت پر بھیجے جانے والے حلوے، شہد اور کئی قسم کے حلوے اڑانا۔

میں خاموشی سے راہداری میں آئی، اپنے جوتے پہنے اور نیچے اتر گئی۔ باورچی خانے کی طرف مڑنے سے پہلے میں اصطبل سے ملحقہ کمرے کے نیم وا دروازے سے آتے شور کو سن کر متجسس ہوئی۔ میں چند قدم اس سمت بڑھی اور اندر جھانک کر دیکھا کہ شوکت اور اورحان نے افسوس کے لیے آنے والی عورتوں میں سے کسی ایک کے بچے کو باندھ رکھا تھا اور اپنے مرحوم نانا کے رنگوں اور موقلم سے اس کا چہرہ رنگ رہے تھے۔

"اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو ہم تمہیں اسی طرح ماریں گے۔" شوکت نے یہ کہہ کر اسے تھپڑ جڑا۔

"میرے پیارے بچے، اب آرام سے کھیلو، ایک دوسرے کو تکلیف نہ پہنچانا۔ ٹھیک ہے؟" میں نے اس قدر تحمل اور میٹھی آواز میں کہا، جتنا میں اسے کر سکتی تھی۔

''اپنے کام سے کام رکھو!'' شوکت چلایا۔

میں نے دیکھا کہ وہ جس لڑکے کو کھڑے بیٹھے تھے اس کی چھوٹی سی خوف زدہ سہمی ہوئی بالوں والی

بہن وہیں کھڑی تھی اور کسی وجہ سے مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ اب اسے بھول جاؤ، میں نے سوچا!

باورچی خانے میں خیرے نے مجھے شک بھری نظروں سے دیکھا۔

''میں نے رو رو کر خود کو تھکا لیا ہے خیرے۔'' میں نے کہا: ''خدا کے واسطے مجھے ایک گلاس پانی

دے دو۔''

اس نے خاموشی سے ایسا ہی کیا۔ پانی پینے سے پہلے میں نے اس کی گرے سے سوجی آنکھوں

میں جھانکا۔

''بے چارہ شیخ آفندی، لوگ کہتے ہیں کہ وہ شمورے کی شادی سے قبل ہی وفات پا چکا تھا۔''

میں نے تبصرہ کیا: ''لوگوں کی زبان میں ایسے قصے نہیں ہیں کہ جن کا منہ بند کیا جا سکے۔ کچھ تو یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں

کہ سارا معاملہ ہی گڑبڑ ہے۔''

مبالغہ آمیز تاثر میں اس نے اپنے ہی ون کو جھک کر دیکھا۔ پھر اس نے اپنا سر اٹھایا اور میری

طرف دیکھے بغیر بولی: ''خدا انہیں بے حیا... تجھ کو دور کرے۔''

اس کے چہرے کے تاثرات نے میری کہی بات کی تصدیق کی اور مزید اس کے الفاظ کے انداز نے خاص

نے بتایا کہ وہ جبراً ادا کیے گئے تھے — سچ کو چھپانے کے لیے۔

''کیا چل رہا ہے؟'' میں نے اچانک سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا جیسے میں اس کی محرم راز تھی۔

تذبذب کا شکار خیرے یہ جان چکی تھی کہ شیخ آفندی کی وفات کے بعد شمورے پر دھونس جمانے

کی کوئی امید نہ تھی اور ذرا سی دیر پہلے وہ بڑی جذباتی ہو کر آنسو بہاتے ماتم کر رہی تھی۔

''اب میرا کیا ہوگا؟'' وہ بولی۔

''شمورے تمہارا بے حد احترام کرتی ہے۔'' میں نے تبصرہ دینے کی اپنی عادت کے تحت کہا۔ انگور

کے شیرے اور اچار کے بنی کے مرتبانوں کی قطاروں کے ساتھ رکھے حلووں کے برتن کے ڈھکن اٹھاتے

ہوئے، کسی سے انگلی بھر نکال کر چاٹتے یا ویسے ہی سونگھتے کو دوسرے کا ڈھکن اٹھاتے میں نے پوچھا کہ وہ

کس نے بھیجے تھے۔

خیرے بتاتے چلی جا رہی تھی کہ کون سا کس نے بھیجا تھا: یہ والا قیصری کے قاسم آفندی نے، یہ

سنی ایجیر فنکاروں کے حلقے کے نائب نے جو ہمیشہ آگے رہتا ہے، وہ والا قفل ساز چپ دست محمدی نے، وہ

اور نے (Edirne) کی نو عمر دلہن نے — ''تب ہی شمورے نے اسے ٹوک دیا۔

''مرحوم آفندی کی بیوہ، قلیچے تعزیت کو نہیں آئی، ایک لفظ تک نہیں کہلوایا اور حلوہ بھی نہیں بھیجا!''

وہ باورچی خانے کے دروازے سے سیڑھیوں کی طرف جا رہی تھی۔ میں اس کے پیچھے گئی۔

جانتے ہوئے کہ وہ اکیلے میں مجھ سے بات کرنا چاہے گی۔

"حسین آفندی اور میرے بابا کے درمیان ایک طرح کی عداوت تھی۔ پھر بھی حسین کے جنازے کے دوران ہم نے حلوہ تیار کر کے ان لوگوں کو بھیجا۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔" شکورے نے کہا۔

"میں جا کر پتا کرتی ہوں۔" میں نے شکورے کے خیالات پڑھتے ہوئے کہا۔

چوں کہ میں نے ہماری گفتگو مختصر رکھی تھی، اس نے میرے رخسار پر بوسہ دیا۔ جب صحن کی تاریکی نے ہمیں چھپا دیا، ہم نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور وہاں کھڑی رہیں۔ بعد ازاں، میں نے حسین و جمیل شکورے کے بال سہلائے۔

"اے استھر مجھے خدشہ ہے۔" وہ بولی۔

"میری پیاری، مت ڈرو۔" میں نے کہا۔ "ہر مشکل میں امید کی کرن زندہ رہتی ہے۔ دیکھو آخر اب تم شادی شدہ ہو۔"

"لیکن مجھے معلوم نہیں کہ میں نے صحیح کیا یا نہیں۔" وہ بولی، "اسی وجہ سے میں نے اسے اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ میں نے اپنے بدنصیب باپ کے سرہانے رات بسر کی۔"

اس نے اپنی آنکھیں پوری کھول کر مجھے یوں دیکھا جیسے کہتی ہو، تم جانتی ہو میں کیا کہہ رہی ہوں۔

"حسن دعویٰ کرتا ہے کہ قاضی کی نگاہوں میں تمہاری شادی غیر موثر ہے۔" میں نے کہا، "اس نے تمہارے لیے یہ بھیجا ہے۔"

اگرچہ کہا تو اس نے یہی کہ "اب مزید نہیں۔" لیکن اس نے وہ چھوٹی سی پرچی فوراً ہی کھول کر پڑھی لیکن اس مرتبہ اس نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ اس میں کیا لکھا تھا۔

اس کی احتیاط درست تھی، ہم اس صحن میں اکیلی نہیں تھیں۔ جہاں ہم ایک دوسرے کو گلے لگائے کھڑی تھیں۔ ہمارے اوپر بناوٹی مسکراہٹ والا بزدل حسن تھا جو دیوان خانے کی کھڑکی کے کواڑ جوڑ رہا تھا جو کسی نامعلوم سبب سے گر کر ٹوٹ گئے تھے۔ وہ ہم دونوں اور اندر موجود ماتم و زاری کرتی عورتوں پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔ اس دوران خیریے گھر سے باہر آئی اور ایک خیر خواہ ہمسائے کے بیٹے کے لیے حلوہ لینے دوڑی جس نے صحن کے دروازے پر دستک دیتے پکار کر کہا تھا، "حلوہ آیا ہے۔"

"ہمیں انہیں دکھانے کچھ دیر تو ہو ہی چکی ہے۔" شکورے نے کہا، "میں اب محسوس کر سکتی ہوں کہ میرے بے چارے بابا کی روح اب ان کے بدن کو چھوڑ کر پرواز کر رہی ہے اور آسمانوں کی طرف روانہ ہو رہی ہے۔"

اس نے خود کو میری بانہوں سے چھڑوایا اور روشن آسمان کو دیکھتے ہوئے ایک طویل دعا پڑھی۔ میں نے اچانک خود کو شکورے سے اس قدر دور اور اجنبی محسوس کیا کہ مجھے اس پر حیرت نہ ہوئی

کہ میں وہ ویاول ہوتی جس پر اس کی نگاہیں پھسل رہی تھیں۔ اپنی دعا ختم کرنے کے بعد حسین و جمیل شگورے نے میرے دونوں رخساروں پر بوسہ دیا۔

"اہستھر۔" وہ بولی، "جب تک کہ میرے بابا کا قاتل آزاد گھوم رہا ہے، اس جہان میں میرے اور میرے بچوں کے لیے کوئی سکون نہیں۔"

مجھے اس پر خوشی ہوئی کہ اس نے اپنے نئے شوہر کا نام نہ لیا تھا۔

"قیس آفندی کے گھر جاؤ، اس کی بیوہ سے بات کرو اور معلوم کرو کہ انہوں نے ہمیں حلوہ کیوں نہیں بھیجا۔ تمہیں جو بھی معلوم ہو، مجھے فوراً آ کر بتاؤ۔"

"کیا تمہارے پاس حسن کے لیے کوئی پیغام ہے؟" میں نے پوچھا۔

مجھے خجالت محسوس ہوئی، یہ سوال پوچھنے پر نہیں بلکہ اس لیے کہ میں ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نہ دیکھ پائی تھی۔ اپنی خجالت و شرمندگی چھپانے کے لیے میں نے خیر بے کورہ کا اور اس برتن کا ڈھکن اٹھایا جو وہ اٹھائے ہوئے تھی۔ "اوہ، سوجی کا حلوہ پستے کے ساتھ۔" میں نے چکھنے کے بعد کہا۔ "اور انہوں نے اس میں نارنجی بھی ڈالی ہے۔"

مجھے شگورے کو یوں مسکراتے دیکھ کر خوشی ہوئی جیسے سب کچھ منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔

میں نے اپنی گٹھڑی لی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی میں نے دو ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ مجھے گلی کے نکڑ پر قرہ دکھائی دیا۔ وہ ابھی اپنے سسر کی تدفین سے واپس لوٹا تھا اور میں اس کے چمکتے چہرے کو دیکھ کر جا سکتی تھی کہ یہ نیا نویلا شوہر اپنی زندگی سے خاصا خوش تھا۔ اس کے جوش و جذبے کو ماند کرنے کی خاطر میں گلی سے ہٹ گئی اور سبزیوں کی کیاریوں سے ہوتے ہوئے اس گھر کے باغ سے گزری جہاں اپنے پھانسی لگ جانے سے قبل مشہور یہودی طبیب موشے ہامون کی محبوبہ کا بھائی رہا کرتا تھا۔ یہ باغ جو ہمیشہ موت کی یاد دلاتا تھا، جب میں یہاں سے گزرتی تو ہمیشہ مجھ پر اتنی اداسی طاری کر دیتا تھا کہ میں بالکل ہی بھول گئی کہ مجھے اس جاسوس ادکا کا ایک تلاش کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

موت کی یہی فضا قیس آفندی کے گھر میں بھی چھائی ہوئی تھی، اگرچہ وہ مجھے بالکل بھی اداس نہ کرتی تھی۔ میں استھر تھی، ایک ایسی عورت جو ہزاروں گھروں میں آتی جاتی تھی اور سینکڑوں بیواؤں سے واقف تھی۔ میں جانتی تھی کہ عورتیں جو اپنے شوہروں سے محروم ہو جاتی تھیں وہ پہلے پہل شکست اور بدحالی کے حصار میں آ جاتی تھیں یا پھر بربی اور بغاوت کے (اگرچہ شگورے نے یہ تمام مصیبتیں سہی تھیں)۔ قلیچے کے زہر کے اثر آ گئی تھی اور میں نے فوراً ہی جان لیا کہ اس سے میرا کام جلدی ہو جائے گا۔

ان تمام متکبر عورتوں کی طرح جن کے ساتھ زندگی نے ظالمانہ سلوک کیا تھا، قلیچے کو بجا طور پر شبہ تھا کہ اس سے ملنے کے لیے آنے والے تمام لوگ اس کے مشکل ترین ایام میں اس پر ترس کھانے آتے تھے یا پھر اس کے کرب و اذیت کا نظارہ کرنے اور اپنی بہتر صورت حال پر دل ہی دل میں خوش ہونے کے لیے،

یوں وہ اپنے مہمانوں کے ساتھ کوئی خوش طبعی روا نہ رکھتی بلکہ اِدھر اُدھر کی باتوں کی بجائے سیدھا اصل مسئلے پر بات کرتی تھی۔ ایستھر اس سہ پہر کیوں آئی تھی، جب قلبیے اپنے رنج و غم کے ساتھ ایک تسلی بھری نیند لینے کو تھی؟ بخوبی واقف قلبیے نے چین کے تازہ ترین ریشم اور برصہ کے رومالوں میں کوئی دلچسپی نہ دکھائی تھی، میں نے اپنی گٹھڑی کھولنے تک کا دکھاوا نہ کیا بلکہ سیدھی مطلب کی بات پر آئی اور غمگین آنکھوں والی شکورے کی تشویش بیان کی۔ ''شکورے کا دکھ اس بات کو سوچ کر بڑھ گیا ہے کہ اس نے کسی طور تمہارے احساسات کو ٹھیس پہنچائی ہے، جو اسی کی طرح دکھی ہے۔'' میں نے کہا۔

بڑے غرور سے قلبیے نے تصدیق کی کہ اس نے شکورے کی خیریت دریافت کی تھی، نہ اس کے پاس تعزیت کے لیے گئی تھی یا اس کے ساتھ آہ وزاری کی تھی، نہ ہی وہ خود کو حلوہ تیار کرنے اور بھیجنے پر مائل کر پائی تھی۔ اس کے غرور کے پیچھے ایک قسم کی مسرت بھی تھی جسے وہ چھپا نہ پائی تھی: یہ خوشی کہ اس کی خفگی یا آزردگی کی پرواہ کی گئی تھی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے آپ کی حاضر جواب ایستھر نے قلبیے کے غصے کی وجوہات اور حالات جاننے کی کوشش کی۔

قلبیے کو یہ تسلیم کرنے میں دیر لگی کہ اس تزئین شدہ کتاب کے باعث جو مرحوم انشتے آفندی تیار کر رہا تھا، قلبیے اس سے خفا تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر، خدا اسے جنت نصیب کرے، مٹھی بھر سکوں کے لیے اس کتاب پر کام کرنے پر آمادہ نہ ہوا تھا بلکہ اس لیے کہ انشتے آفندی نے اسے قائل کیا تھا کہ یہ منصوبہ سلطان کے زیرِ نگرانی انجام پا رہا تھا۔ تاہم، جب اس کا مرحوم شوہر اس بات سے آگاہ ہوا کہ انشتے آفندی نے جس مصوری کے لیے اس کی خدمات حاصل کی ہیں، وہ سادہ تزئین شدہ صفحات سے بڑھ کر پوری تصویروں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ مزید برآں، ایسی مصوری جس میں فرنگیوں کے توہین آمیزی، الحاد اور حق کی گستاخی کے نشانات تھے، تو وہ بے چین ہو گیا اور غلط اور درست کی پہچان کھونے لگا۔ نفیس آفندی سے کہیں زیادہ معقول اور انسان ہونے کے باعث اس نے احتیاط سے مزید کہا کہ یہ تمام شکوک یک دم کی بجائے رفتہ رفتہ ابھرے اور چوں کہ بے چارے نفیس آفندی کو کبھی ایسا کچھ نہ مل سکا جسے کھلی بے ادبی خیال کیا جاتا، وہ اپنی پریشانی یا تشویش کو بے بنیاد قرار دینے میں کامیاب رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ارضِ روم کے نصرت جو جاگے ہر خطاب میں شامل ہو کر اپنے دل کو تسلی دیتا رہا اور اگر روزانہ کی پانچ نمازوں میں سے کوئی اس سے قضا ہو جاتی تو وہ بے چین ہو جاتا۔ بالکل جیسے وہ جانتا تھا کہ کتاب خانے میں چند مخصوص بدمعاش اس کے مذہب سے لگاؤ کا مذاق اڑاتے تھے، تو وہ بخوبی سمجھ گیا کہ یہ بے شرم لطیفے اس کی قابلیت اور فنکاری پر رشک و حسد کے باعث گھڑے جاتے تھے۔

قلبیے کی چمکتی آنکھ سے ایک بڑا سا آنسو اس کے رخسار پر پھسل گیا اور پہلا موقع ملتے ہی آپ کی اس بھلے دل والی ایستھر نے قلبیے کے لیے اس سے بہتر شوہر تلاش کرنے کا فیصلہ کیا جس سے وہ حال ہی میں محروم ہو چکی تھی۔

"میرا مرحوم شوہر اپنی اس تشویش میں اکثر مجھے شریک نہیں کیا کرتا تھا۔" قلیبے نے معذرتانہ لہجے میں کہا۔ "جو کچھ بھی مجھے یاد ہے اس کی بنیاد پر اور ان تمام ٹکڑوں کو باہم جوڑ کر میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ سب کچھ تصویر کشی کے معاملے پر ہوا ہے جو اسے اپنی آخری رات انشتے آفندی کے گھر لے گئی تھی۔"

یہ معذرت کا کوئی انداز تھا۔ جواب میں، میں نے اسے یاد دلایا کہ کیسے اس کی اور شکورے کی قسمتیں، ان کے دشمنوں کا تو تذکرہ ہی نہیں، بھی ایک جیسی تھیں۔ اگر کوئی یہ سوچتا کہ انشتے آفندی کو غالباً اسی "بدمعاش" نے قتل کیا تھا۔ ایک گوشے میں مجھے گھورتی دو بڑے سر والے بن باپ کے بچوں کی نگاہوں نے دونوں عورتوں کے درمیان ایک اور مشابہت کا تذکرہ کیا۔ لیکن میری بے رحم مشاطہ کی منطق نے مجھے فوراً ہی یاد دلایا کہ شکورے کی صورت حال کہیں زیادہ خوب صورت، زرخیز اور پراسرار تھی۔ میں نے جو محسوس کیا تھا، قلیبے کو من وعن بتا دیا:

"شکورے نے مجھے تمہیں یہ بتانے کو کہا ہے کہ اگر اس نے تمہارے ساتھ کچھ غلط کیا ہے تو اسے افسوس ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کہنا چاہتی ہے کہ اسے تم سے ایک بہن کی سی محبت ہے اور ایک ایسی عورت کی محبت جو تم سا ہی نصیب رکھتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ تم اس بارے میں سوچو اور اس کی مدد کرو۔ جب مرحوم نفیس آفندی آخری رات یہاں سے رخصت ہوئے تو کیا انہوں نے ذکر کیا تھا کہ وہ انشتے آفندی کے علاوہ بھی کسی سے ملیں گے؟ کیا تمہیں کبھی خیال آیا کہ وہ اور [illegible] سے ملنے بھی جانے والے تھے؟"

"ان کی میت کے ساتھ یہ ملا تھا۔" اس [illegible]

اس نے ایک بیرے سے بنے ڈبے سے ایک [illegible] کاغذ نکالا، جس میں کشیدہ کاری کی سوئیاں، کپڑے کے ٹکڑے اور ایک بڑا سا اخروٹ رکھا تھا۔

جب میں نے وہ مڑا تڑا کاغذ پکڑ کر اس کا جائزہ لیا، مجھے روشنائی سے بنی کچھ شکلیں نظر آئیں جو کنوئیں کے پانی سے پھیل کر بگڑ چکی تھیں، میں یقین کر چکی تھی کہ وہ شکلیں کیا تھیں جب قلیبے نے میرے خیالات کو زبان دی۔

"گھوڑے۔" وہ بولی، "لیکن مرحوم نفیس آفندی کے پاس صرف طلاکاری کا کام تھا۔ انہوں نے کبھی گھوڑوں کی تصویریں نہیں بنائیں اور کوئی بھی انہیں کبھی گھوڑوں کی تصویریں بنانے کو نہ کہتا۔"

آپ کی بیوہ بھی متحیر ان گھوڑوں کو دیکھ رہی تھی جن کے خاکے عجلت میں بنائے گئے تھے لیکن وہ ان سے کچھ بھی سمجھ نہ پائی۔

"اگر میں یہ کاغذ کا ٹکڑا شکورے کے لیے لے جاؤں تو وہ خاصی خوش ہوگی۔" میں نے کہا۔

"اگر شکورے ان تصویری خاکوں کو دیکھنا چاہتی ہے تو اسے کہو کہ خود آ کر لے جائے۔"

قلیبے نے بے حد تکبر کے ساتھ کہا۔

میرا نام ہے فترہ

شاید اب تک آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ مجھ جیسے آدمی یعنی اداس اور رنجور آدمی جن کے لیے محبت، کرب و اذیت، خوشی اور غم زدگی اپنی ابدی تنہائی کو قائم رکھنے کے محض عذر ہیں، انھیں زندگی بھی بے انتہا خوشی پیش کرتی ہے نہ ہی بے انتہا اداسی۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہم ان جذبات کے زیرِ اثر دوسری روحوں کے جذبات سمجھ نہیں سکتے، اس کے برعکس، ہم ان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ ایسے وقتوں میں ہماری روحیں جس عجیب بے قراری میں ڈوب جاتی ہیں ہم اس کا ادراک نہیں کر پاتے۔ یہ خاموش ہنگامے ہماری عقل و دانش کو مدھم کرتے اور ہمارے دلوں کو حبس زدہ کرتے ہیں۔ یہ خاموش ہنگامے اس جگہ پر قابض ہو جاتے ہیں جو ہم نے اس سچی خوشی اور دکھ کے لیے مخصوص کر رکھی ہوتی ہے جو آپ نے بھی تجربہ کی ہوں گی۔

میں اس کے باپ کو دفنا چکا تھا، خدا کا شکر ہے۔ جب میں جنازے سے واپس گھر آیا اور تعزیت اور تسلی کی غرض سے اپنی بیوی شکورے کو گلے لگایا اور پھر اچانک آنسوؤں کے دورے میں وہ پیچھے ایک بڑے سے کشن پر گر گئی جہاں اس کے بچے بیٹھے تھے اور مجھے بغض و عداوت سے گھور رہے تھے اور مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کیا کروں۔ اس کا دکھ اور میری فتح اتفاق سے ہم وقت ہو گئے تھے۔ ایک ہی جھٹکے میں میں نے اپنی نوجوانی کے خواب سے بیاہ کر لیا تھا، اس کے باپ سے خود کو آزاد کروا لیا تھا جو میری عزت نہ کرتا تھا اور اس گھر کا مالک بن گیا تھا۔ میرے آنسوؤں کے اخلاص پر کون یقین کرتا؟ لیکن میرا یقین کریں، یہ ایسا نہیں تھا۔ میں واقعی غم کرنا چاہتا تھا لیکن نہ کر سکا۔ انشتے میرے لیے حقیقی باپ سے بڑھ کر رہے تھے۔ لیکن اس مبلغ نے جس نے انشتے کو آخری غسل دیا تھا، اور کبھی بھی اپنی زبان بند نہ کی تھی، یہ افواہ پھیلائی کہ میرے انشتے کی موت پراسرار حالات میں ہوئی تھی، جنازے کے دوران ہی یہ بات ہمسائے میں پھیل گئی تھی —— جیسا کہ میں مسجد کے صحن میں کھڑے محسوس کر سکتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے رونے کے قابل نہ ہو پانے کو منفی انداز میں لیا جائے۔ مجھے آپ کو بتانا نہیں پڑے گا کہ "پتھر دل" کے طور پر پہچانے جانے کا خوف کس قدر حقیقی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ کوئی ہمدرد خالہ یا پھوپھی ہمیشہ گواہی دے گی کہ "وہ اپنے دل میں رو رہا

ہے" جیسا کہ مجھ جیسے کسی شخص کو دوسرے لوگ برا بھلا نہ کہیں۔ میں درحقیقت واقعی اپنے دل میں رو رہا تھا جب میں نے پرہجوم علاقے میں خود کو کسی گوشے میں چھپا لینے کی سعی کی اور دور دراز کے رشتے داروں سے جو آنسوؤں کی کسی بھی وقت برسات کرنے کی حیرت انگیز خوبیاں رکھتے تھے، میں نے اپنے گھر کا مالک بننے کے بارے میں سوچا اور یہ کہ آیا مجھے کسی طور صورت حال کو اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے لیکن عین اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ گھبراہٹ کا ایک لمحہ۔ کیا وہ حسن تھا؟ اس کے باوجود کہ میں خود کو کسی بھی قیمت پر اس تمام رونے بسورنے کے جہنم سے بچانا چاہتا تھا۔

وہ شاہی خدمت گار تھا، جو مجھے محل بلانے کے لیے آیا تھا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔

صحن سے باہر نکلتے ہوئے مجھے زمین پر کیچڑ میں تھوڑا ایک سکہ دکھائی دیا۔ کیا میں محل جانے سے خوف زدہ تھا؟ ہاں، لیکن میں گھوڑوں، کتوں، درختوں اور لوگوں کے درمیان باہر سردی میں نکلنے پر بھی خوش تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اس شاہی خدمت گار لڑکے کو دوست بنا سکتا تھا، جاگتے کے خواب دیکھنے والے ان نا امیدوں کی طرح جو خیال کرتے ہیں کہ وہ دنیا کے ظلم و سفاکی کو ختم کر سکتے ہیں، جلاد کا سامنا کرنے سے قبل، زنداں کے محافظ سے ادھر ادھر کی باتوں کے بارے میں ہلکی پھلکی گفتگو کی کوشش، زندگی کی رعنائیاں، تالاب میں تیرتی بطخیں، یا آسمان پر تیرتے بادل کا نرالا پن۔ لیکن افسوس کہ اس نے مجھے مایوس کیا اور ایک قدرے ترش رو دکھا اور کم گو نوجوان ثابت ہوا۔ جب میں آیا صوفیہ کے قریب سے گزرا تو میں نے بلند و بالا صنوبر کو گیرا لو اور آسمان کی جانب نزاکت سے پہلے رعب کے عالم میں دیکھا، وہ واقعے برسوں کے بعد شکورے سے شادی کے فوراً بعد مرنے کی دہشت نہ تھی جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے بلکہ یہ محل کے اذیت رسانوں کے ہاتھوں، شکورے سے وصل سے پہلے ہی مر جانے کی ناانصافی تھی۔

ہم درمیانی دروازے کے دہشت خیز مینار کی جانب نہیں گئے جس کے عقب میں اذیت رسان اور جلاد اپنا کام کرتے تھے بلکہ ترکھانوں کی دکانوں کی جانب۔ جب ہم اناج کے گوداموں کے بیچ سے گزرے، بطخوں سے بھاپ اڑاتے بھورے گھوڑے کی ٹانگوں کے درمیان خود کو کیچڑ سے صاف کرتی ایک بلی مڑی لیکن اس نے ہمیں نہ دیکھا۔ بلی پہلے ہی خود پر بھی گندگی میں مگن تھی، جیسا کہ ہم تھے۔

اناج کے گوداموں کے پیچھے، وہ شخص، جن کے عہدے اور وابستگی کا تعین میں ان کے سبز اور ارغوانی یونیفارم سے نہ کر پایا، انھوں نے خدمت گار کو واپس بھیج دیا اور مجھے چھوٹے سے گھر کے تاریک کمرے میں بند کر دیا جو میں تازہ لکڑی کی مہک سے بتا سکتا تھا کہ بالکل نیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کسی شخص کو تاریک کمرے میں بند کرنے سے کیا مراد تھی، تشدد سے پہلے اسے دہشت زدہ کرنا۔ یہ امید کرتے ہوئے کہ وہ بیہودگی سے شروع کریں گے میں نے ان جھوٹوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا جو میں اپنی پشت بچانے کے لیے بول سکتا تھا۔ ملحقہ کمرے میں ایک ہجوم خاصا شور مچا رہا تھا۔

آپ میں یقیناً ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو میرے اس مضحکہ اڑاتے اور خوش طبع لہجے کو اپنے

قتل سے منسوب نہیں کر سکتے جو زدوکوب اور تشدد کا سامنا کرنے کو ہو۔ لیکن کیا میں نے ذکر نہیں کیا کہ میں خود کو خدا کے خوش قسمت ترین بندوں میں سے ایک سمجھتا ہوں؟ اور اگر برسوں کی محرومی کے بعد پچھلے دو روز سے میرے سر پر خوش بختی کے جو پرندے محو پرواز تھے، کافی ثبوت نہیں ہیں تو یقیناً وہ جو مجھے صحن کے دروازے کے باہر چاندی کا سکہ ملا، وہ ضرور کوئی اچھا شگون رہا ہوگا۔

تشدد کے انتظار میں، مجھے چاندی کے سکے سے تسلی ملی اور مجھے مکمل یقین تھا کہ یہ میری حفاظت کرے گا۔ میں نے خوش بختی کی اس نشانی کو جو اللہ نے مجھے دی تھی، ہتھیلی میں لیا، کئی بار رگڑا اور بار بار بوسہ دیا۔ لیکن انہوں نے مجھے جس بھی وقت تاریکی سے نکالا اور اگلے کمرے میں لے کر آئے جہاں میں نے شاہی محافظوں کے کماندار کو دیکھا اور اس کے گنجے سر والے کروٹ اذیت رساں کو، میں جانتا تھا کہ چاندی کا سکہ بے وقت تھا۔ میرے اندر سے احمق بے رحم آواز بالکل درست تھی: میری جیب میں موجود سکہ خدا کی طرف سے نشانی نہیں تھا بلکہ انہی میں سے ایک تھا جو میں نے دو روز قبل شکورے پر برسائے تھے — جو بچوں کی نظر سے بچ رہا تھا۔ یوں اپنے اذیت رسانوں کے ہاتھوں میں میرے پاس ایسا کچھ نہ تھا جس میں میں پناہ لیتا۔

میں نے یہ غور بھی نہ کیا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ میں رونا دھونا التجا کرنا چاہتا تھا لیکن جیسے کہ خواب میں ہو میرے منہ سے کوئی آواز تک نہ نکلی۔ جنگوں، موت اور سیاسی قتلوں اور تشدد (جن کا میں نے دور سے مشاہدہ کیا تھا) کے باعث میں جانتا تھا کہ زندگی پلک جھپکنے میں ختم ہو سکتی تھی لیکن میں نے اتنے قریب سے اس کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے اس دنیا سے ویسے ہی محروم کرنے والے تھے جیسے انہوں نے مجھے میرے کپڑوں سے محروم کر دیا تھا۔

انہوں نے میری قمیص اور بنیان اتار دیں۔ ایک جلاد اپنے گھٹنے میرے کندھوں پر رکھ کر میرے اوپر بیٹھ گیا۔ کھانا تیار کرتی کسی عورت کی سی نپی تلی نفاست سے دوسرے نے میرے سر پر ایک پنجرہ رکھ دیا اور اس کے اگلے حصے پر لگا پیچ آہستہ آہستہ گھمانے لگا۔ نہیں، وہ پنجرہ نہیں تھا بلکہ ایک شکنجہ تھا جس نے بتدریج میرے سر کو جکڑ لیا۔

میں گلا پھاڑ کر چیخا۔ میں نے منت وزاری کی لیکن بے ربطی سے۔ میں رونے اور چلانے لگا، زیادہ تر اس لیے کہ میرے اعصاب جواب دے چکے تھے۔

وہ ذرا دیر کو رکے اور پوچھنے لگے، ”کیا انشٹے آفندی کو جان سے مارنے والے تم تھے؟“

میں نے گہری سانس بھری۔ ”نہیں۔“

وہ دوبارہ شکنجہ کسنے لگے۔ یہ اذیت رساں تھا۔

انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

”پھر کس نے قتل کیا؟“

"مجھے نہیں معلوم!"

مجھے خیال آیا کہ کیا مجھے انہیں بتانا چاہیے کہ میں نے ہی انہیں قتل کیا تھا۔ دنیا میرے سر میں گھوم رہی تھی۔ مجھ پر جھجک طاری تھی۔ میں نے خود سے پوچھا کہ کیا میں تکلیف کا عادی ہو رہا تھا۔ میرے جلاد اور میں کچھ دیر کو ساکت رہے۔ مجھے تکلیف محسوس نہیں ہوئی، میں صرف دہشت زدہ تھا۔

تب جب میں نے اپنی جیب میں موجود چاندی کے سکے سے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مجھے جان سے مارنے والے تھے، انہوں نے اچانک مجھے رہا کر دیا۔ انہوں نے وہ شکنجہ نما اتار دیا جس نے درحقیقت میرے سر کو ذرا زخمی کر دیا تھا۔ وہ جس نے مجھے نیچے دھایا تھا، کسی معذرت کے شائبے کے بھی بغیر کھڑا ہوا۔ میں نے اپنی قمیص اور بنیان پہن لی۔

کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔

کمرے کے دوسرے گوشے میں، میں نے سربراہ مصور عثمان آفندی کو دیکھا، میں ان کے قریب گیا اور ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

"پریشان مت ہو میرے بچے۔" انہوں نے مجھ سے کہا۔ "وہ بس تمہیں آزما رہے تھے۔"

میں فوراً ہی جان گیا کہ انشتے کی جگہ مجھے نیا باپ مل گیا تھا، خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

"ہمارے سلطان نے حکم دیا ہے کہ تم پر اس وقت تشدد نہ کیا جائے۔" کمان دار نے کہا "انہوں نے تمہارے لیے یہ مناسب جانا ہے کہ تم سربراہ مصور استاد عثمان کی اس بدبخت بدمعاش کی تلاش میں مدد کرو جس نے ان کے منی ایچر فنکاروں اور ان کے مسودوں پر کام کرنے والے وفادار خادموں کو قتل کیا ہے۔ تمہارے پاس تین روز ہیں جن میں تم منی ایچر فنکاروں سے تفتیش کرو گے، ان تزئین شدہ صفحات کی پڑتال کرو گے جو انہوں نے بنائے تھے اور اس کایاں اور ہوشیار مجرم کو تلاش کرو گے۔ بادشاہ سلامت ان افواہوں پر خاصے نزاں ہیں جو شر پسند ان کے منی ایچر فنکاروں اور تزئین شدہ مسودوں کے بارے میں پھیلا رہے ہیں۔ سربراہ خزانچی حازم آغا اور میں، دونوں ہی اس مجرم کی تلاش میں تمہاری مدد کریں گے، جیسا کہ سلطان کا فرمان ہے۔ تم میں سے ایک انشتے آفندی کے بہت قریب رہا ہے اور یوں اس کی خوش الحانی کی تہ اور ان منی ایچر فنکاروں کو جانتا ہے جو رات کو اس سے ملنے آتے تھے اور کتاب کے پیچھے کی کہانی کو بھی۔ دوسرا ایک عظیم ماہر فنکار ہے جو اپنی ہتھیلی کی طرح کتاب خانے کے تمام منی ایچر فنکاروں سے واقف ہے۔ تین دن کے اندر اندر اگر تم اس سورا اور اس کے چرائے گئے اوراق کو پیش کرنے میں ناکام رہے تو ــــ تین کے بارے میں کافی افواہیں اڑ رہی ہیں ــــ یہ ہمارے منصف سلطان کی آرزو ہے کہ تم، میرے بچے قرہ آفندی، تم پہلے ہو گے جسے تشدد اور پوچھ گچھ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بعد میں، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ باقی تمام منی ایچر فنکاروں کو بھی اپنی باری سے گزرنا ہوگا۔"

میں ان دونوں پرانے دوستوں کے درمیان جنہوں نے برسوں ساتھ کام کیا تھا کوئی رازدارانہ

یہ میں ہوں، استاد عثمان

شاہی محافظ دستے کے کمان دار اور سربراہ خزانچی نے ہم دونوں کو تنہا چھوڑنے سے قبل ہمارے سلطان کے یہ احکامات دہرائے۔ یقیناً قرہ خوف، رونے اور تشدد کی حکمت عملی کے باعث تھکن زدہ تھا۔ وہ کسی بچے کی طرح خاموش ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں اسے پسند کرنے لگوں گا اور میں نے اس کے سکون میں کوئی خلل نہ ڈالا۔

کمان دار کے آدمیوں نے میرے خطاطوں اور ماہر منی ایچر فنکاروں کے گھروں سے جو اوراق جمع کیے تھے، ان کا جائزہ لینے کے لیے میرے پاس موجود تھے اور یہ طے کرنے کے لیے کہ ان پر کس نے کام کیا تھا۔ آپ سب جانتے ہیں جب میں نے انشتے آفندی کی کتاب کے لیے تیار تصویروں پر نگاہ ڈالی تو کس قدر تنفر محسوس کیا تھا اور کیسے قرہ نے اپنا نام صاف کروانے کے لیے سربراہ خزانچی حازم آغا کو دے دی تھیں۔ منظور شدہ، ان صفحات میں ضرور کچھ ایسا رہا ہو گا جس سے مجھ جیسے کسی منی ایچر فنکار میں تنفر اور کراہت کے جذبات سر اٹھاتے، جس نے اپنی تمام عمر فن کے لیے وقف کر دی تھی، محض بر فن اس قسم کے ردعمل کو ہوا نہ دیتا۔ سو اس نئے دریافت شدہ تجسس کے ساتھ میں نے ان نو اوراق کا دوبارہ جائزہ لینا شروع کیا جو اس مرحوم احمق نے منی ایچر فنکاروں سے بنوائے تھے جو اس کے پاس رات کے پردے میں آتے تھے۔

میں نے خالی صفحے کے عین درمیان ایک درخت دیکھا، جس کے گرد اگرد بے چارے نفیس کا بنایا گیا حاشیے کا نمونہ تھا جو شائستگی سے ہر ورق کو فریم کیے ہوئے تھا۔ میں نے اس منظر اور کہانی کو تصور میں لانے کی کوشش کی جس سے وہ درخت متعلق تھا۔ اگر میں اپنے مصوروں سے درخت بنانے کا کہتا تو پیارا تتلی، عقل مند بگلا اور چالاک زیتون کہانی کے حصے کے طور پر اس درخت کا تخیل باندھنے سے آغاز کرتے تاکہ وہ اسے اعتماد کے ساتھ بنا سکتے۔ اگر مجھے تب اس درخت کا جائزہ لینا ہوتا، تو میں اس کی شاخوں اور پتوں کو دیکھ کر تعین کر پاتا کہ مصور کے ذہن میں کون سی داستان تھی۔ تاہم یہ ایک قابل رحم سا تنہا درخت تھا جس کے عقب میں کافی بلند افقی لکیر تھی جو شیراز کے پرانے فنکاروں کی یاد دلاتی اور تنہائی اور اداسی کے انداز پر زور دیتی تھی۔ تاہم، افق کو بلند کرنے سے بننے والی خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ درخت کی سادگی سے

عکاسی کی خواہش، جیسا کہ وینس کے فنکار کرتے تھے، یہاں ایرانیوں کی دنیا کو بلندی سے دیکھنے کی خواہش کے ساتھ ہم وقوع تھی اور اس کا نتیجہ ایک قابل رحم تصویر تھی جو نہ وینسی تھی، نہ ہی ایرانی۔ دنیا کے آخری گوشے پر درخت اسی طرح دکھائی دیتا۔ دو جداگانہ انداز کو اکٹھا کرنے کی کوشش میں میرے منی ایچر فنکاروں اور اس مرحوم مسخرے کے بجز دماغ نے مل کر اس طرح کا کام تخلیق کیا تھا جو کسی بھی طرح کے فنی جوہر سے عاری تھا، لیکن وہ بالکل مختلف نقطۂ نظر سے بنائی جانے والی مصوری سے زیادہ بے جگری نے میرے غصے کو بار بار ہی ہوا دی تھی۔

دوسری تصویروں کو دیکھتے ہوئے میرے یہی احساسات تھے، کھلے سر والی عورت اور شان دار خوابوں کے گھوڑے کی تصویر۔ موضوع کے انتخاب نے بھی مجھے دق کیا، چاہے وہ دو سرگرداں درویش تھے یا شیطان۔ یہ بالکل واضح تھا کہ میرے مصوروں نے شرمیلے انداز سے وہ کمتر گھٹیا تصویریں ہمارے سلطان کی تزئین شدہ کتاب میں شامل کر دی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر سے اللہ کے اس انصاف پر مرعوبیت محسوس کی کہ اس نے کتاب کے مکمل ہونے سے قبل ہی انشتے کی زندگی لے لی تھی۔ یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ مجھے اس مسودے کو کسی صورت مکمل کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔

اس کتے کو دیکھ کر کون برہم ہوتا جس کی تمیں سر پر کھڑے ہو کر تصویر کشی کی گئی تھی اور وہ سر اٹھائے میرے ناک تلے مجھے یوں گھور رہا تھا کہ میرا بھائی ہو؟ دوسری جانب میں کتے کے انداز، وضع یا حالت کی سادگی پر حیرت زدہ تھا، اس کی دھمکاتی ترچھی نگاہ کے حسن پر، زمین کی طرف جھکا سر اور اس کے دانتوں کی سفیدی، مختصراً ان منی ایچر فنکاروں کے جوہرِ فن پر جنہوں نے اس کی عکاسی کی تھی (میں یہ تخمین ہی کرنے کو تھا کہ کس نے اس تصویر پر کام کیا تھا) دوسری جانب ماورائے ادراک، بے معنی منطق سے جس طرح اس فن نے مہمیز پائی تھی، میں اسے معاف نہ کر سکتا تھا۔ فرنگیوں کی نقل کی خواہش اور نہ ہی یہ عذر کہ ہمارے سلطان نے اس کتاب کی تیاری کی ذمے داری سونپی تھی، کہ یہ ڈیوک کو تحفے کے طور پر دی جانی تھی، اس لیے اس میں ایسی تکنیک استعمال کرنی تھی جس سے وینس کے لوگ شناسا ہوتے: یہی ان تصویروں میں خوشامدی تصنع کی مناسب وضاحت تھی۔

میں ایک بڑی محنت سے تیار کی گئی تصویر میں سرخ رنگ کا جوش دیکھ کر وحشت زدہ ہو گیا جب کہ میں فوراً ہی اپنے منی ایچر فنکاروں میں سے ہر ایک کے ہر گوشے میں استعمال موقلم کو پہچان گیا۔ ایک فنکار کا ہاتھ جو میں پہچان نہ پایا، اس نے ایک خاص سرخ رنگ استعمال کیا تھا، کسی پوشیدہ منطق کے تحت اور اس تصویر کے ذریعے آشکار پوری دنیا آہستہ آہستہ اسی رنگ میں بھیگ گئی تھی۔ میں نے اس پر ہجوم تصویر پر کچھ وقت صرف کیا اور قرہ کو بتایا کہ میرے منی ایچر فنکاروں میں سے کس نے سرو کا درخت (بگلے)، بحری جہاز اور گھر (زیتون) اور چیل اور پھول (تتلی) بنائے تھے۔

"یقیناً آپ کے جیسا ایک عظیم ماہر منی ایچر فنکار جو برسوں کتاب خانے کا سربراہ رہا ہو، اپنے

تمام مصوروں کے فن کو الگ الگ پہچان سکتا تھا، ان کی لکیروں کی بناوٹ اور ان کے موقلم کے استعمال کا انداز اور مزاج۔" قرہ نے کہا۔ "لیکن جب میرے انشتے جیسا کوئی کتابوں کا کج رو یا سخی قدردان ان فن مصوروں کو نئی اور نا آزمودہ کار تکنیکیں استعمال کر کے مصوری کرنے پر مجبور کرتا ہے، تو آپ اسے یقین سے کیسے تعین کر سکتے ہیں کہ کون سے فنکار نے کون سا نمونہ بنایا؟"

میں نے ایک مثال سے جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ "ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ اصفہان پر ایک شاہ حکومت کرتا تھا، وہ کتابوں کے فن کو بہت پسند کرتا تھا اور اپنے قلعے میں بالکل تنہا رہتا تھا، وہ بڑا طاقتور، زور آور، ذہین لیکن بے رحم شاہ تھا اور اسے بس دو ہی چیزوں سے محبت تھی، مزین شدہ کتابیں جنہیں وہ بنوانے کا حکم دیتا تھا اور اپنی بیٹی۔ وہ شاہ اپنی بیٹی سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ اس کے دشمن اس دعوے میں ہی حق بجانب ہو سکتے تھے کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار تھا — کیوں کہ وہ اس قدر متکبر اور حاسد تھا کہ وہ ان ہمسایہ شہزادوں اور شاہوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیتا تھا جو اس کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے کے لیے قاصد بھیجتے تھے۔ قدرتی طور پر اس کی بیٹی کے شایان شان کوئی شوہر نہ تھا اور اس نے اپنی بیٹی کو ایک کمرے تک محدود کر رکھا تھا جہاں تک رسائی 40 مقفل دروازوں کے بعد ہوتی تھی۔ اصفہان کے عام عقیدے کے مطابق اس کا خیال تھا کہ اگر کسی غیر شخص کی نگاہ اس کی بیٹی پر پڑی تو اس کا حسن ماند پڑ جائے گا۔ ایک روز خسرو و شیریں کی تصویر کشی والے مسودے کے بعد جس کی ذمے داری سونپی گئی تھی اور اسے ہرات کے انداز میں مصوری کی گئی تھی، اصفہان میں ایک افواہ گردش کرنے لگی کہ زرد چہرے والی حسینہ جو ایک تصویر میں ظاہر ہوئی تھی وہ حاسد شاہ کی بیٹی کے سوا اور کوئی نہ تھی! افواہوں کو سننے سے پہلے ہی شاہ کے دل میں اس پراسرار مصوری پر شک تھا، کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ کتاب کے اوراق کھولے اور آنسوؤں کی برسات میں دیکھا کہ واقعی اس کی بیٹی کا حسن ان صفحات کی زینت بن چکا تھا۔ کہانی آگے بڑھنے پر معلوم ہوا کہ وہ دراصل 40 مقفل دروازوں کی حفاظت میں قید خود شاہ کی بیٹی نہیں تھی جو کسی رات مصوری کے لیے ظاہر ہوئی بلکہ اس کا حسن تھا جو ایک روز کسی آسیب کی طرح بیزاری سے تنگ آ کر کمرے سے فرار ہوا، آئینوں کے عکس اور دروازوں تلے اور چابیوں کے سوراخوں سے روشنی کی کسی کرن کی طرح یا دھوئیں کے کسی لچھے یا لکیر کی طرح ہوتا ہوا اس شب بھر کام کرتے مصور کی نگاہوں تک جا پہنچا تھا۔ وہ ماہر فن نوجوان حتیٰ کہ ایک فنکار خود کو روکنے میں ناکام رہا اور اس نے اس حسن کی خوبی سے عکاسی کر دی جو وہ خود تک محدود رکھنے یا دیکھنے کا متحمل نہ ہو پایا تھا، اس تصویر میں جو وہ مکمل کرنے کے قریب تھا۔ یہ وہ منظر تھا جس میں شیریں کو مضافات میں سیر کے دوران خسرو کی تصویر دیکھ کر اس کی محبت میں گرفتار ہوتے دکھایا گیا تھا۔"

"میرے پیارے استاد، میرے آقا، یہ ایک اتفاق ہے۔" قرہ نے کہا۔ "میں بھی خسرو و شیریں کے اس منظر کا بے حد مداح ہوں۔"

"یہ کوئی من گھڑت افسانے نہیں ہیں بلکہ یہ واقعات درحقیقت پیش آئے۔" میں نے کہا۔

اسٹو منی ایچر فنکار نے شاہ کی حسین و جمیل بیٹی کی تصویر کشی شیریں کے طور پر نہیں کی تھی بلکہ بانسری بجاتی ہی خدمت گار یا میز لگاتی کسی کنیز کے طور پر کیوں کہ وہ اس وقت اسی کی تصویر کشی کر رہا تھا۔ نتیجے کے طور پر دربار میں کھڑی کنیز کے حسن و جمال کے سامنے شیریں کی خوب صورتی ماند پڑ گئی اور یوں اس تصویر کا توازن بگڑ گیا۔ جب شاہ نے اپنی بیٹی کو تصویر میں دیکھا تو وہ اس ماہر منی ایچر فنکار کی نشان دہی چاہتا تھا جس نے اس کی تصویر بنائی تھی۔ لیکن شاہ کے غیظ و غضب کے خوف سے ماہر فن منی ایچر فنکار نے شیریں اور اس کنیز کو اپنے مخصوص انداز میں نہیں بلکہ اپنی شناخت چھپانے کے لیے ایک نئے انداز میں بنایا تھا۔ اس تصویر میں کچھ دوسرے منی ایچر فنکاروں کی ماہرانہ مصوری بھی استعمال ہوئی تھی۔"

"شاہ نے اس منی ایچر فنکار کو کیسے شناخت کیا جس نے اس کی بیٹی کی تصویر بنائی تھی؟"

"کانوں سے!"

"کس کے کانوں سے؟ بیٹی کے کانوں سے یا اس کی تصویر کے؟"

"دراصل، کسی کے بھی نہیں۔ اپنے وجدان پر بھروسا کرتے ہوئے، اس نے پہلے وہ تمام کتابیں، اوراق اور تصویریں کھولیں جو اس کے اپنے منی ایچر فنکاروں نے بنائے تھے اور ان سب میں کانوں کا جائزہ لیا۔ وہ جو برسوں سے جانتا تھا، اسی بات کو اس نے ایک نئی روشنی میں دیکھا۔ قابلیت کی سطح سے قطع نظر، ہر منی ایچر فنکار نے کان خود اپنے مخصوص انداز میں بنائے تھے۔ اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ وہ چہرہ جس کی تصویر کشی کی گئی، کسی سلطان کا چہرہ تھا یا بچے یا جنگجو یا حتیٰ کہ خدا معاف فرمائے کسی نقاب میں چھپا ہوا کسی مقدس ہستی کا چہرہ تھا، یا حتیٰ کہ خدا ایک بار پھر معاف فرمائے، معاذ اللہ، شیطان کا چہرہ۔ ہر صورت میں ہر منی ایچر فنکار نے کان ہمیشہ ایک ہی انداز میں بنائے تھے، یوں جیسے وہ کوئی دستخط تھے۔"

"کیوں؟"

"جب فنکاروں نے کسی چہرے کی تصویر کشی کی تو انہوں نے اس کے اعلیٰ حسن پر توجہ مرکوز رکھی، انداز یا اسلوب کے پرانے نمونوں کی ہدایات پر، اظہار پر، یا اس پر کہ آیا اسے کسی اصل سے مشابہ ہونا چاہیے۔ لیکن جب کانوں کی تصویر کشی کا وقت آیا، انہوں نے کسی دوسرے کا انداز چرایا نہ ہی کسی نمونے کی نقل کی اور نہ ہی اصل کان کا مطالعہ کیا۔ کانوں کے لیے انہوں نے کچھ سوچا نہ کسی سے متاثر ہوئے نہ یہ ہی سوچنے کو رکے کہ وہ کیا کر رہے تھے۔ انہوں نے بس یادداشت کے سہارے اپنے موقلم کی رہنمائی کی۔"

"لیکن کیا عظیم فنکار بھی اپنے شہ پارے صرف یادداشت کی بنیاد پر نہیں بناتے تھے، حقیقی گھوڑوں اور درختوں یا لوگوں کو دیکھے بغیر؟" قرہ نے پوچھا۔

"بالکل،" میں نے کہا، "لیکن وہ یادداشت برسوں کی غور و فکر، مراقبے اور گیان دھیان کے بعد ملتی ہے۔ زندگی بھر بہت سے گھوڑے، مصوری اور حقیقت میں دیکھنے کے بعد، وہ جانتے ہیں کہ وہ جو آخری گوشت پوست کا گھوڑا انہوں نے دیکھا تھا، وہ ان کے تصور کے گھوڑے کا صرف ستیاناس ہی کرے

زیر نگرانی ہوئی تھی۔ جہاں کہیں میں نے اپنا مدرسہ رکھا تھا وہ اور میں نے غور و توجہ سے دیکھا:

1. مرقعۂ ہمایوں کے صفحات پر ہم نے پہلے لومڑی کے کھلے منہ کا جائزہ لیا جس کی کھال ایک سمور فروش گروہ کا مالک، سرخ کا قفتان اور ارغوانی پٹی پہنے، اپنی گود میں لیے ہوئے تھا جب وہ گروہ ہمارے سلطان کے سامنے سے گزرا جو اس موقع کے لیے خصوصی تیار کیے گئے سائبان سے پریڈ دیکھ رہے تھے۔ بغیر غلطی کیے زیتون نے لومڑی کے دانت جو الگ الگ دیکھے جا سکتے تھے اور لنشتے کی تصویر میں شیطان کے دانت، دونوں بنائے تھے، ایک منحوس مخلوق، نصف بھوت اور نصف دیو، جو لگتا تھا سمرقند سے آئے تھے۔

2. تقریب کے خصوصی پرمسرت روز، ہپوڈروم کے قریب ہمارے سلطان کے سائبان نما خیمے کے نیچے، پھٹے پرانے کپڑوں میں سرحدی غازیوں کی غربت زدہ جماعت ظاہر ہوئی۔ ان میں سے ایک نے التجا کی: "میرے سلطان عالی مقام، ہم، آپ کے بہادر سپاہی اپنے مذہب کے نام پر کفار سے لڑتے ہوئے قید ہوئے اور اپنے بہت سے بھائیوں کو پیچھے یرغمال چھوڑ کر رہا ہوئے ہیں۔ یعنی ہمیں تاوان لینے کی خاطر آزاد کیا گیا ہے۔ تاہم جب ہم واپس استنبول پہنچے تو ہم نے ہر شے کو اس قدر گراں پایا کہ ہم اپنے ان بھائیوں کو آزاد کروانے کے لیے رقم جمع کرنے کے قابل نہیں جنہیں ہم کفار کی قید میں پژمردہ چھوڑ آئے ہیں۔ ہم آپ کی مدد کے رحم و کرم پر ہیں۔ براہِ مہربانی ہمیں سونا یا انعام عطا کریں جن کے بدلے ہم اپنے ساتھیوں کی آزادی حاصل کر لیں۔" بگلے نے واضح طور پر ایک طرف ست کتے کے ناخن بنائے تھے..... جو ایک کھلی آنکھ سے ہمارے سلطان پر نگاہ جمائے ہوئے تھا، ہمارے بے چارے مفلس و قلاش غازیوں پر اور ہپوڈروم میں ایرانی اور تاتاری سفیروں پر..... ان کے ساتھ ساتھ صفحے کے ایک کونے میں کتے کے ناخن لنشتے کی کتاب میں "طلائی کتے" کی ہم جوئی کی عکاسی کرتے تھے۔

3. لکڑی کے ایک تختے پر کھڑے انڈے اچھالتے ہوئے شعبدہ بازوں اور ہمارے سلطان کے سامنے قلابازیاں کھانے والے مداریوں کے درمیان ارغوانی جانگیاں پہنے عریاں پنڈلیوں والا ایک گنجا آدمی بھی تھا جس نے سرخ قالین پر ایک جانب بیٹھ کر طنبورہ بجایا، اس آدمی نے وہ آلۂ موسیقی بالکل اسی طرح تھام رکھا تھا جس طرح لنشتے کی کتاب میں "سرخ" کی تصویر کشی میں لڑکیاں پیتل کا طشت اٹھائے ہوئے تھیں: بلاشبہ زیتون کا کام۔

4. جب باورچیوں کا ٹولہ ہمارے سلطان کے قریب سے گزرا، وہ گوشت اور پیاز سے بھری گوبھی کو اپنے چھکڑے پر لادے چولہے پر دھری دیگ میں پکا رہے تھے۔ چھکڑے کے ساتھ ماہر باورچی گلابی زمین پر کھڑے تھے، نیلے پتھروں پر قورمے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ یہ پتھر اسی فنکار نے بنائے تھے جس نے گہری نیلی زمین پر سرخ والے بنائے تھے جس پر نیم جناتی مخلوق تیر رہی تھی، اس تصویر میں جسے لنشتے نے موت کہا تھا: تتلی کا بے داغ کام۔

5. گھڑسوار تاتار قاصد پیغام لائے تھے کہ ایرانی شاہ کی افواج میں عثمانیوں کے خلاف ایک

اور ہم کے لیے نقل و حرکت شروع ہو گئی تھی جنہوں نے اس پر ایرانی سفیر کی اعلیٰ مشاہدہ گاہ و کوشک کو زمین کے برابر کر دیا جس نے اس مسرت بھری تقریب میں ہمارے سلطان عالم پناہ کو بار بار یقین دلایا تھا کہ شاہ ان کا دوست تھا اور ان کے لیے برادرانہ محبت کے سوا دل میں اور کچھ نہ رکھتا تھا۔ غیظ و غضب اور تباہی کے اس واقعے کے دوران آب بردار، ہجوم دوم میں اڑنے والا گرد و غبار بٹھانے دوڑے اور سفیر پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہجوم کو پرامن کرنے کی خاطر کندھوں پر السی کے بیج کے تیل سے بھرے چرمی تھیلے اٹھائے آدمی نمودار ہوئے۔ آب برداروں اور السی کے تیل کے چرمی تھیلے اٹھائے آدمیوں کے اٹھے ہوئے بیچ اسی فنکار نے بنائے تھے جس نے "سرخ" کی تصویر کشی میں سپاہیوں کے اٹھتے قدم بنائے تھے: تتلی کا ہی کام۔

یہ آخری دریافت کرنے والا میں نہیں تھا جو ہمارے اشاروں اور سراغ کی تلاش میں دائیں بائیں بے حد سے گھما رہا تھا کبھی اس اور پھر اس تصویر پر، بلکہ وہ قرہ تھا جو اپنی آنکھیں پوری کھولے ہوئے تھا اور تشدد کے خوف اور گھر میں اپنی منتظر بیوی تک واپس پہنچنے کی امید میں انہیں شاذ ہی جھپکتا تھا۔ اس کام میں پوری سہ پہر صرف ہوئی کہ تصاویر جو مرحوم انشتے نے چھوڑی تھیں، ان میں سے کس پر ہمارے کس مٹی ایچر فنکار نے کام کیا تھا اور بعد میں ان کی علامات کی تعبیر کے لیے۔

قرہ کے مرحوم انشتے نے کسی صفحے کو کسی ایک مٹی ایچر فنکار کی فنکارانہ قابلیت تک محدود نہ رکھا تھا، بیشتر تصاویر پر میرے تمام تینوں ماہر مٹی ایچر فنکاروں نے کام کیا تھا۔ اس سے مراد یہ تھی کہ تصاویر اکثر و بیشتر گھر گھر حرکت میں رہی تھیں۔ اس کام کے علاوہ، جسے میں نے پہچان لیا مجھے ایک پانچویں فنکار کے انا ڑی موقلم بھی دکھائی دیے لیکن جیسے جیسے میں اس شرمناک کام کی جانب سے دکھائی گئی فن و ہنر کی کمی پر برہم ہوتا گیا، قرہ نے موقلم کے محتاط انداز سے تعین کیا کہ وہ بلاشبہ اس انشتے کا کام تھا — یوں اس نے ہمیں بھٹکنے سے بچا لیا۔ اگر ہم بے چارے نفیس آفندی کو چھوٹ دیتے جس نے انشتے کی کتاب کے لیے طلاکاری کا کام کیا تھا اور ہماری مرتبۂ ہمایوں کے لیے (ہاں، یقیناً اس بات نے میرا دل توڑ دیا) اور جس نے، میں نے سمجھا کہ اپنا موقلم چند دیواریں، پتے اور بادل بنانے کے لیے بھی استعمال کیا تھا، یہ واضح تھا کہ ان تصاویر پر صرف میرے ہی تین ذہین اور قابل استاد مٹی ایچر فنکاروں نے کام کیا تھا۔ وہ مجھے بے حد عزیز تھے جنہیں میں نے ان کی شاگردی کے زمانے سے بے حد محبت سے تربیت دی تھی، میرے تین عزیز از جان ماہرین فن: زیتون، تتلی اور لیلکا۔ ان کی صلاحیت، مہارت اور مزاج کی سراغ کے حصول کی خاطر بات کرتے ہوئے جس کی ہمیں تلاش تھی، ہم ناگزیر طور پر خود میری زندگی کے بارے میں بھی باتیں کرنے لگے:

زیتون کی خصوصیات

اس کا اصل نام ولی جان تھا۔ اگر میرے دیے گئے نام کے علاوہ بھی اس کی کوئی عرفیت تھی تو مجھے اس کی خبر نہیں کیوں کہ میں نے اسے کبھی اپنے کسی کام پر دستخط کرتے نہیں دیکھا۔ وہ جب شاگرد تھا تو ہم

قرہ، جس سے وہ پہلے ہی واقف تھا؟" میں نے کہا۔ "یا اگر تم پسند کرو، وہ اس تصویر کو دیکھنے کی خاطر انشٹے کو قتل کیوں کرے گا؟"

ہم دونوں نے کچھ دیر ان سوالوں پر غور کیا۔

"کیوں کہ اس تصویر میں کہیں کچھ کمی ہے۔" قرہ نے کہا۔ "یا اس لیے کہ اس کو اپنے کیے کسی عمل پر پچھتاوا ہے اور وہ اس پر خوف زدہ ہے۔ یا حتیٰ کہ —" اس نے کچھ دیر سوچا۔ "انشٹے کو قتل کرنے کے بعد وہ مزید نقصان کے لیے تصویر لے گیا، کوئی نشانی یا یادگار رکھنے کی خاطر، یا شاید بغیر کسی وجہ کے۔ آخر کو زیتون، ایک عظیم مصور ہے جو فطری طور پر مصوری کے کسی خوب صورت فن پارے کے لیے بے حد عقیدت رکھتا ہوگا۔"

"ہم پہلے ہی بات کر چکے ہیں کہ کس طرح سے زیتون ایک عظیم مصور ہے۔" میں نے خفا ہوتے ہوئے کہا۔ "لیکن انشٹے کی ایک بھی تصویر خوب صورت نہیں۔"

"ہم نے ابھی تک آخری تصویر نہیں دیکھی۔" قرہ نے بے خوفی سے کہا۔

تتلی کی خصوصیات

دوبارہ وہ خانہ محلے کے حسن چلپی کے نام سے جانا جاتا ہے لیکن میرے لیے وہ ہمیشہ سے "تتلی" رہا ہے۔ یہ حقیقت مجھے اس کے لڑکپن اور نوجوانی کے حسن و جمال کی یاد دلاتی ہے: وہ اس قدر وجیہہ تھا کہ اس کو دیکھنے والے اپنی نگاہوں پر یقین نہ کر پاتے اور دوبارہ دیکھنا چاہتے۔ میں اس کے جس قدر وہ وجیہہ تھا اسی قدر باصلاحیت ہونے کے تجربے پر ہمیشہ حیرت زدہ ہوتا تھا۔ وہ رنگوں پر قادر ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی طاقت ہے، رنگ استعمال کرنے کی خوشی سے ڈگمگاتے ہوئے وہ بڑے شدت و شوق سے مصوری کیا کرتا۔ لیکن میں نے قرہ کو متنبہ کیا کہ تتلی من موجی، بے مقصد اور متلون مزاج تھا۔ انصاف پسند ہونے کے لیے بے چین ہو کر میں نے مزید کہا کہ وہ ایک اصل منی ایچر فنکار ہے جو دل سے مصوری کرتا ہے۔ اگر تزئین کاری کے فنون کو ذہانت کی ضرورت نہیں، ہمارے اندر کے جانور سے بات کرنے یا سلطان کے غرور و فخر کو بڑھانے اور سہارا دینے کی، یعنی اگر یہ فن آنکھوں کے لیے صرف ایک جشن یا تقریب ہے تو تتلی ضرور ایک سچا منی ایچر فنکار ہے۔ وہ چوڑے، آسان، بے فکرے قصیدہ و خط بناتا ہے یوں جیسے اس نے چالیس برس قبل قزوین کے استادوں سے سبق لیا ہو، وہ اعتماد سے اپنے شوخ، خالص رنگ استعمال کرتا ہے اور اس کی تصویروں میں ہمیشہ ایک نرمی سے گولائی نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن اسے تربیت دینے والا میں ہوں، قزوین کے وہ عرصہ دراز پہلے دنیا سے گزر جانے والے استاد نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اس سے کسی بیٹے کی سی محبت رکھتا ہوں بلکہ نہیں، بیٹے سے بڑھ کر — لیکن مجھے اس سے کبھی مرعوبیت محسوس نہیں ہوئی۔ میرے سب شاگردوں کی طرح، اس کے بچپن اور لڑکپن میں، میں اسے موقلم، مسطر اور حتیٰ کہ لکڑی کی چھڑیوں سے پیٹتا رہا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس کا احترام نہیں کرتا۔ بے پروائی سے دیکھنے والا کوئی شخص جو اخذ کرے گا، اس

کہ اس کا کام دوسروں کو خوشی دے گا۔ وہ مجھے اس لیے برہم کرتا ہے کیوں کہ وہ اس رقم کے بارے میں سوچتا ہے جو وہ کمائے گا۔ یہ زندگی کی ایک اور ستم ظریفی ہے، بہت سے فنکار ہیں جو بہت کم صلاحیت کے حامل ہیں لیکن خود کو اپنے فن کے سامنے دستبردار کرنے میں تتلی سے زیادہ قابل ہیں۔

اپنی خامیوں پر قابو پانے میں تتلی پر یہ ثابت کرنے کا خیال غالب ہے کہ اس نے خود کو فن کے لیے قربان کر دیا ہے۔ ان بدھ مت اپچ فنکاروں کی طرح جو انگلیوں کے ناخنوں اور چاول کے دانوں پر تصویریں بناتے ہیں، عام آنکھ سے تقریباً نہ دکھائی دینے والی تصویریں، وہ مہین اور نازک دست کاری میں منہمک ہے۔ میں نے ایک مرتبہ اس سے پوچھا تھا کہ آیا اس نے خود کو اس امنگ کے سپرد کر دیا جس نے ابتدائی عمر میں بہت سے مصوروں کو اندھا کر دیا تھا کیوں کہ وہ اس بے پناہ لیاقت پر شرمندہ تھا جس سے اللہ نے اسے نوازا تھا۔ صرف نااہل منی ایچر فنکار ہی اپنے لیے آسانی سے نام کمانے اور موٹی عقل والے سرپرستوں کی نگاہوں میں اہمیت حاصل کرنے کی خاطر چاول کے دانے پر بنائے اپنے درخت کے ہر پتے میں رنگ بھرتے تھے۔

اپنی بجائے دوسرے لوگوں کی خوشی کے لیے مصوری کرنے کا تتلی کا رجحان، اس کی دوسروں کو خوش کرنے کی بے قابو ضرورت، اسے تقریباً تحسین کا ایک غلام بنا دیتی ہے۔ اور یوں ایک غیر یقین تتلی سربراہ مصور بن کر اپنے موقف کی تائید چاہتا ہے۔ یہ موضوع اٹھانے والا اقرو تھا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا، ''میں جانتا ہوں کہ وہ میری موت کے بعد میری جگہ لینے کا سوچ رہا ہے۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں کیا یہ خواہش اسے اپنے منی ایچر بھائیوں کی جان لینے پر اکسا سکتی ہے؟''

''ایسا ہو سکتا ہے۔ وہ ایک عظیم فنکار ہے لیکن وہ اس سے واقف نہیں اور وہ مصوری کرتے ہوئے دنیا کو فراموش نہیں کر سکتا۔''

میں نے یہ کہا، جس کے بعد مجھے سمجھ آئی کہ سچ یہ تھا کہ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ میرے بعد کتاب خانے کی سربراہی تتلی سنبھالے۔ میں زیتون پر بھروسہ نہ کر سکتا تھا اور آخر میں لگا، وینس کے انداز کا نادانستہ طور پر غلام بن جاتا۔ تتلی کی اپنی تحسین کی خواہش میں اس خیال پر پریشان تھا کہ وہ کوئی زندگی لے سکتا تھا کتاب خانے اور سلطان دونوں سے نمٹنے میں بے حد اہم ہو گی۔ صرف تتلی کی حساسیت اور خود اپنے رنگوں کی تحتی پر یقین ہی وینس کی طرز فن کے خلاف مزاحمت کر سکتے تھے جو حقیقت کی نمائندگی کی بجائے خود پوری تفصیل سے حقیقت کی عکاسی کر کے دیکھنے والے کو فریب دیتے تھے: تصویریں، بشمول سائے، پادریوں، پلوں، چوکھٹی، شمع دان، چرچ اور اصطبل، بیل اور چھکڑوں کے پہیوں کی، یوں جیسے وہ سب کے سب اللہ کے نزدیک یکساں اہمیت کے حامل تھے۔

''کیا کبھی ایسا ہوا کہ آپ بغیر اطلاع اسے ملنے گئے ہوں جیسا کہ دوسروں کو ملنے گئے تھے؟''

''جو کوئی بھی تتلی کے کام کو دیکھے، وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ وہ محبت کی قدر کے ساتھ ساتھ دل سے محسوس کیے جانے والے مسرت و غم کو بھی سمجھتا ہے۔ لیکن رنگوں سے سب محبت کرنے والوں کی طرح وہ اپنے

جذبات کی رو میں بہ جاتا ہے اور جنون مزاج ہے۔ چوں کہ میں اس کی خدا کی طرف سے عطا کردہ اور مجوزاتی صلاحیت، رنگوں کے لیے اس کی حساسیت سے مسحور ہوں، میں نے اس کی نوعمری میں اس پر بہت توجہ دی اور اس کے بارے میں ہر جاننے والی بات معلوم کی۔ ظاہر ہے، ایسی صورت حال میں دوسرے منی ایچر فنکار جلد ہی حسد کا شکار ہو گئے اور استاد شاگرد کا رشتہ کشیدگی اور تناؤ میں آ گیا۔ محبت کے ایسے بہت سے لمحات تھے جب تتلی نے ذرا خوف محسوس نہ کیا کہ دوسرے کیا کہیں گے۔ حال میں، جب سے اس نے قریب ہی کے پھل فروش کی حسین بیٹی سے شادی کی ہے، مجھے اسے جا کر ملنے کی تمنا ہوئی نہ ہی مجھے یہ موقع ملا۔"

"افواہ ہے کہ وہ ارض روم والے حوجا کے پیروکاروں میں شامل ہے۔" قرہ نے کہا، "لوگ کہتے ہیں کہ اسے بہت فائدہ ہو گا اگر حوجا اور اس کے آدمی بعض کاموں کے مذہب سے غیر ہم آہنگ ہونے کا اعلان کر دیں اور یوں ہماری کتابوں کو ——— جن میں جنگوں، ہتھیاروں، خونیں مناظر اور معمول کی تقریبات کی تصویر کشی ہے، باورچیوں سے لے کر جادوگروں، درویشوں، نوعمر رقاص لڑکوں اور کباب فروشوں سے قفل سازوں تک ——— شیطان کا تو کوئی تذکرہ ہی نہیں ——— اور ہمیں پرانے ایرانی فنکاروں کے موضوعات اور انداز تک محدود کر دیں۔"

"چاہے ہم امیر تیمور کے زمانے کی ان حیرت انگیز تصویروں کی جانب بجر وقن سے اور فتح مندی سے واپس لوٹ جائیں، چاہے ہم حتیٰ کہ ان کے تمام تفصیل اور غیر اہم چیزوں کے ساتھ اس زندگی اور طرز زندگی کو واپس پلٹ جائیں ——— جیسا کہ ذہین بگلا یقینی طور پر میرے بعد کرنے کے قابل ہو گا ——— حتمی تجزیے میں، یہ سب فراموش کر دیا جائے گا۔" میں نے بے رخی سے کہا، "کیوں کہ ہر کوئی فرنگیوں کی طرح مصوری کرنا چاہے گا۔"

کیا میں نے درحقیقت واقعی چمکار کے ان الفاظ کا یقین کیا؟

"میرے انشتے کا بھی یہی خیال تھا۔" قرہ نے ملامت سے اعتراف کیا، "تاہم یہ بات انھیں امید دلاتی تھی۔"

بگلے کی خصوصیات

میں اسے عاصی مصور مصطفیٰ چلیبی کے نام سے دستخط کرتے دیکھ چکا ہوں۔ اس پر غور کرنے کی زحمت کیے بغیر کہ آیا اس کا کوئی الگ اسلوب تھا یا ہونا چاہیے تھا، آیا اس کی پہچان دستخط کے ساتھ ہونی چاہیے تھی یا نہیں یا اسے پرانے فنکاروں کی طرح گمنام رہنا چاہیے تھا یا آیا کسی کا عجز و انکسار اسے ایسا کرنے کی اجازت دیتا تھا یا نہیں، اس نے بس ایک مسکراہٹ اور فتح مندی کامیابی کے ساتھ اپنے نام کے دستخط کر دیے تھے۔

وہ بہادری سے اس رستے پر گامزن رہا جو میں نے اس کے لیے طے کیا تھا اور وہ کچھ کر دکھایا جو

میرا نام ہے قرمزی

میرے اور عظیم استاد عثمان کے سامنے مختلف مسودوں کے اوراق پڑے تھے ـــــ بعض خطاطی شدہ متن اور مجلد ہونے کو تیار تھے، بعض میں ابھی رنگ نہ بھرے گئے تھے یا کسی اور طرح سے نامعلوم سبب کے باعث نامکمل تھے ـــــ جب ہم نے تمام سہ پہر استاد منی ایچر فنکاروں اور میرے انشتے کی کتاب کے اوراق کے تجزیے میں، اپنے اندازوں کو بیان کرتے ہوئے صرف کی۔ ہم نے خیال کیا کہ ہم کمان دار کے آخری محترم مگر غیر مہذب آدمیوں کو دیکھ چکے تھے جو ہمارے پاس منی ایچر مصوروں اور خطاطوں کے گھروں سے جمع کاغذات لائے تھے جن کے گھروں پر یکبارگی تلاشی لی گئی تھی (بعض اوراق کا ہماری دونوں کتابوں سے بالکل کوئی تعلق نہ تھا اور بعض ایسے تھے جنہوں نے تصدیق کی کہ خطاط بھی چند مزید سکوں کی خاطر محل سے باہر کا کام قبول کر رہے تھے)۔ تب ان میں سب سے کم، معزز استاد کے سامنے کھڑا ہوا اور اپنی پیٹی میں سے ایک کاغذ نکالا۔

پہلے تو میں نے پرواہ نہ کی، یہ سوچتے ہوئے کہ وہ ان درخواستوں میں سے ہی کوئی ایک ہوگی جن میں کوئی باپ جس قدر ممکن ہو اتنے رسالے کے سربراہوں اور گروپ کپتانوں کے پاس جا کر اپنے بیٹے کی شاگردی کی خاطر درخواست دیتے ہیں۔ اندر نفوذ کرنے والی مدھم روشنی سے میں بتا سکتا تھا کہ صبح کا سورج ماند پڑ چکا تھا۔ اپنی آنکھوں کو آرام دینے کی خاطر میں وہ ورزش کر رہا تھا جس کا مشورہ شیراز کے پرانے استادوں نے منی ایچر فنکاروں کو دیا تھا تاکہ وہ وقت سے پہلے طاری ہونے والے نابینا پن کو ٹال سکیں، یعنی میں کسی شے پر توجہ مرکوز کیے بغیر خالی نگاہوں سے فاصلے پر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تبھی میں نے سنسنی خیزی سے اس کاغذ کے رنگ اور دل کی دھڑکن روکنے والی تہوں کو پہچانا جسے میرے استاد تھامے ہوئے تھے اور بے یقینی کے تاثرات سے دیکھ رہے تھے۔ یہ بالکل ان خطوط جیسا تھا جو شکورے مجھے اسیتر کے ذریعے بھجوایا کرتی تھی۔ میں کسی احمق کی طرح کہنے والا تھا، "کیا اتفاق ہے"، جب میں نے غور کیا کہ شکورے کے پہلے خط کی طرح اس کے ہمراہ بھی کسی کھردرے کاغذ پر تصویر تھی!

استاد عثمان نے تصویر اپنے پاس رکھ لی۔ خط انہوں نے مجھے تھما دیا جو میں نے خجالت سے دیکھا

کہ شکورے کی جانب سے تھا۔

"میرے عزیز شوہر قرہ، میں نے مرحوم نیس آفندی کی بیوہ قلیبے کا حال دریافت کرنے استھر کو بھیجا تھا۔ وہاں قلیبے نے استھر کو یہ تصویر والا ورق دکھایا جو میں تمہیں بھیج رہی ہوں۔ بعد میں، میں قلیبے کے گھر گئی، اسے ہر ممکن طریقے سے قائل کرنے کی کوشش کی کہ اس کے بہترین مفاد میں تھا کہ یہ تصویر مجھے دے دے۔ یہ ورق بے چارے نیس آفندی کی لاش کے ساتھ کنوئیں سے ملا تھا۔ قلیبے نے قسم کھائی کہ گھوڑے کی تصویر کشی کے لیے کسی نے اس کے شوہر کی خدمات حاصل نہ کی تھیں، وہ ابدی رحمت میں رہے، خدا کرے۔ تو پھر، وہ کس نے بنائے تھے؟ کمان دار کے آدمیوں نے گھر کی تلاشی لی۔ میں یہ خط اس لیے بھیج رہی ہوں کہ یہ معاملہ تفتیش میں ضرور اہم ہوگا۔ بچے تمہاری احترام سے دست بوسی کرتے ہیں۔

تمہاری بیوی شکورے۔"

میں نے اس خوب صورت تحریر کے آخری تین الفاظ احتیاط سے تین بار پڑھے یوں جیسے کسی باغ میں گلاب کے تین حیرت انگیز خوب صورت پھولوں کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر میں اس ورق پر جھک گیا جس کا ہاتھ میں عدسہ تھامے استاد عثمان جائزہ لے رہے تھے۔ میں نے فوراً ہی غور کیا کہ وہ شکلیں جن کی روشنائی لیور رنگ تھی، گھوڑے تھے جن کی ایک ترتیب میں تصویر بنائی گئی تھی جیسا کہ پرانے استاد ہاتھ سیدھا کرنے کے لیے کرتے۔

استاد عثمان نے جنہوں نے شکورے کی کسی تبصرے کے بغیر پڑھی تھی، ایک سوال اٹھایا: "یہ کس نے بنائی؟" پھر انہوں نے خود جواب دیا: "یقیناً کسی ایسے فنکار نے جس نے مرحوم انشتے کا گھوڑا بنایا تھا۔"

کیا وہ اس قدر پر یقین ہو سکتے تھے؟ مزید یہ کہ ہمیں بالکل یقین نہ تھا کہ اس کتاب کے لیے گھوڑا بنایا کس نے تھا۔ ہم نے تو اوراق میں سے گھوڑا نکالا اور اس کا جائزہ لینے لگے۔

وہ ایک خوب صورت، سادہ، بھورے رنگ کا گھوڑا تھا جس پر سے آپ نظریں نہ ہٹا پاتے۔ کیا میں سچا تھا، جب میں نے یہ کہا؟ میرے پاس اپنے انشتے کے ساتھ اس گھوڑے کو دیکھنے کا بہت وقت تھا اور بعد میں جب میں ان تصویروں کے ساتھ تنہا رہ گیا لیکن تب میں نے اس کے بارے میں زیادہ نہ سوچا تھا۔ وہ ایک خوب صورت مگر عام گھوڑا تھا۔ وہ اس قدر عام سا تھا کہ ہم یہ بھی یقین نہ کر پائے تھے کہ اسے کس نے بنایا تھا۔ وہ اصل اخروٹی رنگ کا نہیں تھا بلکہ بھورا لاکھ کے سے رنگ کا، اس کی سموں میں ہلکے سے سرخ رنگ کا اشارہ بھی ملتا تھا۔ یہ ایسا گھوڑا تھا جسے میں نے اکثر دوسری کتابوں اور دوسری تصویروں میں دیکھا تھا جو میں جانتا تھا کہ کسی ایجر فنکار نے ذرا سا بھی غور و فکر کیے اور بغیر دیکھے زبانی ہی بنائی تھیں۔

ہم اسی طرح گھوڑے کو گھورتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے دریافت کیا کہ اس میں ایک راز چھپا تھا، اب اگرچہ میں گھوڑے کی خوب صورتی کو دیکھ سکتا تھا جو میری آنکھوں کے سامنے افق حرارت کی طرح

جھلائی اور اس کے اندر ایک طاقت جس نے زندگی کے جوش و جذبے کو ابھارا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا، "جادوئی لمس رکھنے والا کون منی ایچر فنکار ہے جس نے اس گھوڑے کی اس طرح عکاسی کی کہ جیسے اللہ اسے دیکھتا؟" یوں جیسے اچانک یہ فراموش کرتے ہوئے کہ وہ بھی ایک کمینے قاتل کے سوا کچھ نہ تھا۔ گھوڑا میرے سامنے یوں تھا جیسے وہ کوئی اصل گھوڑا ہو لیکن اپنے دماغ کے کسی گوشے میں میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ صرف ایک تصویر تھی۔ ان دو سوچوں کے درمیان گرفتار ہونا خوش کن تھا اور اس نے میرے اندر کاملیت کا ایک احساس جگایا۔

کچھ دیر ہم مشق کے ذریعے بنائے گئے دھندلے گھوڑوں کا موازنہ میرے انشتے کی کتاب کے لیے بنائے گئے گھوڑے سے کرتے رہے، آخر کار یہ تعین کرتے ہوئے کہ انھیں ایک ہی ہاتھ نے بنایا تھا۔ ان مضبوط اور خوش وضع نسل کش گھوڑے کے مغرور انداز، تحرک کی بجائے جمود کی عکاسی کرتے تھے۔ میں انشتے کی کتاب کے لیے بنے گھوڑے سے مرعوب تھا۔

"یہ اس قدر شاندار گھوڑا ہے۔" میں نے کہا، "اس سے کسی کو یہ شدید آرزو ملتی ہے کہ کاغذ نکالے اور اس کی نقل کرے اور پھر بار آخری بار اس کی تصویر کشی کرے۔"

"عظیم ترین خراج تحسین جو تم کسی مصور ادا کر سکتے ہو یہ ہے کہ اس کے کام نے تمہارے اندر مصوری کرنے کے جوش و خروش کو ابھارا ہے۔" استاد عثمان نے کہا، "لیکن اب آؤ، اس کی قابلیت کو بھول جائیں اور اس شیطان کی شناخت بے نقاب کرنے کی کوشش کریں۔ کیا انشتے آفندی، خدا انھیں جنت نصیب کرے، نے بھی اس قسم کی کسی کہانی کا تذکرہ کیا جو اس تصویر سے متعلق ہو؟"

"نہیں۔ ان کے مطابق، یہ ان گھوڑوں میں سے ایک تھا جو کبھی طاقت ور سلطان کے زیر حکومت علاقوں میں رہتے تھے۔ یہ ایک خوب صورت گھوڑا ہے، عثمانی نسب کا گھوڑا۔ یہ وہ علامت ہے جو وینس کے ڈیوک کے سامنے ہمارے سلطان کی امارت اور علاقے پر ان کے اختیار کا مظاہرہ کرے گی۔ لیکن دوسری جانب جیسا کہ وینس کے فنکار ہر شے کی عکاسی کرتے ہیں، یہ گھوڑا ابھی زیادہ زندگی نما ہوتا تھا۔ خدا کے تصور یا بصارت سے جنم لینے والے گھوڑے سے زیادہ اس گھوڑے کی طرح جو استنبول کے کسی خاص دولہا کے خاص اصطبل میں رہا تا کہ وینس کا ڈیوک بدلے میں ہمارے سلطان کی طاقت اور دوستی کو قبول کرتے ہوئے خود سے کہہ سکے، "بالکل جیسے عثمانی منی ایچر فنکار، دنیا کو ہماری طرح دیکھنے لگے ہیں، اسی طرح خود عثمانی بھی ہم سے مشابہ ہونے لگے ہیں۔" کیوں کہ اگر تم گھوڑے کو مختلف طور پر بنانے لگو تو تم دنیا کو مختلف طور پر دیکھنے لگتے ہو۔ اس کی خصوصیات یا انوکھے پن کے باوجود اس گھوڑے کی تصویر کشی پرانے استادوں کے انداز میں کی گئی تھی۔"

ہم نے گھوڑے پر جس قدر زیادہ غور و فکر کیا، وہ میری نگاہوں میں اسی قدر خوب صورت اور بیش قیمت بن گیا۔ اس کا منہ ذرا سا کھلا تھا اور دانتوں کے بیچ سے اس کی زبان دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی

آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کی ٹانگیں مضبوط اور دل فریب تھیں۔ کیا کوئی تصویر اس لیے داستانوی بنتی تھی جیسی وہ تھی یا پھر اس باعث جو اس کے بارے میں کہا جائے؟ استاد عثمان بالکل دھیرے سے اس جانور پر اپنا عدسہ حرکت میں لا رہے تھے۔

"یہ گھوڑا کیا پیغام دینے کی کوشش کر رہا ہے؟" میں نے احمقانہ جوش و خروش سے کہا۔ "یہ گھوڑا کیوں وجود رکھتا ہے؟ یہ گھوڑا کیوں؟"

"سلاطین، شاہوں اور پادشاؤں کی جانب سے تیار کروائی گئی تصویروں کے ساتھ ساتھ کتابیں بھی ان کی طاقت کا اعلان کرتی ہیں۔" استاد عثمان نے کہا۔ "سرپرست کو یہ کام خوب صورت لگتے ہیں۔ ان کے سونے کے ورق کے فراخ استعمال، مزدوری پر بے پناہ اخراجات اور بصارت پر کیوں وہ حکمران کی امارت کا ثبوت ہوتی ہیں۔ کسی تصویر کی حسن و خوبی اہم ہے کیوں کہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ فنی ایجر ذکار کی قابلیت یا فن تصویر کی تخلیق میں استعمال شدہ سونے کی طرح ہی نایاب اور بیش قیمت ہے۔ دوسروں کو گھوڑے کی تصویر اس لیے خوب صورت لگتی ہے کیوں کہ یہ ایک گھوڑے سے مشابہ ہے، خدا کے گھوڑے کا وژن یا تصور ہے یا پھر خالصتاً تخیلی گھوڑا ہے۔ سچائی کی جھلک کو فن یا مہارت سے منسوب کیا جاتا ہے۔ جہاں تک ہماری بات ہے، تصویر کا حسن اس کی لطافت اور جذبات سے شروع ہوتا ہے۔ یقیناً یہ معلوم کرتا کہ یہ گھوڑا نہ صرف محض خود کو آشکار کرتا ہے بلکہ تصویر کشی کے ہاتھ، اس شیطان کے نشان کو، یہ تصویر کے معنی کو بڑھا دے گا۔ پھر یہ بھی معلوم کرتا ہے کہ یہ صرف گھوڑے کی تصویر نہیں بلکہ خود گھوڑا ہے جو خوب صورت ہے، یعنی کسی گھوڑے کی تصویر کو صرف ایک تصویر نہیں بلکہ حقیقی گھوڑے کے طور پر دیکھنا۔"

"اگر تم اس تصویر کو یوں کسی اصلی گھوڑے کی طرح دیکھو تو تمہیں وہاں کیا دکھائی دے گا؟"

"اس گھوڑے کی جسامت دیکھیں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ کوئی ٹٹو یا کم نسل گھوڑا نہیں بلکہ اس کی گردن کے خم اور لمبائی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اچھا ریس کا گھوڑا ہے اور اس کی کمر کی ہمواری اسے طویل سفروں کے لیے موزوں بناتی ہے۔ اس کی دبلی پتلی نازک ٹانگوں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ عربی گھوڑوں کی طرح چست اور چالاک تھا، لیکن اس کا جسم خاصا لمبا اور بڑا ہے کہ یہ عربی گھوڑا نہیں۔ اس کی ٹانگوں کی خوب صورتی وہی بتاتی ہے جو بخارا کے عالم ابن فضلان نے اپنی "کتاب اسپ" میں اعلیٰ گھوڑوں کے متعلق کہا تھا کہ اگر وہ کسی دریا کنارے پہنچیں تو وہ حیرت زدہ یا خوف زدہ ہوئے یا چونکے بغیر آسانی سے چھلانگ لگا دیں گے۔ مجھے "کتاب اسپ" میں منتخب ترین گھوڑوں کے متعلق لکھی حیرت انگیز باتیں زبانی یاد ہیں، جسے ہمارے شاہی بیطار (جانوروں کے طبیب) فیضی نے بڑی خوبی سے ترجمہ کیا تھا اور میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ ہمارے سامنے رکھے سرخی مائل بھورے گھوڑے پر ہر لفظ صادق آتا ہے: کسی اچھے گھوڑے کا چہرہ خوب صورت اور آنکھیں غزال سی ہونی چاہئیں، اس کے کان سرکنڈے کی طرح سیدھے اور ان کے درمیان خاصا فاصلہ ہونا چاہیے، اچھے گھوڑے کے دانت چھوٹے چھوٹے ہونے چاہئیں، گول پیشانی اور لمبی

ی بھنویں، اسے دراز قد، لمبی ایال اور پتلی کمر والا، چھوٹی ناک اور چھوٹے کندھوں اور چوڑی پشت والا ہونا چاہیے۔ اس کی ران بھاری، گردن لمبی، چھاتی چوڑی، ران کے اندر کے حصے گوشت سے بھرے اور پیٹھ چوڑی ہو۔ جانور کو مغرور اور خوش وضع ہونا چاہیے اور جب یہ ٹہلے یا چلے تو ایسے حرکت کرے جیسے دونوں جانب موجود لوگوں کو آداب بجالا رہا ہو۔"

"وہ تو بالکل ہمارا سرخی مائل بھورا گھوڑا ہے۔" میں نے حیرت کے عالم میں گھوڑے کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم نے اپنا گھوڑا دریافت کر لیا ہے۔" استاد عثمان نے اسی ذو معنی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، "لیکن بدقسمتی سے ہمیں اس سے کچھ فائدہ نہیں جب بات منی ایچر فنکار کی شناخت کی آتی ہے کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ کوئی بھی منی ایچر فنکار اپنی صحیح الدماغی کی حالت میں گھوڑے کی تصویر کشی کے لیے اصل گھوڑے کو نمونے کے طور پر استعمال نہ کرے گا۔ قدرتی طور پر میرے منی ایچر فنکار ایک ہی تحرک میں یادداشت کے بل پر گھوڑے کی تصویر بناتے۔ ثبوت کے طور پر مجھے خود کو یاد دلانے دیجیے کہ ان میں سے بیشتر اس کے کھر سے اس کا خاکہ بنانا شروع کرتے ہیں۔"

"کیا یہ اس لیے نہیں کیا جاتا کہ تصویر کشی ایسے ہو جیسے گھوڑا مضبوطی سے زمین پر کھڑا ہے؟" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"جیسا کہ قزوین کے جمال الدین نے گھوڑوں کی تصویر کشی پر اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ کوئی گھوڑے کے کھر سے شروع کر کے اس کی پوری تصویر درست طور پر صرف اس صورت میں بنا سکتا ہے جب پورا گھوڑا اس کی یادداشت میں موجود ہو۔ ظاہری بات ہے کہ خیال و یادداشت کے بل پر گھوڑے کی تصویر کشی، یا حتیٰ کہ زیادہ مضحکہ خیز، بار بار اصلی گھوڑے کو دیکھ کر، کسی کو سر سے گردن اور پھر گردن سے جسم تک کام کرنا ہوگا۔ میں نے سنا کہ وینس کے بعض مصور تذبذب سے بغیر کسی وخطا کے نئی تمہارے عام بار بردار گھوڑوں کی تصویریں خیاطوں اور قصابوں کو فروخت کر کے خوش ہیں۔ ایسی تصویر کو دنیا کے معنی یا خدا کی تخلیق کے حسن و جمال سے کچھ لینا دینا نہیں۔ لیکن میں اس بات کا قائل ہوں کہ درمیانے درجے کے فنکاروں کو بھی جاننا چاہیے کہ حقیقی مصوری اس کے مطابق نہیں ہوتی کہ کسی خاص لمحے میں آنکھوں نے کیا دیکھا بلکہ اس کے مطابق ہوتی ہے جو ہاتھ یاد رکھتا ہے اور جس کا عادی ہے۔ قرطاس کے سامنے مصور ہمیشہ تنہا ہوتا ہے۔ بالکل اسی وجہ سے وہ ہمیشہ یادداشت کا محتاج ہوتا ہے۔ اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہمارے اس گھوڑے میں جو ہاتھ کی تیز اور بامہارت حرکت سے یادداشت کے بل پر بنایا گیا ہے چھپے خفیہ دستخط کو سامنے لانے کی کوشش کریں۔ یہاں ذرا غور سے دیکھو۔"

وہ اس شان دار قابل دید گھوڑے پر بالکل آہستگی سے عدسہ گھما رہے تھے یوں جیسے کسی بیل کے چمڑے پر باریکی سے بنے کسی قدیم نقشے میں خزانے کا مقام دریافت کر رہے ہوں۔

میں جیحوں کے کنارے سے Halkul-Vad کا قلعہ دوبارہ فتح کیا تھا اور پھیکی سرخی مائل بھورے، اور چمکتی سبز رنگ کے گھوڑے، جن میں سے ایک تب سر کے بل لڑھک گیا جب وہ اس پر فرار ہوئے، ایک سیاہ گھوڑا جسے دیکھ کر استاد عثمان نے تبصرہ کیا: "یہ میری نظر سے چوک گیا تھا۔ مجھے حیرت ہے ایسا بے پروا کام کس نے کیا ہوگا؟" ایک سرخ گھوڑا جس نے جلسے سے اپنے کان اس سمت میں موڑ رکھے تھے جہاں درخت تلے بیٹھا ایک شاہی خدمت گار بانسری بجا رہا تھا، شیریں کا اس کے جیسا ہی دل فریب اور شرمیلا اس کا منتظر گھوڑا شبدیز (Shabdiz) جب وہ چاندنی میں جھیل میں غسل کر رہی تھی، نیزہ بازی میں استعمال ہونے والے زندگی سے بھرپور گھوڑے، طوفان جیسا گھوڑا اور اس کا خوب صورت دولہا جس پر کسی وجہ سے استاد عثمان نے تبصرہ کیا: "مجھے نوعمری میں اس سے بے حد محبت تھی، میں بے حد تھک گیا ہوں۔" سورج کی سی رنگت کا تیز، پروار گھوڑا جسے اللہ نے کافروں کے حملے میں ان کی حفاظت کے لیے پیغمبر الیاس کے پاس بھیجا تھا ــــ جس کے پر غشی سے الیاس کو دے دیے گئے تھے، سلطان سلیمان عالیشان کا سرمئی گھنی داڑھی والا چھوٹا سا سر اور بھاری بھرکم وجود، جو اداسی سے عالم میں نوعمر اور قابل محبت شہزادوں کو دیکھ رہے تھے، مشتعل گھوڑے، سرپٹ دوڑتے گھوڑے، حسین زرد گھوڑے، خوب صورت گھوڑے، گھوڑے جنہیں کوئی توجہ نہ دی، گھوڑے جو ان اوراق سے کبھی نہ نکلے اور گھوڑے جو تزئین شدہ حاشیے پر چڑھے اس قید سے فرار ہو رہے تھے۔

ان میں سے کسی ایک میں بھی وہ نتھنے نہ تھے جن کی ہمیں تلاش تھی۔

پھر بھی ہم خود پر طاری ہو جانے والی تھکن اور افسردگی کے ساتھ ایک مستقل جوش و خروش قائم رکھنے میں کامیاب رہے، چند ایک مرتبہ ہم گھوڑے کے بارے میں بھول ہی گئے اور تصویر کے حسن میں کھو گئے ان رنگوں میں جو محاتی دست برداری پر مجبور کرتے تھے۔ حیرت سے زیادہ یاد ماضی کے جوش وجذبے سے استاد عثمان کی نگاہ ہمیشہ تصویروں پر رہی ــــ جن میں سے بیشتر خود انہوں نے بنائی تھیں، نگرانی کی تھی یا آرائش کی تھی ــــ "یہ تو ہم پاشا محلے کے تو ہم نے بنائی تھیں!" انہوں نے ایک مرتبہ ہمارے سلطان کے محترم سلطان سلیمان کے سرخ جنگی خیمے کے نیچے چھوٹے چھوٹے کاسنی پھولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "وہ ہر طرح سے ایک استاد تھے لیکن چالیس برس تک وہ تصویروں کی خالی جگہوں کو پانچ پتوں، ایک ہی بار کھلنے والے پھولوں سے بھرتے رہے، یہاں تک کہ غیر متوقع طور پر وہ دو برس قبل وفات پا گئے۔ میں انہیں ہمیشہ یہ چھوٹے چھوٹے پھول بنانے کی ذمہ داری دیتا تھا کیوں کہ وہ یہ کام کسی سے بھی بہتر کر سکتے تھے۔" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہو گئے اور پھر بولے: "یہ قابل افسوس ہے، قابل افسوس!" اپنی پوری دلسوزی کے ساتھ میں نے محسوس کیا کہ یہ الفاظ ایک پورے عہد کے خاتمے کے ترجمان تھے۔

ہم پر تقریباً تاریکی اتر چکی تھی جب کمرے میں روشنی کا سیلاب امڈ آیا۔ شور و غل تھا۔ میرا دل، جنگی ڈھول کی طرح بجنے لگا تھا، فوراً سمجھ گیا۔ شہنشاہ جہاں، عالم پناہ ہمارے سلطان آ چکے تھے۔ میں نے

میرے خاموش رہے۔

"میں شاعروں کے مقابلے اور چینی اور مغربی مصوروں اور آئینے سے مقابلے کا شائق نہیں۔" وزیر سلطان نے کہا، "مجھے سب سے زیادہ اطبا کا مقابلہ پسند ہے جو موت سے مقابلہ کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر، وہ اچانک ہم سے رخصت ہو کر نماز مغرب کے لیے روانہ ہو گئے۔

بعد میں جب مغرب کی اذان ہو رہی تھی، نیم تاریکی میں محل کے دروازوں سے نکلنے کے بعد میں خوش خوش شکورے، بچوں اور ہمارے گھر کے تصور میں گھر کی طرف بھاگا جا رہا تھا، جب مجھے اطبا کے مقابلے کی کہانی یاد آئی۔

اپنے سلطان کی موجودگی میں مقابلہ کرنے والے دو طبیبوں میں سے ایک — جس کی تصویر کشی اکثر گلابی رنگ میں کی جاتی ہے — جس نے ہاتھی تک کو مار گرانے والے تیز زہر کی سبز گولی بنائی، جو اس نے دوسرے طبیب کو دے دی، وہی جو گہرا نیلا کا قفطان پہنے ہوتا ہے۔ اس طبیب نے پہلے تو وہ زہر بھری گولی نگل لی اور بعد میں وہ گہرا نیلا تریاق پی لیا جو اس نے پہلے ہی تیار کیا تھا۔ جیسا کہ اس کی نرم خوئی سے معلوم کیا ہی جا سکتا ہے کہ اسے کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ مزید یہ کہ اب اس کی باری تھی کہ اپنے حریف کو موت کا ذائقہ چکھائے۔ اپنی باری کے لطف کا مزہ اٹھاتے، بے حد ہولے سے حرکت کرتے ہوئے اس نے باغ سے ایک گلابی رنگ کا گلاب توڑا اور اسے اپنے ہونٹوں کے قریب لے آیا، اس کی پنکھڑیوں میں اس نے بے حد دھیمی آواز میں ایک پُراسرار نظم سرگوشی میں سنائی۔ اس کے بعد جیسے انتہائی اعتماد کے ساتھ بڑھتے ہوئے، اس نے وہ گلاب اپنے حریف کی طرف بڑھایا تاکہ وہ اسے اپنے گل دستے میں ڈال سکے۔ سرگوشی میں پڑھی گئی نظم کی طاقت نے گلابی رنگ میں ملبوس دوسرے طبیب کو پھول، جس میں معمول کی خوشبو کے سوا کچھ نہ تھا، اپنی ناک تک لے جاتے ہوئے اس قدر مضطرب کر دیا کہ وہ خوف و دہشت کے مارے گر پڑا اور وہیں مر گیا۔

مجھے "زیتون" کہتے ہیں

نمازِ مغرب سے پہلے دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے اسے بلا تردد کھول دیا۔ باہر گلی سے کمان دار کے آدمیوں میں سے ایک کھڑا تھا، ایک صاف ستھرا وجیہہ، خوش مزاج اور نوعمر نوجوان۔ ہاتھ میں ورق اور لکھنے کی تختی کے ساتھ ساتھ وہ تیل کا لیپ بھی لیے ہوئے تھا جو اس کے چہرے کو روشن کرنے کی بجائے اس پر سایہ کر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے مجھے صورتِ حال سے آگاہ کیا: ہمارے سلطان نے ماہر ترین اچھے فنکاروں کے درمیان مقابلے کا انتظام کیا تھا، یہ دیکھنے کو کہ ان میں سے کون مختصر ترین وقت میں بہترین گھوڑا بنا سکتا تھا۔ مجھے فرش پر بیٹھنے، تختی پر ورق جما دینے اور اسے اپنے گھٹنوں پر رکھ کر تیزی سے حاشیوں کے درمیان جگہ پر دنیا کا سب سے حسین گھوڑا بنانے کو کہا گیا تھا۔

میں نے اپنے مہمان کو اندر بلا لیا۔ میں بھاگ کر روشنائی اور سب سے نفیس موقلم اٹھایا جو بلی کے کان سے ترشے بالوں سے بنایا گیا تھا۔ میں فرش پر بیٹھا اور منجمد ہو گیا؟ کیا یہ مقابلہ کوئی چال ہو سکتا تھا کہ جس کے نتیجے میں مجھے اپنا خون یا اپنا سر دینا پڑتا؟ شاید! لیکن کیا ہرات کے پرانے فنکاروں کی تمام داستانوی تصویریں موت اور حسن کے درمیان بھاگتی نفیس لکیروں سے نہیں بنائی گئی تھیں؟

میں مصوری کرنے کی آرزو سے معمور تھا، تاہم میں بالکل پرانے فنکاروں کی طرح مصوری کرنے سے بظاہر خوف زدہ تھا اور میں نے خود کو روک لیا۔ کورے ورق کو دیکھتے میں نے توقف کیا تا کہ میری روح اندیشے سے چھٹکارا پا سکے۔ مجھے صرف اس خوب صورت گھوڑے پر توجہ مرکوز کرنی تھی جو میں بنانے والا تھا، مجھے اپنی طاقت اور ارتکازِ توجہ مجتمع کرنے کی ضرورت تھی۔

وہ سب گھوڑے جن کی تصویریں میں نے کبھی بنائی تھیں اور دیکھے تھے، میری نگاہوں کے سامنے سرپٹ بھاگنے لگے۔ تاہم ان میں سے ایک بالکل بے نقص تھا۔ میں اب کچھ دیر میں اس گھوڑے کی تصویر کشی کرنے والا تھا جسے اس سے پہلے کوئی نہ بنا پایا تھا۔ قطعی انداز میں میں نے اپنے تخیل کی نگاہ سے اس کی تصویر لی۔ دنیا معدوم ہو گئی، یوں جیسے میں اچانک خود کو فراموش کر چکا تھا، بھول چکا تھا کہ میں یہاں بیٹھا تھا اور حتیٰ کہ یہ کہ میں ابھی تصویر بنانے والا تھا۔ میرے ہاتھ نے خود اپنی مرضی سے دوات میں موقلم ڈبویا۔

بالکل درست مقدار میں روشنائی لی۔ آداب، میرے اچھے ہاتھ، میرے تخیل کے شاندار گھوڑے کو اس دنیا میں لے آؤ! گھوڑا اور میں یوں لگتا تھا جیسے ایک بن گئے تھے اور ہم ظاہر ہونے والے تھے۔

اپنے وجدان کی پیروی کرتے میں نے حاشیہ زدہ صفحے پر مناسب جگہ تلاش کی۔ میں نے گھوڑے کو وہاں کھڑے تصور کیا اور اچانک: اس سے بھی پہلے کہ میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو پاتا، میرے ہاتھ نے فیلہ کن انداز میں اپنے مرضی سے کام شروع کر دیا — دیکھو کس قدر نفاست سے — کھر سے شروع کر کے، اس نے اس کی دبلی پتلی خوب صورت ٹانگ کا نچلا حصہ بنایا اور پھر اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ جب یہ اسی قطعی انداز میں گھٹنے کے خم سے آگے بڑھا اور جلدی سے سینے کی نچلی جانب آیا، میں فخر محسوس کرنے لگا۔ یہاں سے گول گھومتے ہوئے فتح مند انداز میں اوپر بڑھا: جانور کا سینہ کس قدر خوب صورت تھا! سینے تے پتلے ہو کر گردن کی صورت بنائی، بالکل میرے دماغ میں موجود گھوڑے جیسی۔ اپنا موقلم اٹھائے بغیر میں رخسار سے نیچے آیا، دھانے تک، جو میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کھلا چھوڑ دیا، میں منہ کے اندر چلا گیا — تو اس کو اب ایسا ہوتا تھا، اپنا منہ زور اور کھولو اسپ فرشتہ — اور میں نے زبان باہر نکال دی۔ میں نے ناک کو ذرا سا موڑا — تذبذب کی کوئی گنجائش نہیں! زاویہ بناتے میں نے لمحے بھر پوری تصویر پر نظر ڈالی اور جب میں نے دیکھا کہ میں نے بالکل اپنے تصور کے مطابق خاکہ بنایا تھا، میں بالکل سمجھ گیا کہ میں کیا بنا رہا تھا اور پھر کان اور شاندار گردن کا قابل دید خم میرے ہاتھ نے تنہا ہی بنایا۔ جب میں نے اپنی یادداشت کے زور پر اس کی پشت بنائی، میرا ہاتھ موقلم کے کھردرے ریشوں کو دوات میں ڈبونے کے لیے خود بخود نکل گیا۔ پیچھے بناتے ہوئے میں خاصا مطمئن تھا اور مضبوط اور باہر کو ابھرے پچھلے اعضا اور ٹانگیں بناتے ہوئے، میں پوری طرح تصویر میں مگن تھا۔

جب میں نے سرخوشی کے عالم میں اس کی دم بنانی شروع کی، یوں لگتا تھا کہ میں اس گھوڑے کے ساتھ اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ یہ ایک جنگی گھوڑا تھا، دوڑ کا گھوڑا، اپنی دم کو بل دے کر گھماتا ہوا، میں نے اسے زندہ دلی سے اوپر حرکت دی، جب میں دم کے گرد کا حصہ اور کولہے بنا رہا تھا تو مجھے خود اپنی پیٹھ میں ایک خوش گوار ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اس احساس سے مسرور، میں نے خوشی خوشی پیٹھ کا شاندار نرم حصہ مکمل کیا اور پھر پچھلی بائیں ٹانگ جو ذرا سی دائیں ٹانگ کے عقب میں تھی اور پھر کھر۔ میں اس گھوڑے کو دیکھ کر حیران تھا جو میں نے بنایا تھا اور اپنے ہاتھ پر متحیر تھا، جس نے پچھلی بائیں ٹانگ کی خوب صورت حالت کو بالکل ویسا بنایا تھا، جیسا میں نے تصور کیا تھا۔

میں نے صفحے سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا اور جلدی سے انگارہ سی دو اس آنکھیں بنائیں لیکن لمحے بھر کی ہچکچاہٹ کے ساتھ میں نے نتھنے اور زین کا مکمل بنایا۔ میں نے ایال کے بال ایک ایک کر کے بنائے یوں جیسے نرمی سے ان میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کر رہا ہوں۔ میں نے جانور پر رکاب ڈالی اور اس کی پیشانی پر سفید نشان اور پھر اس کے نازک حصے پورے شوق سے، مناسب تناسب کے ساتھ بنا کر اسے مکمل کر دیا۔ جب میں نے وہ عالیشان گھوڑا مکمل کر لیا تو میں خود وہ عالیشان گھوڑا بن چکا تھا۔

مجھے "تتلی" کہتے ہیں

میرا خیال ہے کہ وہ تقریباً اذان مغرب کا وقت تھا۔ دروازے پر کوئی تھا۔ اس نے بتایا کہ سلطان نے ایک مقابلے کا اعلان کیا تھا۔ جیسا آپ کا علم میرے عزیز سلطان، بلاشبہ مجھ سے زیادہ خوب صورت گھوڑا کون بنا سکتا تھا؟

اگرچہ اس پر میں شک کیا گیا کہ تصویر کو سیاہ و روشنائی کے انداز میں اور رنگوں کے بغیر بنانا تھا۔ رنگ کیوں نہیں؟ کیوں کہ میں ان کے انتخاب اور استعمال میں بہترین تھا؟ کون فیصلہ کرے گا کہ کون سی تصویر بہترین تھی؟ میں نے چوڑے شانوں اور پھولی ہونٹوں والے اس حسین و جمیل لڑکے سے مزید معلومات لینے کی کوشش کی جو گلی سے آیا تھا اور یہ معلوم کر پایا کہ اس مقابلے کے پیچھے سربراہ مصور استاد عثمان تھے۔ استاد عثمان۔ بے شک میری قابلیت و ہنر سے واقف ہیں اور تمام مصوروں میں مجھے سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں، سو، میں نے خالی ورق پر نگاہ دوڑائی، گھوڑے کے سامنے ہونے کا انداز، صورت اور ظاہری برتاؤ جو سلطان اور استاد عثمان دونوں کو خوش کرتا، میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ گھوڑے کو زندگی سے بھرپور مگر سنجیدہ ہونا تھا، ان گھوڑوں کی طرح جو استاد عثمان نے دس برس قبل بنائے تھے اور اس انداز میں اکسانا چاہیے تھا جو ہمیشہ ہمارے سلطان کو خوش کرتا تا کہ دونوں ہی گھوڑے کی خوب صورتی پر متفق ہوتے۔ مجھے حیرت ہے وہ سونے کے کتنے سکے انعام میں دے رہے ہیں؟ میر مصور اس تصور کو کیسے بناتے؟ یہ جوا کس طرح سے؟

اچانک جانور اس قدر تیزی سے میرے خیالوں میں وارد ہوا کہ جس وقت تک مجھے سمجھ آئی کہ وہ تھا کیا، میرے ملعون ہاتھ نے موقلم اٹھایا اور کسی کے بھی تخیل سے ماورا اس گھوڑے کو اگلی اٹھی ہوئی بائیں ٹانگ سے شروع کرتے ہوئے بنانا شروع کر دیا۔ تیزی سے ٹانگ کو جسم سے جوڑنے کے بعد میں نے جلدی سے دو قدمیں بنا لیں، خوشی و اعتماد سے ..... اگر آپ نے انہیں دیکھا ہوتا تو آپ کہتے کہ یہ فنکار کوئی مصور نہیں بلکہ خطاط ہے۔ میں مرعوب ہو کر اپنے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا جب وہ اس طرح حرکت میں تھا جیسے کسی اور ہی کا ہو۔ وہ قابل دید قدمیں گھوڑے کا فراخ پیٹ، ٹھوس سینہ اور دراج جیسی گردن بن گئیں۔ تصویر کو خیال کیا جا سکتا

فن کی مکمل تھی۔ اوہ، میں کیسی ہنر و قابلیت کا مالک تھا! اسی دوران میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ نے ایک مضبوط اور خوش و خرم گھوڑے کی ناک اور کھلا دہن بنایا اور پھر ذہین پیشانی اور کان۔ ایک بار پھر، دیکھو، کس قدر خوب صورت! میں نے خوشی کے عالم میں ایک اور قوس بنائی یوں جیسے کوئی خط تحریر کر رہا ہوں اور میں اس قدر جذبات کی رو میں تھا کہ ہنس دیتا۔ میں نے پچھلی ٹانگوں پر اٹھے اپنے گھوڑے کی گردن سے اس کی زین تک ایک مکمل قوس بنائی۔ جب میں اپنے گھوڑے کو فخر سے دیکھ رہا تھا میرا ہاتھ اس کی زین میں محو تھا، اب ایک گول مٹول، مضبوط اور قوی وجود سامنے آ رہا تھا جو بالکل بھی مجھ ایسا نہ تھا: ہر کوئی اس گھوڑے کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جائے گا۔ میں نے ان اچھے تبصروں کے بارے میں سوچا جو میرے انعام جیتنے پر ہمارے سلطان کرتے۔ انھوں نے مجھے سونے کے سکوں سے بھرا ایک بٹوہ دیا تھا اور میرا دوبارہ جیتنے کو جی چاہا جب میں نے تصور کیا کہ میں کیسے گھر پر انھیں گن رہا تھا۔ تبھی میرے ہاتھ نے جسے میں کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا، نے زین مکمل کی اور میرے موقلم کو دوات کی طرف لے گیا اور واپس لایا۔ قبل اس کے کہ میں بے ساختہ ہنسی کے ساتھ گھوڑے کی پیٹھ بنانی شروع کرتا یوں جیسے کسی نے مجھے لطیفہ سنا دیا ہو۔ میں نے پھرتی سے دُم کا خاکہ بنایا، پچھلا حصہ محبت سے اسے اپنے ہاتھوں میں بھرنے کی خواہش کرتے ہوئے، کسی نوعمر حسین لڑکے کی پچھلی طرح، میں نے کس قدر متناسب بنایا تھا۔ جب میں [illegible] میرے ہوشیار ہاتھ نے پچھلی ٹانگوں کو مکمل کر لیا تھا اور میرا موقلم رک گیا۔ یہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا دنیا کا نفیس ترین گھوڑا تھا جو کسی نے کبھی دیکھا تھا۔ مجھ پر مسرت کا غلبہ تھا، خوشی سے سوچتے ہوئے کہ انہیں یہ گھوڑا کس قدر پسند آئے گا، کیسے وہ مجھے حتی ایچ فنکاروں میں سب سے باصلاحیت قرار دیں گے اور حتیٰ کہ کیسے وہ فوراً ہی اعلان کر دیں گے کہ میں سربراہ مصور بننے والا تھا، لیکن پھر میں نے سوچا کہ وہ احمق مزید کیا کہیں گے: ”کتنی جلدی اور مسرت سے اس نے یہ بنایا ہے!“ صرف اسی وجہ سے میں فکر مند تھا کہ وہ میری حیران کن تصویروں کو سنجیدگی سے نہ لیں گے۔ اس لیے میں نے باریک بینی سے ایال، نتھنے، دانت، دُم کے بال اور زین کا مکمل تفصیل سے بنایا تا کہ کوئی شبہ نہ رہے کہ میں نے تصویر پر بے حد محنت کی تھی۔ اس حالت میں یعنی عقبی جانب سے گھوڑے کے نازک حصے دکھائی دینے چاہئیں تھے لیکن میں نے وہ نہ بنائے کہ وہ خواتین کی سوچ پر نامناسب طور پر غالب ہو جاتے۔

میں نے فخر سے اپنے گھوڑے کا جائزہ لیا: پیچھے سے کسی طوفان کی طرح آگے بڑھتا، مضبوط اور زور آور! یوں لگتا تھا جیسے ہوا چلنے سے موقلم سے لکیریں حرکت میں آ گئی تھیں، کسی سطر کے حروف کی طرح، تاہم جانور باوقار بھی تھا۔ وہ اس تصویر کو بنانے والے اعلیٰ حتی ایچ فنکار کی اس طرح تعریف و تحسین کریں گے جیسے بہزاد یا میر مصور کی اور پھر میں بھی ان جیسا بن جاؤں گا۔

جب میں نے وہ عالی شان گھوڑا بنا لیا تو میں اس گھوڑے کو بنانے والا پرانے زمانے کا ایک عظیم فنکار بن گیا۔

مجھے ''بگلا'' کہتے ہیں

نمازِ مغرب کے بعد میں نے کاپی خانے جانے کا ارادہ کیا لیکن مجھے بتایا گیا کہ دروازے پر کوئی ملنے آیا تھا۔ خیر ہو گی۔ مجھے امید تھی۔ معلوم ہوا کہ محل سے قاصد آیا تھا۔ اس نے سلطان کے مقابلے کا بتایا۔ اچھا تو دنیا کا سب سے خوب صورت گھوڑا۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ ہر ایک کے لیے مجھے کیا ادائیگی کریں گے اور میں آپ کو جلدی سے پانچ بنا دوں گا۔

ایسا کچھ کہنے کی بجائے میں نے خود پر قابو رکھا اور باہر دروازے پر کھڑے منتظر لڑکے کو اندر بلا لیا۔ میں نے لمحے بھر کو سوچا: دنیا کا حسین ترین گھوڑا وجود ہی نہیں رکھتا جسے میں بناؤں۔ میں جنگی گھوڑے بنا سکتا ہوں، بڑے منگول گھوڑے، عربی گھوڑے، میدانِ جنگ میں ڈوبے جنگی گھوڑے یا تھک کر زیرِ تعمیر جگہوں تک چھکڑے بھر پتھر لادے بدصورت بیمار بے ہودہ گھوڑے۔ لیکن کوئی بھی ان میں سے کسی کو بھی خوب صورت گھوڑا نہیں کہہ سکتا۔ قدرتی طور پر، ''دنیا کے خوب صورت ترین گھوڑے'' سے میں جانتا ہوں کہ ہمارے سلطان کی مراد وہ قابلِ دید گھوڑے تھے جن کی ہزاروں بار ایران میں تصویر کشی ہو چکی تھی، ان تمام پرانی ترکیبوں، نمونوں اور انداز کو سامنے رکھتے ہوئے۔ لیکن کیوں؟

یقیناً ایسے لوگ تو تھے ہی جو نہیں چاہتے تھے کہ میں سونا جیت لوں۔ اگر انہوں نے مجھے اوسط گھوڑا بنانے کا کہا تھا، یہ سب جانتے ہیں کہ کسی کی بنائی تصویر بھی میری بنی تصویر سے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پھر بھی کون تھا جس نے ہمارے سلطان کو بے وقوف بنایا؟ ہمارے حکمران، ان حاسد فنکاروں کی ان تمام باتوں کے باوجود، بخوبی جانتے ہیں کہ میں ان منی ایچر فنکاروں میں قابل ترین ہوں۔ وہ میری مصوری پسند کرتے ہیں۔

میرا ہاتھ اچانک اور برہمی سے حرکت میں آ گیا یوں جیسے ان تمام تکلیف دہ سوچوں سے اوپر اٹھنا چاہتا ہو اور ایک ہی کوشش میں میں نے سرے سے لے کر اس کے سم تک مکمل گھوڑا بنا دیا اور یہ والا بہتر تھا۔ کتابی فن کے کتاب خانے میں کوئی منی ایچر فنکار ایسے خوب صورت جانور نہ بنا سکتا تھا۔ میں یادداشت کے بل پر ایک اور گھوڑا بنانے کو تھا کہ محل سے آئے لڑکے نے کہا: ''ایک کافی ہے۔''

وہ کاغذ پکڑ کر جانے کو تھا لیکن میں نے اسے روک دیا کیوں کہ میں پوری طرح جانتا تھا جیسے

میں اپنا نام جانتا ہوں، کہ یہ بدمعاش ان گھوڑوں کے لیے مٹھی بھر سونا دیں گے۔

اگر میں اپنے انداز میں مصوری کروں تو وہ مجھے سونا نہیں دیں گے! اگر میں سونا نہیں جیت سکتا تو میرا نام ہمیشہ کے لیے داغ دار ہو جائے گا۔ میں سوچنے رکا۔ "انتظار کرو۔" میں نے لڑکے سے کہا۔ میں اندر گیا اور دو بے حد چمک دار وینسی سکوں کے ساتھ واپس آیا اور لڑکے کو دیے۔ آگے بڑھا: وہ خائف تھا، اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "تم شیر جیسے بہادر ہو۔" میں نے کہا۔

میں نے اشتعال کی وہ بیاضیں نکالیں جو میں نے دنیا کی نگاہوں سے چھپا کر رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں میں انتہائی خوب صورت تصویروں کی نقول رکھتا تھا جو میں نے برسوں کے دوران دیکھی تھیں۔ ان نقول کا تو تذکرہ ہی نہیں جو بڑوں کا سربراہ جعفر خزانے میں منتقل کتابوں کی جلدوں سے، بہترین درختوں، اژدھوں، پرندوں، شکاریوں اور جنگجوؤں کی بناتا، جبکہ اگر آپ اسے سونے کے دس سکے دیتے۔ میری بیاض اصل ہے ان کے لیے نہیں جو حقیقی دنیا میں جس میں وہ رہتے ہیں، اسے تصویروں اور آرائش کے ذریعے دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ ان کے لیے جو پرانے افسانوں اور داستانوں کو یاد کرنا چاہتے ہیں۔

اوراق پلٹ کر خدمت گار [illegible] کو تصویریں دکھاتے ہوئے، میں نے بہترین گھوڑا منتخب کیا۔ میں نے تیزی سے اس تصویر پر سوئی سے سوراخ کیے، پھر میں نے اس کے نیچے صاف ورق رکھا۔ پھر میں نے اس پر کوئلے کی راکھ چھڑکی اور اسے ذرا ہلایا تا کہ سوراخوں سے گزر کر نچلے صاف ورق تک پہنچ جائے۔ میں نے وہ منقش سادہ ورق اٹھایا۔ کوئلے کی راکھ نے نقطہ بہ نقطہ خوب صورت گھوڑے کی پوری تصویر کو نچلے ورق پر منتقل کر دیا تھا۔ اسے دیکھنا خوشی کا باعث تھا۔

میں نے اپنا قلم اٹھایا۔ اس جوش کے ساتھ جو اچانک میرے اندر بھر گیا تھا، میں نے نفاست اور تیزی اور فیصلہ کن جنبش میں ان نقاط کو آپس میں یوں ملایا کہ جیسے میں گھوڑے کا پیٹ، خوب صورت گردن، ناک اور پیچھے بنا رہا تھا، میں نے لطف سے گھوڑے کو اپنے اندر محسوس کیا۔ "یہ ہے۔" میں نے کہا، "دنیا کا سب سے خوب صورت گھوڑا۔ ان احمقوں میں سے کوئی بھی یہ نہیں بنا سکتا۔"

تا کہ محل سے آنے والا لڑکا بھی یہ یقین کر لیتا اور یوں وہ ہمارے سلطان کو یہ نہ بتاتا کہ میں نے یہ تصویر کیسے بنائی تھی، میں نے اسے تین اور وینسی سکے دیے۔ میں نے بتایا کہ میں اگر سونا جیت گیا تو اسے اور انعام دوں گا۔ مزید یہ کہ میرا خیال تھا کہ اس نے یہ بھی تصور کیا تھا کہ وہ جلد ہی میری بیوی کی جھلک دوبارہ دیکھ سکے گا جسے دیکھ کر اس نے کھلے منہ سے رال ٹپکائی تھی۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ وہ کسی منی ایچر فنکار کے بنائے گھوڑے سے اس کی قابلیت کا بتا سکتے ہیں۔ تاہم بہترین منی ایچر فنکار ہونے کے لیے بہترین گھوڑا بنانا کوئی نہیں، آپ کو ہمارے سلطان اور ان کے خوشامدیوں کو قائل کرنا ہو گا کہ آپ بلاشبہ بہترین منی ایچر فنکار ہیں۔

جب میں نے عالی شان گھوڑا بنایا، میں جو ہوں بس وہی ہوں، اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

مجھے قاتل کہا جائے گا

جس طرح میں نے گھوڑے کی تصویر کشی کی اس سے کیا آپ طے کر پائے کہ میں کون ہوں؟

جیسے ہی میں نے سنا کہ مجھے گھوڑے کی تصویر بنانے کی دعوت دی گئی تھی، میں جانتا تھا کہ یہ کوئی مقابلہ نہ تھا: وہ مجھے میری بنائی تصویر سے پکڑنا چاہتے تھے۔ میں پوری طرح باخبر ہوں کہ فالتو کاغذ پر میرے ہاتھ کے بنے گھوڑے [illegible] کے بے چارے نفیس آفندی کی لاش کے ساتھ ملے تھے، لیکن میرا کوئی الگ انداز یا نقص نہیں ہے جس سے وہ مجھے میرے بنے گھوڑوں سے پہچان سکیں۔ اگرچہ مجھے اس کا حتی المقدور یقین تھا، گھوڑے کو بناتے ہوئے میں گھبراہٹ زدہ تھا۔ کیا میں نے انشتے کے لیے گھوڑا بناتے کچھ غلط کیا تھا جس سے میں پکڑا جاتا؟ مجھے اس مرتبہ کی گھوڑے کی تصویر بنانی تھی۔ میں نے بالکل مختلف چیزوں کا سوچا۔ میں نے خود پر "قابو" پایا اور بالکل مختلف بن گیا۔

لیکن میں کون ہوں؟ کیا میں ایسا فنکار ہوں جو ان شبیہوں کو دبا لیتا جو میں بنانے کے قابل تھا، تاکہ کتاب خانے کے انداز یا اسلوب میں موزوں بیٹھ سکوں یا کوئی فنکار جو کسی روز کامیابی سے اپنے اندر گہرائی میں موجود گھوڑے کی عکاسی کرتا؟

اچانک اور دہشت سے، مجھے اس فاتح مشی ایچر فنکار کی موجودگی اپنے اندر محسوس ہوئی۔ یوں تھا جیسے میں کسی دوسری روح کی نگران نگاہوں میں تھا اور مختصر یہ کہ میں شرمسار تھا۔

میں نے تیزی سے جان لیا کہ میں گھر نہ رہ پاتا اور باہر سے چٹخنی لگا کر میں تیز قدمی سے تاریک گلیوں میں آگے بڑھا۔ جیسا کہ شیخ عثمان بابا نے اپنی "حیات اولیا" میں لکھا، حقیقی سرگرداں درویش کو اپنے اندر کے شیطان سے فرار کی خاطر تا عمر کہیں بھی زیادہ دیر رکے بغیر سرگرداں رہنا ہوگا۔ 67 برس شہر شہر گھومنے کے بعد وہ بھاگتے بھاگتے تھک گئے اور شیطان کے سامنے ہار مان لی۔ یہی عمر ہے جس میں استاد مشی ایچر خود کو انداز یا اسلوب کی تمام اشاروں سے آزاد کرواتے ہوئے، فنکار نابینا پن حاصل کر لیتے ہیں یا اللہ کی عطا کردہ تاریکی، عمر جس میں وہ بے ارادہ کوئی انداز اپنا لیتے ہیں۔

میں بایزید میں مرغی فروشوں کے بازار میں گھوما، غلام منڈی کے خالی چوراہے سے، چکی اور

چوبی دکانوں کی مہک کے درمیان سے، یوں جیسے کسی کی تلاش میں۔ میں حجام کی دکانوں کے بند دروازوں
کے سامنے سے گزرا، گنجے سے استری کرنے والوں کے قریب سے، ایک بوڑھا نان بائی جو اپنی رقم گن رہا تھا
مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا، میں اچار اور نمکین مچھلی کی خوشبو والی پنساری کی دکان سے گزرا اور چونکہ
میری نگاہیں صرف رنگوں سے خوش ہوتی تھیں میں جڑی بوٹیوں کی دکان کے اندر گیا جہاں کچھ تولا جا رہا تھا
دیپ کی روشنی میں، میں نے شوق سے جیسے کوئی اپنی محبوبہ کو دیکھتا ہو، کافی، ادرک، زعفران اور چکنی کے
تھیلوں، سونف اور گوند کے رنگ برنگے ڈبوں، جن کی خوشبو دکان میں چھائی ہوئی تھی اور کالے اور سفید
زیرے کے ڈھیر کو دیکھا۔ بعض اوقات میرا جی ہر شے کو منہ میں ڈالنے کو چاہتا ہے، بعض اوقات میں تمام
مخلوق کی تصویر سے ورق کو بھر دینا چاہتا ہوں۔

میں اس جگہ گیا جہاں گزشتہ ہفتے میں میں نے دو مرتبہ پیٹ بھرا تھا، جسے میں نے "بیمار ماندہ لوگوں کا
لنگر" کا نام دیا تھا ــــ درحقیقت "قابل رحم لوگوں کا" کہنا زیادہ موزوں ہوتا۔ واقف لوگوں کے لیے یہ
نصف شب تک کھلا رہتا تھا۔ اندر ایک بدقسمت جمع تھے، گھوڑا چوروں یا پھانسی کے پھندے سے بچے
لوگوں کے مجمع میں، جیسا ایک قابل رحم جن کا دکھ اور بے بسی ان کو اس دنیا سے دور جنت میں لے جاتی
جیسا کہ افیون کے عادی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، بھکاری جو بنیادی آداب نبھانے میں بھی مشکل میں تھے
اور ایک نوجوان جو اس ہجوم سے دور ایک گوشے میں بیٹھا تھا۔ میں نے حلب کے باورچی کو سلام کیا۔ اپنے
پیالے میں گوشت بھری گوبھی کے ڈولما کا ڈھیر لگا کر میں نے اس پر دہی ڈالا اور اس پر چند سرخ مرچیں
چھڑک کر اس نوجوان کے قریب جا بیٹھا۔

ہر شب مجھ پر اداسی طاری ہو جاتی ہے، ایک پریشانی مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔ اوہ میرے
بھائی، میرے پیارے بھائیو، ہم زہر آلودہ ہیں، ہم گل سڑ رہے ہیں، مر رہے ہیں، ہم زندہ رہتے ہوئے خود کو
تھکا رہے ہیں، ہم اپنی گردن تک بدبختی میں ڈوب چکے ہیں ــــ بعض راتیں میں خواب میں اسے کنوئیں سے
نکلتے اور اپنے پیچھے آتے دیکھتا ہوں، لیکن میں جانتا ہوں کہ ہم اسے منوں مٹی تلے دفن کر چکے ہیں۔ اس کا قبر
سے نکلنا ممکن نہیں۔

نوجوان نے، جس نے میرا خیال تھا شوربے میں ناک ڈبو رکھی تھی اور پوری دنیا کو بھلائے بیٹھا تھا،
گفتگو شروع کی۔ "کیا یہ اللہ کی طرف سے کوئی نشانی تھی؟" "ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "انھوں نے گوشت
کا قیمہ بنا دیا ہے۔ میری گوبھی بالکل میری پسند کے مطابق ہے۔" میں نے اس کے بارے میں پوچھا: وہ
حال ہی میں بیچنے والے ایک قابل رحم مدرسے سے فارغ التحصیل ہوا تھا اور کاتب کے طور پر عارفی پاشا
کی حویلی میں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا نہیں کہ رات کے اس پہر وہ پاشا کی ملحقہ مسجد یا گھر میں یا اپنی
محبوبہ کی بانہوں میں کیوں نہ تھا بلکہ اس کی بجائے اس نے غیر شادی شدہ شخصوں سے بھرے پڑے اس
گلے سڑے لنگر خانے میں آنے کا انتخاب کیوں کیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں سے آیا تھا اور

کون تھا، میں نے لمحہ بھر سوچا۔

"میرا نام بہزاد ہے۔ میں ہرات اور تبریز سے آیا ہوں۔ میں نے سب سے عالیشان تصویریں بنائیں، انتہائی حیرت انگیز شہ پارے۔ ایران اور عرب میں، ہر مسلمان کتاب خانے میں جہاں مصوری کی جاتی ہے، لوگ سینکڑوں برسوں سے میرے بارے میں یہ کہتے آئے ہیں: یہ حقیقی لگتی ہے، بالکل بہزاد کے کام کی طرح۔"

یقیناً یہ معاملہ نہیں ہے۔ میری تصویریں وہ عیاں کرتی ہیں جو دماغ میں ہے نہ کہ وہ جو آنکھیں دیکھتی ہیں۔ لیکن تصویر جیسا کہ آپ خوبی جانتے ہیں، آنکھوں کی دعوت ہے۔ اگر آپ ان دو خیالوں کو باہم ملائیں تو میری دنیا کا ظہور ہو گا۔ یعنی:

الف: مصوری، آنکھوں کی دعوت کے طور پر، اسے زندگی دیتی ہے جو دماغ دیکھتا ہے۔

لام: آنکھ اس دنیا میں جو دیکھتی ہیں، وہ اس در بے تک تصویر میں داخل ہو جاتا ہے کہ اس سے دماغ کو مدد ملتی ہے۔

میم: نتیجے کے طور پر ہماری دنیا میں حسن آنکھ کا وہ کچھ دریافت کرتا ہے جو دماغ پہلے سے ہی جانتا ہے۔

کیا قابل رحم مدرسے کے ہر ساتھی اس شخص نے اس منطق کو سمجھا جو میں نے اپنی روح کی گہرائیوں سے ایک فیضان سے اخذ کی تھی؟ بالکل نہیں۔ کیوں؟ کیوں کہ اگرچہ آپ نے حوجا کے قدموں میں بیٹھ کر تین سال گزارے تھے جو کسی علاقے کے ایک ایسی سکول میں روزانہ تین تقرئی سکوں کے عوض سبق دیتا ہے —— آج آپ اس رقم سے تین روٹیاں خرید سکتے ہیں —— آپ پھر بھی ذرا نہیں جانتے کہ وہ بہزاد آخر تھا کون۔ یہ واضح تھا کہ تین سکوں والا حوجا آفندی بھی بہزاد کو نہیں جانتا تھا۔ ٹھیک ہے پھر، مجھے وضاحت کرنے دیں۔ میں نے کہا:

میں نے ہر شے، بلکہ ہر طرح کی مصوری کی ہے: مسجد میں سبز محراب کے سامنے تشریف آرا وچار خلفا کے ہمراہ؛ ایک دوسری کتاب میں شب معراج سات آسمانوں کی سیر اور براق کی؛ چین کے راستے میں سمندروں میں طوفان لائے عفریت کو ڈرا کر بھگانے کے لیے سمندر کنارے معبد میں گھنٹیاں بجاتا ہوا سکندر؛ بانسری سنتے تالاب میں برہنہ نہاتے سلطان کو اپنی حرم کی حسین وجمیل عورتوں کو دیکھتے دکھایا تھا؛ ایک نوعمر پہلوان جسے اپنے استاد سے تمام حربے سیکھنے کے بعد اپنی جیت کا یقین تھا جسے سلطان کی موجودگی میں اپنے استاد کے ہاتھوں ہی شکست ہوئی جس نے اسے آخری حربہ نہیں سکھایا تھا؛ سجی ہوئی دیواروں والے مدرسے کے کمرے میں لیلیٰ مجنوں اپنے بچپن میں قرآن کریم پڑھتے ہوئے محبت میں گرفتار ہوتے؛ عاشقوں کی ایک دوسرے پر نگاہ کرنے کی ناقابلیت انتہائی شرمساری سے انتہائی بھلے ہانس تک؛ محلات کی پتھر بہ پتھر تعمیر؛ تشدد سے مجرم کی سزا؛ عقابوں کی پرواز؛ کھیلتے خوش باش خرگوش؛ بے رحم چیتے؛ سرو اور چنار کے درخت

بیان کرنے والوں جس کی تصویر اس نے اپنی تمام عمر میں دیکھی تھی ۔۔۔ کون جانے کس واسطے کی بنا پر تھی۔ میں نے بیحد احتیاط اختیار کیا، یعنی اپنا بنگلہ چھوڑا اور دکان سے باہر نکل آیا۔ کافی دیر چلنے کے بعد میں ایک ویران خانقاہ میں داخل ہوا، جہاں مجھ پر سکون اور طمانیت کا احساس چھا گیا تھا۔ میں نے اپنی حالت درست کی اور کچھ لمحے خاموشی کو سنتا رہا۔

بعد میں میں نے آئینے کو اس جگہ سے نکالا جہاں چھپا رکھا تھا اور اسے پنچی میز پر رکھ دیا، اس کے ساتھ میں نے گود میں دو ورق تصویر اور تختہ رکھا۔ جب میں وہاں اپنے آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا، میں نے چارکول سے اپنی تصویر بنانے کی سعی کی۔ میں صبر سے دیر تک تصویر کشی کرتا رہا۔ کافی دیر بعد جب میں نے دیکھا کہ ایک بار پھر ورق پر بنا چہرہ آئینے میں دکھائی دیتے میرے چہرے سے مشابہ نہ تھا، مجھے اس قدر خود ترسی کا احساس ہوا کہ میری آنکھیں بھر آئیں۔ وہ فنی مصور جنہیں اشتے اتنی تفصیل سے بیان کرتے تھے، ایسا کیسے کر لیتے تھے؟ میں نے پھر خود کو ان میں سے ایک تصور کیا، یہ سوچتے ہوئے کہ اگر میں اس کیفیت میں تصویر بناتا تو میں اپنی تصویر خاصی اچھی بنا سکتا تھا۔

بعد میں، میں نے فرنگی مصوروں اور اشتے دونوں پر لعن طعن کی، جو بنایا تھا اسے مٹایا اور ایک اور تصویر بنانے کے لیے پھر سے آئینے میں دیکھا۔

آخر میں نے خود کو دوبارہ سڑکوں پر چلتے پایا اور پھر یہاں اس گھٹیا کافی خانے میں۔ مجھے پوری طرح معلوم بھی نہ تھا کہ میں یہاں پہنچا کیسے تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا، مجھے ان جاہل، رحم طلب فنکاروں اور خطاطوں کے ساتھ گھلنے ملنے پر اس قدر شرمساری ہوئی کہ میری پیشانی پر پسینے کی بوندیں جمع ہو گئیں۔

مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کو ٹہوکے دے کر میری موجودگی سے آگاہ کرتے اور ہنستے ہوئے مجھے دیکھ رہے تھے ۔۔۔ ٹھیک ہے، میں انہیں ایسا کرتے صاف دیکھ سکتا ہوں۔ میں ایک فطری رویہ رکھنے کی کوشش کرتے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ اسی دوران میری آنکھیں دوسرے فنکاروں کی متلاشی ہو گئیں، میرے پیارے بھائی جن کے ساتھ کسی وقت میں نے استاد عثمان کے شاگرد کے طور پر کام کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان میں سے ہر کسی کو بھی آج شام گھوڑے کی تصویر بنانے کا کہا گیا ہو گا اور یہ کہ ان میں سے ہر کسی نے ان احمقوں کی طرف سے انتظام کردہ اس مقابلے کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے اپنی ہی پوری کوشش کی ہو گی۔

داستان گو آفندی نے ابھی اپنے کھیل کا آغاز نہ کیا تھا۔ ابھی تصویر تک آویزاں نہ کی گئی تھی۔ میں کافی خانے کے ہجوم سے گھلنے ملنے پر مجبور تھا۔

سو ٹھیک ہے پھر، چلیں آپ سے میں صاف گوئی سے بات کروں: باقی سب کی طرح میں نے بھی لطیفے سنائے، بیہودہ کہانیاں سنائیں، مبالغہ آمیز تاثرات سے اپنے ساتھیوں کے رخسار چومے، دوستی انداز میں پھبتیاں کسیں، بوڑھے معاون فنکاروں کا حال پوچھا اور باقی سب کی طرح ہمارے مشترک دشمنوں پر

ٹھہرے کے اور جب میں واقعی پُرجوش ہو گیا، میں بداخلاقی پر اتر آیا اور آدمیوں کو گردنوں پر بوسہ دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ میری روح کا ایک حصہ بے رحم حد تک خاموش تھا، جب میں ایسے رویے میں ملوث ہوا، اس نے مجھے ناقابل برداشت کرب دیا۔

اس کے باوجود دیر نہ گزری تھی کہ میں اپنی استعاراتی زبان استعمال کرتے ہوئے موقلم، سرکنڈے کے قلم، کافی خانے کے ستونوں، بانسوں، سیڑھیوں کے ستون، دروازوں کے نقش، نوخیز پودوں، میناروں، گاڑھے شوربے میں ڈوبی عورتوں کی انگلیوں، صنوبر کے درختوں کے بیہودہ موازنے کرنے لگا اور پھر نارنجیوں، انجیروں، چھوٹی چھتریوں، تکیوں، چپاتیوں کی جلی ڈھیریوں کے حسین لڑکوں سے۔ اس دوران میرا اہم عمر ایک انتہائی متکبر خطاط، خاص باچتگی سے اور کسی خود اعتمادی کے بغیر، صرف جہاز کے مستول اور کسی دربان کے پول سے ہی موازنہ کر رہا تھا۔ مزید برآں، میں نے بوڑھے کئی ایچر فنکاروں کا بالواسطہ حوالہ دیا، نئے شاگردوں کے چیری کے رنگ کے ہونٹوں کا، استاد خطاط جو اپنی دوات (میری طرح) کسی خاص جگہ چھپاتے تھے ("انتہائی لذت آمیز گوشے میں")، کیسے غالباً میری مے سرخ میں گلاب کی پتیوں کی بجائے افیون ڈالی گئی تھی، تبریز اور ہرات کے آخری عظیم فنکار حلب میں کافی اور مے سرخ سے کو ملاتا اور خطاط اور وہاں ملنے والے حسین وجمیل لڑکے۔

کبھی کبھی یوں لگتا جیسے میرے اندر کی دو روحوں میں سے ایک، آخر میں دوسری کو پیچھے چھوڑ کر فاتح کے طور پر ابھرتی، اور یہ کہ میں بالآخر اپنا وہ خاموش مگر پہلو بھول گیا تھا۔ ایسے وقت میں مجھے اپنے بچپن کی چھٹیاں یاد آئیں جن میں اپنے رشتے داروں کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان تمام لطیفوں، بوسوں اور گلے لگانے کے باوجود میرے اندر اب بھی خاموشی تھی جس نے مجھے اس ہجوم کے درمیان بھی تکلیف زدہ اور الگ تھلگ کر رکھا تھا۔

مجھے اس خاموش اور رحم سے عاری بے چاری روح سے کس نے نوازا تھا ـــــ یہ روح تھی یا بلکہ جن تھی ـــــ جو مجھے ہمیشہ دوسروں سے الگ رکھتی اور سرزنش کرتی؟ شیطان؟ لیکن میرے اندر کی خاموشی سکون پا چکی تھی، اس بے رحم ہڈی سے نہیں جس پر شیطان نے اکسایا تھا، اس کے برعکس انتہائی خالص اور سادہ کہانیوں سے جو کسی کی روح میں اتر جاتی ہیں۔ مے سرخ کے اثر میں، میں نے دو کہانیاں سنائیں، اس امید میں کہ مجھے ان سے سکون مل جائے گا۔ ایک دراز قد، زرد لیکن ملی جلی گلابی رنگت والے خطاط کے شاگرد نے اپنی سبز آنکھیں میری آنکھوں سے ملائیں اور وہ پوری توجہ سے مجھے سن رہا تھا۔

نابینا پن اور انداز یا اسلوب پر دو کہانیاں
جو منی ایچر فنکار نے اپنی روح کی تنہائی کم کرنے کو سنائیں

الف: جو خیال کیا جاتا ہے، اس کے برعکس اصل گھوڑوں کو دیکھ کر گھوڑوں کی تصویریں بنانا،

لام: ہرات اور شیراز میں، جب کوئی استاد منی ایچر فنکار عمر بھر کی شدید مشقت کے سبب اپنی آخری عمر میں نابینا ہو جاتا، اسے نہ صرف اُس استاد فنکار کے عزم و حوصلے کی نشانی سمجھا جاتا تھا بلکہ اسے خدا کا اس عظیم فنکار کی قابلیت اور کام کا اعتراف گردانا جاتا تھا۔ ہرات میں وہ وقت بھی تھا جب ایسے استادوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا جو بوڑھے ہونے کے باوجود نابینا نہیں ہوتے تھے۔ ایسی صورت حال میں ان میں سے بعض بڑھاپے میں نابینا ہونے کی اداکاری پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ایک طویل عرصے تک لوگ بڑی عقیدت سے ان فنکاروں کو یاد کرتے رہے جو کسی دوسرے بادشاہ کے لیے کام کرنے یا اپنا اسلوب بدلنے کی بجائے خود کو نابینا کر لیتے تھے۔ یہی زمانہ تھا جب امیر تیمور کے بیٹے میران شاہ کی اولاد سے ابوسعید نے اپنے کتاب خانے میں مزید تبدیلی متعارف کروائی، یعنی تاشقند اور سمرقند کی فتح کے بعد نابینا پن کے دکھاوے کو اصل نابینا پن سے زیادہ احترام دینے کی رسم۔ ایک بوڑھے کاریگر سیاہ ولی نے ابو سعید کو متاثر کیا۔ اس نے تصدیق کی کہ نابینا منی ایچر فنکار تاریکی میں خدا کے تصور کے گھوڑے دیکھ سکتے تھے، اگر اصل قابلیت ایسے بینا منی ایچر فنکار رکھتے تھے جو دنیا کو کسی نابینا شخص کی طرح دیکھتے تھے۔ ۶۷ برس کی عمر میں اس نے اپنا یہ نکتہ یوں ثابت کیا کہ کاغذ کی طرف ایک بھی نگاہ کیے بغیر وہ گھوڑا بنایا جو اس کے مو قلم کی نوک پر آیا تھا، اگرچہ اس دوران سارا وقت اس کی آنکھیں کھلی اور کاغذ پر ہی مرکوز رہی تھیں۔ اس فنکارانہ تقریب کے اختتام پر جس میں میران شاہ نے ستاروں سے بانسری بجوائی تھی اور گویّے داستان گوؤں سے داستانیں سنوائی تھیں، داستانوی فنکار کی خوبیوں کی حمایت میں، وہ شاندار گھوڑا جو سیاہ ولی نے بنایا تھا، اس کا موازنہ ان ہی کے بنائے باقی گھوڑوں سے کیا گیا۔ ان کے مابین زیادہ فرق نہ تھا جس پر میران شاہ کو خاصا جھنجلایا۔ بعد ازاں داستانوی فنکار نے اعلان کیا کہ منی ایچر فنکار جو قابلیت کے حامل ہوں، چاہے ان کی آنکھیں بند ہوں یا کھلی، ہمیشہ گھوڑوں کو ایک ہی طرح سے دیکھیں گے، یعنی ویسے جیسے اللہ ان کا تصور کرتا ہے اور عظیم ماہر منی ایچر فنکاروں میں نابینا اور بینا میں کوئی فرق نہیں؛ ہاتھ ہمیشہ ایک ہی طرح گھوڑا بنائے گا کیوں کہ "اسلوب یا انداز" نامی فرنگیوں کی اختراع کا کوئی وجود نہ تھا۔ عظیم فنکار سیاہ ولی کے بنے گھوڑوں کی نقل ۱۱۱ برس تک تمام مسلمان منی ایچر فنکاروں نے کی۔ جہاں تک خود سیاہ ولی کی بات ہے، ابوسعید کی شکست اور اس کے کتاب خانے کے منتشر ہونے کے بعد، وہ سمرقند سے قزوین منتقل ہو گئے جہاں دو سال بعد ان پر قرآن کریم کی اس آیت مبارکہ کہ "نابینا اور بینا برابر نہیں" کو جھٹلانے کی ملعون کوششوں پر سزا سنا دی گئی۔ اس کے لیے انھیں پہلے نابینا کیا گیا اور پھر نوجوان نظام شاہ کے سپاہیوں نے انھیں قتل کر دیا۔

میں خطاط کے خوب صورت آنکھوں والے شاگرد کی تیسری کہانی سنانے ہی والا تھا جس میں بیان تھا کہ کیسے عظیم استاد بہزاد نے خود کو نابینا کر لیا تھا، کیسے وہ بھی ہرات کو نہ چھوڑنا چاہتے تھے، کیوں انھوں نے بالجبر تبریز لے جائے جانے پر دوبارہ کبھی مصوری نہ کی، کیسے منی ایچر فنکار کا اسلوب دراصل

حقیقت میں اس کتاب خانے کا انداز تھا جس میں وہ کام کرتا تھا اور دوسری کہانیاں جو میں نے استادوں سے سنی تھیں لیکن میرے خیالوں پر داستان گو کا غلبہ تھا۔ مجھے کیسے معلوم ہوا تھا کہ وہ آج شب شیطان کی کہانی سنانے والا تھا؟

میں نے کہنا چاہا کہ ”میں ابلیس تھا جس نے سب سے پہلے کہا، ”میں“ اور وہ شیطان (ابلیس) تھا جس نے انداز یا اسلوب اپنایا تھا۔ وہ شیطان ہی تھا جس نے مشرق کو مغرب سے الگ کیا تھا۔“

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور داستان گو کے کھردرے ورق پر اپنے دل کے مطابق شیطان کی تصویر بنائی۔ میرے تصویر بنانے میں داستان گو اور اس کا معاون، دوسرے فنکار اور مصور بہت شوق سے دیکھتے رہے اور مجھے خوش کر دیے۔

تب کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرا اپنا کوئی الگ انداز ہے یا یہ سرخ کی دین ہے؟

یقیناً میں بہت محنت کرتا ہوں تاکہ تم غمگین گناہ کر سکو۔ لیکن بعض جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تم سب جو جماہی لیتے، ہچکیاں یا قے کی ڈکار لیتے ہو تو یہ میرا کیا دھرا ہے، جس سے مجھے پتا چلتا ہے کہ تم مجھے ذرا بھی نہیں سمجھے۔

تم مشورہ دے سکتے ہو کہ انہیں خود کو غلط سمجھنے دو تاکہ تم انہیں زیادہ آسانی سے بہکا سکو۔ سچ ہے، لیکن مجھے ذرا یاد دلانے دو، مجھ میں انا ہے، غرور جس نے مجھے پہلی بار خدا تعالیٰ کی نگاہ سے گرا دیا۔ اگرچہ میں ہر قابل تصور صورت اختیار کر سکتا ہوں اور اگرچہ میرا ذکر لاتعداد کتابوں میں ہزاروں بار آیا ہے کہ میں کامیابی سے نیکوکاروں کو بہکاتا ہوں، خصوصاً کسی حسین عورت کے حرص آمیز روپ میں، کیا میرے سامنے موجود منی ایچر فنکار برادران بتا سکتے ہیں کہ وہ کیوں میری بدصورت، سینگ والی، لمبی دُم والی اور بھیانک مخلوق کی صورت تصویر کشی پر اصرار کرتے ہیں جس کا چہرہ باہر کو ابھرے مسوں سے بھرا ہو؟

یوں ہم اصل معاملے پر آ گئے ہیں: تمثیل مصوری۔ استنبول میں کسی مبلغ کا بھڑکایا ہوا ہجوم جس کے نام کا میں تذکرہ نہ کروں گا تاکہ وہ بعد میں تمہیں تنگ نہ کرے، اور تذلیل کو خدا کے کلام کے برعکس قرار دیتا ہے، کسی گانے کی طرح اذان، خانقاہوں میں مردوں کا جمع ہونا، ایک دوسرے کی گود میں بیٹھنا اور آلات موسیقی کے ساتھ کثرت سے گانا، قہوہ کا پینا۔ میں نے سنا ہے کہ ہم میں موجود بعض منی ایچر فنکار جو اس مبلغ اور اس کے ہجوم سے خوف زدہ ہیں، اصرار کرتے ہیں کہ فرنگیوں کے انداز میں اس تمام مصوری کے پس پردہ دراصل میں ہوں۔ صدیوں سے مجھ پر بے جا الزامات لگائے جاتے رہے ہیں، لیکن سچ ہے اس قدر بعید اور کوئی الزام مجھ پر نہیں لگا۔

آؤ شروع سے آغاز کریں۔ ہر کوئی میرے اماں حوا کو ممنوعہ پھل کھانے کی ترغیب دلانے میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ یہ سارا معاملہ شروع کیسے ہوا تھا۔ نہیں، اس کی ابتدا میری خدائے باری تعالیٰ کے سامنے تکبر کے اظہار سے بھی نہیں ہوئی تھی۔ کسی اور بات سے پہلے، اس کا ہمارے سامنے آدم کو لانے اور ہم سب سے اس کے سامنے سجدے کی توقع رکھنے کا معاملہ ہے، جس پر میں نے خاصا موزوں اور فیصلہ کن انکار کر دیا...... اگرچہ باقی فرشتوں نے تعمیل کی۔ کیا تمہیں یہ مناسب لگتا ہے کہ مجھے آگ سے تخلیق کرنے کے بعد اس ذات باری تعالیٰ نے مجھے آدم کو سجدے کا حکم دیا جسے اس نے خام کھری مٹی سے بنایا تھا؟ او میرے برادران، اپنے ضمیر کے مطابق سچ بولو۔ ٹھیک ہے پھر، میں جانتا ہوں کہ تم اس بارے میں سوچتے رہے ہو اور یہاں کی کوئی بات صرف ہمارے درمیان نہیں رہے گی: وہ سب کچھ سن لے گا اور ایک دن وہ تم سے حساب مانگے گا۔ خیر، پروا نہ کرو کہ اس نے تمہیں پہلی ہی بار میں ضمیر کیسے دے دیا، میں مانتا ہوں کہ تمہارا خوف کھانا درست ہے اور میں یہ سوال اور مٹی بمقابلہ آگ کی بحث بھول جاؤں گا۔ لیکن ایک بات ہے جو میں کبھی نہیں بھولوں گا...... ہاں بلاشبہ، ایک بات جس پر میں ہمیشہ فخر کروں گا: میں نے آدم کو کبھی سجدہ نہ کیا۔

اگرچہ نئے فرنگی فنکار بالکل یہی کر رہے ہیں اور وہ آنکھوں کے رنگ، رنگت، خم دار ہونٹوں، پیشانی کی لکیروں، علامتوں اور آدمیوں، پادریوں، امیر تاجروں اور حتیٰ کہ عورتوں کے ان کے حسین بدن،

میں، شکورے

میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے بابا مجھے کچھ ناقابل فہم باتیں بتا رہے تھے اور وہ اس قدر وحشت خیز تھیں کہ میں جاگ گئی۔ شوکت اور راحان میری دونوں طرف سے مجھ سے چپکے ہوئے تھے اور ان کی گرمی سے مجھے پسینہ آ گیا تھا۔ شوکت کا ہاتھ میرے پیٹ پر دھرا تھا۔ اور راحان اپنا پیٹ ابھرا میرے پیچھے پر رکھے ہوئے تھا۔ کسی طور میں بستر سے اٹھی اور انہیں جگائے بغیر کمرے سے نکل آئی۔

میں نے چوڑی راہداری طے کی اور خاموشی سے قرو کا دروازہ کھولا۔ بیرونی شمع کی روشنی میں میں اسے نہیں بلکہ اس کے سفید بستر کے تھوڑے سے حصے کو دیکھ سکی جو تاریک سرد کمرے کے عین درمیان میں کسی کفن دی گئی لاش کی طرح پڑا تھا۔ شمع کی روشنی کمرے کے بیچ میں ناکام گئی تھی۔

جب میں نے اپنا ہاتھ آگے کیا تو شمع کی مرتی ہوئی روشنی قرو کے تھکن زدہ، بڑھی ہوئی داڑھی والے چہرے اور عریاں شانوں پر پڑی۔ میں اس کے قریب بڑھ آئی۔ بالکل اور راحان کی طرح وہ سکڑ سمٹ کر سو رہا تھا اور اس کے چہرے پر کسی خوابیدہ دوشیزہ کا سا تاثر تھا۔

"یہ میرا شوہر ہے۔" میں نے خود سے کہا۔ وہ اس قدر دور اور اجنبی لگتا تھا کہ میں رنجیدہ ہو گئی۔ اگر میرے پاس خنجر ہوتا تو شاید میں اس کی جان لے لیتی —— نہیں، میں اصل میں ایسا کچھ بھی کرنا نہیں چاہتی، میں صرف سوچ رہی تھی جس طرح بچے سوچتے ہیں کہ کیسا ہو اگر میں اس کی جان لے لوں۔ مجھے اس کا یقین نہیں تھا کہ وہ برسوں صرف میرے خیالوں کے سہارے زندہ رہا تھا اور نہ ہی اس کے بچوں جیسے معصوم تاثرات کا۔

اپنے پیر سے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے میں نے اسے جگایا۔ جب اس نے مجھے دیکھا وہ خوش ہونے اور جوش میں آنے سے زیادہ ہکا بکا ہو گیا، چاہے ایک لمحے کو ہی جیسا کہ مجھے امید تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے پورے حواسوں میں آتا، میں نے کہا:

"میں نے خواب میں بابا کو دیکھا۔ انہوں نے مجھے رازداری سے کوئی وحشت خیز بات بتائی تھی۔ تم ہی تھے جس نے ان کا قتل کیا——"

"جب تمہارے بابا کا قتل ہوا وہ سب کیا ہم ساتھ ہی نہیں تھے؟"

"میں اس سے واقف ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم جانتے تھے کہ میرے بابا گھر پر اکیلے ہوں گے۔"

"میں نہیں جانتا تھا۔ مجھے پہلے کے ساتھ بچوں کو باہر بھیجنے والی تو تم تھیں۔ صرف تمہیں ہی پتہ تھا۔ ہمیشہ اس بارے میں جانتی تھی۔ اور جہاں تک یہ کہ اور کون جان سکتا تھا، یہ تم مجھ سے بہتر جانتی ہو۔"

"کسی وقت مجھے کوئی باطنی آواز محسوس ہوتی ہے جو بتانے والی ہو کہ یوں سب کچھ ہوا تھا، ہماری ساری بدنصیبی کا راز۔ میں اپنا ذہن کھولتی ہوں تا کہ وہ آواز بول سکے۔ لیکن جیسا کہ خواب میں کوئی آواز نہیں نکلتی۔ تم اب میرے بچپن والے اچھے اور سیدھے سادے قرو نہیں رہے۔"

"اس سیدھے سادے قرو کو تم اور تمہارے بابا نے دھتکار دیا تھا۔"

"اگر تم نے میرے بابا سے انتقام لینے کے لیے مجھ سے شادی کی ہے تو تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بچے تمہیں پسند نہیں کرتے۔"

"میں جانتا ہوں۔" اس نے دکھ سے کہا۔ "بستر پر جانے سے پہلے تم تھوڑی دیر کو بچوں کے پاس گئی تھیں۔ میں نے خود کو کوسنے برا بھلا کہنے کی آواز سنی تھی۔"

"تمہیں انہیں تھپڑ لگا دینا چاہیے۔" میں نیم دلی سے خواہش کرتے کہا کہ وہ ایسا ہی کرتا۔ پھر میں گھبراہٹ سے مزید بولی۔ "اگر تم نے ان پر ہاتھ اٹھایا تو میں تمہاری جان لے لوں گی۔"

"بستر پر آ جاؤ۔" وہ بولا۔ "تم سردی سے ٹھٹھر جاؤ گی۔"

"شاید میں تمہارے قریب کبھی بھی نہ آؤں۔ شاید میں نے شادی کر کے غلطی کی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری شادی قانون کی نظر میں جائز نہیں۔ کیا تم جانتے ہو ہونے سے پہلے میں نے حسن کے قدموں کی چاپ سنی تھی؟" "یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ جب میں اپنے مرحوم شوہر کے گھر میں تھی، برسوں میں نے حسن کے قدموں کی چاپ سن رکھی ہے۔ بچے اسے پسند کرتے ہیں اور وہ بے رحم ہے۔ اس کے پاس ایک برہنہ تلوار ہے، خود کو اس سے محفوظ رکھنے کی تدبیر کرو۔"

میں نے قرو کی آنکھوں میں بے حد شکستہ دلی اور تھکن دیکھی۔ میں جانتی تھی کہ میں اسے خوف زدہ کر پاؤں گی۔

"ہم دونوں میں اب تم ہو جو زیادہ امید اور زیادہ اداسی رکھتے ہو۔" میں نے کہا۔ "میں بس ناخوش نہ ہونے اور اپنے بچوں کی حفاظت کی تگ و دو میں ہوں، جب کہ تم ثابت قدمی سے خود کو ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہو۔ یہ اس لیے نہیں ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔"

وہ بولے چلا گیا کہ اسے مجھ سے کس قدر محبت تھی۔ کیسے وہ اجاڑ ویران کارواں سرائے میں پہاڑوں اور برف آلود راتوں میں ہمیشہ میرے بارے میں سوچتا تھا۔ اگر وہ یہ باتیں نہ کہتا تو میں بچوں کو

itsurdu.blogspot.com

بھاگتی اور اپنے سابقہ شوہر کے گھر چلی جاتی۔ چوں کہ مجھے تجسّس ہوئی، میں نے یہ کہا، ''بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا سابق شوہر کسی بھی وقت واپس لوٹ آئے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے میں رات کو تمہارے ساتھ پکڑے جانے یا بچوں کی طرف سے پکڑے جانے کا خوف ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ جیسے ہی ہم آغوش ہوں گے دروازے پر دستک ہو جائے گی۔''

ہمیں صحن کے دروازے کے پار لڑتی ہوئی بلیوں کی آہ و زاری سنائی دی۔ اس کے بعد دیر تک خاموشی رہی۔ مجھے لگا، میں سسکیاں بھرنے لگوں گی۔ میں اپنا شمع دان پیچھے میز کے سرے پر رکھ سکتی تھی نہ ہی مڑ کر اپنے بیٹوں کے پاس کمرے میں جا سکتی تھی۔ میں نے خود کو بتایا کہ میں تب تک کمرے سے نہیں نکلوں گی جب تک کہ مجھے یقین نہ ہو جائے کہ قرہ کا میرے بابا کی موت سے کچھ بھی لینا دینا نہ تھا۔

''تم ہمیں حقیر سمجھتے ہو۔'' میں نے قرہ سے کہا، ''ہماری شادی کے بعد سے تم مغرور ہو گئے ہو۔ تم ہمیں حقارت سے دیکھتے ہو کیوں کہ میرا شوہر لاپتا تھا اور اب جب کہ میرے بابا قتل ہو چکے ہیں، تم ہمیں مزید قابلِ ترس سمجھتے ہو۔''

''میری محترم شکورے۔'' میں نے محتاط رہتے ہوئے کہا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے اس طرح سے بات شروع کی تھی۔ ''تم خود جانتی ہو کہ یہ سچ نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے سب کچھ کر گزروں گا۔''

''پھر بستر سے نکلو اور میرے ساتھ ... انکار کرو۔''

میں نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں انکار کر رہی تھی؟

''میں نہیں کر سکتا۔'' اس نے کہا اور خیالات میں اپنے ... اور سونے کے لباس کو دیکھا۔

وہ درست تھا لیکن میں پھر بھی اس پر برہم ہو گئی کہ وہ میری درخواست پر کان نہیں دھر رہا تھا۔

''میرے بابا کے قتل ہونے سے پہلے، تم کسی ایسی بلی کی طرح خوف سے دیکھتے ہوئے اس گھر میں داخل ہوتے تھے جس نے دودھ گرا دیا ہو۔'' میں نے کہا، ''لیکن اب جب تم مجھے ''میری محترم شکورے'' کہہ کر خاطب کرتے ہو، یہ کھوکھلا لگتا ہے ــــ یوں جیسے تم چاہتے ہو کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ یہ ایسا ہے۔''

میں کپکپا رہی تھی، غصے سے نہیں بلکہ سخت سردی کے باعث جو میری ٹانگوں، کمر اور گردن کو ٹھٹھرا رہی تھی۔

''بستر میں آ جاؤ اور میری بیوی بن جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''میرے باپ کو قتل کرنے والا بدمعاش کیسے پکڑا جائے گا؟'' میں نے پوچھا، ''اگر اس کے ملنے میں کچھ وقت ہے تو میرا اس گھر میں تمہارے ساتھ رہنا درست نہیں۔''

''تمہارے اور ... کے باعث استاد عثمان نے اپنی ساری توجہ گھوڑوں پر مرکوز کر رکھی ہے۔''

''استاد عثمان میرے بابا کے شدید دشمن تھے، خدا ان کی مغفرت فرمائے۔ اب میرے بے

ہمارے بابا اوپر آسمان سے دیکھ سکتے ہیں کہ تم ان کے قاتل کو پکڑنے کے لیے استاد عثمان پر انحصار کر رہی ہو۔ وہ اس پر بہت اذیت میں ہوں گے۔"

وہ اچھل کر بستر سے نکلا اور میری طرف آیا۔ میں جنبش تک نہ کر سکی۔ لیکن میری توقع کے برعکس اس نے ہاتھ سے صرف میری شمع بجھائی اور وہاں کھڑا رہا۔ ہم گھور اندھیرے میں تھے۔

"تمہارے بابا اب ہمیں نہیں دیکھ سکتے۔" اس نے سرگوشی کی۔ "ہم دونوں تنہا ہیں۔ اب مجھے بتاؤ شکورے، جب میں بارہ برس بعد واپس آیا تو تم نے مجھے یہ تاثر دیا کہ تم مجھ سے محبت کر پاؤ گی، یہ کہ تم اپنے دل میں میرے لیے گنجائش نکال سکو گی۔ پھر ہم نے شادی کر لی۔ تب سے تم مجھ سے محبت سے بھاگ رہی ہو۔"

"مجھے تم سے شادی کرنی پڑی۔" میں نے سرگوشی کی۔

وہاں، تاریکی میں، میں نے محسوس کیا کہ میرے الفاظ بغیر کوئی رحم کھائے اس کے گوشت میں ناخنوں کی طرح گڑ گئے تھے، جیسا کہ ایک بار شاعر فضولی نے بیان کیا تھا۔

"اگر میں تم سے محبت کرتی تو میں تب کرتی جب میں بچی تھی۔" میں نے دوبارہ سرگوشی کی۔

"پھر بتاؤ مجھے، تاریکی کی میری ملکہ۔" اس نے کہا۔ "تم نے ضرور ان تمام مصور فنکاروں کی چھپ کر نگرانی کی ہوگی جو تمہارے گھر آتے جاتے تھے اور انہیں جانتی ہوگی۔ تمہاری رائے میں ان میں سے قاتل کون ہے؟"

مجھے خوشی ہوئی کہ وہ اپنی حس مزاح قائم رکھے ہوئے تھا۔ آخر وہ میرا ہی شوہر تھا۔

"مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

کیا میں نے واقعی یہی کہا تھا، مجھے یاد نہیں۔ ہم ایک دوسرے کو بوسہ دینے لگے۔ تاریکی میں اس کی قربت میں ایک ہاتھ میں ابھی تک شمع تھامے، میں نے اس کا لمس محسوس کیا اور میرے آنسو، میرے بال، میری کپکپاہٹ، میرا سونے کا لباس اور حتیٰ کہ اس کا بدن سب تعجب خیز تھے۔ اس کے گرم رخسار پر اپنی ناک رگڑ کر گرم کرنا بھی خوش گوار تھا، لیکن اس شرمیلی شکورے نے خود پر قابو پائے رکھا۔ اسے بوسہ دیتے ہوئے میں نے خود پر قابو کھو کر شمع ہاتھ سے گرنے نہ دی لیکن مجھے اپنے بابا، جو مجھے دیکھ رہے تھے، اور اپنے سابق شوہر اور بستر میں سوتے اپنے بچوں کا خیال آتا رہا۔

"گھر میں کوئی ہے۔" میں چیخی۔ میں نے قرہ کو پرے دھکیلا اور باہر دیوان خانے میں چلی گئی۔

میرا نام ہے قرہ

خاموش اور ان دیکھی، صبح کاذب کی تاریکی کے پردے تلے، مجھے کسی قصوروار گھریلو مہمان کا سا احساس ہوا اور میں کیچڑ آلود تنگ گلیوں میں بغیر تھکے چلتا چلا گیا۔ بایزید پر میں نے صحن میں وضو کیا، مسجد میں داخل ہوا اور نماز ادا کی۔ امام آفندی کے سوا کوئی نہ تھا اور ایک بوڑھا آدمی جو نماز پڑھتے پڑھتے سو سکتا تھا ____ ایک صلاحیت جو زندگی بھر مشق کے بعد ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کیسے ہمارے غیظ بھرے خوابوں اور اداس یادوں کے لمحات ہوتے ہیں جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ اللہ نے ہم پر توجہ کر دی ہے اور ہم کسی ایسے شخص کی توقع بھری امید سے دعا کرتے ہیں جو سلطان کے ہاتھ میں اپنی درخواست تھمانے میں کامیاب رہا ہو؛ یوں میں نے خدا سے دعا کی کہ مجھے محبت کرنے والے لوگوں سے بھرا خوش باش گھر عطا کرے۔

جب میں استاد عثمان کے گھر پہنچا، میں جانتا تھا کہ ایک لمحے میں ہی وہ بتدریج میرے خیالوں میں میرے (مرحوم) انشتے کی جگہ لے لیں گے۔ وہ زیادہ مخالف اور زیادہ اجنبی تھے، لیکن کتابوں کی تزئین کاری پر ان کا یقین زیادہ گہرا تھا۔ وہ کسی ایسے عظیم استاد سے زیادہ، جس نے اتنے بہت سے برسوں تک اچھے فنکاروں میں خوف، مرعوبیت اور محبت کے طوفان اٹھائے تھے، کسی مشاہدۂ نفس کے عادی بوڑھے درویش سے مشابہ تھے۔

جب ہم استاد کے گھر سے محل کے لیے نکلے ____ وہ گھوڑے پر سوار ہوئے اور آگے کو جھک کر بیٹھ گئے، میں پیدل اور اسی طرح آگے کو جھکا ہوا تھا ____ ہم نے ضرور ان مستی تصویروں کے بوڑھے درویش اور اس کے شاگرد کو یاد دلایا ہوگا، جو پرانے قصوں کے ساتھ آویزاں کی جاتی تھیں۔

محل میں ہمیں شاہی محافظ دستے کا کمان دار اور اس کے ساتھی ملے جو ہم سے زیادہ مشتاق اور تیار تھے۔ ہمارے سلطان کو یقین تھا کہ ایک مرتبہ اس صبح تینوں استاد فنکاروں کی بنائی گئی گھوڑوں کی تصویریں دیکھ لینے کے بعد ایک لمحے میں طے کر لیں گے کہ ہمارے درمیان وہ بدبخت قاتل کون تھا اور یوں سلطان نے حکم دیا تھا کہ قاتل کو خود پر لگے الزام کا جواب دینے کی اجازت دیے بغیر فوراً زنداں میں ڈال

دیا جائے۔ ہمیں جلاد کے فوارے پر نہیں لے جایا گیا تھا جہاں ہر کوئی دیکھ اور حظ لے سکتا تھا بلکہ سلطان کے ذاتی باغ کے ایک حصے میں چھوٹے سے بے فکرے گھر میں، جسے پوچھ گچھ، تشدد اور گلا گھونٹ کر مارنے کے لیے ترجیح دی جاتی تھی۔

ایک نوجوان جو اپنی شائستگی اور نرم خوئی سے کمان دار کے آدمیوں میں سے ایک لگتا تھا، اس نے حکمیہ انداز میں میز پر تین اوراق رکھے۔

استاد عثمان نے اپنا محدب عدسہ نکالا اور میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ زمین کے کسی قطعے پر خوش وضعی سے تیرتے عقاب کی طرح ان کی نگاہ جو انہوں نے شیشے سے یکساں فاصلے پر جمار کھی تھی، تین حیرت انگیز گھوڑوں کی تصویروں پر سے گزری اور اس عقاب کی طرح جس نے کوئی غزال کا بچہ دیکھ لیا ہو جو اس کا شکار ہوگا، وہ ہر گھوڑے کی ناک پر ٹھہرے اور پوری توجہ اور سکون سے اس پر توجہ مرکوز کی۔

"وہ یہاں نہیں ہے۔" انہوں نے کچھ دیر بعد سرد مہری سے کہا۔

"کیا یہاں نہیں ہے؟" کمان دار نے پوچھا۔

میں نے فرض کیا تھا کہ استاد غور و فکر سے کام کریں گے اور دیانت سے ہم تک گھوڑوں کا ہر پہلو سے جائزہ لیں گے۔

"بدبخت مصور نے ایک بھی سراغ نہیں چھوڑا۔" استاد عثمان نے کہا، "ان تصویروں سے ہم تعین نہیں کر پائیں گے کہ سرخی مائل بھورے رنگ کا گھوڑا کس نے بنایا تھا۔"

محدب شیشہ وہ ایک طرف رکھ چکے تھے، اسے اٹھاتے ہوئے میں نے گھوڑوں کے نتھنوں کا جائزہ لیا: استاد درست کہتے ہیں، میرے انشے کے مسودے کے لیے بنائے گئے سرخی مائل بھورے گھوڑے کے مخصوص نتھنوں سے مشابہ یہاں کچھ نہ تھا۔ تبھی میری توجہ باہر منتظر اذیت رسانوں تک منعطف ہوئی جن کے مقصد کا میں اندازہ نہ کر پایا۔ جب میں نیم وا دروازے سے انہیں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، میں نے کسی کو تیزی سے یوں پیچھے دوڑتے دیکھا جیسے اس نے کوئی جن دیکھ لیا ہو، وہ شہتوت کے درختوں میں سے ایک کے عقب میں پناہ لے رہا تھا۔

اس لمحے، ایک ملکوتی روشنی کی طرح جس نے سرمئی صبح کو منور کر دیا تھا، ہمارے سلطان عزت مآب، عالم پناہ کمرے میں داخل ہوئے۔

استاد عثمان نے ان کے سامنے اعتراف کیا کہ وہ ان تصاویر سے کچھ بھی تعین نہ کر پائے تھے۔ اس کے باوجود وہ ان عالی شان تصویروں میں موجود گھوڑوں کی طرف ہمارے سلطان کی توجہ دلانے سے گریز نہ کر پائے: جس طرح، جس طرف وہ پیچھے بنے، دوسرے کا نفیس انداز اور تیسری تصویر میں، قدیم کتابوں کے مواد سے موزوں وقار اور تمکنت۔ اسی دوران انہوں نے اپنا قیاس بتایا کہ کون سی تصویر کس فنکار نے بنائی ہوگی اور قاصد جو ہر فنکار کے دروازے پر گیا تھا، اس نے استاد عثمان کے کہے کی توثیق کی۔

itsurdu.blogspot.com

"میرے آقا، اس پر حیران مت ہوں کہ میں مصوروں کو اپنے ہاتھ کی پشت کی طرح جانتا ہوں۔" استاد نے کہا۔ "مجھے یہ بات حیرت زدہ کرتی ہے کہ کیسے ان لوگوں نے جنہیں میں بلاشبہ اپنے ہاتھ کی پشت کی طرح جانتا ہوں، بالکل نامانوس کام کیا ہے۔ کیوں کہ حتی کہ استاد منی ایچر فنکار کا قلم بھی اپنی بنیاد یا اصل رکھتا ہے۔"

"آپ کے کہنے سے کیا مراد ہے؟" ہمارے سلطان نے کہا۔

"عالی جاہ، اقبال مند سلطان اور عالم پناہ، میری رائے میں، میرے خیال میں یہ چھپے ہوئے دستخط جو یہاں سرخی مائل بھورے گھوڑے کے نتھنوں پر ظاہر ہیں، یہ مصوری کوئی بے معنی اور بے سروپا غلطی نہیں بلکہ ایک ایسی علامت ہے جس کی جڑیں ماضی بعید میں دوسری تصویروں، دوسرے طریقہ کار، دوسرے انداز اور شاید حتی کہ دوسرے گھوڑے تک پہنچتی ہیں۔ اگر ہمیں صدیوں پرانی کتابوں کے حیرت انگیز اوراق کے جائزے کی اجازت ہوتی جنہیں آپ مقفل رکھتے ہیں اور اس کی کلید، خاتون، آہنی صندوقوں اور اندرونی خزانے کی الماریوں میں رکھتے ہیں، تو ہم اس تکنیک کو پہچاننے کے قابل ہو جاتے جسے ہم ابھی ایک غلطی کے طور پر دیکھتے ہیں، پھر ہم اسے تین منی ایچر فنکاروں میں سے کسی کے موقلم سے منسوب کر سکتے تھے۔"

"آپ میرے خزانے میں داخل ہونا چاہتے ہیں؟" سلطان نے حیرت سے دریافت کیا۔

"یہ میری خواہش ہے۔" میرے استاد نے کہا۔

یہ خواہش اسی قدر بے باک تھی جیسے شاہی حرم میں داخلے کی خواہش۔ تبھی مجھے سمجھ آئی کہ شاہی حرم اور خزینہ امیرہ جہاں ہمارے سلطان کی ذاتی جنت کے حسن کی خوب صورت جگہیں تھے، وہیں وہ ہمارے سلطان کے دل میں بھی وہ عزیز ترین مقام رکھتے تھے۔

ہمارے سلطان کے وجیہہ چہرے سے، جسے اب میں خوف کے عالم میں دیکھ رہا تھا، میں یہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اب کیا ہو گا لیکن وہ اچانک ہی چلے گئے۔ کیا وہ ناراض ہو گئے تھے اور طیش میں آ گئے تھے؟ کیا میرے استاد کی گستاخی پر ہمیں یا حتی کہ تمام منی ایچر فنکاروں کو سزا دی جائے گی؟

اپنے سامنے موجود تین گھوڑوں کو دیکھتے ہوئے میں نے تصور کیا کہ میں شکورے سے دوبارہ ملنے سے قبل، اس سے کبھی قربت کے بغیر ہی ہلاک کر دیا جاؤں گا۔ ان عالی شان گھوڑوں کی تمام خوب صورت خصوصیات کے بے تعلق ہونے کے باوجود، اب یہ کسی اجنبی دنیا سے ابھرنے لگتے تھے۔

میں نے اس دہشت خیز خاموشی میں شدت سے ادراک کیا کہ بالکل جس طرح بچپن میں ہی محل لائے جانے، یہاں پروان چڑھنے اور رہنے سے مراد تھی، ہمارے سلطان کی خدمت اور شاید ان کے لیے جان دینا، سو منی ایچر فنکار ہونے سے مراد تھی، خدا کی خدمت اور اس کے حسن و جمال کی خاطر جان دے دینا۔

بہت بعد میں جب سربراہ خزانچی کے آدمی ہمیں باب السلام پر لائے، میرے دماغ پر موت

چھا گئی، موت کی خاموشی۔ لیکن جب ہم اس دروازے سے گزرے جہاں لاتعداد پاشاؤں کے سر قلم کیے گئے تھے، محافظوں نے یوں ظاہر کیا جیسے انہوں نے ہمیں دیکھا بھی نہیں تھا۔ دیوان میدانی جس نے گزشتہ روز مجھے مبہوت کر دیا تھا یوں جیسے وہ خود جنت تھی، اس کے مینار اور صنوبروں نے مجھ پر ذرا اثر نہ کیا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ ہم مزید اندر، ہمارے سلطان کے خفیہ جہاں کے مرکز میں، اندرونی حرم یا رہائشی حصوں میں لے جائے جا رہے تھے۔

ہم اس دروازے سے گزرے جہاں وزرائے اعظم تک کا داخلہ ممنوع تھا۔ کسی ایسے بچے کی طرح جو پریوں کی کہانیوں کے دیس میں پہنچ گیا ہو، میں نے ایسے عجائب اور مخلوقات سے بچنے کے لیے جو میرا سامنا کر سکتے تھے، اپنی نگاہیں زمین پر جمائے رکھیں۔ میں اس عرض اوداسی (Arz Odasi) کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ بھی نہ پایا جہاں سلطان دربار لگاتے تھے، لیکن میری نظر لمحہ بھر کو سرو کے درخت کے قریب حرم کی دیواروں پر ٹھہری، سرو کا درخت جو دوسرے درختوں سے بالکل مختلف نہ تھا اور اس دراز قد شخص پر جو چمکتا نیلا ریشمی کا فتان پہنے ہوئے تھا۔ ہم اونچے ستونوں کے قریب سے گزرے۔ آخر کار ہم ایک پھاٹک کے قریب رکے، بڑا اور باقی سب سے زیادہ مرعوب کن، سجاوٹی بلوریں ستونوں میں فریم شدہ۔ اس کی دہلیز پر جھلملاتے کافتان پہنے خزینہ امیر و افسر تھے، جن میں سے ایک جھک کر قفل کھول رہا تھا۔

براہ راست ہماری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سربراہ خزانچی نے کہا: ”تم پر قسمت کا دروازہ کھلا ہے کہ ہمارے سلطان عالی مقام نے تمہیں اندرونی خزانے میں داخلے کی اجازت بخشی ہے۔ یہاں تم ان کتابوں کا جائزہ لو گے جو کسی اور نے کبھی نہیں دیکھیں، تم حیرت انگیز تصویریں اور سونے کے اوراق دیکھو گے اور شکاریوں کی طرح تم اپنے شکار، قاتل کا سراغ لگاؤ گے۔ میرے سلطان نے تمہیں یاد دہانی کا کہا ہے کہ استاد عثمان کے پاس جمعرات کی دوپہر تک تین روز ہیں ـــــ جن میں سے ایک اب ختم ہو چکا ہے ـــــ جن میں حتمی ایچ ونکاروں میں سے مجرم کا نام لینا ہے۔ اس میں ناکامی پر معاملہ شاہی محافظوں کے سپرد کر دیا جائے گا کہ وہ اسے تشدد اور زدوکوب کے ذریعے حل کرے۔“

پہلے تو انہوں نے قفل پر چڑھا موم جامہ اتارا، جس پر مہر تھی تاکہ قفل میں کوئی چابی بلا اجازت داخل نہ ہو۔ خزانے کے دربان اور دو افسروں نے تصدیق کی کہ مہر موجود تھی اور سر ہلا کر اشارہ دیا۔ مہر توڑی گئی اور جب اس میں چابی لگائی گئی تو قفل ایک آواز کے ساتھ کھلا جس نے وہاں طاری خاموشی کو توڑ دیا۔

استاد عثمان کا رنگ اچانک سیاہ پڑ گیا۔

جب بھاری منقش چوبی دروازے کا ایک کواڑ کھلا، ان کے چہرے پر ایک اداسی کی تابندگی دیکھنے میں آئی جو قدیم وقتوں کی یادگار لگتی تھی۔

”میرے سلطان نہیں چاہتے کہ کاتب حضرات اور معاونین جو فہرست اندراج رکھتے ہیں، بلا ضرورت داخل ہوں۔“ سربراہ خزانچی نے کہا، ”شاہی کتب خانے کے مہتمم کی وفات ہو گئی ہے اور ان کی

چند کتابوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ اس لیے سلطان نے حکم دیا ہے کہ آپ کے ساتھ صرف جزمی آقا ہی اندر جائیں گے۔"

جزمی آقا روشن چمکتی آنکھوں والا پستہ قد آدمی تھا جو کم سے کم ستر سال کا لگتا تھا۔ اس کی پگڑی جو کسی بادبان سے مشابہ تھی، اس سے زیادہ وزنی تھی۔

"جزمی آقا خزانے کے اندرونی حصے کو اپنے گھر سے زیادہ جانتا ہے۔ وہ کتابوں کی جگہ اور باقی سب سے کسی سے بھی زیادہ واقف ہے۔"

بوڑھے بونے نے اس پر کسی فخر کا اظہار نہ کیا۔ وہ عقربی ہاتھوں والی انگیٹھی، سیپ کے دستے والے پیشاب دان، تیل کے لیمپ اور ان شمعوں پر نگاہیں دوڑا رہا تھا جو گل کے خدمت گار تھامے ہوئے تھے۔

سربراہ خزانچی نے اعلان کیا کہ ہمارے عقب میں دروازہ دوبارہ مقفل کر دیا جائے گا اور اس پر سلطان سلیم یاوز کی ستر سال پرانی مہر لگا دی جائے گی۔ نماز مغرب کے بعد خزانے کے افسروں کے سامنے ان کی گواہی میں مہر دوبارہ توڑی جائے گی۔ مزید یہ کہ ہمیں بے حد احتیاط کرنی ہو گی کہ کوئی بھی شے... قطعی شے "ہمارے کپڑوں، جیبوں یا بغلوں میں نہ رہ جائے: باہر نکلنے پر ہماری مکمل جامہ تلاشی ہو گی۔

دونوں اطراف میں کھڑے افسروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم اندر داخل ہوئے۔ اندر بے انتہا سردی تھی۔ ہمارے پیچھے دروازہ بند ہو جانے پر ہم تاریکی میں گھر گئے۔ مجھے پھپھوندی، مٹی اور سیلن کی ملی جلی بو محسوس ہوئی جو میرے نتھنوں میں گھس گئی۔ بیش بہا اشیا، صندوق اور جنگی خود، گدے اور بے ترتیب بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے یوں احساس ہوا جیسے میں کسی جنگ کا شاہد تھا۔

میری آنکھیں اس عجیب روشنی سے مانوس ہوئیں جو بلند کھڑکیوں کی موٹی سلاخوں سے، اونچی دیواروں کے ساتھ ساتھ سیڑھیوں کے کنگروں سے اور دوسری منزل کے چوبی فرش والی راہداریوں سے چھن کر آ رہی تھی۔ مخملیں کپڑے کے رنگ میں نہایا یہ تحیر سرخ تھا۔ میں نے سوچا کہ کیسے اس تمام دولت کو جنگوں، بہائے گئے خون اور شہروں اور خزانوں کو لوٹنے کے نتیجے میں جمع کیا گیا تھا۔

"دہشت زدہ؟" بوڑھے بونے نے میری احساسات کو زبان دیتے ہوئے پوچھا، "پہلی بار آنے پر ہر کوئی دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ رات کو ان اشیا کی روحیں ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتی ہیں۔"

دہشت زدہ کرنے والی شے وہ خاموشی تھی جس میں یہ تمام اشیا پڑی تھیں۔ اپنے عقب میں ہم نے دروازے کے قفل پر مہر لگانے کی آوازیں سنیں اور ہم نے مرعوب ہو کر اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی، ساکت اور بے حرکت۔

میں نے تلواریں، ہاتھی دانت، کافتان، چاندی کے شمع دان اور ساٹن کے بینر دیکھے۔ میں نے صدف سے سجے ڈبے دیکھے، آہنی صندوق، چینی گل دان، کمر بند، لمبی لمبی بانسریاں، زرہ، ریشم کے کشن، دنیا کے گلوب کے نمونے، جوتے، سمور، گینڈے کے سینگ، شتر مرغ کے مزین انڈے، رائفل،

تیر، گرز اور الماریاں۔ وہاں ہر طرف قالینوں، کپڑے اور سامان کے ڈھیر تھے، اوپر کی منزل کے چوبی فرش کے تختوں سے مجھ پر گرتی آبشار کی طرح، اوپر کے کنگوروں یا جنگلوں سے، دیواروں میں بنی الماریوں اور دو حجرے کے طاقوں سے۔ کپڑوں، صندوقوں، سلطانوں کے کفتانوں، تلواروں، بڑی بڑی گلابی شمعوں، دستاروں، موتیوں سے سجے تکیوں، طلائی زردوزی والی زینوں، ہیرے کے دستوں والی چھوٹی خم دار تلواروں، یاقوتی دستوں والے گرز، کلغی والی دستار، دستاروں کے شمشیر، گھڑیاں، پانی کے قرابے، خنجر، گھوڑوں اور ہاتھیوں کے ہاتھی دانت کے بنے مجسمے، ہیروں سے آراستہ تھے، صدف سے سجے دراز، گھوڑوں کی کلغیاں، بڑی بڑی تسبیحیں اور یاقوت اور فیروزے سے سجے خود، ان پر ایک عجیب پراسرار روشنی چھائی جیسی میں نے پہلے کبھی کہیں نہ دیکھی تھی۔ یہ روشنی جو بلند کھڑکیوں سے چھن کر نیچے آتی تھی، اس نے نیم تاریک کمرے کی فضا میں تیرتے گرد کے ذرات کو روشن کر دیا، گرمیوں کی اس دھوپ کی طرح جو مسجد کے گنبد میں روشنی کے روزن سے اندر آتی تھی — لیکن یہ دھوپ نہیں تھی۔ اس انوکھی روشنی میں، ہوا قابل محسوس ہو چکی تھی اور سب اشیا یوں تھیں جیسے ایک ہی مادے سے بنی ہوں۔ ہم نے خاصی دیر تک کمرے میں تشویش کے ساتھ خاموشی محسوس کی، میں آگاہ تھا کہ یہ ہر شے پر چھائی روشنی کے ساتھ ساتھ گرد بھی تھی جس نے ہر شے کو ایک حریری [illegible] دیتے ہوئے اس سرد کمرے میں سرخ رنگ کو غالب کر دیا تھا، اور جب نگاہ ان عجیب و غریب اور حیرت انگیز چیزوں پر تیرتی، حتیٰ کہ دوسری تیسری نگاہ بھی ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنے میں ناکام رہی، اشیا کی عظیم [illegible] پر وحشت تیز ہو گئی۔ جسے میں نے صندوق خیال کیا تھا، بعد میں کھلا کہ وہ ایک تہ ہونے والی میز تھی، اور [illegible] عجیب و غریب فرنگی اشیا و آلات۔ مجھے کفتانوں اور کلغیوں کے ڈھیر میں جو اپنے صندوقوں سے نکال کر یہاں بکھرا دیے گئے تھے، صدف کا ایک صندوق ملا اور ہمیں ماسکو کے زار کی بھیجی گئی بید کی الماری بھی موجود تھی۔

جزی آغا نے دیوار میں بنے طاق میں انگیٹھی رکھ دی۔

"کتابیں کہاں ہیں؟" استاد عثمان نے سرگوشی کی۔

"کون سی کتابیں؟" بونے نے پوچھا۔ "عرب سے آنے والی، کوفی قرآن، وہ جو جنت مکانی سلطان سلیم یاوز تبریز سے لائے تھے، ان پاشاؤں کی کتابیں جنہیں موت کی سزا سنانے کے بعد ان کی جاگیر اور اثاثے ضبط کر لیے گئے تھے، سلطان کے دادا کو وینس کے سفیر کی جانب سے تحفے میں پیش کی گئی جلدیں یا سلطان محمد فاتح کے زمانے کی عیسائی کتابیں؟"

"وہ کتابیں جو شاہ طہماسپ نے عالی مرتبت سلطان سلیم دوم جنت مکانی کو پچیس سال قبل تحفے کے طور پر بھیجی تھیں۔" استاد عثمان نے کہا۔

بونا ہمیں ایک بڑی سی چوبی الماری کے پاس لے گیا۔ استاد عثمان نے جب الماری کے پٹ کھولے اور اپنے سامنے موجود کتابوں پر نگاہ ڈالی، وہ بے صبر ہو گئے۔ انھوں نے ایک کتاب کھولی، اس کا

سرورق پڑھا اور اس کے صفحے پلٹائے۔ مل کر ہم نے حیرت کے عالم میں خواتین کی تصویروں پر قدرے
ترچھی نگاہیں دوڑائیں۔

"چنگیز خان، چغتائی خان، تولی خان اور قبلائی خان، چین کا حکمران۔" استاد عثمان نے کتاب
بند کر کے دوسری اٹھانے سے قبل پڑھا۔

ہم نے ایک انتہائی حیرت انگیز طور پر خوب صورت تصویر کشی دیکھی جس میں فرہاد محبت کی طاقت
کے بل بوتے پر اپنی محبوبہ شیریں اور اس کے گھوڑے کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے تھا۔ محبت کرنے
والوں کے عشق اور رنج و الم کی تصویر کشی کے لیے، پہاڑ کے پتھروں، بادلوں اور تین عظیم صنوبر کے درختوں
جو فرہاد کے اس اقدام محبت کے شاہد تھے، ان کی تصویر کشی ایسے کرب کے عالم میں رنج زدہ لرزاں ہاتھوں
سے کی گئی تھی کہ استاد عثمان اور میں فوراً ہی جھڑتے پتوں میں غم و اندوہ اور آنسوؤں کے ذائقے کے اثر میں
آ گئے۔ اس متاثر کن لمحے کی عکاسی —— جیسا کہ عظیم استاد کا کہنا تھا —— فرہاد کی طاقت کے اظہار کے لیے نہیں
بلکہ اس عکاسی کے لیے کی گئی تھی کہ اس کی محبت پورے عالم میں محسوس کی گئی تھی۔

"تبریز میں اسی برس قبل بنائی گئی بہزاد کی ایک نقل۔" استاد عثمان نے وہ کتاب بند کر کے رکھتے
اور دوسری نکالتے کہا۔

یہ Kelile and Dimne کی وہ تصویر تھی جس میں بلی اور چوہے کی جبری دوستی دکھائی گئی تھی۔
کھیتوں میں، ایک بے چارا چوہا زمین پر نیولے اور فضا میں عقاب کے حملے کے درمیان پھنسا، اپنا
بچاؤ شکاری کے پھندے میں پھنسی ایک بد قسمت بلی میں تلاش کرتا ہے۔ انہوں نے ایک سمجھوتہ کر لیا: بلی،
چوہے کی دوست ہونے کا دکھاوا کرتے ہوئے اسے چاٹتی ہے اور یوں نیولے اور عقاب کو بھگا دیتی ہے۔ قبل
اس کے کہ میں فنکار کی حساسیت کو سمجھ سکتا، استاد نے اس کتاب کو باقی سب کے ساتھ واپس رکھا اور ایک
اور کتاب کھولی۔

یہ ایک پر اسرار مرد و عورت کی دلکش تصویر تھی۔ عورت نے کوئی سوال پوچھتے ہوئے ایک ہاتھ
خوب صورتی سے پھیلا رکھا تھا، اپنی سبز چادر پر سے وہ دوسرے ہاتھ سے اپنا گھٹنا تھامے ہوئے تھی، جب کہ
وہ آدمی اس کی طرف مڑ کر توجہ سے اسے سن رہا تھا۔ ان کے درمیان، دوستی، محبت، قربت اور اتنی یگانگت پر
رشک کرتے ہوئے میں نے اس تصویر کو اشتیاق سے دیکھا۔

وہ کتاب نیچے رکھ کر استاد عثمان نے کسی دوسری کتاب کا صفحہ کھول لیا۔ ابدی دشمن، ایرانی اور
تورانی افواج کے گھڑسوار رسالے، اپنی مکمل زرہ بکتر خود، ساق پوش، تیر کمان اور ترکش کے ساتھ اور ان
عالی شان، داستانوی اور پوری طرح مسلح گھوڑوں پر سوار تھے۔ قبل اس کے کہ وہ جنگ میں موت کے لیے
ایک دوسرے سے رزم آرا ہوتے، وہ ایک دوسرے کے سامنے گرد آلود وسیع میدان میں اپنے نیزے بلند
اٹھائے صبر و تحمل سے اپنے اپنے کمان داروں کو دیکھتے صف آرا ہو رہے تھے، جو جنگ شروع کرنے کے لیے

سامنے کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ میں خود کو بتانے ہی والا تھا کہ چاہے وہ تصویر آج بنی تھی یا سینکڑوں سال پہلے، چاہے وہ محبت کی منظر کشی تھی یا جنگ کی، وہ فنکار جو مکمل یقین کے ساتھ حقیقت میں مصوری کرتا اور دوسروں تک پہنچاتا ہے وہ اس کی مصوری کے لیے خود اپنی محبت اور خواہش کی جنگ ہے۔ میں مزید یہ اعلان کرنے والا تھا کہ منی ایچر فنکار درحقیقت خود اپنے صبر کی مصوری کرتے ہیں، جب استاد عثمان نے کہا: "وہ یہاں بھی نہیں ہے۔" اور وہ بھاری سی عظیم کتاب بند کر دی۔

ایک کتاب کے صفحوں پر ہم نے امڈتے بادلوں کے ساتھ ملے جلے بلند پہاڑ دیکھے، وہ ایک قدرتی منظر کی عکاسی تھی جو ابد تک پھیلا ہوا لگتا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیسے مصوری اسی دنیا کو دیکھنے لیکن ایک دوسرے جہاں کی منظر کشی کا نام تھا۔ استاد عثمان نے بیان کیا کہ کیسے اس چینی تصویر نے بخارا سے ہرات، ہرات سے تبریز اور آخر میں تبریز سے ہمارے سلطان کے محل کا سفر کیا تھا، راستے میں ایک سے دوسری کتاب میں سفر کرتے، مجلد اور غیر مجلد اور پھر چین سے استنبول تک سفر کے آخر میں دوسری تصویروں کے ساتھ مجلد ہوتے ہوئے۔

ہم نے جنگ اور ہلاکت کی تصویریں دیکھیں، ہر ایک زیادہ وحشت خیز اور پچھلی تصویر سے زیادہ مہارت سے بنائی گئی تھی: شاہ فریدان کے ہمراہ رستم، افراسیاب کی فوج پر حملہ آور ہوتا ہوا رستم اور زرہ میں چھپا ہوا رستم کوئی پراسرار نامعلوم جوان مرد —— ایک دوسری کتاب میں ہم نے کئی پچھلی لاشیں، سرخ لہو میں بھیگے خنجر، معصوم سپاہی جن کی آنکھوں میں موت کی زردی چھائی تھی اور بانس کی طرح ایک دوسرے کو کاٹتے جنگجو دیکھے جب کہ افسانوی افواج جنہیں ہم کوئی نام نہ دے پائے اسی کی سے رزم آرا تھیں۔ استاد عثمان نے —— کون جانتا ہے کتنی ہزارویں بار —— خسرو کو چاندنی میں جھیل میں نہاتی شیریں کو چپکے سے دیکھتے دیکھا، ایک دوسرے کو ایک طویل ہجر کے بعد پا کر بے ہوش ہوتے لیلیٰ مجنوں کو اور ایک زندہ دل تصویر، پھڑپھڑاتے پرندوں، درختوں اور پھولوں سے معمور، سلامان اور ابسال (Salaman & Absal) کی جب وہ پورے جہان سے فرار ہو کر ایک مسرت بھرے جزیرے پر رہنے لگے۔ ایک سچے عظیم فنکار کی طرح، وہ بدتر تصویر کے ایک گوشے میں بھی موجود کسی عجوبے پر میری توجہ دلانے سے خود کو روک نہ پائے، شاید مصور کی طرف سے کسی غلطی کے باعث یا رنگوں کے ساتھ گفتگو کے ساتھ جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی، خسرو اور شیریں اپنی خدمت گاروں کے دل خوش کن گیت سن رہے ہیں، لیکن ذرا دیکھو یہاں کس قسم کا ملول اور کینہ پرور مصور تھا جس نے درخت کی شاخ پر وہ منحوس الو بٹھا دیا ہے؟ مصری عورتوں کے درمیان جنہوں نے نارنجیاں چھیلتے ہوئے یوسف کو دیکھ کر اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں، یہ عورتوں کا سا لباس پہنے خوب صورت لڑکا کس نے شامل کیا ہے؟ کیا وہ منی ایچر فنکار جس نے اسفندیار کو تیر سے اندھا کرنے کی تصویر بنائی کی تھی، پیش بینی کر سکتا تھا کہ خود وہ بھی اندھا کر دیا جائے گا؟

ہم نے معراج پر مصاحب فرشتے دیکھے۔ سیارہ زحل کی علامت سانولا، مجھے یاد ہے وہ اور بھی حقیقی

داڑھی والا بوڑھا اور اپنی ماں اور خادماؤں کی نگران نگاہوں میں صدفی پنگھوڑے میں سکون سے خوابیدہ رستم۔ ہم نے سکندر کی بانہوں میں دارا کو اذیت ناک موت مرتے دیکھا۔ کیسے بہرام گور اپنی روسی شہزادی کے ہمراہ سرخ کمرے میں چلا گیا تھا۔ کیسے سیاوش اس سیاہ گھوڑے پر سوار آگ میں سے گزرا، جس کے نتھنوں میں کوئی انوکھا پن نہ تھا اور خسرو کا المناک جنازہ وہ جسے خود اس کے بیٹے نے قتل کر دیا۔ استاد عثمان تیزی سے کتابوں کو اٹھاتے اور ایک طرف رکھتے ہوئے بعض اوقات کسی فنکار کو پہچان جاتے اور مجھے دکھاتے یا کسی عمارت کے کھنڈر کے الگ تھلگ حصے میں اگنے والے پھولوں کے درمیان عاجزی سے چھپے فنکار کے دستخط دکھاتے یا دیو کے ساتھ موجود سیاہ کونوں میں چھپے دستخط۔ ان دستخط اور سرورق کا موازنہ کرتے ہوئے وہ تعین کر سکتے تھے کہ کس نے کس سے کیا مستعار لیا تھا۔ وہ تصویروں کے سلسلوں کی تلاش میں بعض کتابوں کے اوراق بے تکان پلٹتے۔ طویل خاموشی میں اوراق پلٹنے کی سرسراہٹ کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا۔ کبھی کبھار استاد عثمان بلند آواز میں "آہا!" کہتے لیکن میں پرسکون ہی رہا اور سمجھ نہ پایا کہ انھیں کس چیز نے پرجوش کیا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھے یاد دلاتے کہ وہ پہلے ہی دوسری کتابوں میں کسی خاص تصویر جیسی صفحے کی ترکیب یا درختوں کی ترتیب اور گھڑسوار دیکھ چکے ہیں بالکل مختلف کہانیوں کے مختلف مناظر میں اور وہ ان تصویروں کی نشان دہی میری یادداشت کو دھوکا دیتے ہوئے کرتے۔ انھوں نے امیر تیمور کے بیٹے شاہ رخ کے وقت کی نقاشی کی "خمسہ" کی ایک تصویر کا موازنہ کیا — یا دو سو برس قبل — ایک دوسری تصویر سے جو انھوں نے بتایا کہ تبریز میں ستر اسی سال پہلے ہی بنائی گئی تھی۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے کہ اس حقیقت سے ہم کیا جان سکتے تھے کہ دونوں منی ایچر فنکاروں نے ایک ہی تصویر دوسرے کا کام دیکھے بغیر بنائی تھی۔ انھوں نے اس سوال کا جواب بھی خود ہی دیا: "مصوری کرنا گویا یاد کرنا ہے۔"

قدیم تزئین شدہ کتابیں کھولتے اور بند کرتے ہوئے استاد عثمان اپنا چہرہ غم والم کے عالم میں فن پارے میں ڈبو لیتے (کیوں کہ اب کوئی اس طرح مصوری نہ کر سکتا تھا) اور پھر بڑے طریقے سے بنائی تصویروں کو دیکھ کر خوشی سے پرجوش ہو جاتے (وہ تمام ہمارے منی ایچر فنکار بھائیوں کی!) — اور وہ مجھے دکھاتے کہ مصور نے کیا کچھ یاد رکھا تھا، یعنی پرانی تصویروں کے درخت، زاویے، پتھریاں، چیتے، خیمے، اژدہے اور اداس شہزادے اور اس عمل میں انھوں نے جس جانب اشارہ کیا وہ یہ تھا کہ: ایک وقت تھا جب اللہ نے اس کی تمام انفرادیت کے ساتھ دنیا پر نظر کی تھی اور جو کچھ دیکھا تھا اس کے حسن پر یقین رکھتے ہوئے، ہمیں یعنی اپنے بندوں کو اپنی تخلیق میراث میں دی تھی۔ مصوروں اور فن سے محبت کرنے والوں کا فرض دنیا پر نگاہ کرنا، اللہ کے عظمت وجلال کو یاد کرنا ہے۔ مصوروں کی ہر نسل کے عظیم ترین استادوں نے اپنی زندگیاں صرف کرتے اور نابینا ہونے تک اپنی سعی و کاوشیں جاری رکھیں اور کچھ حاصل کرنے کی جستجو کرتے رہے اور اس حیران کن خواب کو درج کیا جسے دیکھنے کا ہمیں اللہ نے حکم دیا تھا۔ ان کا کام ابتدا سے اپنی سنہری یادوں کو یاد کرتے نسل انسانی سے مشابہ تھا۔ بدقسمتی سے عظیم ترین استاد بھی کسی بوڑھے شخص یا محنت ومشقت کے سبب

گئی تھی۔" استاد عثمان نے کہا، "ہمیں داستان کے ان پرشکوہ شاہان اور ایام کو دوبارہ دیکھنا ہوگا، جب الف منی ایچر فنکاروں کی مصوری کے ساتھ تھا۔ ہمیں اور بہت سی کتابوں کو چاک کرنا ہوتا ہے۔"

میرے دماغ سے یہ خیال گزرا کہ شاید استاد عثمان کا بنیادی مقصد ان کے پنّوں سے بنائے گئے نتھنوں والے گھوڑوں کی تلاش نہیں بلکہ جس قدر ممکن ہو سکے ان شاندار تصاویر کا جائزہ لینا تھا جو برسوں کھوجی نگاہوں سے محفوظ اس خزانے میں خاموشی سے خوابیدہ رہی تھیں۔ میں ان اشاروں کی تلاش میں بے صبر ہو گیا جو مجھے گھر میں میری منتظر شکورے سے ملا دیتے۔ میں یہ سوچ کر بددل ہو گیا کہ عظیم استاد جس قدر زیادہ دیر ممکن ہو سکے خزانے میں رہنا چاہیں گے۔

یوں ہم دوسری الماریوں، دوسرے صندوقوں کو کھولنے لگے جو وہ تے ہمیں دکھاتے تا کہ ان میں موجود تصویروں کا جائزہ لے سکیں۔ آہستہ آہستہ تصویروں سے میرا جی بھر گیا جب ایک جیسی لگتی تھیں اور قلعے کی کھڑکی تلے خسرو کو شیریں سے ملتے دوبارہ بھی نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں استاد سے دور ہٹ گیا تھا — اس گھوڑے کے نتھنوں پر نگاہ بھی ڈالے بغیر جس پر خسرو سوار تھا — اور خود کو آتش دان کے قریب گرم کرنے لگا، یا پھر میں احترام اور مرعوبیت کے عالم میں خزانے سے ملحقہ کمروں میں کپڑے، سونے، ہتھیاروں، زرہ اور مال غنیمت کے درمیان چلتے پھرنے لگا۔ درمیان میں کبھی کبھی استاد عثمان کے ہاتھ کے اشارے یا اچانک پکار پر میں سمجھا کہ کوئی نشان مل گیا تھا یا ہاں، الو جیسی ناک والا گھوڑا آخر کار مل گیا تھا اور بھاگ کر ان کے قریب جاتے ہوئے میں نے ان کو دیکھا جو استاد عثمان اپنے ذرا سے کانپتے ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھے یا سلطان محمد فاتح کے وقت کے اوشاق قالین پر گود میں لیے بیٹھے تھے، صرف ایسی کوئی تصویر دکھانے کو جس طرح کی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی، جس میں عکاسی کی گئی تھی کہ کیسے شیطان عیاری سے نوحؑ کی کشتی پر سوار ہو رہا تھا۔

ہم نے سینکڑوں شاہوں، بادشاہوں، سلاطین اور خوانین کو دیکھا — جنھوں نے امیر تیمور سے سلطان سلیمان عالی شان کے زمانے تک مختلف بادشاہتوں اور سلطنتوں پر حکومت کی تھی — خوشی اور جوش مسرت سے شکار کیے جانے والے غزال، شیروں اور خرگوشوں کو دیکھا۔ ہم نے دیکھا کہ کیسے خود شیطان نے بھی اپنی انگلیاں چبا ڈالیں اور نفرت و خجالت سے دہرا ہو گیا جب ایک بے حیا شخص نے جو اونٹ کی پچھلی ٹانگوں سے بندھے لکڑی کے ٹکڑے پر کھڑا تھا، بدفعلی کی کوشش کی۔ ایک عربی کتاب میں جو بغداد کے راستے سے آئی تھی، ہم نے سمندروں پر محو پرواز ایک تاجر کو دیکھا جو ایک افسانوی خیالی پرندے کے پیروں سے چمٹا ہوا تھا۔ اگلی کتاب میں جس کا پہلا ورق خود ہی کھل گیا، ہم نے وہ منظر دیکھا جو شکورے اور مجھے بے حد پسند تھا، جس میں شیریں درخت کی شاخ سے لٹکی خسرو کی تصویر تھامے ہوئے تھی اور اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ پھر ایک اور تصویر کو دیکھتے ہوئے جس میں چرخیوں اور دھاتی گولوں سے بنے ایک پیچیدہ کلاک کی اندرونی مشین کی تصویر کشی کی گئی تھی، پرندے اور عربی مجسمے ہاتھی کی پشت پر سوار تھے، ہمیں گزرتے وقت کا

احساس ہوا۔

مجھے معلوم نہیں کہ کتاب کے بعد کتاب اور تصویر کے بعد تصویر کا یونہی جائزہ لیتے میں ہم نے اور کتنا وقت گزار دیا۔ یوں تھا جیسے ان تصویروں اور کہانیوں میں، جو ہم نے دیکھیں، غیر مبدل، منجمد ہوئی وقت، اس حبس آلود اور کائی زدہ وقت سے بالکل ملا جلا تھا جس کا تجربہ ہم وہاں خزانے میں کر رہے تھے۔ یوں لگا جیسے وہ مزین شدہ صفحات، لاتعداد شاہوں، خواتین اور سلاطین کے کتاب خانوں میں جمالی کے بے پناہ فروغ سے صدیوں میں بنائے گئے اور اوراق ہم وجود ہو جاتے، ساتھ ساتھ وہ اشیا بھی جو ہمارا محاصرہ کیے ہوئے تھیں: خود، تلواریں، ہیروں جڑے دستے والے خنجر، زرہیں، چین سے آئے برتن، گرد آلود اور نازک بانسریاں اور موتیوں سے سجی مسند اور قالین —— جس طرح کہ ہم نے لاتعداد تصویروں میں دیکھے تھے۔

"مجھے اب سمجھ آئی کہ صد ہا برسوں میں ایک جیسی ہی تصویروں کو چھپ چھپا کر اور بغور دیکھ جانے سے، ہزار ہا فنکاروں نے چالاکی سے اپنے جہان کی ایک دوسرے جہان میں رفتہ رفتہ تبدیلی کی منظر کشی کی تھی۔"

میں یہ اعتراف کرنے والا پہلا شخص ہوں گا کہ مجھے پوری طرح سمجھ نہ آئی تھی کہ استاد عثمان کی اس سے کیا مراد تھی۔ لیکن وہ توجہ جو میرے استاد نے ہمارے ہرات، تبریز سے بغداد اور پھر استنبول تک دو سو برسوں میں بنائی جانے والی ہزاروں تصویروں پر صرف کی تھی، وہ کسی گھوڑے کے نتھنوں کی علامتی کھوج سے بڑھ گئی تھی۔ ہم نے فیضان، قابلیت اور ان استادوں کے صبر و تحمل کے ایک اداس مرثیے میں شرکت کی تھی جنھوں نے ان زمینوں پر برسوں مصوری اور نقاشی کاری کی تھی۔

اس شب جب خزانے کے دروازے شام کو نماز مغرب کے وقت کھولے گئے اور استاد عثمان نے مجھے بتایا کہ ان کی یہاں سے جانے کی کوئی خواہش نہ تھی اور مزید یہ کہ صرف صبح تک یہاں رہ کر تیل کے لیمپوں اور شمعوں کی روشنی میں تصاویر کا جائزہ لینے سے ہی سلطان کے تفویض کردہ فرض کی ادائیگی ہو سکتی تھی۔ میرا پہلا رد عمل جس سے میں نے استاد کو مطلع کیا، یہ تھا کہ میں بوڑھے اور ان کے ساتھ وہیں رہوں گا۔

لیکن جب دروازہ کھولا گیا اور میرے استاد نے منتظر افسروں تک ہماری خواہش پہنچائی اور سربراہ خزانچی کی اجازت چاہی تو مجھے فوراً ہی اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہوا۔ مجھے شکورے اور اپنے گھر کو دیکھنے کی چاہ ہوئی۔ جب میں نے یہ خیال کیا کہ کیسے وہ بچوں کے ساتھ تنہا رات گزارے گی اور اب مرمت شدہ کھڑکیوں کے پٹ کیسے بند کرے گی تو میں بے چین ہوتا چلا گیا۔

خزانے کے ادھ کھلے پھاٹک سے میں اندرون کے صحن میں صنوبر کے بڑے بڑے درختوں میں باہر کی زندگی کے شکوہ اور جلال کی جانب مائل تھا —— اب دھندلی تھی —— اور وہ شاہی خدمت گاروں کے تاثرات پر جو ایک دوسرے سے اشاروں کی زبان میں بات کر رہے تھے تاکہ ہمارے سلطان کے سکون میں مخل نہ ہوں۔ لیکن میں خجالت اور احساس جرم سے منجمد وہیں کھڑا رہا۔

ہم، دو درویش

تحقیق، سمرقند اور ہرات سے آنے والے اوراق پر مشتمل ایک کتاب اس خزانے کے دور افتادہ گوشے میں رکھی تھی جسے ہمارے سلطان عالی مقام کے آباؤ اجداد نے سینکڑوں برسوں میں مال غنیمت سے بھرا تھا۔ ان اوراق میں ہماری تصویر کے شامل ہونے کی افواہ، جو غالباً منی ایچر فنکاروں میں تقسیم کے لیے پھیلائی گئی تھی، ضرور بونے جری نے اڑائی تھی۔ اگر ہم اب اپنی کہانی اپنے انداز میں بیان کر سکیں تو ——— خدا کی رضا ہمارے شامل حال ہو ——— ہمیں امید ہے کہ اعلیٰ کافی خانے میں ہجوم میں سے کوئی بھی اس پر مشتعل نہ ہوگا۔

ہماری موت کو ۱۱۰ برس گزر چکے ہیں، اور ہماری غیر معقول ایرانی حماقتیں، درویش خانقاہ کو بند ہوئے ۱۱۰ برس، وہ الحاد اور بدعت کے گڑھ اور شیطانیت اور بد معاشی کے اڈے نے۔ لیکن خود دیکھ لیں، ہم یہاں ہیں آپ کے سامنے۔ یہ کیسے ہو سکا؟ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کیسے: ہماری تصویر کشی وحشی کے انداز میں کی گئی ہے؛ جیسا کہ یہ تصویر اشارہ کرتی ہے، ایک روز ہم دونوں درویش، سلطان کے قلمرو علاقوں میں ایک سے دوسرے شہر آوارہ گردی کر رہے تھے۔

ہم برہنہ پیر تھے، ہمارے سر گنجے تھے اور ہم نیم برہنہ تھے، ہم میں سے ہر ایک بنیان اور ہرن کی کھال پہنے ہوئے تھا، ہماری کمر کے گرد بیلٹ تھی اور ہم اپنی چھڑیاں تھامے ہوئے تھے، ہمارے کشکول ہماری گردنوں سے ایک زنجیر کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے، ہم میں سے ایک لکڑیاں کاٹنے کی کلہاڑی پکڑے ہوئے تھا اور دوسرا چمچ، جو کچھ بھی خدا ہمیں عطا کرتا، اسے کھانے کے لیے۔

اس لمحے ایک ندی کنارے کارواں سرائے کے سامنے ایستادہ، میرے پیارے دوست، نہیں، بلکہ میرے محبوب، نہیں، بلکہ میرے بھائی اور میں نے معمول کا مباحثہ کیا: "تم پہلے برائے مہربانی، نہیں پہلے تم۔" ہم شور مچا کر ایک دوسرے سے بحث کر رہے تھے کہ کون پہلے چمچ لے کر کھانا شروع کرے گا، جب ایک فرنگی سیاح، ایک عجیب آدمی نے ہمیں روکا، دونوں کو چاندی کا وینسی سکہ دیا اور ہماری تصویر بنانے لگا۔ وہ یقیناً فرنگی تھا، وہ پر اسرار سا تھا۔ اس نے ہمیں ورق کے عین درمیان میں بنایا، یوں جیسے ہم

غنیمت سمجھا تو ہم دونوں اس طور استنبول اور شاہی خزانے میں واپس آ گئے۔ یہاں سے، بار بار نقل کے بعد، ہم نے ایک سے دوسری خطیہ کتاب میں سفر کیا اور آخرکار اس پرمسرت کافی خانے میں آن پہنچے جہاں آبِ حیات سے نئی روح پھونکنے اور شباب حاصل کرنے کی طرح، کافی کا دور چلتا ہے۔ اب پھر:

مصوری، موت اور دنیا میں ہمارے مقام سے متعلق ایک مختصر مقالہ

قونیہ کے خوجا آفندی نے جس کا ہم نے ابھی تذکرہ کیا ہے، اپنے ان خطبوں میں سے ایک میں کہیں یہ دعویٰ کیا ہے، جو ایک ضخیم جلد میں لکھے اور جمع کیے گئے ہیں: قلندری درویش دنیا کا غیر ضروری میل کچیل ہیں کیوں کہ ان کا تعلق ان چار درجوں میں سے کسی ایک سے بھی نہیں جن میں آدمیوں کو تقسیم کیا گیا: 1۔معززین 2۔تاجر 3۔کسان اور 4۔فنکار، یوں وہ فالتو اور غیر ضروری ہیں۔

مزید برآں، انھوں نے یہ بھی کہا: ''یہ دونوں ہمیشہ کسی جوڑے کی طرح آوارہ گردی کرتے پھرتے ہیں اور ہمیشہ بحث کرتے نظر آتے ہیں کہ دونوں میں سے کون اس واحد تیغ کے ساتھ پہلے کھائے گا اور وہ جو نہیں جانتے کہ یہ ان کے اصلی فطری کی طرف ایک عیارانہ اشارہ ہے ـــــ کون دوسرے سے پہلے لواطت کرے گا ـــــ اسے دلیپ جان کر بیٹھے ہیں۔'' عالی مقام، انہیں علامت سمجھیں خوجا نے ہمارے راز سے پردہ اٹھایا ہے کیوں کہ ہمارے ساتھ ساتھ خود، حسین تو عزیز کے شاگرد اور مئی ایچر فنکار، وہ سب اسی راستے کے راہی ہیں۔

اصل راز

تاہم، اصل راز یہ ہے: جب فرنگی کافر ہماری تصویر بنا رہا تھا، اس نے ہمیں اتنے پیارے انداز میں دیکھا اور اس قدر توجہ سے ہر تفصیل پر نگاہ کی کہ ہم اسے پسند کرنے لگے اور اس کی تصویر کشی سے حظ اٹھانے لگے۔ لیکن وہ دنیا کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کا گناہ کر رہا تھا اور جو کچھ رہا تھا اس کی تصویر کشی کا جرم۔ اس طرح اس نے ہماری تصویریں یوں بنائی جیسے ہم اندھے تھے اگرچہ ہم بالکل دیکھ سکتے تھے، لیکن ہم نے برا نہ مانا۔ اب ہم بلاشبہ خاصے مطمئن تھے۔ خوجا کے مطابق، ہم جہنم میں تھے، کچھ کافروں کے نزدیک ہم گلی سڑی لاشوں کے سوا کچھ نہ تھے اور آپ کے مطابق، مئی ایچر فنکاروں کا وہ ذہین گروہ جو یہاں جمع ہے، ہم ایک تصویر ہیں اور کیوں کہ ہم ایک تصویر ہیں، ہم یہاں آپ کے سامنے اس طرح کھڑے ہیں جیسے ہم زندہ اور ٹھیک ٹھاک ہیں۔ محترم خوجا آفندی سے ہمارے سامنے کے بعد اور تین راتوں میں قونیہ سے سیوا اس پہنچنے پر آٹھ دیہات سے ہوتے ہوئے، راستے بھر بھیک مانگتے۔ ایک رات ہمیں ایسی سردی اور برف نے گھیرا کہ ہم دونوں درویش ایک دوسرے کو سختی سے گلے لگائے سو گئے اور ٹھٹھر کر مر ہی گئے۔ مرنے سے ذرا دیر پہلے میں نے خواب دیکھا: میں اس تصویر کا موضوع تھا جو ہزار ہا برسوں کے بعد جنت میں داخل ہوئی۔

یہ میں ہوں، استاد عثمان

بخارا میں لوگ ایک کہانی سنایا کرتے ہیں جس کا تعلق عبداللہ خان کے زمانے سے ہے۔ یہ ازبک خان ایک ضدی حکمران تھا اور اگرچہ وہ اس پر معترض نہ تھا کہ ایک سے زیادہ مصور مل کر تصویر بنائیں لیکن اس بات کے خلاف تھا کہ مصور ایک دوسرے کی نقل کریں ۔۔۔ کیوں کہ اس صورت میں یہ بے حد ناممکن ہو جاتا تھا کہ دھاندلی سے ایک دوسرے کی نقل کرنے والے فنکاروں میں غلطی کا الزام کسے دیا جائے۔ زیادہ اہم طور پر، ایک وقت کے بعد انہیں خدا کا تصور پیش کرنے کو تاریکی میں دیکھنے کی بجائے چوری کرنے والے منی ایچر فنکار اپنے قریب بیٹھے فنکار پر نگاہ ڈالا کرتے تھے اور ڈھٹائی سے جو چاہتے نقل کر لیتے۔ اسی وجہ سے ازبک خان نے بے حد خوشی سے دو عظیم استادوں کا خیر مقدم کیا؛ ایک جنوب میں شیراز سے اور مشرق سے سمرقند سے، جو جنگ اور ظالم شاہوں سے فرار ہو کر اس کے دربار میں پہنچ آئے تھے۔ تاہم اس نے ان دونوں معروف فنکاروں کو ایک دوسرے کا کام دیکھنے سے منع کر دیا اور انہیں محل کے جس قدر ممکن ہو سکا ایک دوسرے سے دور کمرے یا کارگاہ دے کر الگ کر دیا۔ اس طرح ٹھیک 37 سال اور چار مہینے یوں پیچھے کی داستان کو سنتے ہوئے ان دونوں عظیم استادوں نے عبداللہ خان کو دوسرے کے اس شاندار کام کو بیان کرتے سنا جو خود انہوں نے کبھی نہ دیکھا تھا کہ کیسے وہ دوسروں سے مختلف یا عجیب طور پر یکساں تھا۔ اسی دوران وہ دونوں ایک دوسرے کی مصوری سے متعلق تجسس کا شکار رہے۔ ازبک خان کی زندگی کا کچھوے جیسا طویل سفر مکمل کر لینے کے بعد، دونوں فنکار ایک دوسرے کی مصوری دیکھنے ایک دوسرے کے کمروں کی طرف بھاگے۔ بعد میں ساتھ ساتھ بیٹھے، اپنی گود میں ایک دوسرے کی تصویریں لیے اور ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے جو وہ عبداللہ خان کی سنائی داستانوں سے پہچانتے تھے، دونوں منی ایچر فنکاروں کو مایوسی نے آن گھیرا کیوں کہ تصویریں اس قدر شاندار نہیں تھیں جتنی کہ انہیں ان کہانیوں سے توقع تھی جو انہیں سنائی گئی تھیں۔ اس کی بجائے وہ ان تصویروں جیسی ہی تھیں جو انہوں نے حالیہ برسوں میں دیکھی تھیں بلکہ زیادہ معمولی، مدھم، بے رونق اور دھندلی۔ دونوں استادوں کو تب ادراک نہ ہوا کہ اس دھندلے پن کی وجہ وہ اندھاپن تھا جو ان پر طاری ہونے لگا تھا نہ ہی ان دونوں کو مکمل طور پر نابینا ہو جانے کے بعد اس کا ادراک

ہوا۔ اس کی بجائے انھوں نے اس حصے کے ہیرو کو خان کے ہاتھوں بے وقوف بنانے سے منسوب کیا اور یوں وہ یہ یقین کرتے مر گئے کہ خواب تصویروں سے زیادہ خوب صورت تھے۔

خزانے کے سرد کمرے میں بھیگی ہوئی رات میں جب میں نے سرد انگلیوں کے ساتھ اوراق پلٹے اور کتاب میں موجود ان تصویروں کو دیکھا جن کے خواب میں چالیس برسوں سے دیکھتا آیا تھا، میں جانتا تھا کہ میں ہرات کی سنگ والا کہانی کے فنکاروں کی نسبت خوش تھا۔ بوڑھے ہونے اور اگلے جہان جانے سے قبل مجھے یہ جان کر ایسا اطمینان محسوس ہوا کہ میں وہ کتابیں تھامے ہوئے تھا جن کی داستانیں میں پوری زندگی سنتا آیا تھا اور کبھی کبھی میں بڑبڑاتا، "شکر ہے خدایا شکر ہے۔" جب میں صفحے پلٹتے ہوئے اسے اس کی حقیقی داستان سے زیادہ حیرت انگیز پاتا تھا۔

مثال کے طور پر، اپنی بڑی فتح شاہ اسماعیل نے دریا عبور کیا تھا اور تیمور کے نسل پر ہرات اور پورے خراسان کو ازبکوں سے دوبارہ فتح کیا تھا، جس کے بعد اس نے اپنے بھائی سام مرزا کو ہرات کا گورنر مقرر کیا۔ اس موقع پر جشن منانے کے لیے اس کے بھائی نے "میلان النجوم" نامی کتاب کی ایک تزئین شدہ جلد ایک تحفہ دی، جس میں امیر خسرو دہلوی کے محل کی کہانی کا بیان تھا۔ روایت کے مطابق، اس کتاب میں ایک تصویر میں دریا کنارے دو حکمرانوں کی ملاقات کی منظر کشی کی گئی تھی جہاں انھوں نے اپنی فتح کا جشن منایا۔ ان کے چہرے دہلی کے سلطان کیقباد اور اس کے باپ بنگال کے حکمران بغرا خان سے مماثل تھے لیکن وہ کتاب کی تخلیق کے ذمے دار شاہ اسماعیل اور اس کے بھائی سام مرزا کے چہروں سے بھی مشابہت رکھتے تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جس کسی کی بھی کہانی کے سورما میرے سامنے آتے، اس صفحے کو دیکھتے ہوئے وہی سلطان کے خیمے میں ظاہر ہو جاتے اور میں نے اس معجزاتی ورق کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔

اس داستانوی عہد کے عظیم استادوں میں سے ایک شیخ محمد کی ایک تصویر میں، ایک غریب محکوم شخص، جس کی محرومیت اور محبت داستانوں میں محبت کے درجے کو پہنچ چکے تھے، سلطان کو چوگان کھیلتے دیکھ کر بے انتہا امید میں تھا کہ گیند لڑھک کر اس کی جانب آ جائے تاکہ وہ اسے پکڑ کر اپنے حاکم کو پیش کر سکے۔ بالآخر دیر تک صبر سے انتظار کے بعد، گیند واقعی اس کے قریب آئی اور اس کے گیند سلطان کو پیش کرنے کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ جیسا کہ مجھے ہزاروں طرح بیان کیا گیا ہے، محبت، محرومیت اور اطاعت گزاری جو کوئی غریب محکوم عام طور پر اپنے عظیم خان یا کسی اعلیٰ وزیر شہنشاہ کے لیے، یا جو کوئی نوعمر شاگرد اپنے استاد کے لیے محسوس کرتا ہے، اس کی یہاں اس قدر باریکی اور گہری فکر سے تصویر کشی کی گئی تھی، محکوم شخص کے انگلیوں کے پوروں سے گیند تھامنے سے لے کر اس میں اپنے حاکم کا چہرہ دیکھنے کی جرأت کی کی۔ اس صفحے کو دیکھتے ہوئے میں جانتا تھا کہ اس دنیا میں ایک عظیم استاد کا شاگرد ہونے سے بڑی خوشی کوئی نہ تھی اور یہ کہ غلامی کی صدیوں کو بھگتی تاج داری ایک نوعمر، خوب صورت اور ذہین شاگرد کا استاد ہونے کی خوشی سے کم نہ تھی — اور مجھے اس سچائی سے لاعلم رہنے والوں کے لیے رنج محسوس ہوا۔

میں نے جلدی جلدی دیکھتے ورق پلٹائے لیکن ہزاروں پرندوں، گھوڑوں، سپاہیوں، محبت کرنے والوں، ہاتھیوں، درختوں اور بادلوں پر بھرپور توجہ دیتے ہوئے جب کہ خزانے کے خوش باش پستہ قد بونے کو پرانے زمانے کے شاہوں کی طرح اپنی دولت و امارت کی نمائش کا موقع مل گیا تھا اور وہ بڑے بے ترتیبی سے صندوقوں سے جلدوں کی جلدیں نکال کر لا لا اور میرے سامنے رکھ رہا تھا۔ حیرت انگیز مجلد ضخیم کتابوں، عام کتابوں اور بے ترتیب جلدوں سے بھرے ایک آہنی صندوق کے دو مختلف خانوں سے دو غیر معمولی کتابیں برآمد ہوگئیں —— ایک ارغوانی جلد والی شیراز کے سے انداز میں مجلد کتاب اور دوسری ہرات میں جلد کی گئی اور مخصوص طرز پر گہرے روغن والی —— جس کے صفحات ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ تھے کہ پہلے میں نے سوچا کہ وہ ایک دوسرے کی نقول تھے۔ جب میں یہ تعین کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ کون سی کتاب اصلی تھی اور کون سی نقل، میں نے سرورق پر خطاطوں کے ناموں کا تجزیہ کیا، خفیہ دستخطوں کی تلاش کی اور آخرکار مجھے ایک کپکپاہٹ کے ساتھ یہ ادراک ہوا کہ نگاہی کی یہ دو جلدیں وہ داستانوی کتابیں تھیں جنھیں تبریز کے استاد شیخ علی نے تیار کیا تھا، ایک قرہ قویونلو کے خان جہاں شاہ کے لیے اور دوسری آق قویونلو کے خان اوزون حسن کے لیے۔ جب قرہ قویونلو کے شاہ نے پہلی جلد کی نقل تیار کرنے سے روکنے کے لیے اندھا کروایا تو عظیم استاد نے آق قویونلو خان کے پاس پناہ لی اور اپنی یادداشت کی بنا پر بہتر اور عمدہ نقل تیار کی۔ داستانوی کتابوں میں سے دوسری میں تصاویر دیکھنے کے بعد جو اس نے نابینا ہونے کے بعد تیار کی تھیں، وہ تصویریں سادہ تر اور خالص تر تھیں جب کہ رنگ زیادہ زندہ دل اور توانائی بخش تھے جنھوں نے مجھے یاد دلایا کہ نابینا کی یادداشت زندگی کی بے رحمی کا اظہار کرتی ہے لیکن اس کی قوت اور جوش کو دو گنا کر دیتی ہے۔

چوں کہ خود میں ایک اصلی عظیم فنکار ہوں، سو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے جو سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے، میں جانتا تھا کہ ایک روز میں نابینا ہو جاؤں گا۔ لیکن ابھی کیا میں یہی چاہتا تھا؟ چوں کہ پر شور خزانے کی بھرپور اور دہشت خیز تاریکی میں "اس" کی موجودگی قریب ہی محسوس کی جا سکتی تھی، کسی سزا یافتہ شخص کی طرح جو سر قلم کیے جانے سے قبل ایک آخری مرتبہ دنیا کو دیکھنا چاہتا ہو، میں نے "اس" سے پوچھا: "مجھے یہ سب تصویریں دیکھنے کی اجازت دیجیے اور میرا جی بھرنے دیجیے۔"

خدا کی ذات: عقل و فہم اور صحت کی قوت کے تحت میں نے اوراق پلٹے تو بہت بار میرا سامنا نابینا پن کی داستانوں اور معاملات سے ہوا۔ ایک مشہور منظر جس میں چنار کے درخت کی شاخ سے لٹکی خسرو کی تصویر دیکھ کر شیریں اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے، شیراز کے شیخ علی رضا نے درخت کے ایک ایک پتے کی یوں مصوری کی تھی کہ انھوں نے سارے آسمان کو بھر دیا تھا۔ ایک بے وقوف کے جواب میں جس نے اس تصویر کو دیکھ کر تبصرہ کیا تھا کہ اس کا اصل موضوع چنار کا درخت نہیں تھا، شیخ علی نے جواب دیا کہ اصل موضوع حسین و جمیل دوشیزہ کا عشق بھی نہ تھا۔ یہ فنکار کا عشق تھا اور اپنے اس کہے کے ثبوت میں انھوں نے حوالہ

کے دانے پر تمام پتوں کے ساتھ چنار کے اسی درخت کی تصویر کشی کی۔ اگر شیریں کی پیاری خاتون خدمت گار کے حسین پیروں تلے بچھے دستکاری نے میری غلط رہنمائی نہ کی ہوتی، تو میں یقیناً نابینا استاد کا کاغذ پر بنایا شاندار درخت ہی دیکھ رہا تھا — چاول کے دانے پر بنا درخت نہیں جسے ادھورا چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ کام شروع کرنے کے سات برسوں اور تین مہینوں کے بعد نابینا ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے صفحے پر ایک نوک دار تیر سے رستم کے سکندر کو ادھا کرنے کی ہندوستان کی انداز سے واقف فنکاروں کی طرح عکاسی کی گئی تھی، اس قدر زندہ دلی اور رنگارنگی سے کہ دیکھنے والے کو حقیقی معنی میں ایک فنکار کا نابینا پن، سدا بہار غم و اندوہ اور قصے قصہ و آرزو و حسرت بھرے جشن کا ابتدائیہ لگتے تھے۔

میری نگاہیں ان تصاویر اور کتابوں پر پھسلتی رہیں، کسی ایسے شخص کے جوش و خروش سے جو خود کو یہ داستان بھی سنانا چاہتا تھا جو اس نے برسوں سہی تھیں، اس بوڑھے شخص کی پریشانی کی طرح نہیں جسے احساس تھا کہ وہ جلد ہی کچھ بھی نہ دیکھ پائے گا۔ خزانے کے اس سرد کمرے میں جس پر گہرا سرخ رنگ چھایا ہوا تھا جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا — شمعوں کی روشنی میں کپڑے اور گرد کے رنگ کے باعث — داد و تحسین میں کبھی میری آنکھیں نم ہو جاتی تھیں جس پر قرہ دو زانو ہو کر میرے قریب آتے اور میرے کندھے سے جھانک کر میرے سامنے رکھا شاندار ورق دیکھتے۔ خود [illegible] پانے میں ناکام ہو کر میں انہیں بتانے لگتا:

"یہ سرخ رنگ تبریز کے عظیم استاد مرزا بابا امامی سے تعلق رکھتا ہے، جس کا راز وہ اپنے ساتھ قبر میں لے گیا۔ انھوں نے یہ قالینوں کے کونوں پر استعمال کیا تھا، ایرانی شاہ کی دستار پر علوی اطاعت و وفاداری کا سرخ رنگ اور دیکھو یہاں اس صفحے پر شیر کے پیٹ پر اور اس خوب صورت لڑکے کا قفتان پر۔ اللہ نے کبھی براہ راست طور پر اپنا یہ سرخ رنگ آشکار نہیں کیا، ماسوائے تب کہ جب اس نے اپنے بندوں کا خون بہنے دیا۔ تاکہ ہم اس قسم کے سرخ رنگ کی افسردگی سے تلاش کریں جو انسانی آنکھ صرف انسان کے بنائے کپڑے پر دیکھ سکتی ہے اور عظیم ترین فنکاروں کی تصویروں میں، تاہم خدا نے اپنا راز پتھروں تلے رہتے ناپاک ترین حشرات الارض کے سپرد کر دیا۔" میں نے مزید کہا، "اس کا شکر کہ اس نے اب یہ ہم پر آشکار کر دیا۔"

"ذرا یہ دیکھو۔" میں نے کافی دیر بعد ایک بار پھر انہیں ایک شہ پارہ دکھانے سے گریز کے قائل ہوتے ہوئے کہا — یہ غزلوں کے کسی ایسے مجموعے سے متعلق تھا جس میں محبت، دوستی، بہار اور خوشی کا بیان تھا۔ ہم نے درختوں پر بہار کے شوخ رنگوں کا جوبن آتے دیکھا، جنت نظیر باغ کے سرو و صنوبر اور اس باغ میں تکیہ لگائے بیٹھے مے نوشی کرتے اور شاعری پڑھتے ہوئے محبوبوں کی سرخوشی، یوں تھا جیسے اس کافی ٹھنڈے گرد آلود سرد خزانے کے کمرے میں ہم بہار کے ان غنچوں کی مہک محسوس کر سکتے تھے اور ان نشاط پرستوں کے نازک بدن کی خوشبو۔ "دیکھو کہ اس فنکار نے جس نے ان محبوبوں کی کلائیاں بنائی تھیں، ان کے بے خودی، ان کا حسین انداز اور ان کے اردگرد اس قدر محبت سے پھڑپھڑاتے پرندوں کی خوشی، پس منظر میں

در پے میری نابینا پن حاصل لینے کی لگن اور وہ سب کرب و اذیت جو میں نے برداشت کیے اور دوسروں کو کروائے۔ یوں جیسے کسی معجزے کے تحت پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے میں دیر تک اس کی تصویر کو شوق و مسرت سے تکتا رہا۔ خاموشی در پے ہو چکی تھی اور میں ابھی تک دیکھ ہی رہا تھا۔ ایک آنسو میری آنکھ سے پھسل کر میرے رخسار سے ہوتا ہوا داڑھی میں گم ہو گیا۔

جب میں نے غور کیا کہ ایک شمع آہستگی سے پورے خزانے میں تیرتی میرے قریب آ رہی تھی، میں نے الم دور کر دیا اور یونہی ان کتابوں میں سے ایک کھولی جو بوڑھے نے میرے قریب ابھی ابھی رکھی تھیں۔ وہ شاہوں کے لیے تیار کی جانے والی خاص کتاب تھی۔ میں نے ایک سرسبز چشمے کے کنارے ایک دوسرے پر فریفتہ ہرن دیکھے، جنہیں پر عداوت رشک و حسد سے پیار یا گیدڑ دیکھ رہے تھے۔ میں نے صفحہ پلٹایا: اخروٹ اور گھوڑے جو صرف ہرات کے پرانے فنکاروں کا کام ہو سکتا تھا ـــــ وہ کس قدر شان دار تھے! میں نے صفحہ پلٹایا: حسرت ناک پرانی تصویر سے اچانک میرے انداز میں بیٹھے ہر کوئی ناکام نے میرا خیر مقدم کیا! میں چہرے سے قصہ پہچان کر یہ پایا کہ وہ کون تھا کیوں کہ وہ کسی کی بھی طرح دکھائی دے رہا تھا؛ میں نے ایسا خیال کیا، تاہم تصویر کی فضا، پیچھے کی مختلف رنگوں میں رنگی دیواریں کسی چیز کی یاد دلاتی تھی۔ مجھے یہ ایک عالی شان ہاتھ کی تصویر پہچان کر میرا دل تیز دھڑکنے لگا۔ میرا دل میرے ادراک سے پہلے ہی جانتا تھا صرف وہی ایسا شان دار ہاتھ بنا سکتا تھا: یہ بہزاد کا کام تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے تصویر سے پھوٹتی روشنی میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

میں چند ایک مرتبہ پہلے عظیم فنکار بہزاد کی بنائی تصویریں دیکھ چکا تھا، شاید اس لیے کہ میں نے وہ اکیلے میں نہیں بلکہ سابق استادوں کے ساتھ برسوں قبل دیکھی تھیں، شاید اس لیے کہ میں تھیں، نہ تھا کہ وہ عظیم بہزاد کا کام تھا، میں اس طرح حیرت زدہ ہوا تھا جس طرح کہ اب۔

خزانے کے کمرے کی بوجھل کالی دوپہر کی روشنی ہوتی گئی تھی۔ یہ خوب صورتی سے بنایا گیا ہاتھ میرے دماغ میں اس دبلی پتلی شان دار کلائی کے ساتھ ضم ہوا جس پر محبت کی علامت بنی تھی، جو میں نے ابھی ابھی دیکھی تھی۔ دوبارہ میں نے خدا کی حمد و ثنا کی کہ اس نے میرے اندھا ہونے سے پہلے مجھے ایسا کامل وہ حسن دکھایا۔ میں کیسے جانتا ہوں کہ میں جلد ہی نابینا ہو جاؤں گا؟ میں نہیں جانتا! مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے اس وجدان میں قرہ کو شریک کر سکتا تھا جو ایک شمع تھامے میرے پہلو میں آ کھڑا ہوا تھا اور صفحے کو دیکھ رہا تھا، لیکن میری زبان سے کچھ اور نکلا۔

"ہاتھ کی یہ شان دار تصویر کشی دیکھو۔" میں نے کہا، "یہ بہزاد کا کام ہے۔"

میرے ہاتھ نے اپنی مرضی سے بہزاد کا ہاتھ تھام لیا، یوں جیسے وہ ان نرم، گلابی جلد والے خوب صورت لڑکوں کا ہاتھ تھا جن میں سے ہر کسی سے مجھے اپنی نوعمری میں محبت رہی تھی۔ اس کا ہاتھ ہموار اور مضبوط تھا، میرے ہاتھ سے زیادہ گرم، نازک اور چوڑا اور میں اس کی کلائی دیکھ کر ہیجان میں آ گیا۔ جب

میں نوجوان تھا تو میں ہر شاگرد بچے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا اور اسے یہ بتانے سے پہلے کہ جز بندی کیسے کرتے ہیں، میں محبت وشفقت سے اس کی پیاری خوف زدہ آنکھوں میں جھانکتا۔ اسی طرح میں نے قرہ کو دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کی چمکوں میں شمع کا شعلہ منعکس ہوتے دیکھا۔ "ہم سب کی اچھی زندگی بیت چکی ہے۔" میں نے کہا: "لیکن اب ہر چیز انجام کو پہنچ رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

میں نے ایسے عظیم فنکار کی طرح "ہر شے انجام کو پہنچ رہی ہے" کہا، جو دیانت دار ہونے کی خواہش رکھتا ہو، جس نے اپنی زندگی کے برس کسی آقا یا شہزادے کے لیے وقف کر دیے ہوں، اپنے کتاب خانے میں قدیم لوگوں کے انداز میں شہ پارے تیار کیے ہوں، جسے یہ محکم یقین ہو کہ اس کے کتاب خانے کا اپنا ایک انداز تھا، ایک عظیم استاد جو جانتا ہے کہ جب بھی اس کا سرپرست آقا اپنی آخری جنگ ہارے گا، اور مار کرتے دشمن کی صورت نئے آقا آ جائیں گے، کتاب خانے کو موقوف یا منتشر کریں گے، کتابوں کو پھاڑ کر صفحوں کو بے ترتیب کر دیں گے اور جو بچ رہے گا اس کی تحقیر کریں گے، اسے برباد کر دیں گے، بشمول ان تفصیلات کے جن پر اسے مجھ سے یقین تھا، جو خود اس کی دریافت تھے اور جن سے اسے اپنی اولاد کی طرح محبت تھی، لیکن مجھے اس کی قرہ سے مختلف طرح وضاحت کرنے کی ضرورت تھی۔

"یہ تصویر عظیم شاعر عبداللہ ہاتفی کی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہاتفی اتنا عظیم شاعر تھا کہ جب ہرات پر شاہ اسماعیل کے قبضے کے بعد ہر کوئی دوڑ کر اس کے پاس گیا اور اس کی خوشامد کی تو وہ اپنے گھر ہی رہا۔ جواب میں شاہ اسماعیل خود چل کر اس کے گھر اس سے ملنے گیا جو شہر کے مضافات میں تھا۔ بہزاد کی ہاتفی کے چہرے کی تصویر کشی سے نہیں بلکہ تصویر کے نیچے لکھی تحریر سے ہم جانتے ہیں کہ یہ ہاتفی ہے۔ ہے نا؟"

قرہ نے اپنی خوب صورت آنکھوں سے "ہاں" کا اشارہ کرتے مجھے دیکھا۔

"جب ہم نے تصویر میں شاعر کے چہرے کو دیکھا۔" میں نے کہا۔ "ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کسی بھی دوسرے چہرے جیسا چہرہ تھا۔ اگر عبداللہ ہاتفی یہاں ہوتا، خدا اسے جنت نصیب کرے، ہم اس تصویر میں چہرہ دیکھ کر اسے کبھی نہ پہچان پاتے۔ تاہم اس تصویر کی کلیت پر انحصار کرتے ہوئے ہم ایسا کر سکتے تھے۔" ترکیب کے انداز، ہاتفی کے انداز، رنگوں میں، طلاکاری اور استاد بہزاد کی مبہوت کن تصویر کشی میں کچھ ایسا ہے جو یک دم اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ یہ کسی شاعر کی تصویر ہے۔ ہمارے فن کی دنیا میں معانی، انداز پر مقدم ہیں۔ جب ہم فرنگی اور وینسی فنکاروں کی نقل تیار کرنے لگتے ہیں، جیسا کہ اس کتاب میں ہمارے سلطان نے جس کا کام تمہارے انشتے کو سونپا تھا، معانی کی اقلیم ختم ہوتی ہے اور طرز کی عملداری شروع ہوتی ہے۔ تاہم وینسی طریقوں میں ـــــ"

"میرے انشتے، خدا انہیں جنت نصیب کرے، قتل کر دیے گئے۔" قرہ نے روکھے پن سے کہا۔

میں نے قرہ کا ہاتھ سہلایا، جو میرے ہاتھ میں تھا، یوں جیسے کسی نو عمر شاگرد کا چھوٹا سا ہاتھ سہلاتے ہوئے جو کسی روز ضرور کوئی شہ کار تخلیق کرے گا۔ خاموشی اور احترام سے ہم استاد بہزاد کے اس شہ پارے کو کچھ دیر دیکھتے رہے۔ بعد میں قرہ نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

"ہم پچھلے صفحے کے سرخی مائل بھورے گھوڑوں کی ناکوں کا جائزہ لیے بغیر تیزی سے اس صفحے سے گزر گئے۔" اس نے کہا۔

"ان میں کچھ نہیں ہے۔" میں نے کہا اور میں نے دوبارہ وہ پچھلا صفحہ پلٹا تا کہ وہ خود دیکھ لے: گھوڑوں کے نتھنوں سے متعلق کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

"ہمیں وہ مخصوص ناک والے گھوڑے کب ملیں گے؟" قرہ نے کسی بچے کی طرح پوچھا۔ لیکن شب کی اس گھڑی جب صبح ہونے کو تھی: جب ہمیں شاہ طہماسپ کی داستانوی "شاہنامہ" سبز آبی ریشم کے ڈھیر تلے ایک آہنی صندوق میں ملی اور ہم نے باہر نکالی، قرہ سرخ اوشاک قالین پر بے خبر سو چکا تھا، اس کا سر موتیوں سے جڑے مخملیں تکیے پر دھرا تھا۔ اسی دوران جیسے ہی میں نے برسوں بعد اس داستانوی ضخیم مجلد کتاب پر نظریں دوڑائیں، مجھے فوراً سمجھ آ گئی کہ میرے لیے ابھی دن آغاز ہی ہوا تھا۔

وہ داستانوی کتاب جو میں نے تقریباً 25 برسوں بعد دیکھی تھی، اس قدر بڑی اور ضخیم تھی کہ جزری آغا اور مجھے اسے اٹھانے میں بھی دشواری ہوئی۔ جب میں نے اس کی جلد کو چھوا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ چمڑے کے اندر لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ 25 برس پہلے سلطان سلیمان عالی شان کی وفات پر شاہ طہماسپ اس سلطان سے آخر چھٹکارا پانے پر اس قدر مسرور تھا جس نے دو مرتبہ تبریز کو فتح کیا تھا کہ اس نے سلطان کے جانشین سلطان سلیم کو تحائف سے بھرے اونٹ بھیجے، جن میں قرآن کریم کا ایک شان دار نسخہ اور اپنے خزانے کی سب سے خوب صورت ترین یہ کتاب بھی شامل تھے۔ پہلے تین سو تعداد کا ایرانی سفارتی وفد اس ضخیم کتاب کو ادرنے لایا جہاں نیا سلطان سرما کے شکار کے لیے مقیم تھا۔ اونٹوں اور خچروں پر لدے دوسرے تحائف کے ہمراہ جب یہ کتاب استنبول پہنچی تو اس کو خزانے میں منتقل کیے جانے سے قبل سربراہ مصور قرہ میمی اور ہم تین نوجوان فنکار اسے دیکھنے گئے۔ بالکل استنبول کے ان باسیوں کی طرح جو ہندوستان سے آئے ہاتھی اور افریقہ سے آئے زرافے کو دیکھنے بھاگے گئے تھے، ہم محل کی طرف دوڑے جہاں مجھے استاد قرہ میمی سے معلوم ہوا کہ عظیم استاد بہزاد، جو ضعیفی میں ہرات چھوڑ کر تبریز آ گئے تھے، انہوں نے اس کتاب کے لیے کام نہیں کیا تھا کیوں کہ تب وہ نابینا ہو چکے تھے۔

ہم جیسے حقانی سی اینچ فنکاروں کے لیے جو سات آٹھ تصویروں والی عام کتابیں دیکھ کر حیرت زدہ تھے، اس ضخیم کتاب کو دیکھنا جس میں 250 کے قریب بڑی تصویریں تھیں، کسی سوئے ہوئے شان دار محل کی سیر جیسا تھا۔ ہم نے ان شان دار اوراق کو ایسے عقیدت و احترام سے دیکھا جیسے ہمارے سامنے معجزاتی طور پر باقاعدہ ارم تیرتے ہوئے آ گئے ہوں اور اگلے پچیس برس ہم اس کتاب کے بارے میں باتیں کرتے

رہے جو خزانے میں مقفل رہی۔

میں نے خاموشی سے "شاہنامہ" کا وہ بھاری سرورق کھولا جیسے کسی محل کا بڑا سا صدر دروازہ کھول رہا ہوں۔ اوراق پلٹتے ہوئے، ایک خوش گواری سرسراہٹ کی آواز آئی اور محویت سے زیادہ مجھ پر افسردگی غالب تھی۔

1۔ ایسی کہانیوں سے ہوشیار رہتے ہوئے کہ استنبول کے تمام استاد فن اجیر فنکاروں نے اس کتاب سے تصاویر چرائی ہیں، میں ان تصاویر پر پوری توجہ نہ کر سکا۔

2۔ یہ سوچتے ہوئے کہ مجھے کہیں اتفاق سے کسی کونے میں بہزاد کا بنایا ہوا کچھ دکھائی دے جائے، میں ان شہ پاروں پر اپنی پوری توجہ نہ کر سکا جو ہر پانچ چھے تصویروں کے بعد میرے سامنے ظاہر ہوتے (کس قدر فیصلہ کن طریقے اور وقار سے خوبصورت (Tahmuras) نے اپنا گرز جنوں اور دیووں کے سروں پر مارا جو بعد میں اس کے زمانے میں اسے حروف تہجی، یونانی اور دیگر مختلف زبانیں سکھاتے!)

3۔ گھوڑوں کی ناک اور قرمز اور بوٹے کی موجودگی نے، جو کچھ میں نے دیکھا اس کے سامنے خود کو جھکا دینے سے روکے رکھا۔

قدرتی طور پر، میں خود کو دل شکستہ دماغ سے مشاہدہ کرتا پا کر مایوس تھا، باوجود اس کے کہ اللہ اور اس کی فیاضی نے مجھے یہ موقع عطا کیا تھا [illegible] کہ میری بینائی پر تاریکی کا مخملیں پردہ چھا جائے، میں اسے اس داستانوی کتاب سے معمور کر سکوں — تمام استاد اجیر فنکاروں پر رحمت الٰہی نازل ہوئی۔ جس وقت صبح کاذب کی روشنی خزانے میں پہنچی جو اب رفتہ رفتہ کسی قبر سے جیسا لگنے لگا تھا، میں اس اعلیٰ شان دار کتاب کی تمام 250 تصاویر دیکھ چکا تھا۔ چوں کہ میں نے اپنے دماغ سے دیکھا تھا، مجھے ایک مرتبہ درجہ بندی کی اجازت دیں، یوں جیسے میں کوئی عرب عالم تھا جسے صرف استدلال میں دلچسپی تھی:

1۔ کہیں بھی مجھے ایسا کوئی گھوڑا دکھائی نہ دیا جس کے نتھنے اس سے مشابہ ہوں جو اس بدبخت قاتل نے بنایا تھا۔ مختلف رنگوں کے ان گھوڑوں کے درمیان بھی نہیں جن سے رستم کا توران میں چوروں کے تعاقب میں سامنا ہوا تھا، نہ ہی فریدون شاہ کے ان غیر معمولی گھوڑوں میں جنہوں نے تیر کر دجلہ عبور کیا تھا جب عرب سلطان نے اسے ایسی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا، نہ ہی تور (Tur) کے اپنے چھوٹے بھائی ایرج کا سر قلم کرتے دیکھتے افسوس کے شکار سرمئی گھوڑوں میں۔ تور اپنے باپ کے باعث ایرج سے حسد کرتا تھا جس نے اپنی سلطنت کی تقسیم کے وقت ایران سے دور چین تک کا بہترین علاقہ ایرج کو دے دیا تھا جب کہ تور کو صرف مغربی علاقے دیے تھے، نہ ہی سکندر اعظم کی ان بہادر افواج کے گھوڑوں میں جن میں [illegible]، مصری، بربر اور عرب شامل تھے، سب زرہ، آہنی ڈھال، لاثانی تلواروں اور چمکتے خود سے مسلح، نہ ہی وہ افسانوی گھوڑا جس نے شاہ یزدگرد کو ہلاک کیا تھا — خدا کے لکھے مقدر سے بغاوت پر الہامی سزا کے نتیجے میں جس کی ناک سے مسلسل خون بہہ رہا تھا — اس نے یزدگرد کو اسی سبز جھیل کے کنارے بے یارو مددگار

ہلاک کیا تھا جس کے شفا بخش پانیوں نے شاہ کو تکلیف سے نجات دی تھی اور نہ ہی ان ہیکلوں ان افسانوی اور مکمل گھوڑوں میں جو سب کے سب مجھے یا سات منی ایچر فنکاروں نے بنائے تھے۔ تاہم میرے پاس ابھی پورا ایک سے زائد دن پڑا تھا جس میں مجھے خزانے کی دیگر کتابوں کا جائزہ لینا تھا۔

2۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ استاد مصوروں کے درمیان پچھلے پچیس برس سے مسلسل موضوع گفتگو رہا تھا: سلطان کی خاص اجازت سے ایک مصور اس ممنوعہ خزانے میں داخل ہوا، یہ شان دار کتاب دیکھی، اسے کھولا اور شمع کی روشنی میں اپنی خاکہ کشی کی کتاب میں کئی غیر معمولی گھوڑوں، درختوں، بادلوں، پھولوں، پرندوں، باغوں اور جنگ و محبت کے مناظر کے نمونے اپنے کام میں استعمال کے لیے نقل کر لیے ـــ جب بھی کوئی فنکار کوئی حیرت انگیز اور غیر معمولی فن پارہ بناتا، تو دوسرے حسد کے سبب اس بارے میں ایسی باتیں اڑاتے اور تبریز کا ایرانی کام کہہ کر اس فن پارے کی تحقیر کرتے تھے۔ تبریز جب عثمانی سرزمین کا حصہ نہ تھا۔ جب مجھے اس بہتان کا نشانہ بنایا گیا، مجھے بجا طور پر غصہ آیا، تاہم باطن فخر بھی ہوا، لیکن جب میں نے دوسروں کے بارے میں یہی الزام سنا تو میں نے اس کا یقین کر لیا۔ اب، مجھے اداسی سے ادراک ہوا کہ عجب طور پر ہم چاروں منی ایچر فنکاروں نے، جنہوں نے اس کتاب کو پچیس برس قبل دیکھا تھا، اس کی تصاویر کو اپنی یادداشت میں نقش کر لیا تھا، تب سے ہم انہیں ہمارے سلطان کی کتابوں میں یاد کر کے تبدیل کرتے، ترمیم کرتے اور مصوری کرتے آئے تھے۔ میرا جوش و جذبہ ضرورت سے زائد شکی مزاج سلاطین کی بے رحمی سے ماند نہیں پڑا تھا جو ایسی کتابوں کو خزانے سے نکال کر ہم فنکاروں کو نہیں دکھاتے تھے بلکہ خود ہماری مصوری کی دنیا کی تنگ ذہنی کے باعث ایسا ہوا تھا۔ چاہے وہ ہرات کے عظیم استاد ہوں یا تبریز کے نئے استاد، ایرانی فنکاروں نے ہم عثمانیوں کی نسبت زیادہ غیر معمولی مصوری کی ہے، زیادہ شہ پارے بنائے ہیں۔

برق کے کوندے کی طرح، مجھ پر آشکار ہوا کہ کس قدر موزوں ہو گا کہ اگر اب سے دو روز بعد مجھے اور میرے تمام منی ایچر فنکاروں کو زنداں میں ڈال دیا جائے۔ اپنا قلم تراش استعمال کرتے ہوئے میں نے اپنے سامنے کھلی تصویر کی آنکھیں بے رحمی سے کھرچ دیں۔ یہ ایک فارسی عالم کا قصہ تھا جس نے ہندوستان کے سفیر کی لائی شطرنج کو محض دیکھ کر شطرنج کھیلنی سیکھ لی تھی، اور پھر اس کھیل کے ایک ہندو استاد کو شکست دی تھی! ایک فارسی جھوٹ! ایک ایک کر کے میں نے شطرنج کھیلنے والوں کی آنکھیں کھرچ دیں اور شاہ اور اس کے آدمیوں کی بھی جو شطرنج کا کھیل دیکھ رہے تھے۔ ورق واپس پلٹتے ہوئے میں نے ان شاہوں کی آنکھیں بھی بے دردی سے نوچ لیں جنہوں نے بے رحمی سے جنگیں کی تھیں، عالی شان زرہوں میں ملبوس حملہ آور فوجوں کے سپاہیوں کی اور زمین پر پڑے کٹے سروں کی بھی۔ تین صفحوں پر ایسا کرنے کے بعد میں نے اپنا قلم تراش دوبارہ اپنی پیٹی میں لگا لیا۔

میرے ہاتھ کپکپائے لیکن مجھے برا محسوس نہ ہوا۔ کیا مجھے اب ویسا محسوس ہوا جیسا بہت سے

جنونیوں کو یہ عجیب اقدام کرکے محسوس ہوتا تھا جس کے نتائج کا سامنا مجھے مصور کے طور پر میرے پچاس برس کے عرصے میں کئی مرتبہ ہوا؟ میں اس سے زیادہ کچھ نہ چاہتا تھا کہ جن آنکھوں کو میں نے اندھا کیا تھا، ان سے ان اوراق پر خون بہنے لگے۔

اس نے مجھے کرب و اذیت میں ڈالا اور زندگی کے انجام پر میرا مختصر تشفی و دلاسا بھی مجھے دیا۔ یہ اصل کتاب شاہ طہماسپ نے دس برس تک ایران کے انتہائی ماہر فنکاروں سے بنوائی تھی۔ اس کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس نے عظیم بہزاد کے قلم کا لمس محسوس نہ کیا ہو اور اس کی ہاتھوں کی وہ باکمال تصویر کشی جو کہیں سے نہ ملی۔ اس حقیقت نے توثیق کی کہ ہرات سے تب کے غیر موزوں شہر —— تبریز کو فرار کے بعد بہزاد اپنی زندگی کے آخری برسوں میں نابینا ہو گیا تھا۔ سو میں نے ایک بار پھر یہ خوشی فیصلہ کیا کہ اپنی عمر بھر کی محنت کے بعد پرانے فنکاروں کی سی مہارت حاصل کرنے کے بعد، عظیم استاد نے کسی دوسرے کتاب خانے یا شاہ کی خواہشوں پر اپنی مصوری کو داغدار کرنے سے گریز کی خاطر خود کو اندھا کر لیا تھا۔

تبھی قرہ اور یوسف نے وہ عظیم کتاب جو وہ اٹھائے ہوئے تھے، کھولی اور میرے سامنے رکھ دی۔

"نہیں، یہ نہیں ہے۔" میں نے توقف کے بغیر کہا۔ "یہ کوئی معمول شاہنامہ ہے۔ سکندر کی آہنی گھڑسوار فوج کے آہنی گھوڑے آتش گیر مادے سے بھرے تھے اور اپنے نتھنوں سے نکلتے شعلوں کے ساتھ دشمن پر حملہ آور ہونے سے قبل، لیمپوں کی طرح جل اٹھے تھے۔"

ہم نے پچھلی مصوری سے نقل کی گئی آتش زن فوج پر نگاہ کی۔

"تبریزی آقا۔" میں نے کہا، "ہم نے بعد میں سلطان سلیم کی تواریخ میں ان تحائف کی تصویر کشی کی تھی جو شاہ طہماسپ کے ایرانی سفیر پچیس برس قبل اپنے ہمراہ لائے تھے۔ ان تحائف میں یہ کتاب "شاہنامہ" بھی شامل تھی ——"

اس نے تیزی سے "تواریخ سلطان سلیم" تلاش کی اور میرے سامنے لا رکھی۔ رنگا رنگ تصویروں سے سجے جس کے اوراق پر سفیر دوسرے تحائف کے ساتھ سلطان سلیم کو "شاہنامہ" بھی پیش کر رہے تھے۔ میری نگاہوں نے اوپر تلے رکھے تحائف میں وہ تلاش کر لیا جسے میں نے برسوں پہلے پڑھا تھا لیکن کیونکہ وہ اس قدر محیر العقول تھا، میں اسے بھلا چکا تھا:

"فیروزہ اور سیپ کے دستے والی سنہری سوئی جسے ہرات کی محترم قابل شخصیت، استادوں کے استاد مصور بہزاد عالی مقام نے خود کو نابینا کرنے کے لیے استعمال کیا۔"

میں نے یوسف سے پوچھا کہ اسے "تواریخ سلطان سلیم" کہاں سے ملی۔ میں نے خزانے کی گرد آلود تاریکی میں، قالینوں اور کپڑے کے ڈھیر کے درمیان، الماریوں اور سیڑھیوں کے پیچھے، صندوقوں کے درمیان تک رکھا تھا اس کا پیچھا کیا۔ میں نے دیکھا کہ کیسے ہمارے سامنے ابھی بڑے ہوتے،

بھی سکتے تھے، دھاتوں، ہاتھی دانت اور چیتوں کی کھال پر بچھے رہے۔ مخصوص کمروں میں سے ایک میں، وہ
کپڑے اور مخمل کی جیب سی سرخی میں چھپا ہوا تھا جو ہے کے صندوق کے قریب ہے جس سے دوسری کتابوں
کے درمیان سے "شاہنامہ" برآمد ہوئی تھی، سونے اور چاندی کے تاروں سے کشیدہ کاری والی چادروں،
جام اور بغیر پالش شدہ سیلون کے پتھروں اور یاقوت لگے گلدانوں کے درمیان، میں نے بہت سے
تحائف دیکھے، جو شاہ طہماسپ نے بھیجے تھے: اصفہان کے ریشمی قالین، ہاتھی دانت کی شطرنج اور ایک شے
جس نے فوراً میری توجہ کھینچ لی ۔۔۔ چینی اژدہوں سے سجا ایک قلم دان اور سیپ سے بنی شاخیں جو یقینی
امیر تیمور کے زمانے کی تھیں۔ میں نے قلم دان کھولا اور اس میں سے بچے ہوئے کاغذ اور عرق گلاب کی
جھلک تھی، اس کے اندر قیمتی ورقے اور صدف سے بنی سنہری سوئی تھی جو دستار سے پھول جوڑنے کے کام آتی
تھی۔ میں نے سوئی لی اور کسی آسیب کی طرح اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔

سوئی جسے استاد بہزاد نے خود کو نابینا کرنے کے لیے استعمال کیا تھا، میں نے "شاہنامہ" کے
کھلے صفحے پر رکھی اور اسے دیکھنے لگا۔ اس بات نے نہیں کہ انہوں نے خود کو اس سوئی سے اندھا کر دیا تھا بلکہ
ایک ایسی شے کو دیکھنے پر میں کپکپایا جو انہوں نے اپنے کانپتے ہاتھوں میں لی تھی۔

شاہ طہماسپ نے سلطان کو تحفے میں دی جانے والی کتاب کے ہمراہ یہ دہشت خیز سوئی
کیوں بھیجی تھی؟ کیا اس لیے کہ یہ شاہ، جو جوانی میں بہزاد کا شاگرد رہا تھا اور نوجوانی میں فنکاروں کا
سرپرست، بڑھاپے میں فنکاروں اور شاعروں کو اپنے حلقے سے دور کر کے بدل گیا تھا اور خود کو صرف
عبادت کے لیے وقف کر دیا تھا؟ کیا یہی وجہ تھی کہ وہ اس عظیم کتاب سے دستبردار ہونے کو تیار تھا جس
پر عظیم ترین فنکاروں نے دس برس کام کیا تھا؟ کیا اس نے یہ سوئی اس لیے بھیجی تھی کہ ہم سب جان لیں کہ اس
عظیم فنکار نے خود کو اپنی مرضی سے نابینا کیا تھا یا جیسا کہ کچھ عرصے یہ افواہ پھیلی تھی، اس لیے کہ جو کوئی بھی اس
کتاب کے اوراق ایک بار دیکھ لے، اسے اس جہان میں مزید کچھ دیکھنے کی تمنا نہ رہے گی؟ بہرصورت یہ
کتاب شاہ کے لیے اب مزید کوئی شہکار نہ رہی تھی، جسے سخت پچھتاوا اور خوف محسوس ہوتا تھا کہ اپنی نوجوانی
میں مصوری کی محبت کے ذریعے اس نے مذہب سے گستاخی یا توہین کا ارتکاب کیا، جیسا کہ بڑھاپے میں بہت
سے حکمرانوں کے ساتھ ایسا ہوا۔

مجھے کینہ پرور مصوروں کی کہانیاں یاد آ گئیں جو اپنے خوابوں کی تعبیروں کی آرزو میں ہی بوڑھے
ہو گئے تھے: جب قرہ قویونلو حکمران جہان شاہ کی افواج شیراز میں داخل ہوئے تو تیمور کے دور کے استاد
مصور ابن حسام نے اعلان کیا: "میں کسی بھی دوسری طرح سے مصوری سے انکار کرتا ہوں۔" اور اس کے
فاتح نے اس کے حکم پر اسے گرم سلاخ کے ساتھ اندھا کر دیا۔ سلطان سلیم یاوز کی افواج جن فنی ایجاد
فنکاروں کو شاہ اسماعیل کی شکست، تبریز پر قبضے اور ہشت آسمان محل کی غارت گری کے بعد استنبول لائی تھیں،
ان میں ایک بوڑھا ایرانی استاد بھی تھا جس کے بارے میں افواہ تھی کہ اس نے خود کو کسی دوا سے نابینا کر لیا

کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ وہ خود کو مثالی طرز پر مصوری پر بھی آمادہ نہ کر پائے گا — کچھ لوگوں کے اس غلط دعویٰ کے مطابق نہیں کہ اسے سفر میں کوئی بیماری ہو گئی تھی جس کے سبب وہ بینائی کھو بیٹھا۔ ان کے لیے مثال قائم کرنے کی غرض سے، میں اپنے مصوروں کو ان کی مایوسی کے لمحات میں بتایا کرتا تھا کہ استاد بہزاد نے کیسے خود کو اندھا کر لیا تھا۔

کیا کوئی دوسری تدبیر تھی؟ اگر استاد منی ایچر فنکار یہاں کے طریقے استعمال کرتا اور وہاں دیگر جگہوں پر، کیا تب وہ چاہے کم ہی سہی پورے کتاب خانے کو اور پرانے استادوں کے انداز یا اسلوب کو بچا نہیں سکتا تھا؟

سوئی کے انتہائی باریک تیز سرے پر ایک گہرا دھبہ تھا، تاہم میری تھکن زدہ آنکھیں معلوم نہ کر سکی تھیں کہ وہ خون تھا یا نہیں۔ محدب عدسے کو نیچے کرتے ہوئے، یوں جیسے اسی افسردگی کے احساس سے موزوں صحبت کی کوئی فسردہ دل منتظر تھا ہوئے، میں دیر تک سوئی کو دیکھتا رہا۔ میں نے یہ تصور میں لانے کی کوشش کی کہ بہزاد نے سب کیسے کیا ہو گا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ کوئی فوراً ہی نابینا نہیں ہو جاتا، مخملیں تاریکی آہستگی سے رفتہ رفتہ اترتی ہے، بعض اوقات کئی روز بعد، بعض اوقات مہینوں بعد، جیسا کہ بوڑھے لوگ قدرتی طور پر نابینا ہو جاتے ہیں۔

میں نے اسے دوسرے کمرے میں [illegible] ہوئے، روشنی دیکھی تھی، میں کھڑا ہوا اور دیکھنے لگا۔ ہاں، وہی تھا یہ: مڑے ہوئے دستے اور بھاری آہنی فریم والا ہاتھی دانت کا آئینہ اس کی لمبائی کی طرح سے سجائی گئی تھی۔ میں دوبارہ بیٹھ گیا اور خود اپنی نگاہوں سے دیکھی جگہوں پر شمع کا شعلہ کس خوبی سے رقص کر رہا تھا — میری ان آنکھوں نے میرے ہاتھ کی مصوری کا ساتھ برسوں تک مشاہدہ کیا تھا۔

"استاد بہزاد نے یہ ایسے کیسے کیا تھا؟" میں نے خود سے ایک بار پھر پوچھا۔

آئینے سے ایک بار بھی نگاہ ہٹائے بغیر، اپنی آنکھوں میں کاجل لگاتی کسی عورت کی بے تکی حرکات سے، میرے ہاتھ نے خود بخود سوئی تلاش کر لی۔ ہچکچاہٹ کے بغیر، یوں جیسے سجانے کے لیے تیار کیے جانے والے شترمرغ کے انڈے میں سوراخ کرتے ہوئے، میں نے بہادری، سکون اور مضبوطی سے سوئی کو اپنی دائیں آنکھ میں گاڑ لیا۔ میرا دل ڈوب گیا، اس لیے نہیں کہ مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں کیا کر رہا تھا بلکہ اس لیے کہ میں نے دیکھا کہ میں کیا کر رہا تھا۔ میں نے سوئی کو اپنی دائیں آنکھ میں انگلی کی پور کے چوتھائی حصے کی گہرائی تک گاڑا اور پھر باہر نکال لیا۔

آئینے کے فریم پر درج رباعی میں شاعر نے دیکھنے والے کو ابدی حسن اور حکمت کی دعا دی تھی — اور خود آئینے کو ابدی زندگی کی۔

مسکراتے ہوئے میں نے دوسری آنکھ کے ساتھ بھی یہی کیا۔

دیر تک میں نے جنبش تک نہ کی۔ میں نے دنیا پر نگاہ کی — ہر شے پر۔

جیسا کہ میرا قیاس تھا، دنیا کے رنگ تاریک نہ ہوئے تھے لیکن بلکہ جیسے آہستہ آہستہ بھور رنگ ہو کر ایک دوسرے میں ملنے لگے تھے۔ میں اب بھی تھوڑا بہت دیکھ سکتا تھا۔

سورج کی زرد روشنی خزانے کے کمرے اور دھندلے سرخ رنگ کے کپڑے پر پڑی۔ حسب رواج تقریب میں سربراہ خزانچی اور اس کے آدمیوں نے مہر توڑی اور قفل اور دروازہ کھولا۔ جزی آغا نے پیشاب دان، لیمپ اور انگیٹھیاں تبدیل کیں، وہ تازہ روٹی اور خشک شہتوت لایا اور دوسروں کے لیے اعلان کیا کہ وہ ہمارے سلطان کی کتابوں میں چھپے ہوئے الو کے نقشوں والے گھوڑوں کی تلاش جاری رکھ سکتے ہیں۔ دنیا کی خوب صورت ترین تصویروں کو دیکھتے ہوئے، خدا کے تصور دنیا کو ذہن میں لانے کی کوشش کرنے سے زیادہ نادر و لطیف اور کیا ہو سکتا تھا۔

میرا نام ہے قرہ

جب سربراہ خزانچی اور افسران نے بڑا دروازہ کھولا تو میری نگاہیں خزانے کے کمروں کے مخملیں سرخ ہالے کی اس قدر عادی ہو چکی تھیں کہ اندرون کے شاہی حرم کے صحن سے چھن کر آتی سرما کی صبح کی روشنی جو اس گم کرنے والی تھی۔ میں ساکت کھڑا رہا اور خود استاد عثمان بھی۔ اگر ہم جنبش کرتے تو یوں لگتا تھا جیسے خزانے کی پیچیدہ زردی مائل، نیم گرد آلود اور مرئی فضا میں ہمیں جن اشاروں کی تلاش تھی وہ گم ہو جاتے۔

تجسس حیرانی کے ساتھ یوں جیسے کسی عالی شان شے کو پہلی بار دیکھ رہے ہوں، استاد عثمان نے کھلے دروازے کی دونوں جانب قطاروں میں کھڑے خزانچی افسران کے سربراہ اور ہمارے درمیان روشنی کی چادر کو دیکھا۔

گزشتہ شب میں نے انہیں ''شاہنامہ'' کے صفحات پلٹتے دیکھا تھا۔ میں نے حیرانی کا یہی تاثر ان کے چہرے پر دیکھا تھا، جب ان کا دیوار پر پڑنے والا سایہ ذرا لرزا تھا، ان کا سر ان کے محدب عدسے پر احتیاط سے جھک گیا تھا اور ان کے ہونٹ پہلے نرمی سے نیم وا ہوئے یوں جیسے کسی خوش گوار راز کو افشا کرنے والے ہوں، پھر جب انہوں نے تصویر کشی کو استعجاب کے عالم میں دیکھا تو ان کے ہونٹ باہم پیوست ہو گئے۔

بڑا دروازہ دوبارہ بند ہونے کے بعد میں زیادہ بے صبری اور بے چینی سے کمروں میں گھومنے لگا۔ میں نے اضطراب سے سوچا کہ ہمیں خزانے کی کتابوں سے زیادہ معلومات لینے کا وقت نہ ملے گا۔ مجھے احساس ہوا کہ استاد عثمان اپنی ذمے داری پر مناسب طور توجہ مرکوز نہ کر سکیں گے اور میں نے ان سے اپنے اندیشوں کا اظہار کیا۔

حقیقی استاد کی طرح جو اپنے شاگردوں سے قلبی لگاؤ کے اظہار کا عادی ہو، انہوں نے میرا ہاتھ تسلی بھرے انداز میں تھام لیا۔ ''ہمارے جیسے آدمیوں کے پاس اس کے سوا کوئی انتخاب نہیں کہ دنیا کو جیسا خدا کا تصور ہے ویسے دیکھنے کی کوشش کریں اور اس کے انصاف کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔'' انہوں نے کہا۔ ''اور یہاں ان استادوں اور تصویروں کے درمیان مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ دو چیزیں ایک نقطے پر مرتکز

شاید وہ اب یوں اس تصویر کو بیان کرتا چلا جائے گا جیسے پرانے اساتذہ کی نابینائی کی مدح سرائی میں کوئی اقرار وہ نظم سنا رہا ہو۔ "میرے عظیم استاد، میرے پیارے (روحانی) باپ۔" کسی عجیب تحریک پر میں نے انہیں ٹوک دیا، "جسے میں ابد تک دیکھنا چاہتا ہوں، وہ ہے میری محبوبہ کا نازک چہرہ۔ ہماری شادی کو تین روز ہوئے ہیں۔ میں نے بارہ برس تک اس کی چاہ کی ہے۔ وہ منظر جس میں شیریں خسرو کی تصویر دیکھ کر اس کی محبت میں گرفتار ہوتی ہے، مجھے اس کے سوا کسی کی یاد نہیں دلاتا۔"

میرے استاد کا چہرہ تاثرات سے بھرپور تھا، شاید تجسس، لیکن انہیں میری کہانی سے کچھ لینا دینا تھا نہ ہی سامنے پڑے جنگ کے خونیں مناظر سے۔ وہ کسی ایسی اچھی خبر کی توقع میں تھے جس میں وہ قدرے سکون حاصل کر پائیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری جانب نہیں دیکھ رہے تھے تو میں نے جلدی سے پرندے کے پر کی وہ سوئی نکالی اور چل دیا۔

خزانے کے تیسرے کمرے کے تاریک گوشے میں، وہ جو حمام سے متصل تھا، ایک گوشہ فرنگی بادشاہوں اور فرمانرواؤں کی طرف سے تحفے میں بھیجی گئی عجیب و غریب دیواری گھڑیوں سے بھرا پڑا تھا۔ جب وہ کام کرنا چھوڑ دیتیں، جو کہ وہ [illegible] عرصے میں عموماً چھوڑ دیتی تھیں تو وہ انہیں ایک طرف ڈال دیتے۔ اس کمرے میں پہنچ کر میں نے احتیاط سے سوئی کا جائزہ لیا جس سے استاد عثمان کے دعوے کے مطابق بہزاد نے خود کو اندھا کیا تھا۔

شیشوں سے منعکس ہو کر اندر چھن کر آتی سرخ روشنی، گرد آلود اور ٹوٹی ہوئی دیواری گھڑیوں کے بلور اور میری سوئی کی سنہری نوک جس پر گلابی مائل مائع کی تہ کبھی کبھار جھلملاتے۔ کیا واقعی استاد بہزاد نے خود کو اس شے سے واقعی اندھا کر لیا تھا؟ کیا استاد عثمان نے بھی اپنے ساتھ یہی تکلیف دہ کام کیا تھا؟" ایک شیطانی مزاح کا تاثر دیتا ہوا، انگلی برابر سائز اور رنگین پینٹ شدہ، ایک بڑے سے کلاک کے میکنزم سے جڑی سوئی، یوں لگتا تھا کہتی ہو، "ہاں!" واضح طور پر کلاک جب کام کر رہا تھا، ہر گھنٹہ گزرنے پر شیطانی دستار پہنے یہ شخص خوشی خوشی سر ہلاتا ہوگا — ہمارے سلطان اور ان کے حرم کی خواتین کی تفریح طبع کے لیے یہ تحفہ بھیجنے والے کمیں برگ کے بادشاہ اور اس کے ہنرمند گھڑی ساز کا ایک بے ضرر مذاق۔

میں نے چند ایک درمیانے درجے کی کتابوں کا جائزہ لیا: جیسا کہ بونے نے تصدیق کی یہ ان پاشاؤں کے اثاثے میں تھیں جن کا سر قلم کیے جانے کے بعد ان کی ملکیت و جائیداد کو بحق سرکار ضبط کر لیا گیا تھا۔ اتنے پاشاؤں کو ہلاک کیا گیا تھا کہ ان کتابوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ ترحم بھری خوشی کے ساتھ بونے نے اعلان کیا کہ اپنی دولت اور طاقت و اختیارات کے نشے کا شکار کوئی بھی پاشا جو یہ بھول جائے کہ وہ سلطان کا محکوم اور رعیت ہے اور اپنے اعزاز میں سونے کے ورقوں سے کوئی کتاب تیار کروائے یوں جیسے وہ کوئی شہنشاہ بادشاہ ہے، اسی بات کا مستحق ہے کہ اسے پھانسی لگا دی جائے اور اس کی ملکیت اثاثے ضبط کر لیے جائیں۔ حتیٰ کہ ان کتابوں میں بھی جن میں سے کچھ مرصع مسودے یا شعری مجموعوں کی تصویر کشی تھیں، جہاں کہیں مجھے

شیریں کے خسرو کی محبت میں گرفتار ہونے کی تصویر دکھائی دی، میں رک گیا اور دھیان سے دیکھنے لگا۔

تصویر کے اندر تصویر، یعنی خسرو کی تصویر جسے شیریں نے کسی گاؤں کی سیر کے دوران دیکھا تھا، کبھی بھی تفصیل سے پیش نہ کی گئی — اس سبب سے نہیں کہ منی ایچر فنکار اس قدر چھوٹی چیز کی صحیح طور پر عکاسی نہ کر سکتے تھے — بہت سے تو اتنی ہنرمندی اور مہارت رکھتے تھے کہ انگلیوں کے ناخنوں، چاول کے دانوں یا حتیٰ کہ بالوں پر بھی تصویر کشی کر سکتے تھے۔ تو پھر وہ شیریں کی محبت کے محور خسرو کے خدوخال اور چہرے کو اس قدر تفصیل سے کیوں نہ بنا پائے تھے کہ وہ پہچانا جا سکتا؟ بعض اوقات سہ پہر میں، شاید اپنی بے بسی بھلانے کو میں بے ترتیب البم کے اوراق پلٹتے ہوئے جو اتفاق سے مجھے مل گئی ہو، سوچتا ہوں کہ میں ایسے سوالات پر استاد عثمان سے بحث کروں گا۔ میں کپڑے پر بنائی گئی دلہن کی بارات کی تصویر میں گھوڑے کی شبیہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ میرے دل کی دھڑکن لحظہ بھر کو رک گئی۔

میرے سامنے ایک نازنین دلہن کو لے جاتا ہوا انوکھے نتھنوں والا گھوڑا تھا۔ جانور گویا تصویر سے نکل کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ یوں تھا جیسے وہی گھوڑا مجھے کوئی راز بتانے کو تھا۔ یوں جیسے کسی خواب میں میں چلانا چاہتا تھا لیکن میری آواز خاموش تھی۔

ایک مسلسل حرکت میں میں نے اوراق اکٹھے کیے، چیزوں اور صندوقوں کے ڈھیر میں استاد عثمان کی طرف بھاگا اور وہ ورق ان کے سامنے رکھ دیا۔

انھوں نے تصویر کو دیکھا۔

جب ان کے چہرے پر پہچان کی کوئی چمک نہ ابھری تو میں بے چین ہو گیا۔

"اس گھوڑے کے نتھنے بالکل ویسے ہیں جیسے میرے انشتے کی کتاب کے لیے بنائے گئے تھے۔" میں پکار اٹھا۔

انھوں نے گھوڑے پر اپنا محدب عدسہ رکھا۔ وہ اتنے جھک گئے کہ ان کی آنکھ اور عدسے اور تصویر میں فاصلہ نہ رہا، یہاں تک کہ ان کی ناک تقریباً صفحے کو چھونے لگی۔

میں خاموشی برداشت نہ کر پایا۔ "جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، یہ میرے انشتے کی کتاب میں بنائے گئے گھوڑے کے انداز پر بنایا گیا گھوڑا نہیں ہے۔" میں نے کہا، "لیکن ناک بالکل ویسی ہی ہے۔ فنکار نے دنیا کو چینیوں کی طرح دیکھنے کی کوشش کی۔" میں خاموش ہو گیا۔ "یہ بارات ہے۔ یہ چینی تصویر سے مشابہ ہے لیکن تصویریں چینی نہیں، یہ ہمارے لوگ ہیں۔"

استاد کا عدسہ لگتا تھا صفحے سے جڑ گیا ہو اور ان کی ناک عدسے سے۔ دیکھنے کی خاطر انھوں نے صرف اپنی آنکھوں کا استعمال نہیں کیا بلکہ اپنے سر، اپنی گردن کے عضلات، اپنی بوڑھی کمر اور اپنے شانوں کو بھی اپنی پوری قوت سے استعمال کیا۔ خاموشی۔

"گھوڑے کے نتھنے کٹے ہوئے ہیں۔" میں نے بعد میں پھولی سانس سے کہا۔

میں نے اپنا سر ان کے سر کے قریب جھکایا۔ رخسار ملائے ہم دیر تک نقشوں کو گھورتے رہے۔ میں نے اداسی سے ادراک کیا کہ نہ صرف گھوڑے کے نقشے کٹے ہوئے تھے بلکہ استاد عثمان کو انہیں دیکھنے میں دشواری بھی ہو رہی تھی۔

"آپ کو یہ نظر آ رہے ہیں۔ ہیں ناں؟"

"تھوڑے سے۔" انہوں نے کہا، "تصویر کو بیان کرو۔"

"اگر آپ مجھ سے پوچھتے ہیں تو یہ ایک اداس دلہن ہے۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "وہ سرمئی گھوڑے پر سوار ہے جس کے نقشے کٹے ہوئے ہیں، وہ اپنی ساتھیوں کے ہمراہ اور محافظوں کی حفاظت میں جو اس کے لیے اجنبی ہیں، شادی کے لیے جا رہی ہے۔ محافظوں کے چہرے، ان کے تحت تاثرات، خوف دلاتی سیاہ داڑھیاں، چڑھی ہوئی تیوریاں، لمبی گھنی مونچھیں، بھاری بدن، سادہ و باریک کپڑے کے چغے، بلکے سے جوتے، سمور کے سرپوش، بھالے، ڈھالیں اور چھوٹی تلواریں اشارہ کرتے ہیں کہ ان کا تعلق دور اشم کے آق قویونلو ترکمانوں سے ہے۔ نقاش نے خوب صورتی [illegible] دی ہے اس بات کو دکھایا جائے کہ وقت شب تمل کے خیموں اور مشعلوں کی روشنی میں ہم جولیوں کے ہمراہ [illegible] ہے طویل سفر پر ہے۔ افسردہ دل چینی شہزادی ہے۔"

"یا شاید ہمیں صرف اس لیے یہ خیال [illegible] کہ وہ چینی ہے کیونکہ منی ایچر فنکاروں نے اس کے بے عیب حسن پر زور دینے کے لیے چینیوں کی طرح اس [illegible] سفید کر دیا ہے اور اس کی آنکھیں ترچھی بنائی ہیں۔" استاد عثمان نے کہا۔

"وہ جو کوئی بھی ہو، اس اداس حسن پر میرا دل دکھتا ہے [illegible] نصف شب کو وحشت ناک چہروں والے اجنبی محافظوں کے ہمراہ بے انت لق و دق میدانوں میں سفر کرتے ہوئے عجیب سرزمین کی طرف رواں دواں ہے اور اس شوہر کی جانب جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا۔" میں نے کہا اور فوراً ہی اپنی بات میں اضافہ کیا، "وہ جس گھوڑے پر سوار ہے اس کے چھدے ہوئے نقشوں سے ہمیں کیسے معلوم ہو گا کہ یہ منی ایچر فنکار کون ہے؟"

"البم کے صفحے پلٹو اور مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا۔" استاد عثمان نے کہا۔

تبھی پستہ قد بونا ہمارے پاس آ گیا جسے استاد عثمان کے پاس یہ کتاب اٹھا کر لاتے ہوئے میں نے راہداری میں دیکھا تھا، ہم تینوں ان اوراق کو دیکھنے لگے۔

ہمیں ہماری اداس دلہن کے سے انداز میں تیغ اچھالی حسین چینی دوشیزاؤں کا جمگھٹ دکھائی دیا جو باغ میں ایک انوکھا سا ربابیہ بجا رہی تھیں۔ ہمیں چینی گھر دکھائی دیے، طویل سفروں پر رواں ہوتے ترش رو دکھائی دیتے کارواں، پرانی یادوں کی طرح حسین بے انتہا میدانوں کے مناظر۔ ہمیں چینی انداز میں بنے گھر اور درخت، ان پر بہار کا جوبن اور ان کی شاخوں پر نیم اپنی سرخوشی میں مدہوش عندلیب دکھائی دیں۔ ہمیں اپنے خیموں میں شاعری، شراب اور محبت سے لطف اندوز ہوتے خراسانی شہزادے دکھائی دیے۔

قابلِ دید باغات اور وجیہہ معززین اپنے بازوؤں پہ عالی شان عقابوں کو بٹھائے، اور گھوڑوں پہ سوار شکار کرتے ہوئے نظر آئے۔ پھر یوں تھا جیسے ان اوراق سے شیطان چھڑ گیا تھا، ہم محسوس کر سکتے تھے کہ تصویر کشی میں بدی بیشتر اوقات اپنا جواز رکھتی تھی۔ کیا تیر سے عظیم الجثہ اژدہے کو ہلاک کرتے بہادر شہزادے کو منی ایچر فنکار نے ذومعنی رخ دیا تھا؟ اپنے درمیان موجود شیخ سے توقع لگائے بدنصیب کسانوں کی غربت پہ بدبختی سے خوش ہوا تھا؟ کیا اس نے کتوں کی اداس خالی نگاہوں سے زیادہ خوشی کشید کی تھی یا غریب جانوروں پر حقارت سے منہ کھولے وحشی عورتوں کو شیطانی سرخ رنگ دینے سے؟ پھر ہم نے خود منی ایچر فنکار کا شیطان دیکھ لیا: جنوں اور دیوؤں سے مشابہ عجیب و غریب مخلوقات، جنہیں ہرات کے پرانے استاد اور "شاہنامہ" کے فنکار اکثر بنایا کرتے تھے۔ تاہم منی ایچر فنکاروں کے تمسخر آمیز ہنر نے انہیں زیادہ بدشکل، مکار عادات اور ساخت میں انسانی بنا دیا۔ ہم ان وحشت خیز شیطانوں کو دیکھ کر ٹھٹھکے، آدمی کی جسامت کے لیکن کریہہ جسموں، سینگوں اور بلی سی دموں والے۔ صفحات پلٹتے ہوئے میں نے دیکھا کہ گھنی بھنوؤں، گول چہروں، باہر کو ابلی آنکھوں، نوک دار دانتوں، تیز ناخنوں اور بودھوں جیسی سانولی جھریوں زدہ جلد والے یہ برہنہ شیطان ایک دوسرے کو زدوکوب کرتے رہے اور گتھم گتھا ہو گئے، عظیم گھوڑے کو چرا کر اپنے دیوتاؤں کے حضور قربان کرتے، اچھلتے اور کھیلتے، درختوں سے گراتے، حسین شہزادیوں کو ان کی پالکیوں میں لے بھاگتے اور اژدھوں کو قید کرتے اور خزانے حاصل کرنے کے لیے۔ میں نے ذکر کیا کہ اس کتاب میں جس نے بہت سے مو قلم کا لمس دیکھا تھا، سیاہ قلم سے جانا جاتا وہ منی ایچر فنکار جس نے شیطان یا بھوت پریت بنائے تھے، اسی نے گنجے سروں، خستہ حال کپڑوں، آہنی زنجیروں اور لاٹھیوں والے قلندری درویش بھی بنائے تھے اور استاد عثمان نے مجھے ایک ایک کر کے ان کی مماثلتیں بیان کرنے کا کہا اور میں جو کچھ بتاتا اسے انہوں نے بغور سنا۔

"گھوڑے کے نتھنے چھید دینا تاکہ وہ آسانی سے سانس لے سکے اور دور تک سفر کر سکے، یہ صدیوں پرانی منگول روایت ہے۔" انہوں نے بعد میں بتایا۔ "ہلاکو خان کی افواج نے اپنے گھوڑوں کے ساتھ سارے عرب، فارس اور چین کو فتح کیا۔ وہ بغداد میں داخل ہوئے، اس کے باسیوں کا قتل عام کیا، اسے لوٹا اور اس کی ساری کتابیں دجلہ میں دریا برد کر دیں، جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ تب مشہور خطاط اور بعد میں کتابوں کے تزئین کار ابن شاکر شیرازی اس قتل عام سے فرار ہوئے اور شمال کے رستے پر گامزن ہوئے جہاں سے منگول گھڑسوار آئے تھے، بجائے جنوب کے جس طرف ہر کوئی بھاگ رہا تھا۔ اس وقت کوئی بھی تصویر کشی نہیں کرتا تھا کیوں کہ قرآن میں اس سے منع کیا گیا تھا اور مصوروں کو سنجیدگی سے نہ لیا جاتا تھا۔ ہمارے اس معزز پیشے کے عظیم ترین رازوں کے لیے ہم ابن شاکر کے مقروض ہیں، سرپرست بزرگ اور تمام منی ایچر فنکاروں کے استاد، ستارے سے دنیا کا نظارہ، افق کی مرئی یا غیر مرئی لکیر کا ثبات اور بادلوں سے حشرات الارض تک ہر شے کی اس طور پہ عمل کھاتے زندگی بھرے اور خوش امید رنگوں میں تصویر کشی

جیسا کہ چینی تصور کرتے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ منگول جنھوں نے مرکز کی جانب اپنے دورِ فتوحات کے
دوران انھوں نے شمال کے رخ میں آگے بڑھتے رہنے کے لیے گھوڑوں کے گلے کے ہوئے تھے جن پر وہ فوج کو
تاہم جہاں تک میں نے دیکھا اور سنا ہے، سمرقند جہاں وہ برف باری اور شدید موسم سے نبرد آزما ہوتے ہوئے
بھر کے پیدل سفر کے بعد پہنچے تھے، وہاں ان کے بنائے گئے کئی بھی گھوڑے کے نقشے مجھ سے ملے
تھے۔ ان کے نزدیک منگولوں کے مضبوط، زور آور، فاتح گھوڑے جو انھوں نے اپنے وطن میں دیکھے
ویسے میدانوں کے مکمل گھوڑے نہ تھے بلکہ وہ خوب صورت عربی گھوڑے تھے جو وہ انھوں نے
اپنی خوشی بھری جوانی میں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نقشے کی کتاب میں بنائے گئے گھوڑے کی
عجیب تال سے بھرے ذہن میں منگول گھوڑے آتے ہیں منگولوں کی وہ روایت جو انھوں نے قرونِ اولیٰ
سمرقند میں چھپائی تھی۔"

بات کرتے ہوئے استاد عثمان بھی کتاب اور بھی ہمیں دیکھتے رہے۔ یوں جیسے وہ صرف وہی
چیزیں دیکھ سکتے تھے جو ان کے تخیل کی آنکھ میں آتی تھیں۔

"چھپے ہوئے تاکوں میں بنے گھوڑوں اور چینی تصویروں کے علاوہ اس کتاب میں موجود
شیطان یا عفریت ایک اور چیز ایسی ہیں جو ہم نہیں جانتے، اپنے ہمراہ ایران اور یہاں استنبول تک لائے۔ قرآن نے
شاید ان کو رکھا ہو کہ یہ عفریت زمین کے اندر گہرائی میں ... جب طاقتوں کی طرف سے بھیجے گئے ہوں گے
تخیر ہیں تاکہ وہ انسانی زندگیوں کو اور جو کچھ بھی ہم تاریک ... ہوتے ہیں، اسے چھین لیں اور جیسے وہ بھی
تاریکی، سیاہی اور موت کی اپنی دنیا میں لے جانا چاہتے ... زمین سلطنت میں جو شے
چاہے وہ بادل ہو، درخت، شے، کتا یا کتاب، روح رکھتی ہے اور بات کرتی ہے۔"

"ایسا ہی ہے۔" بوڑھے ہونے نے کہا۔ "خدا گواہ ہے بعض راتوں کو جب میں یہاں بند ہوتا
ہوں، نہ صرف دیوار کی گھڑیاں، قیمتی پلیٹوں اور بلوریں پیالوں کی روحیں مسلسل جھنکار پیدا کرتی ہیں بلکہ
تمام رائفلوں، تلواروں، ڈھالوں اور خودوں کی روحیں بھی بے چین و مضطرب ہو کر اپنی اپنی جگہ سے
ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگتی ہیں کہ خزانے کا یہ کمرہ کسی الہامی جنگ کا میدان بن جاتا ہے۔"

"قلندری درویش جن کی تصویریں ہم نے دیکھی ہیں تبریز اصفہان سے فارس اپنے ہمراہ وہ عقیدہ
لائے تھے اور پھر بعد میں استنبول تک۔" استاد عثمان نے بتایا۔ "جب سلطان سلیم یاوز، شاہ اسماعیل بہ وقت
الزماں مرزا ... امیر تیموری نسل سے ... کو شکست دینے کے بعد ہفت آسمان محل سے مالِ غنیمت سمیٹ
رہے تھے تو تبریز شاہ اسماعیل اور ان کے بیچ وکار قلندر، ملازموں کے ساتھ آملے۔ سلطان سلیم جب سرما اور
برف سے گزرتے استنبول آئے تو سامانِ بہشت کے قافلے میں شاہ اسماعیل کی دو بیویاں بھی تھیں جو انھیں
چلدران میں حاصل ہوئی تھیں۔ وہ گوری رنگت اور ترچھی بادامی آنکھوں والی حسین عورتیں تھیں اور ان کے
ہمراہ ہفت آسمان محل کے کتب خانے میں محفوظ کتابیں بھی آگئیں۔ کتابیں جو ان کے تبریز کے سابق آقا چھوڑ

گئے تھے، منگول، ایل خانی، منگول جلیر اور قرہ قویونلو اور جنہیں شکست خوردہ شاہ نے ازبکوں، ایرانیوں اور گورکانی تیموریوں سے مال غنیمت میں سمیٹا تھا، میں ان کتابوں کو تاتاریوں کا یہاں تک ہمارے سلطان اور سربراہ خزانچی مجھے یہاں سے ہٹا دیں۔"

تاہم اب ان کی آنکھیں اسی طرح سمت کا احساس کھونے لگی تھیں جیسا کہ نابیناؤں کی آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے عادت کے مطابق دیکھنے کے لیے اپنے صندلی دستے والے محدب شیشے کو تھام لیا۔ ہم خاموش ہو گئے۔ استاد عثمان نے درخواست کی کہ پستہ قد بونا جو ان کی پوری روداد کسی تیز کہانی کی طرح سن رہا تھا، ایک بار پھر ان کے پاس وہ کتاب ڈھونڈ کر لائے جس کی جلد بندی کی تفصیل انہوں نے بیان کی تھی۔ بونے کے جانے کے بعد میں نے سادگی سے استاد سے پوچھا "تو پھر میرے الشتے کی کتاب میں گھوڑے کی تصویر کشی کا ذمہ دار کون ہے؟"

"دونوں گھوڑوں کے نتھنے بھدے ہوئے ہیں۔" وہ بولے۔ "چاہے یہ سمرقند میں ہوا تھا یا جیسا کہ میں نے کہا ماوراالنہر میں، وہ تمہیں اس البم میں ملا اس کی تصویر اسی حقیقی انداز میں کی گئی ہے۔ جہاں تک الشتے کی کتاب کے خوب صورت گھوڑے کی بات ہے، وہ ہرات کے استادوں کے بنائے گئے حیرت انگیز گھوڑوں کی طرح ایرانی انداز میں بنائے گئے تھے۔ بلاشبہ یہ ایک خوب صورت تصویر ہے اور اس کی مثال کہیں ڈھونڈنی مشکل ہوگی۔ یہ منگول گھوڑا نہیں ایرانی گھوڑا ہے۔"

"لیکن ان کے نتھنے حقیقی منگول گھوڑے کی طرح کٹے ہوئے ہیں۔" میں نے سرگوشی کی۔

"یہ واضح ہے کہ دو سو سال قبل جب منگول پسپا ہوئے اور تیمور اور اس کی آل اولاد کے دور کا آغاز ہوا، ہرات کے پرانے استادوں میں سے ایک نے ایک خوب صورت گھوڑے کی تصویر بنائی جس کے نتھنے کٹے ہوئے تھے —— منگول گھوڑے کے زیر اثر جو اس نے دیکھا تھا یا پھر کسی دوسرے مثنی ایچر فنکار سے متاثر ہو کر جس نے کٹے ہوئے نتھنوں والا گھوڑا بنایا تھا۔ کسی کو بھی وثوق سے علم نہیں کہ کس کتاب کے کس صفحے پر اور کس شاہ کے لیے وہ تصویر بنائی گئی تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ کتاب اور تصویر کی بے حد تعریف کی گئی اور پسند کیا گیا تھا —— کون جانتا ہے شاید حرم میں سلطان کی منظور نظر نے تعریف کی ہو —— اور یہ کہ وہ اس وقت دا استادی تھے؛ میں اس پر بھی قائل ہوں کہ اسی وجہ سے تمام اوسط درجے کے مثنی ایچروں نے رشک و حسد سے خود کلامی کرتے ہوئے اس گھوڑے کی نقل کی اور اس کی کئی تصویریں بنائیں۔ اس طور پر کٹے نتھنوں والا حیرت انگیز گھوڑا بتدریج فنکاروں کے ذہنوں پر نقش ایک نمونہ بن گیا۔ اس کتاب خانے میں۔ برسوں بعد جنگ میں ان کے حکمرانوں کی شکست کی بعد افسردہ عورتوں کی طرح ان مصوروں نے دوسرے حربوں کا استعمال کیا، نئے ممالک میں کام کرنے کے لیے نئے شاہ اور شہزادے تلاش کیے اور اپنے ہمراہ اپنی یادوں میں محفوظ ان گھوڑوں کے عکس لائے جن کے نتھنے خوب صورتی سے کٹے ہوئے تھے۔ شاید مختلف کتاب خانوں میں مختلف استادوں اور مختلف انداز کے زیر اثر بہت سے فنکاروں نے اس کا کبھی استعمال نہ کیا اور

انجام کار وہ اس غیر معمولی تصویر کو بھول گئے جو اس کے باوجود ان کے ذہنوں کے کسی گوشے میں محفوظ رہی۔ تاہم دوسروں نے جو بڑے کتاب خانوں میں گئے، وہ صرف کیے ہوئے نقشوں والے خوب صورت گھوڑے بنائے۔ انہوں نے اپنے بہت سے شاگردوں کو بھی اس حوصلہ افزائی کے ساتھ یہ تصویر کشی سکھائی کہ جیسا کہ استاد یہ یوں کیا کرتے تھے۔" تو پھر اس انداز میں ایرانیوں اور عربوں کی سرزمینوں سے منگولوں اور ان کے جفاکش گھوڑوں کے پسپا ہونے کے بعد ہی، پامال اور تاراج شدہ، آتش شدہ شہروں میں نئی زندگیوں کے آغاز کے صدیوں بعد بھی، وہ مصور اسی طرح گھوڑے بناتے رہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہی معیاری طریقہ تھا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ دوسرے بھی ابھی تک فاتح منگول گھڑسوار فوج اور ان کے جنگی گھوڑوں کے ذریعہ نقشوں سے بے خبر، اسی طرح گھوڑوں کی تصویریں بناتے ہیں جیسا کہ ہم اپنے کتاب خانے میں یہ مظاہرہ کرتے ہوئے کہ یہی "معیاری طریقہ" ہے۔"

"میرے پیارے استاد،" میں نے مرعوب ہو کر کہا۔ "جیسا کہ مجھے امید تھی، آپ کے باعث یہ معمہ واقعی حل ہو رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہر فنکار کا اپنا انفرادی دستخط بھی تھا۔"

"ہر فنکار نہیں بلکہ کتاب خانے کا،" انہوں نے فخر سے کہا، "اور حتیٰ کہ ہر کتاب خانے کا بھی نہیں۔ بعض قابل رحم کتاب خانوں میں جیسا کہ بعض قابل رحم خاندانوں میں ہر کوئی برسوں یہ تسلیم کیے بغیر کہ خوشی ہم آہنگی سے جنم لیتی ہے اور اس طرح ہم آہنگی خوشی بن جاتی ہے، برسوں مختلف آوازوں میں بولتا رہتا ہے۔ ایک دوسرے سے ناخوش میاں بیوی کی طرح برسوں تک برسر پیکار رہتے ہوئے، کبھی بھی باہم اتحاد نہ کرتے ہوئے ــــ بعض مصور، چینیوں کی طرح تصویر بنانے کی کوشش کرتے ہیں، بعض ترکمانوں کی طرح اور کچھ شیرازوالوں کی طرح۔"

میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر فخر کا سایہ لہرانے لگا تھا۔ ایسے آدمی کا تاثر جو بااختیار اور طاقتور رہنا چاہتا تھا، اس کی جگہ اب زود رنج اور بے مروت تاثر نے لے لی تھی۔ میں نے اتنی دیر میں انہیں ایک قابل رحم بوڑھے میں بدلتے دیکھا تھا۔

"میرے عزیز استاد،" میں نے کہا، "یہاں استنبول میں تیس سال کے عرصے میں آپ نے چہار دانگ عالم سے بہت سے فنکار اکٹھے کیے ہیں، ہر طرح کی فطرت اور مزاج کے آدمی، اس قدر ہم آہنگی سے انجام کار آپ ایک مثالی انداز یا اسلوب کی تخلیق اور وضاحت میں کامیاب ہو گئے۔"

تھوڑی دیر ہی پہلے میں جس مرعوبیت کو پورے دل سے محسوس کر رہا تھا، اس نے تب منافقت کی جگہ کیوں لے لی جب میں نے اپنے احساسات کا اظہار کیا؟ ایک ایسا شخص جس کی صلاحیت اور مہارت ہمیں مبہوت کر دیتی ہے، ایمان داری سے کہوں تو جب وہ اپنے تمام اختیار اور اثر و رسوخ سے محروم ہو جائے تو کس قدر قابل رحم ہو جاتا ہے؟

"اب وہ بوڑھا کہاں جا چھپا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

انہوں نے یہ اس طرح موضوع بدلتے کہا کہ جیسے وہ با اختیار لوگ کرتے ہیں جو تعریف اور خوشامد سے خوش ہوتے ہیں لیکن دماغ کے کسی گوشے میں یہ بھی سمجھتے ہیں کہ انہیں یوں خوش نہیں ہونا چاہیے۔

"ایرانی داستانوں اور اسلوب کے عظیم استاد اور ماہر ہونے کے باوجود آپ نے عثمانی شان و شوکت اور طاقت کے شایان شان ایک جداگانہ انداز تخلیق کیا۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "آپ ہی ہیں جو عثمانی تلوار کی طاقت، عثمانی فتح کے خوش امید رنگ، اشیا اور ساز و سامان میں توجہ اور دلچسپی، اور آرام دہ طرز زندگی کی آزادی فن میں لے آئے۔ میرے عزیز استاد، قدیم داستانوی عظیم استادوں کے شہ پارے آپ کے ہمراہ دیکھنا میرے لیے عظیم ترین اعزاز ہے۔"

کافی عرصے تک میں اسی انداز میں سرگوشی کرتا رہا۔ بے قندیل تاریکی اور خزانے کی جھنکار بھری بے ترتیبی میں، جو کسی جنگ کے بعد کے میدان کا منظر پیش کرتا تھا، ہمارے بدن اس قدر قریب تھے کہ میری سرگوشی ایک قربت کا اظہار بن گئی۔

بعد میں، جیسا کہ بعض لوگ اپنے چہروں کے تاثرات پر قابو نہیں پا پاتے، استاد عثمان کی نگاہیں خوشی میں کھوئے کسی بوڑھے کا تاثر دینے لگیں۔ باپ والی جذبے کے ساتھ، پھر ابھی ان شدید جذبات سے کپکپاتے ہوئے جو میں اس نابینا کے لیے محسوس کر رہا تھا، میں نے دیر تک استاد عثمان کی تعریف کی۔

انہوں نے اپنی سرد انگلیوں سے میرا ہاتھ تھام لیا، بازو سہلایا اور میرے چہرے کو چھوا۔ ان کی طاقت اور عمر ان کی انگلیوں سے گزر کر مجھ تک پہنچتی محسوس ہوئی۔ میں نے دوبارہ شکورے کا سوچا جو گھر پر میری منتظر تھی۔

ایک وقت تک یونہی ساکت کھڑے ہوئے، صفحات ہمارے سامنے کھل گئے، یوں تھا جیسے میری بے اندازہ تعریف و توصیف اور ان کی خود تحسین اور خود رحمی نے ہمیں اس قدر تھکا دیا تھا کہ ہم آرام کر رہے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے سامنے خجل تھے۔

"یہ بوتا کہاں چلا گیا؟" انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

مجھے یقین تھا کہ مکار بوتا کسی طاقچے یا جھروکے میں چھپا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اسے تلاش کرتے ہوئے میں نے اپنا رخ ضرور دائیں بائیں موڑا لیکن اپنی نگاہیں پوری توجہ سے استاد عثمان پر ہی رکھیں۔ کیا وہ واقعی نابینا تھے یا وہ خود سمیت پوری دنیا کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ نابینا تھے؟ میں نے سن رکھا تھا کہ شیراز کے بعض بے ہنر اور نااہل بوڑھے استاد اپنے بڑھاپے میں نابینا ہونے کا ناٹک کرتے تاکہ عزت و احترام پا سکیں اور دوسرے ان کی ناکامیوں کے تذکرے سے گریز کریں۔

"میں یہیں مرنا پسند کروں گا۔" وہ بولے۔

"میرے عظیم استاد، میرے پیارے استاد۔" میں نے گویا خوشامد کا اظہار کیا۔ "اس دور میں

دو وار کن اور احمق تھے —— اور مزید یہ کہ وہ جانتا تھا کہ تمہارے بے وقوف انشتے کی کتاب سلطان کا اہم منصوبہ تھی۔ ان کے خوف اور خدشوں میں تصادم ہو گیا۔ اسے اپنے سلطان کا تعین کرنا چاہیے تھا یا ارض روم کے مبلغ کا؟" کسی دوسرے وقت یہ بدنصیب بچہ جسے میں اپنے ہاتھ کی پشت کی طرح خوب جانتا ہوں، میرے پاس اس الجھن کے لیے آتا جو اسے گھن کی طرح کھائے چلی جا رہی تھی۔ لیکن وہ بھی اپنے پرندے کے دماغ کے ساتھ خوب جانتا تھا کہ تمہارے انشتے کے لیے مصوری کا کام، فرنگیوں کی نقالی، میرے اور میرے گلڈ سے دھوکہ دہی پر مبنی ہوتی تھی اور یوں اس نے کسی اور محرم راز کو تلاش کیا۔ اس نے مکار اور پر عزم بگلے پر بھروسا کیا اور ایک ایسے شخص کی ذہانت اور حسن عمل سے متاثر ہونے کی غلطی کی جس کی قابلیت نے اسے متاثر کیا۔ بے چارے طلاکار کی تعریف و تحسین سے ناجائز فائدہ اٹھا کر میں نے بگلے کو بارہا نفیس آفندی کے خلاف جوڑ توڑ کرتے، سازباز کرتے دیکھا ہے۔ ان کے درمیان جو بھی بحث ہوئی، اس کا نتیجہ بگلے کے ہاتھوں نفیس آفندی کے قتل کی صورت نکلا۔ اور چوں کہ معقول عرصہ پہلے اپنے خدشات ارض رومیوں کو بتا چکا تھا، وہ انتقام کی خاطر اور اپنی طاقت کے مظاہرے کے لیے فرنگیوں سے متاثر تمہارے انشتے کو قتل کرنے نکل کھڑے ہوئے، جسے انہوں نے اپنی ساکھ کی موت کا ذمے دار سمجھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس واقعے کا زیادہ افسوس ہے۔ برسوں پہلے تمہارے انشتے نے ہمارے سلطان کو اکسایا کہ وہ وینس مصور بلائیں —— اس کا نام سیبستیانو (Sebastiano) تھا —— کہ وہ اعلیٰ حضرت کی تصویر فرنگی انداز میں بنائے یوں جیسے وہ کوئی کافر بادشاہ تھے۔ اس پر میرے وقار کی توہین میں، اس نے نمونے کی نقل کا شرمناک کام مجھے سونپا اور ہمارے سلطان کے خوف کے باعث میں نے اس تصویر کی رسوا کن نقل کی، جسے فرنگی انداز و اسلوب میں بنایا گیا تھا۔ اگر میں ویسا کرنے پر مجبور نہ کیا گیا ہوتا تو شاید میں تمہارے انشتے کی موت کا افسوس کر سکتا تھا اور آج اس بدمعاش کی تلاش میں مدد کرتا جس نے انہیں قتل کیا تھا، لیکن مجھے تمہارے انشتے کی فکر نہیں، اپنے کتاب خانے کی فکر ہے۔ تمہارا انشتے اس بات کا ذمے دار ہے کہ کیسے میرے منی ایچر فنکاروں نے —— جنہیں میں اپنی اولاد کی طرح چاہتا تھا، جن کی میں نے 25 برس تک پرجوش توجہ سے تربیت کی تھی —— مجھے اور تمام فنکارانہ روایت کو دھوکا دیا۔ ان کی طرف سے فرنگی فنکاروں کی پرجوش نقل اس جواز کے تحت کرنے کا الزام اسی پر ہے کہ "یہ ہمارے سلطان کی منشا ہے۔" وہ تمام باعث ذلت مصور تشدد کے سوا کسی چیز کے مستحق نہیں! اگر ہم منی ایچر فنکاروں کی جماعت، ہمارے سلطان کی بجائے جو ہمیں روزگار دیتے ہیں، سب سے پہلے اپنی صلاحیت اور فن کی قدر کرنا سیکھ جائیں، ہم بہشت کے دروازوں میں داخلے کی اجازت حاصل کر لیں گے۔ اب پھر، میں اس کتاب کا تنہا مطالعہ کرنا چاہوں گا۔"

استاد عثمان نے اپنا یہ آخری بیان کسی ایسے رنجیدہ اور پریشان پاشا کی طرح دیا جو فوجی شکست کا ذمے دار تھا اور اس کا سر اڑانے کا حکم جاری ہو چکا تھا۔ انہوں نے وہ کتاب کھولی جو جزمی آغا نے ان کے سامنے رکھی تھی اور سرگوشی کرتی آواز میں بولنے کو وہ صفحات پلٹانے کا حکم دیا جو وہ چاہتے تھے۔ اس

وکرم پر چھوڑ کر نہ جائے۔ جب یوسف، زلیخا کے جھوٹے الزام کے تحت گرفتار کر کے قید خانے لے جائے جا رہے تھے تو زلیخا اپنے حسین منہ میں انگلی دابے گھبراہٹ اور بے کلی کی بجائے فریب دہی اور نفسانی کشش سے کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی تھی۔ جب خوش گر افسردہ محبوب جوڑوں جیسے عشق کی کسی نظم سے ابھرے تھے، جنت کی یاد دلاتے باغ میں عشق اور مے کے سحر کا شکار ہوئے، اپنے سرخ منہ میں انگلی دابے ایک بدنیت خادمہ نے ان کی چوری چھپے جاسوسی کی۔

باوجود اس کے کہ یہ تمام منی ایچر فنکاروں کی کتابوں اور یادداشتوں میں یہ تصویر موجود ہے، کسی حسین عورت کے منہ میں دابی ہوئی انگلی ہر مرتبہ ایک مختلف حسن کا مظہر ہے۔

یہ تصویریں مجھے کس قدر تسلی دیتی ہیں؟ جب دھند کا چھپا تو میں استاد عثمان کے پاس پہنچا اور ان سے کہا: "میرے پیارے استاد، جب آپ کی اجازت سے دوبارہ پھاٹک کھلے گا تو میں چلا جاؤں گا۔"

"کیا مطلب!" وہ بولے، "ہمارے پاس ابھی بھی ایک رات اور ایک صبح ہے۔ تمہارے آنکھیں کیسے ان عظیم ترین تصویروں سے اتنی جلدی اوب گئیں جو دنیا نے کبھی دیکھی تھیں؟"

انہوں نے یہ کہتے ہوئے اپنے سامنے رکھے صفحے سے چہرہ نہ ہٹایا تھا، تاہم ان کی آنکھوں کی زردی یہ تصدیق کر رہی تھی کہ وہ رفتہ رفتہ نابینا ہو رہے تھے۔

"ہم گھوڑے کے نتھنوں کا راز جان چکے ہیں،" میں نے احترام سے کہا۔

"ہاں!" وہ بولے، "ہاں! باقی ہمارے سلطان عالی جاہ کی مزاج پر ہے۔ شاید وہ ہم سب کو معاف کر دیں گے۔"

کیا وہ مجھے قاتل قرار دیں گے؟ میں خوف کے مارے پوچھ نہ پایا کیوں کہ مجھے فکر تھی کہ وہ مجھے جانے کی اجازت نہ دیں گے۔ بدتر یہ کہ مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ وہ مجھے الزام دے سکتے تھے۔

"پرندے کا وہ پر گم گیا ہے جسے بہزاد نے خود کو نابینا کرنے کے استعمال کیا تھا،" وہ بولے۔

"امکان یہی ہے کہ بونے نے اسے اس کی جگہ پر رکھ دیا ہوگا،" میں نے کہا، "آپ کے سامنے رکھا یہ ورق شاندار ہے!"

ان کا چہرہ کسی بچے کی طرح چمک اٹھا اور وہ مسکرا دیے، "عشق میں مبتلا خسرو، جب وہ نصف شب شیریں کے محل کے سامنے گھوڑے پر سوار اس کا منتظر ہے،" انہوں نے کہا، "ہرات کے پرانے فنکاروں کے انداز میں تصویر کشی۔"

وہ اب تصویر پر یوں نگاہ دوڑا رہے ہیں جیسے اسے دیکھ سکتے ہیں، لیکن انہوں نے اپنا محدب عدسہ ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔

"کیا آپ رات کی تاریکی میں درختوں کے پتوں کی تابناکی اور شان دیکھ سکتے ہیں، ایک ایک کر کے یوں ظاہر ہوتے جیسے ان کی تصویر کشی ستاروں یا بہار کے شگوفوں کی طرح کی گئی ہو، دیوار کی آرائش

میں عاجزانہ صبر، سونے کے ورق کے استعمال میں نفاست اور پوری تصویر کی تیاری میں مجھے توازن اور جیسے
خسرو کا گھوڑا کسی دوشیزہ کی طرح شائستہ اور دلربا ہے۔ اس کے اوپر موجود کھڑکی میں اس کی محبوبہ شیریں اس
کی منتظر ہے۔ اس کی جھکی ہوئی گردن لیکن اس کا چہرہ مغرور۔ یوں جیسے محبت کرنے والوں کو تصویر کی بنت،
صورت اور ان لطیف رنگوں سے خارج ہوتی روشنی میں ہمیشہ یکساں رہتا ہے جنہیں منی ایچر فنکار نے بڑی محبت
سے استعمال کیا ہے۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ کیسے ان کے چہرے ذرا سے ایک دوسرے کی طرف مڑے ہیں جب
کہ ان کے بدن کا رخ کچھ ہماری طرف ہے — کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ تصویر میں ہیں اور یوں ہمیں
دکھائی دے رہے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ان تصویروں سے مشابہ نہیں جو ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہیں۔ اس کے
برعکس لگتا ہے جیسے وہ کسی الہامی یادداشت سے ابھرے ہیں۔ اسی سبب سے اس تصویر کے اندر ان کے
لیے وقت تھم گیا ہے۔ چاہے اس تصویر میں سنائی جانے والی کہانی کا بہاؤ کتنا ہی تیز ہو، وہ خود وہاں ابد تک
موجود رہیں گے، تمیز دار، نرم، شرمیلی نوعمر دوشیزاؤں کی طرح، اپنے ہاتھوں، بازو، سبک بدن یا حتیٰ کہ
آنکھوں سے کسی اچانک جنبش کے بغیر۔ ان کے لیے اس گہری نیلی شب میں سب کچھ منجمد ہے، تاریکی میں
ستاروں کے درمیان پرندے اڑتے ہیں، خود محبت کرنے والوں کے دلوں کی تیز دھڑکن کی طرح
پھڑپھڑاتے اور میں اسی وقت جرات کے لیے فنکار جو جانتے تھے کہ خدا کی تخلیق تاریکی ان کی آنکھوں
پر پردے کی طرح اتر رہی تھی، یہ بھی جانتے تھے کہ اگر وہ دونوں ہفتوں تک ایسی کسی تصویر کو بے حرکت
دیکھتے رہنے سے نابینا ہو گئے تو آخر کار ان کی روحیں جنت کی ابدیت میں ضم ہو جائیں گی۔"

نماز مغرب کے وقت جب خزانے کا دروازہ اسی رسم کے ساتھ اور اسی ہجوم کی نگاہوں تلے کھولا
گیا، استاد عثمان تب بھی اپنے سامنے رکھے ورق کو توجہ سے دیکھ رہے تھے، اس پرندے کو جو آسمان پر بے
حرکت تیر رہا تھا۔ لیکن اگر آپ ان کی جبینوں کی زردی دیکھتے تو آپ یہ بھی جان جاتے کہ وہ خاصے عجیب
انداز میں صفحے کو دیکھ رہے تھے، جیسا کہ بعض اوقات اپنے سامنے رکھے کھانے کو بلا دیکھے تکتے تھے۔

خزانے کے افسروں نے یہ جان کر کہ استاد عثمان اندر ہی ٹھہریں گے اور یہ کہ تیزی کی آمد دروازے
پر تھا، میری پوری تلاشی نظر انداز کر دی اور انہیں پرندے کا وہ پر نہ ملا جو میں نے اپنے زیریں لباس میں چھپا
رکھا تھا۔ جب میں محل کے صحن سے باہر استنبول کی سڑکوں پر نکلا، میں ایک ویران گزرگاہ میں آیا اور اس دہشت
خیز شے کو وہاں سے جہاں سنبھال رکھی تھی، نکالا اور اسے اپنی پٹی سے لگا لیا، جس کے ساتھ استادوں کے استاد
بہزاد نے خود کو نابینا کر لیا تھا۔ میں گلیوں میں واقعی دوڑنے لگا تھا۔

خزانے کے کمروں کی ٹھنڈک میری ہڈیوں میں اس حد تک اتر گئی تھی کہ یوں لگتا تھا کہ جیسے شہر کی
سڑکوں پر ابتدائے بہار کا خوش گوار موسم چھا گیا تھا۔ جب میں پرانے کارواں سرائے بازار کے حجام، حکیم،
پھل اور سبزی فروش کی دکانوں کے قریب سے گزرا، جو رات کو ایک ایک کر کے بند ہو رہی تھیں، میں نے
اپنی رفتار کم کر لی اور غور سے تیل کے لیمپ کی روشنی میں گرم دکانوں میں چمڑے کی چادروں،

کا جروں اور مرتبانوں کا جائزہ لیا۔

میرے الشفے کی گلی (میں ابھی بھی "شکورے کی گلی" نہ کہہ پایا، کہا کہ "میری گلی") میری دوروزی کی عدم موجودگی کے بعد مجھے زیادہ اجنبی اور عجیب لگی۔ لیکن بخیر و خوبی شکورے سے دوبارہ ملنے کی خوشی اور یہ خیال کہ آج شب وہ میرے قریب ہوگی —— چوں کہ قاتل تقریباً پکڑا جا چکا تھا —— اس نے مجھے پورے جہان کے اس قدر قریب کر دیا کہ انار کا درخت اور مرمت شدہ اور بند کھڑکی کے کواڑ دیکھنے پر، مجھے ندی کے پار کسی کو پکارنے والے کسی کسان کی طرح چلانے سے خود کو بہ مشکل روکنا پڑا۔ شکورے کو دیکھنے پر میں اپنی زبان سے پہلے الفاظ یہ سننا چاہتا تھا: "ہم جان گئے ہیں کہ بدبخت قاتل کون ہے۔"

میں نے صحن کا دروازہ کھولا۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ دروازے کی چرچراہٹ تھی، کنویں کے ڈول سے پانی پیتی بے پرواہ چڑیا کی پھڑپھڑاہٹ یا گھر کی تاریکی لیکن اس آدمی کی بجز بے حس چھٹی حس یا حسیات سے جو بارہ برس تنہا رہا تھا، میں فوراً سمجھ گیا کہ گھر پر کوئی نہ تھا۔ گلی سے اس ادراک کے باوجود کہ کوئی اکیلا رہ گیا تھا، وہ پھر سارے دروازے کھولے اور بند کرے گا، الماریاں اور حتیٰ کہ برتنوں کے ڈھکن بھی اٹھا کر دیکھے گا، بالکل یہی میں نے بھی کیا۔ میں نے حتیٰ کہ صندوقوں کے اندر بھی جھانکا۔

اس خاموشی میں واحد آواز جو مجھے سنائی دی، وہ میرے اپنے دل کی تیز دھڑکن تھی۔ اس بوڑھے کی طرح جو ہمیشہ وہی کرے گا جو اس نے پہلے کیا تھا، مجھے تسلی کا احساس ہوا جب میں نے فوراً وہ تلوار باندھ لی جو میں نے ایک ذور کہیں پڑے صندوق ... میں چھپا رکھی تھی۔ وہ ہاتھی دانت کے دستے والی تلوار تھی جو مجھے ہمیشہ ان برسوں میں جب میں نے قلم سے ... کیا، مجھے باطنی سکون اور توازن دیتی آئی تھی۔ کتابیں، جنھیں ہم سمجھتے ہیں کہ تسلی ہیں، ہمارے دکھ کو صرف مزید گہرائی بخشتی ہیں۔

میں نیچے صحن میں گیا۔ چڑیا اڑ چکی تھی۔ یوں جیسے ڈوبتے جہاز کو چھوڑتے ہوئے، میں بڑھتی ہوئی تاریکی میں خاموشی سے گھر سے نکل آیا۔

اب زیادہ بااعتماد، میرے دل نے مجھے بھاگنے اور انھیں ڈھونڈنے کا کہا۔ میں بھاگا لیکن ہجوم والی جگہوں اور مسجد کے صحنوں میں میری رفتار کم پڑ گئی، جہاں سے کسی قسم کی شغل یا تفریح کی توقع میں کتوں نے میرا پیچھا لے لیا۔

میں ہوں ایستھر

میں شام کے کھانے کے لیے مسور کی دال کا شوربہ بنا رہی تھی، جب نسیم نے کہا: "دروازے پر کوئی ملاقاتی ہے۔" میں نے جواب دیا: "خیال رکھنا کہ شوربہ جل نہ جائے۔" اور اس کے بوڑھے ہاتھ میں چمچ تھما کر اسے برتن میں اسے چلانا سکھایا۔ اگر آپ انہیں کر کے نہ دکھائیں تو وہ گھنٹوں وہیں برتن میں چمچ لیے ساکت کھڑے رہیں گے۔

جب میں نے دروازے پر قرہ کو دیکھا تو مجھے اس پر ترس کے سوا کچھ محسوس نہ ہوا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا کہ میں یہ پوچھنے سے خائف تھی کیا ہوا تھا۔

"اندر آنے کی زحمت نہ کرو۔" میں نے کہا۔ "میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔"

میں نے وہ گلابی اور زرد لباس پہنا جو میں تب زیب تن کرتی ہوں جب میں رمضان کی تقریبات، کسی اہم ضیافت اور شادیوں میں مدعو ہوں اور اپنی گٹھری بھی ساتھ لے لی۔

"میں شوربہ واپس آ کر دیکھوں گی۔" میں نے نسیم سے کہا۔

قرہ اور میں نے میرے چھوٹے سے یہودی آس پڑوس میں ایک سڑک پار کی جن کی چمنیوں سے دھواں نکل رہا تھا، جیسے ہماری کیتلیاں اپنی بھاپ باہر پھینکتی ہیں اور میں نے کہا: "شکورے کا سابق شوہر واپس آ چکا ہے۔"

قرہ خاموش ہو گیا اور ہمارے اس علاقے سے نکلنے تک خاموش ہی رہا۔ اس کا چہرہ زرد تھا، ڈھلتے دن کے رنگ جیسا۔

"وہ کہاں ہیں؟" اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

اس سوال سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ شکورے اور اس کے بچے گھر نہیں تھے۔

"وہ اپنے گھر ہیں۔" میں نے کہا۔ کیوں کہ میری مراد شکورے کے پرانے گھر سے تھی اور یہ جانتے ہوئے کہ اس سے قرہ کا دل الجھ جائے گا، میں نے اپنے بیان کے آخر میں "شاید" کا اضافہ کر کے اس کے لیے امید کا در کھول دیا۔

''کیا تم نے اس کے واپس لوٹنے والے شوہر کو دیکھا ہے؟'' اس نے میری آنکھوں کی گہرائی میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے اسے نہیں دیکھا اور نہ ہی میں نے شکورے کو گھر سے فرار ہوتے دیکھا ہے۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ جا چکے ہیں؟''

''تمہارے چہرے سے۔''

''مجھے سب کچھ بتاؤ۔'' اس نے قطعی انداز میں کہا۔

قمرو اس قدر پریشان تھا کہ میں نہ پایا کہ استھر —— جس کی آنکھیں ہمیشہ کھڑکی پر اور جس کے کان ہمیشہ زمین سے لگے تھے —— اگر وہ استھر ہی رہنا چاہتی تھی تو بھی ''سب کچھ'' نہیں بتا سکتی تھی، استھر جس نے بہت سی خواب دیکھنے والی دوشیزاؤں کے لیے شوہر تلاش کیے تھے اور بہت سے ناخوش گھروں کے دروازوں پر دستک دی تھی۔

''میں نے جو سنا وہ یہ کہ ——'' میں بولی، ''شکورے کے سابقہ خاوند کا بھائی حسن تمہارے گھر آیا تھا۔'' جب میں نے کہا ''تمہارے گھر'' تو اسے خوشی ہوئی —— ''اور شوکت کو یہ بتایا کہ اس کا باپ، جنگ سے واپس گھر آ رہا تھا اور یہ کہ وہ سہ پہر قریب لوٹ آئے گا وہ بہت پریشان ہوگا۔ شوکت نے یہ اپنی ماں کو بتایا، جس نے بڑی احتیاط سے قدم اٹھایا کہ کوئی فیصلہ کر پائی۔ سہ پہر کے وقت شوکت اپنے چچا حسن اور دادا سے ملنے گھر سے چلا گیا۔''

''تمہیں یہ سب باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟''

''کیا شکورے نے تمہیں پچھلے دو برس میں حسن کو اسے اپنے گھر واپس لانے کے منصوبوں کے بارے میں نہیں بتایا؟ ایک وقت تھا جب حسن میرے ذریعے شکورے کو خط بھیجا کرتا تھا۔''

''کیا اس نے کبھی حسن کو جواب دیا؟''

''میں استنبول میں تمام قسم کی عورتوں کو جانتی ہوں۔'' میں نے فخر سے کہا، ''کوئی بھی شکورے جتنی اپنے گھر، اپنے شوہر اور اپنی عزت و وقار سے وابستہ نہیں ہوگی۔''

''لیکن اب میں اس کا شوہر ہوں۔''

اس کی آواز میں وہی مخصوص مردانہ عدم یقین تھا جو مجھے ہمیشہ مایوس کرتا تھا۔ حیرت انگیز طور پر شکورے جس بھی طرف جاتی، دوسری جانب ریزوں میں بٹ جاتی۔

''حسن نے ایک تحریر لکھی اور شکورے تک پہنچانے کے لیے مجھے دی۔ اس میں بیان کیا گیا تھا کہ کیسے شوکت اپنے باپ کے انتظار میں گھر آ گیا تھا، کیسے شکورے نے ایک غیر قانونی تقریب میں شادی کی تھی، شوکت کس طرح اس جھوٹے شوہر کے معاملے پر ناخوش تھا جسے اس کا نیا باپ بننا تھا اور کیسے وہ بھی واپس لوٹنے والا تھا۔''

"شکورے کا ردِعمل کیا تھا؟"

"وہ بے چاری اورحان کے ہمراہ رات بھر تمہاری منتظر رہی۔"

"خیریے کا کیا ہوا؟"

"خیریے تو برسوں سے تمہاری حسین بیوی کو چلو بھر پانی میں ڈبونے کے موقع کی تلاش میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے تمہارے انشتے کے ساتھ قربت رکھی، خدا اس کی مغفرت کرے۔ جب حسن نے دیکھا کہ شکورے، ڈاکوؤں اور بھوتوں کے خوف میں تنہا رات گزار رہی تھی، اس نے میرے ذریعے ایک اور رقعہ بھیجا۔"

"اس نے کیا لکھا؟"

خدا کا شکر ہے کہ تمہاری بدقسمت ایستھر لکھ پڑھ نہیں سکتی کیوں کہ جب برہم غضب ناک آفندی اور وزیر یا پاشا یہی سوال پوچھتے ہیں تو وہ کہہ سکتی ہے:

"میں خط نہیں پڑھ پائی، ہاں مگر خط پڑھتی ہوئی خوب صورت دوشیزہ کا چہرہ ضرور پڑھا تھا۔"

"شکورے کے چہرے سے کیا پڑھا؟"

"بے بسی۔"

دیر تک ہم کچھ نہ بولے۔ رات ڈھلتے ایک الو بھوتنے سے یونانی چرچ کے گنبد پر آن بیٹھا۔ بہتی ناکوں والے آس پڑوس کے بچے میرے پیچھے اور قرہ پر ہنسے اور خود کو خوش قسمت سمجھتا ایک خارش شدہ کتا رات کے استقبال کے لیے صنوبری قطاروں کے درمیان موجود گورستان سے باہر نکلا۔

"آہستہ چلو!" میں نے بعد میں قرہ سے چلا کر کہا۔ "میں تمہاری طرح تیزی سے ان پہاڑیوں پر نہیں چڑھ سکتی۔ تم مجھے میری گٹھڑی کے ساتھ اس طرح کہاں لے جا رہے ہو؟"

"اس سے پہلے کہ تم مجھے حسن کے گھر لے کر جاؤ، میں تمہیں کچھ فیاض اور بہادر نوجوانوں کے پاس لے جا رہا ہوں تاکہ تم اپنی گٹھڑی پھیلاؤ اور ان کی خفیہ محبوباؤں کے لیے کچھ پھول دار رومال، ریشمی پیٹیاں اور نقرئی کشیدہ کاری والے بٹوے فروخت کر سکو۔"

یہ اچھی نشانی تھی کہ قرہ اس قابلِ رحم حالت میں بھی مذاق کر سکتا تھا لیکن میں اس کی ہنسی کے عقب میں موجود سنجیدگی کو بھانپ سکتی تھی۔ "اگر تم یونانی چرچ کے پاس جا رہے ہو تو میں تمہیں کبھی حسن کے گھر نہیں لے جاؤں گی۔" میں بولی، "مجھے لڑائی جھگڑوں سے سخت خوف آتا ہے۔"

"اگر تم اتنی ہی ذہانت دکھاؤ، ایستھر، جتنی تم ہمیشہ دکھاتی رہی ہو تو کبھی کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہوگا۔" اس نے کہا۔

ہم ایک سرائے سے گزرے اور لالہ باغات کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئے۔ گرد آلود سڑک کے اوپر کے حصے میں، وہ جگہ جس نے خوش باش وقت دیکھا تھا، قرہ ایک حجام کی دکان میں داخل ہوا جو

ابھی تک کھلی تھی۔ میں نے اسے تیل کے لیمپ کی روشنی میں ایک مخلص دکھائی دینے والے خوب صورت ہاتھوں والے لڑکے سے شیو کرواتے استاد حجام سے باتیں کرتے دیکھا۔ کچھ دیر بعد حجام، اس کا وجیہہ شاگرد اور بعد میں دو دوسرے آدمی اک سرائے میں ہم سے آملے۔ وہ اپنے ساتھ تلواریں اور کلہاڑیاں لائے تھے۔ شہزادے باشی (Sehzadebası) کی بغلی گلی میں دینیات کا ایک طالب علم، جس کے بارے میں میں تصور نہ کرسکتی تھی کہ ایسے معاملات میں ملوث ہوگا، تاریکی میں ہاتھ میں تلوار لیے ہم سے آن ملا۔

''کیا تم دن دھاڑے شہر کے بیچوں بیچ ایک گھر پر حملہ کرنے کا منصوبہ رکھتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''یہ دن نہیں، رات ہے۔'' قرہ نے ایسے لہجے میں کہا جو مذاقیہ سے زیادہ خوش باش تھا۔

''محض اس وجہ سے اتنے پُراعتماد نہ ہو کہ تم نے ایک گروہ اکٹھا کرلیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آؤ امید کریں کہ ہتھیاروں سے لیس اس چھوٹی سی فوج کو ینی چری آوارہ گردی کرتے ہوئے نہ دیکھ لیں۔''

''ہمیں کوئی نہ دیکھ پائے گا۔''

''گزشتہ روز ارض رومیوں نے پہلے ایک مے کدے اور پھر سائر کاپی (Sagırkapı) میں ایک خانقاہ پر حملہ کیا تھا، دونوں جگہوں پر جو ملا اسے انہوں نے زدوکوب کیا۔ ایک بوڑھا شخص سر پر لاٹھی لگنے سے ہلاک ہوگیا۔ اس گھور تاریکی میں وہ سوچ سکتے ہیں کہ تم انہی میں سے ہو۔''

''میں نے سنا ہے کہ یہ سب کچھ شکورے کو بتانے سے قبل تم (مرحوم) نفیس آفندی کے گھر گئی تھیں، اس کی بیوی سے ملیں، خدا اس پر رحم کرے اور [illegible] سے داغ دار گھوڑوں کی تصویریں دیکھیں۔ کیا نفیس آفندی، ارض روم کے مبلغ کے پیروکاروں کے ساتھ بہت وقت گزار رہا تھا؟''

''اگر میں نے نفیس آفندی کی بیوی سے بات کی تو اس [illegible] اس سے انجام کار میری بے چاری شکورے کو مدد ملتی۔'' میں نے کہا۔ ''بہر حال میں وہاں اسے جرمنی سے آئے تازہ ترین کپڑے دکھانے گئی تھی، خود کو تمہارے قانونی اور سیاسی معاملات میں اُلجھانے کے لیے نہیں — جو میرا بے چارہ دماغ بہر حال سمجھ نہیں سکتا۔''

جیسے ہی ہم چارشی کاپی کے عقب میں گلی میں داخل ہوئے، میرا دل خوف سے تیز تیز دھڑکنے لگا۔ آدھے چاند کی زرد روشنی میں اخروٹ اور شہتوت کی عریاں گیلی شاخیں چمکنے لگیں۔ جنوں اور بھوتوں کی چلائی ہوا نے میری گٹھڑی کے کناروں کو جلایا، درختوں میں سیٹیاں بجائیں اور قرب وجوار میں منتظر لیٹے کتوں تک ہمارے گروہ کی خوشبو پہنچائی۔ وہ ایک ایک کرکے بھونکنا شروع ہوگئے۔ میں نے قرہ کو گھر دکھایا۔ ہم خاموشی سے اس کی چھت اور کھڑکیوں کو گھورا کیے۔ قرہ نے آدمیوں کو گھر کے گرد، خالی باغ میں صحن کے دروازے کے دونوں اطراف اور عقب میں انجیر کے درختوں کے پیچھے مختلف جگہوں پر کھڑا کیا۔

''وہاں داخلی راستے میں ایک خبیث تاتاری بھکاری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ اندھا ہے لیکن وہ چوہوں کے مردار سے زیادہ بہتر طور پر جان لے گا کہ اس سڑک پر کون آیا اور گیا ہے۔ وہ خود سے یوں مسلسل

کہتا ہے جیسے وہ سلطان کے بے ہودہ بندروں میں سے کوئی ایک ہو۔ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوئے بغیر اسے آٹھ یا دس چاندی کے سکے دے دو اور وہ تمہیں وہ سب بتا دے گا جو وہ جانتا ہے۔''

دور فاصلے سے میں نے قرہ کو اسے سکے دیتے دیکھا، پھر اس نے اپنی تلوار بھکاری کی گردن پر رکھ دی اور اس سے سوالات پوچھنے لگا۔ اس کے بعد، مجھے معلوم نہیں کہ یہ کیسے ہوا، ایجام کا شاگرد، جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ بس گھر کو دیکھ رہا تھا، اپنی کلہاڑی کے دستے سے تاتاری کو مارنے پیٹنے لگا۔ میں کچھ دیر یہ سوچتے ہوئے دیکھتی رہی کہ یہ سب زیادہ دیر جاری نہ رہے گا لیکن تاتاری واویلا کر رہا تھا۔ میں بھاگ کر گئی اور بھکاری کو پرے کھینچ لیا قبل اس کے کہ وہ اس کی جان لے لیتے۔

''اس نے مجھے ماں کی گالی دی۔'' شاگرد نے بتایا۔

''یہ کہتا ہے کہ حسن گھر پر نہیں ہے۔'' قرہ نے کہا، ''کیا ہم اس اندھے کی بات کا بھروسا کر سکتے ہیں؟'' اس نے مجھے وہ رقعہ تھمایا جو اس نے جلدی میں لکھا تھا، ''یہ لو اسے اس گھر میں پہنچا دو، حسن کو دے دینا اور اگر وہ وہاں نہ ہو تو اس کے باپ کو۔'' اس نے کہا۔

''کیا تم نے شکورے کے لیے کچھ نہیں لکھا؟'' میں نے رقعہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''اگر میں نے اسے الگ سے رقعہ لکھا تو اس کے گھر کے مرد زیادہ مشتعل ہو جائیں گے۔'' قرہ نے کہا، ''اسے بتاؤ کہ میں نے اس کے باپ کا قاتل ڈھونڈ نکالا ہے۔''

''کیا یہ سچ ہے؟''

''بس اسے بتا دو۔''

تاتاری جو ابھی تک رو دھو اور شکایتیں کر رہا تھا، میں نے اسے پیسے دے کر چپ کروا دیا۔ ''مت بھولو جو کچھ میں نے تمہارے لیے کیا ہے۔'' یہ اور اک کرتے ہوئے کہ میں اس واقعے سے باہر نکل آئی تھی اور اب یوں مجھے جانا نہیں ہوگا، میں نے کہا۔

میں نے اپنی ناک اس معاملے میں کیوں گھسیڑی؟ دو سال قبل اورنے دروازے کے علاقے میں انھوں نے چھری لگا کر کپڑے فروخت کرنے والی کو ہلاک کر ڈالا تھا — اس کے کان کاٹنے کے بعد — کیوں کہ جس دوشیزہ کی بات اس نے کسی سے چلائی تھی، اس نے کسی دوسرے سے شادی کر لی تھی۔ میری دادی مجھے بتایا کرتی تھیں کہ ترک اکثر بلاوجہ کسی آدمی کی جان لے لیا کرتے تھے۔ مجھے اپنی عزیز ترین قبرین کے پاس جانے کی تمنا تھی، گھر پر مسور کی دال کا شوربہ پینے کی چاہ۔ اگر چہ میرے پیروں نے مزاحمت کی، میں نے سوچا کہ شکورے کیسے وہاں پیدل چل کر گھر آئی ہوگی۔ تجسس مجھے کھا رہا تھا۔

''کپڑا لے لو! میرے پاس نیا چینی ریشم ہے۔''

میں نے کھڑکیوں کے پٹ کی حرکت سے چھن کر باہر آتی نارنجی مائل روشنی دیکھی۔ دروازہ کھل گیا۔ حسن کے نرم خو باپ نے مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ گھر، امراء کے گھروں کی طرح گرم تھا۔

شکورے نے جو کھانے کی نیچی سی میز پر اپنے لڑکوں کے ساتھ بیٹھی تھی، مجھے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شکورے۔" میں نے کہا، "تمہارا شوہر ادھر ہے۔"

"کون سا والا؟"

"نئے والا۔" میں نے کہا، "اس نے گھر کو اپنے مسلح آدمیوں کے ساتھ گھیرے میں لے رکھا ہے۔ وہ حسن سے لڑنے کے لیے تیار ہیں۔"

"حسن یہاں نہیں ہے۔" زمر خوسر نے بتایا۔

"کتنی خوش نصیبی کی بات ہے! یہ دیکھو۔" میں نے کسی سلطان کے بے رحم حکم پر عمل کرتے عطار صغیر کی طرف قرہ کا رقعہ اسے دیتے ہوئے کہا۔

جب شریف سسر رقعہ پڑھ رہا تھا، شکورے بولی، "ایستھر، آؤ میں تمہارے لیے کچھ مسور کی دال کا شوربہ ڈالوں تا کہ تمہیں گرماہٹ مل سکے۔"

"مجھے مسور کی دال کا شوربہ پسند نہیں۔" میں نے پہلے ہی کہا۔ وہ جس طرح گھر کی مالک کے انداز میں بات کر رہی تھی، مجھے اچھا نہ لگا لیکن جب مجھے سمجھ آئی کہ وہ اکیلے میں مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی، میں نے تخلیہ کیا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

"قرہ کو بتاؤ کہ یہ سب شوکت کے باعث ہے۔" اس نے سرگوشی کی، "گزشتہ شب میں ساری رات قاتل کے خوف میں اورحان کے ساتھ تنہا منتظر رہی۔ اورحان صبح تک خوف سے لرزتا رہا۔ میرے بچے جدا ہو گئے تھے! کون سی ماں اپنے بچے سے جدا رہ سکتی ہے؟ جب قرہ واپس آنے میں ناکام رہا، لوگوں نے مجھے بتایا کہ ہمارے سلطان کی جانب سے تشدد کرنے والوں نے اس سے اگلوا لیا تھا اور یہ کہ اس کا میرے بابا کے قتل میں ہاتھ تھا۔"

"جب تمہارے باپ کا قتل ہوا تو کیا قرہ تمہارے ساتھ نہیں تھا؟"

"ایستھر۔" اس نے اپنی حسین سیاہ آنکھیں پوری کھول کر کہا، "میں تم سے درخواست کرتی ہوں۔ میری مدد کرو۔"

"پھر مجھے بتاؤ کہ تم یہاں واپس کیوں آئی ہو تا کہ میں سمجھوں اور مدد کر سکوں۔"

"تمہارا خیال ہے میں جانتی ہوں کہ میں کیوں واپس آئی ہوں؟" وہ بولی۔ وہ رو دینے کو تھی۔

"قرہ کا رویہ میرے بے چارے شوکت کے ساتھ اچھا نہ تھا۔" وہ بولی، "اور جب حسن نے بتایا کہ بچوں کا حقیقی باپ لوٹ آیا ہے تو میں نے اس کا یقین کر لیا۔"

لیکن میں اس کی آنکھیں دیکھ کر بتا سکتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہی تھی اور وہ جانتی تھی کہ میں بتا سکتی تھی۔ "مجھے حسن نے فریب دیا!" اس نے سرگوشی کی اور مجھے سمجھ آ گئی کہ وہ چاہتی تھی کہ میں اس سے یہ نتیجہ اخذ کروں کہ اسے حسن سے محبت تھی۔ لیکن کیا شکورے نے ادراک کیا تھا کہ وہ حسن کے بارے میں

زیادہ وہ اس لیے سوچ رہی تھی کہ اس نے قرہ سے شادی کی تھی؟

دروازہ کھلا اور نیرے تازہ پکی روٹی لیے اندر داخل ہوئی جس کی مہک کے خلاف مزاحمت نہ کی جا سکتی تھی۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو میں اس کے ناخوش تاثر کو دیکھ کر بتا سکتی تھی کہ ابھی آفندی کی موت کے بعد، وہ بے چاری — اسے فروخت کیا جا سکتا تھا نہ ہی نکالا جا سکتا تھا — شکورے کے لیے غم زدگی اور بدبختی کا ترکہ بن گئی تھی۔ کمرے میں تازہ روٹی کی مہک بھر گئی اور شکورے کا بچوں سے سامنا ہونے پر میں معاملے کی اصل تہ تک پہنچ گئی: چاہے وہ ان کا حقیقی باپ ہوتا، حسن یا قرہ، اس کا مسئلہ ایسے شوہر کی تلاش تھی جس سے وہ محبت کر سکتی۔ اس کا نتیجہ ایک ایسے باپ کی تلاش تھا جو ان لڑکوں سے محبت کر سکتا، جن دونوں کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ شکورے اپنی تمام اچھی نیت اور ارادے کے ساتھ کسی اچھے شوہر سے محبت کرنے کو تیار تھی۔

''تم وہ تلاش کر رہی ہو جو تمہارا دل چاہتا ہے۔'' میں نے بغیر سوچے کہا، ''جب کہ تمہیں اپنے دماغ کے ساتھ فیصلے کرنے کی ضرورت ہے۔''

''میں فوراً اپنے بچوں کے ساتھ قرہ کے پاس واپس جانے کو تیار ہوں۔'' وہ کہنے لگی، ''لیکن میری کچھ شرائط ہیں!'' وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی۔ ''اسے شوکت اور اورحان سے اچھا سلوک کرنا ہوگا۔ اسے میرے یہاں آنے کی وجہ نہیں پوچھنی ہوگی۔ سب سے بڑھ کر اسے ہماری شادی کی اصل شرائط کا پابند رہنا ہوگا — وہ جان جائے گا کہ میں کیا بات کر رہی ہوں۔ اس نے ایک شب مجھے تاکوں، چوروں، ڈاکوؤں اور حسن کے خلاف اپنا دفاع کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔''

''اسے ابھی تمہارے باپ کا قاتل نہیں ملا لیکن اس نے مجھے نہیں یہ بتانے کو کہا ہے کہ اس نے تلاش کر لیا ہے۔''

''کیا مجھے اس کے پاس چلے جانا چاہیے؟''

اس سے پہلے کہ میں جواب دے پاتی، سابقہ سسر جو دیر سے رقعہ پڑھ چکا تھا، بول اٹھا۔ ''قرہ آفندی کو بتا دو کہ میں اپنے بیٹے کی غیر موجودگی میں اپنی بہو کو رخصت کرنے کی ذمے داری نہیں لے سکتا۔''

''کون سا بیٹا؟'' میں نے چڑچڑے پن لیکن نرمی سے کہا۔

''حسن۔'' اس نے کہا۔ چوں کہ وہ مہذب آدمی تھا اس لیے اس کا رنگ سرخ پڑ گیا، ''میرا بیٹا ایران سے واپسی کی راہ پر ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے دیکھا ہے۔''

''حسن کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔ میں شکورے کے پیش کردہ شوربے کے دو چمچ پی چکی تھی۔

''وہ محکمہ مال کے کاتبوں، قلی مزدوروں اور دوسرے لوگوں کو اکٹھا کرتے گیا ہے۔'' اس نے مہذب مگر بھی آدمیوں کے سے بچگانہ انداز میں کہا جو جھوٹ نہیں بول سکتے۔ ''جو کچھ ارض روم میں نے کل

کیا اس کے بعد یقیناً آج رات بھی چوڑی سڑکوں پر گشت کریں گے۔"

"ہم نے ایسا کچھ نہیں دیکھا۔" میں نے دروازے کی طرف جاتے کہا۔ "کیا تمہیں بس یہی کہنا ہے؟"

میں نے سسر سے یہ سوال اسے دھمکانے کو کیا تھا لیکن شمورے بخوبی جانتی تھی کہ حقیقت میں میں اس سے مخاطب تھی۔ کیا اس کا دماغ واقعی اس قدر بگڑا ہوا تھا یا وہ کچھ چھپا رہی تھی۔ مثلاً کیا وہ حسن اور اس کے آدمیوں کی واپسی کی منتظر تھی؟ مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اس کا تذبذب اچھا لگا تھا۔

"ہمیں قرو پسند نہیں۔" شوکت نے اضافہ کیا۔ "اور اس کے بعد یہاں مت آنا ہوتی۔"

"لیکن پھر لیس والے میز پوش، پھولوں اور پرندوں کی کشیدہ کاری والے رومال کون لائے گا جو تمہاری حسین ماں کو بے حد پسند ہیں اور تمہاری پسند یہ دوسرا قمیص کا کپڑا؟" میں نے اپنی گٹھڑی کمرے کے بیچوں بیچ رکھتے ہوئے کہا۔ "جب میں واپس آؤں تو تم اسے کھول کر دیکھ سکتے ہو، جو چاہو چن لو، بلا معاوضہ۔"

واپس جاتے ہوئے میں اداس ہو گئی۔ میں نے شمورے کی آنکھوں کو اس طرح آنسوؤں سے نم کبھی نہ دیکھا تھا۔ جیسے ہی میں باہر کی سڑک سے واپس ہوئی، کیچڑ بھری سڑک پر ہاتھ میں تلوار لیے قرو نے مجھے روک لیا۔

"حسن گھر پر نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "شاید شمورے کی واپسی کا جشن منانے بازار سے شراب خریدنے گیا ہو۔ شاید وہ جلدی اپنے آدمیوں کے ہمراہ واپس آ جائے۔ اس صورت میں تمہاری خوب مار پٹائی ہوگی۔ کیوں کہ وہ پاگل ہے اور اگر اس نے اپنی وہ سرخ تلوار نکالی تو کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا کرے گا؟"

"شمورے نے کیا کہا؟"

"سسر نے کہا کہ بالکل نہیں، میں اپنی بہو کو نہیں جانے دوں گا لیکن اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو میں اس کی پرواہ نہ کرتی، شمورے کی فکر کرتی۔ تمہاری بیوی الجھن میں ہے۔ اگر تم مجھ سے پوچھتے ہو تو اس نے اپنے باپ کی وفات کے دو روز بعد یہاں ڈاکوؤں کے ڈر، حسن کی دھمکیوں اور تمہاری کچھ بتائے بنا گمشدگی کے سبب پناہ لی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسی گھر میں اپنی خوف و خدشوں کی تکلیف کے ساتھ ایک اور رات بھی نہیں گزار سکتی تھی۔ لوگوں نے اسے یہ بھی بتایا کہ اس کے باپ کی موت میں تمہارا ہاتھ تھا۔ لیکن اس کا پہلا شوہر واپس نہیں آیا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ شوکت اور یوں لگتا ہے کہ سسر کو بھی یقین تھا کہ حسن جھوٹا ہے۔ وہ تمہارے پاس واپس آنا چاہتی ہے لیکن اس کی کچھ شرائط ہیں۔"

قرو کی آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے میں نے اس کی شرائط بتا دیں۔ اس نے یوں سرکاری درباری انداز میں فوراً صاد کیا جیسے وہ واقعی کسی وزیر سے گفتگو کر رہا تھا۔

ہوئے گھر پر حملہ کر دیا۔ دو آدمی قلعہ شکن مشین لیے مرکزی دروازے پر تھے جس کی ضربیں پورے گھر میں توپ کے دھماکوں کی طرح گونج رہی تھیں۔

''تم ایک تجربہ کار اور معزز آدمی ہو۔'' میں نے اپنے ہی آنسوؤں سے حوصلہ پا کر کہا۔ ''دروازہ کھولو اور ان غصے سے دیوانے کم نسلوں کو بتاؤ کہ شکورے آ رہی ہے۔''

''کیا تم کسی غیر محفوظ خاتون، کجا کہ اپنی بہو کو جس نے تمہارے گھر میں پناہ لے رکھی ہو، باہر گلیوں میں ان کتوں کے پاس جانے دو گی؟''

''وہ خود جانا چاہتی ہے۔'' میں نے کہا۔ اپنے رومال سے میں نے اپنی ناک صاف کی جو رونے کے باعث بہنے لگی تھی۔

''اس صورت میں وہ دروازہ کھولنے اور جانے کے لیے آزاد ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں شکورے اور اس کے بچوں کے پاس بیٹھ گئی۔ ہر نئی ضرب پر دروازے پر دباؤ ڈالتے آدمیوں کا وحشت انگیز شور مزید آنسوؤں کا بہانہ بن گیا۔ بچے اونچی آواز میں رونے لگے جس سے شکورے اور میری آہ و زاری میں بھی اضافہ ہو گیا۔ پھر باہر سے آتی دھمکاتی خوف دلاتی آوازوں اور قلعہ شکن مشین کی ضربوں، جو لگتا تھا کہ گھر کو تباہ کر دے گی، کے درمیان ہم دونوں جانتی تھیں کہ ہم صرف وقت حاصل کرنے کی خاطر رو رہی تھیں۔

''میری خوب صورت شکورے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے سسر نے تمہیں اجازت دے دی ہے اور تمہارے شوہر قرہ نے تمہاری ساری شرائط تسلیم کر لی ہیں، وہ محبت سے تمہارا منتظر ہے، تمہارا اس گھر میں مزید کوئی کام نہیں۔ اپنی چادر اوڑھو، نقاب کرو، اپنا اسباب اور بچے لو اور دروازہ کھول دو تا کہ ہم خاموشی سے تمہارے گھر جا سکیں۔''

میرے اس بیان پر بچے مزید رونے دھونے لگے اور اس پر شکورے کی آنکھیں کھل گئیں۔

''مجھے حسن کا خوف ہے۔'' وہ بولی۔ ''اس کا انتقام وحشت انگیز ہو گا۔ وہ وحشی ہے۔ یاد رکھو کہ میں یہاں خود آئی تھی۔''

''اس سے تمہاری نئی شادی منسوخ نہیں ہو جاتی۔'' میں نے کہا۔ ''تم بے بس ہو گئی تھیں، یقیناً تمہیں کہیں نہ کہیں پناہ لینی ہی تھی۔ تمہارے شوہر نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ وہ تمہارے واپس لے جانے کو تیار ہے۔ جہاں تک حسن کی بات ہے، ہم اس سے ویسے ہی نمٹ لیں گے جیسے برسوں نمٹتے آئے ہیں۔'' میں مسکرائی۔

''لیکن میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔'' اس نے کہا۔ ''کیوں کہ تب مجھے اپنی رضا و منشا سے اس کے ساتھ واپس لوٹنا ہو گا۔''

''میری پیاری شکورے، میں بھی دروازہ نہیں کھول سکتی۔'' میں نے کہا۔ ''میری طرح تم بھی

اپنے (مرحوم) باپ کے کمرے میں بند کرلیا اور اگرچہ ہم نے مدد کے لیے قرہ کو پکارا، لیکن وہ آیا نہ ہی اس کے آدمی۔ شکورے کے اس پر راضی ہونے پر کہ شوکت اپنے چچا حسن کا یاقوت کے دستے والا خنجر ساتھ لے جاسکتا ہے، لڑکا ہمارے ساتھ گھر سے جانے پر راضی ہوگیا۔

’’حسن اور اس کی سرخ تلوار سے ڈرو۔‘‘ سسر نے شکست اور انتقامی جذبے کی بجائے فکرمندی سے کہا۔ اس نے اپنے دونوں پوتوں کو گلے لگا کر بوسہ دیا اور شکورے کے کان میں سرگوشی کی۔

جب میں نے شکورے کو آخری بار گھر کے دروازے، دیواروں اور چولہے پر نظر دوڑاتے دیکھا۔ مجھے ایک مرتبہ پھر یاد آیا کہ اس نے اسی جگہ پر اپنی زندگی کے خوش باش ترین دن اپنے پہلے شوہر کے ساتھ گزارے تھے۔ لیکن کیا وہ یہ بھی بتا سکتی تھی کہ یہی گھر ان قابل رحم دو تنہا آدمیوں کی پناہ گاہ بھی تھا اور یہ کہ یہاں موت کی بو آتی تھی؟ میں اس کے ہمراہ واپس نہ گئی کیوں کہ اس نے یہاں واپس آکر میرا دل توڑ دیا تھا۔

وہ رات کی سردی اور تاریکی نہیں تھی جس نے بن باپ کے دو بچوں اور تین عورتوں ـــــ ایک خادمہ، ایک یہودن اور ایک بیوہ ـــــ کو [illegible] یا تھا بلکہ وہ آس پڑوس کا عجیب و غریب علاقہ تقریباً ناقابل گزر راستے اور حسن کا خوف تھا۔ ہمارا ہجوم قرہ کے [illegible]میوں کی حفاظت میں تھا اور خزانہ لے جاتے کارواں کی طرح ہم ذیلی رستوں، تنگ گلیوں اور اجاڑ علاقوں سے [illegible]ے تا کہ محافظوں، ینی چریوں، علاقے کے تجسس ٹھگوں، چوروں یا حسن سے بچا جاسکے۔ بعض اوقات اس تا[illegible] میں جس میں آپ اپنا ہاتھ تک سجھائی نہیں دیتا، ہم راستے کو ٹٹولتے ہوئے ایک دوسرے اور دیواروں سے ٹکراتے [illegible]۔ ہم اس احساس کے غلبے کے تحت کہ زیر زمین سے ضرور مردے، جن اور عفریت ظاہر ہو جائیں گے اور [illegible] سرد رات میں اغوا کر کے ساتھ لے جائیں گے۔ دیواروں اور بند کواڑوں کے عقب میں جنہیں ہم اندھوں کی طرح ہاتھوں سے ٹٹول رہے تھے، ہم نے رات کی سردی میں لوگوں کے خراٹوں اور کھانسنے کی آوازیں سنیں اور اصطبل میں جانوروں کے ہنہنانے اور ڈکرانے کی بھی۔

حتیٰ کہ ایستھر نے بھی جس کے لیے غریب ترین اور بدترین اضلاع بھی اجنبی نہ تھے، جو استنبول کی تمام گلیوں میں گھومتی پھرتی تھی ـــــ ماسوائے ان علاقوں کے جہاں دوسری جگہوں سے نقل مکانی کرکے آنے والے اور مختلف بدقسمت کمیونٹیوں کے لوگ جمع تھے ـــــ کبھی کبھار محسوس کیا کہ ہم ان گلیوں میں ہی گم یا غائب ہو جائیں گے جو تمام سیاہی میں بل کھاتی مڑ رہی تھیں۔ تاہم میں ابھی بھی کچھ گلیوں کے گوشوں کو پہچان سکتی تھی جہاں سے دن کے اوقات میں میں اپنی گٹھڑی اٹھائے گزرتی تھی، مثال کے طور پر میں نے خیاط گلی کی دیواریں پہچان لیں، نور اللہ خوجا کی ملکیتی جگہ سے ملحق اصطبل سے آتی ہوئی کھاد کی تیز بو ـــــ جو کسی وجہ سے مجھے دارچینی کی یاد دلاتی تھی ـــــ بازی گروں کی گلی کے آگ سے تباہ حال حصے، اور بازار گزرگاہ جو نابینا حاجی فوارے والے چوک کو جاتی تھی اور یوں مجھے معلوم ہوا کہ ہم شکورے کے

(مرحوم) باپ کے گھر کی جانب نہیں بلکہ کسی اور پر اسرار منزل کی طرف رواں دواں تھے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہ تھی کہ حسن اگر غصے میں آ جاتا تو کیا کرتا اور مجھے معلوم تھا کہ قرہ نے اپنے خاندان کو اس سے ——— اور قاتل کے بھوت سے چھپانے کی ایک اور جگہ تلاش کر لی تھی۔ اگر مجھے علم ہو جاتا کہ وہ جگہ کہاں تھی تو میں آپ کو ابھی بتا دیتی اور کل صبح حسن کو ——— کسی لالچ یا عداوت کے باعث نہیں بلکہ اس لیے کہ میں قائل تھی کہ شکورے پھر سے حسن کی دلچسپی چاہے گی۔ لیکن قرہ، جیسا کہ وہ ذہین تھا، اس نے اب مجھ پر بھی بھروسا نہ کیا۔

ہم غلام بازار کے عقب میں تاریک گلی سے گزر رہے تھے جب گلی کے دور کہیں کنارے پر چیخوں اور آہ و زاری کا ہنگامہ ابل پڑا۔ ہم نے دھینگا مشتی کی آوازیں سنیں اور میں نے لڑائی کے آغاز کا شور و غوغا پہچان لیا: کلہاڑیوں، تلواروں اور لاٹھیوں کے ٹکرانے کا شور اور شدید تکلیف میں چیخ و پکار۔

قرہ نے اپنی بڑی تلوار اپنے سب سے زیادہ قابل بھروسا آدمی کو تھما دی اور شوکت سے زبردستی خنجر لے لیا۔ اس پر لڑکا رونے لگا اور قرہ نے حجام کے شاگرد اور دو دوسرے آدمیوں کو شکورے، خیریے اور بچوں کو محفوظ فاصلے پر لے جانے کو کہا۔ دینیات کے طالب علم نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے ایک آسان مختصر راستے سے گھر پہنچا دے گا۔ یعنی وہ مجھے دوسروں کے ساتھ رہنے دینا نہیں چاہتا تھا۔ کیا یہ قسمت کی چال تھی یا ان کے اپنے پیچھے کے مقام کو راز رکھنے کی چالاکی بھری کوشش؟

وہاں ایک دکان تھی، جو میں سمجھی کہ ایک کافی خانہ تھا، اس تنگ گلی کے آخر میں جہاں سے ہم گزر رہے تھے۔ شاید تلواروں کی لڑائی شروع ہوتے ہی ختم ہو گئی تھی۔ اندر آتا جاتا آدمیوں کا ہجوم آوازے کس رہا تھا، پہلے مجھے خیال ہوا کہ وہ لوٹ مار کر رہے تھے لیکن نہیں وہ کافی خانے کو تباہ کر رہے تھے۔ انہوں نے احتیاط سے تمام کپ، چینل کے برتن، گلاس اور نیچی میزیں، تماشائیوں کی مشعلوں کی روشنی میں اکٹھی کیں اور احتجاج کے طور پر ان سب کو تباہ کر دیا۔ جس آدمی نے انہیں روکنے کی کوشش کی، انہوں نے اسے زد و کوب کیا لیکن وہ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ ان کا ہدف صرف کافی خانہ تھا جیسا کہ خود انہوں نے دعویٰ کیا۔ وہ اس کے برے اثرات کی مذمت کر رہے تھے کہ وہ نظر اور معدے کے لیے نقصان دہ تھا، وہ ذہانت کو ماند کر دیتا تھا اور لوگوں کو اپنے عقیدے سے پھیر دیتا تھا، یہ کس طرح فرنگیوں کے لیے زہر تھی اور کس طرح سلطان محمد نے کافی کی پیشکش ٹھکرا دی تھی، اگرچہ وہ ایک حسین عورت نے پیش کی تھی۔ ——— در پردہ شیطان۔ یوں لگتا تھا جیسے اخلاقی آداب پر شب بھر کے لیے کوئی نوٹنکی پیش کیا جا رہا تھا اور اگر میں انجام کار گھر پہنچ جاتی تو میرا خیال تھا کہ میں نیم کو ذاتی پھٹکارتی، اس کو احتیاط کرتی کہ وہ دیدہ بیں اس قدر نہ بیا کرے۔

چوں کہ وہاں قرب و جوار میں چند کمروں والے گھر اور سستے مسافر خانے تھے، تھوڑی ہی دیر میں مجسس ہجوم جمع ہو گیا جو بیکار آوارہ گردوں، بے گھر آدمیوں اور مخلوط النسل لوگوں پر مشتمل تھا جو غیر قانونی

طور پر شہر میں داخل ہوئے تھے اور انہوں نے کافی کے ان دشمنوں کی ہمت بند عادی تھی۔ تبھی میں نے یہ جانا کہ وہ لوگ ارض روم کے مبلغ حضرت حوجا کے پیروکار تھے۔ ان کا ارادہ استنبول میں شراب، عصمت فروشی اور کافی کے تمام اڈے بند کرنے کا تھا اور وہ راہ وہدایت سے بھٹکے لوگوں کو سخت سزائیں دیتے، مثال کے طور پر ان کو جو درویشوں کی تقریبات کو موسیقی پر رقص کے بجانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے مذہب کے دشمنوں کو برا بھلا کہا وہ جو شیطانوں، ملحدوں، مشرکوں اور مصوروں یا تمثیل کاروں کے ساتھ اشتراک کرتے تھے۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ یہی وہ کافی خانے تھا جس کی دیواروں پر تصویریں لگی تھیں جہاں مذہب اور ارض روم کے حوجا کو بدنام کیا جاتا تھا اور ان کے عدم احترام کی کوئی حد نہ تھی۔

کافی بنانے والے کا خون سے لتھڑے چہرے والا ایک شاگرد اندر سے باہر نکلا اور مجھے خیال گزرا کہ وہ گر پڑے گا لیکن اس نے اپنی پیشانی اور رخسار سے اپنی آستین سے خون صاف کیا، ہمارے گروہ میں شامل ہوا اور حملے کو دیکھنے لگا۔ ہجوم خوف سے ذرا سا پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ قرہ نے کسی کو پہچان لیا اور بھنچا گیا۔ جب ارض روم کے لوگ منظم ہونے لگے، تب میں جان گئی کہ نئی چری یا کوئی دوسرا مسلح گروہ آنے والا تھا۔ مشعلیں بجھا دی گئیں اور ہجوم ایک الجھن زدہ بھیڑ بھاڑ میں بدل گیا۔

قرہ نے مجھے بازو سے گھسیٹا اور دینیات کے طالب علم کے ساتھ بھیج دیا۔ ''عقبی گلیوں سے جاؤ۔'' وہ کہنے لگا، ''یہ تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دے گا۔'' طالب علم جتنی جلدی ممکن ہو، کھسکنا چاہتا تھا اور ہم تقریباً بھاگ رہے تھے۔ میں قرہ کے بارے میں سوچ رہی تھی، لیکن اگر ایستھر کو منظر سے ہٹا دیا جائے تو وہ غالباً کہانی کو جاری نہیں رکھ سکتی، ہے ناں؟

میں، ایک عورت

میں آپ کے اعتراضات پہلے ہی سن سکتا ہوں: ''میرے عزیز داستان گو آفندی! تم کسی بھی شخص یا شے کی نقالی کر سکتے ہو گے لیکن کسی عورت کی بھی نہیں!'' تاہم میں اختلاف کر سکتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں رات کے قلیل وقت میں شادیوں، جشن یا میلوں اور کافی خانوں میں ہر شے کا سوانگ بھرتے ہوئے شہر شہر گھوما ہوں، یہاں تک کہ میری آواز جواب دے گئی اور یوں شادی کرنا کبھی میرے مقدر میں نہ تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں عام عورتوں سے شناسا نہیں ہوں۔

میں خواتین کو بخوبی جانتا ہوں، اور ان میں سے چار کو تو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں، ان کے چہرے دیکھے اور ان سے باتیں کر چکا ہوں۔ 1: میری ماں، خدا اسے ابدی سکون دے، 2: میری پیاری پھوپھی، 3: میرے بھائی کی بیوی (وہ مجھے ہمیشہ مارتا پیٹتا ہے) جس نے ان بے حد کم مواقع میں سے ایک پر کہا جن میں میں اس سے ملا، ''دفع ہو جاؤ!'' ——— وہ پہلی عورت تھی جس کی محبت میں میں گرفتار ہوا اور 4: ایک خاتون جسے اپنے سفر کے دوران قونیہ میں میں نے اچانک ایک کھلی کھڑکی میں دیکھا تھا۔ باوجود اس کے کہ میری اس سے کبھی بات نہیں ہوئی، برسوں میں نے اس کے لیے نفسانی خواہشات پالیں اور ابھی تک رکھتا ہوں۔ شاید اب تک وہ دنیا ہی سے گزر چکی ہو۔

پہلے قانونی طور پر شادی کیے بغیر، جیسا کہ ہمارا اعلیٰ مذہب ہمیں حکم دیتا ہے، کسی عورت کے بے نقاب چہرے کو دیکھنا، اس سے بات کرنا اور اس کی ہمدردی کا مشاہدہ ہم مردوں میں نفسانی خواہشوں اور گہرے روحانی درد، دونوں کی راہ کھول دیتا ہے اور یوں تمام متبادلات میں سے بہترین، عورتوں پر نگاہ رکھنا نہیں خصوصاً حسین عورتوں پر۔ نفسانی خواہشوں کا واحد علاج خوب صورت لڑکوں کی دوستی کی تلاش ہے، عورتوں کا ایک تسلی بخش متبادل اور اس دوران یہ بھی ایک پیاری عادت بن جاتا ہے۔ فرنگیوں کے شہروں میں عورتیں نہ صرف کھلے منہ بے نقاب گھومتی پھرتی ہیں بلکہ ان کے خوب صورت چمکتے بال (ان کی گردنوں کے بعد ان کا سب سے پرکشش حصہ)، ان کے بازو، ان کی خوب صورت گردنیں اور حتیٰ کہ اگر جو میں نے سنا، وہ سچ ہے تو ان کی حسین ٹانگوں کے کچھ حصے بھی، نتیجے کے طور پر ان شہروں کے مردوں کو وہاں گھومنے میں

بڑی مشکل، عجالت، خفت اور انتہائی تکلیف ہوتی ہے کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ہیجان میں رہتے ہیں اور اس وجہ سے قدرتی طور پر ان کا معاشرہ مفلوج ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ یہی وجہ ہے کہ فرنگی کافر آئے روز کوئی نہ کوئی قلعہ ہم عثمانیوں کے سامنے ہار دیتے ہیں۔

نوجوانی ہی میں یہ ادراک کر لینے کے بعد کہ میری روحانی خوشی اور اطمینان کی بہترین ترکیب حسین عورتوں سے دور رہنا تھی، اس مخلوق کے بارے میں میرا تجسس بڑھتا گیا۔ اس وقت چونکہ میں نے اپنی ماں اور خالہ کے سوا کسی عورت کو نہ دیکھا تھا، میرے تجسس نے ایک پراسراری صوفیانہ خاصیت حاصل کر لی۔ میرا سر جھنجھنانے لگا اور میں نے جانا کہ میں صرف اسی طور معلوم کر سکتا تھا کہ عورتیں کیسے محسوسات رکھتی ہیں، اگر میں وہی کرتا جو وہ کرتی ہیں، وہی کھاتا جو وہ کھاتی ہیں، وہی کہتا جو وہ کہتی ہیں، ان کے رونے اور بڑبڑانے کی نقالی کرتا اور ہاں اگر میں ان کے لباس پہنتا۔ اس طرح ایک جمعہ کے روز جب میری ماں، باپ، بڑا بھائی اور پھوپھی، فیرنگ کے ساحلوں پر میرے دادا کے گلاب کے باغ میں گئے، میں نے انہیں بتایا کہ میں بیمار تھا اور اس بہانے گھر رہ گیا۔

"چلو، چلو آؤ۔ دیکھو تم وہاں قینوں، درختوں اور گھوڑوں کی نقالی کر کے ہماری تفریح کا سامان کرو گے۔ ویسے بھی تم یہاں اکیلے کیا کرو گے؟" میری مرحومہ ماں نے کہا تھا۔

یہ تو ناممکن ہی تھا کہ میں کہتا، "پیاری ماں میں آپ کا لباس پہنوں اور لڑکی بنوں گا۔" سو میں نے کہا کہ "میرے پیٹ میں درد ہے۔"

"اتنے بزدل مت ہو۔" میرے بابا نے کہا۔ "ساتھ چلو، ہم کشتی لڑیں گے۔"

میرے مصور اور خطاط بھائیو، میں اب آپ سے بیان کروں گا کہ ان سب کے جانے کے بعد جب میں نے اپنی مرحومہ ماں اور پھوپھی کے لباس پہنے تو کیا محسوس کیا اور اس کے ساتھ ساتھ عورت ہونے کے متعلق راز جو میں نے اس روز معلوم کیے۔ پہلے مجھے سچائی سے کہنے دیجیے کہ آج تک ہم جو کتابوں میں پڑھتے اور مبلغوں سے سنتے آ رہے ہیں، اس کے برعکس جب آپ عورت ہوں تو آپ شیطان کے جیسا بالکل بھی محسوس نہیں کرتے۔

بالکل بھی نہیں! جب میں نے اپنی ماں کے گلاب کے پھولوں سے کڑھے ہوئے اودی زیریں لباس پہنے، فلاح و اطمینان کا ایک نرم احساس مجھ پر حاوی ہو گیا اور میں نے خود کو ان کے جتنا حساس دل محسوس کیا۔ میری پھوپھی کی پستئی سبز رنگ کی ریشمی قمیص جو انہوں نے خود بھی نہ پہنی تھی، اس کے میری جلد سے چھونے پر مجھے تمام بچوں کے لیے ندویا پایا جانے والا بے قابو انس محسوس ہوا، بشمول خود میرے۔ میں ہر کسی کی دیکھ بھال کرنا اور ساری دنیا کے لیے کچھ پکانا چاہتا تھا۔ جب مجھے کسی حد تک یہ سمجھ آئی کہ گداز چھاتی سے کیا مراد تھی، مجھے جو کچھ مل سکا میں نے باندھ لیا — جرابیں اور دھونے کے کپڑے — تاکہ میں وہ مجہول جو مجھے تجسس کر رہا تھا کہ کسی گداز عورت کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ جب میں نے خود کو دیکھا تو وہاں میں

اعتراف کرتا ہوں کہ میں شیطان کی طرح متکبر تھا۔ میں فوراً ہی جان گیا کہ مرد محض میرا سایہ دیکھ کر ہی میرا تعاقب کریں گے اور دیوانے ہو جائیں گے۔ میں نے خود کو خاصا طاقت ور محسوس کیا لیکن میں کیا یہی چاہتا تھا؟ میں مسرور تھا، میں طاقتور بھی ہونا چاہتا تھا اور ترس و ترحم کا باعث بھی، میں کوئی امیر، طاقتور اور ذہین مرد چاہتا تھا جسے میں پہلے سے نہ جانتا اور جو میری دیوانہ وار محبت میں گرفتار ہو جاتا، تاہم مجھے ایسے مرد سے خوف بھی تھا۔ سونے کی وہ چوڑیاں پہنتے ہوئے جو میری ماں نے جہیز کے صندوق میں پھول دار نمونوں والی کشیدہ کاری والی چادروں کے برابر لیونڈر کی خوشبو والی اونی جرابوں کے اندر چھپا رکھی تھیں، وہ غازہ استعمال کرتے ہوئے جو میری ماں عوامی حماموں سے واپسی پر اپنے رخسار چمکانے کے لیے استعمال کرتی تھی۔ اپنی پھوپھی کی بہار رنگ چادر اوڑھتے اور اپنے بال سمیٹنے کے بعد اسی چادر کے رنگ کا باریک نقاب پہنتے، میں نے صدفی فریم والے آئینے میں خود کو دیکھا اور کانپ کر رہ گیا۔ اگرچہ میں نے انہیں چھوا بھی نہیں تھا لیکن میری آنکھیں اور پلکیں بالکل کسی عورت جیسی بن گئی تھیں۔ صرف میری آنکھیں اور رخسار بے نقاب تھے لیکن میں ایک غیر معمولی پرکشش عورت تھا۔ اس نے مجھے بہت خوش کر دیا۔ میری مردانگی نے گویا پہلے ہی اس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا اور میں نفسانی ہیجان میں آ چکا تھا۔ قدرتی طور پر اس بات نے مجھے پریشان کر دیا۔

ہاتھ میں تھامے دستی آئینے میں میں نے اپنی حسین آنکھ سے ایک آنسو بہتے دیکھا اور تبھی ایک نظم درد بھرے انداز میں میرے ذہن میں آئی۔ میں اسے کبھی نہیں بھلا پاؤں گا کیوں کہ اسی لمحے قادر مطلق کے حکم سے میں نے اپنے رنج و الم کو بھلانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نظم کو کسی گیت کی طرح ردھم میں گنگنایا:

"میرا بے چین دل مغرب کی تمنا رکھتا ہے جب کہ میں مشرق میں ہوں اور مشرق کی تمنا رکھتا ہے جب میں مغرب میں ہوتا ہوں۔

جب میں مرد ہوں تو میرے بدن کے دوسرے حصے مصر رہتے ہیں کہ میں عورت ہوں اور جب میں عورت ہوتا ہوں تو یہ مصر رہتے ہیں کہ میں مرد ہوں۔

انسان ہونا کس قدر دشوار ہے، انسانی زندگی گزارنا حتیٰ کہ بدتر۔

میں صرف خود کو آگے اور پیچھے سے محظوظ کرنا چاہتا ہوں، مشرق اور مغرب دونوں سے۔"

میں کہنے کو تھا کہ "آؤ امید کریں کہ ارض روم کے برادران میرے دل سے جاری ہوتا یہ نغمہ نہ سن لیں۔" کیوں کہ وہ اسے ممنوع ٹھہرا دیں گے۔ لیکن مجھے خوف زدہ کیوں ہونا چاہیے؟ شاید وہ بالکل بھی غصہ نہ ہوں۔ میں یہ محض گپ شپ کے لیے نہیں کہہ رہا بلکہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ مشہور مبلغ اعلیٰ حضرت آفندی نے شادی شدہ ہونے کے باوجود ہم عورتوں پر خوب صورت لڑکوں کو ترجیح دی، بالکل جیسے تم حساس مصور کرتے ہو۔ میں تمہیں بس وہ بتا رہا ہوں جو میں نے سنا ہے۔ لیکن میں نے اس سب کا برا نہیں مانا کیوں کہ اس کے باوجود میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں اور وہ اس قدر بوڑھا ہے۔ اس کے دانت گر چکے ہیں اور اس کے قریب رہنے والے تو عمر لوگ بتاتے ہیں کہ اس کے منہ سے، اس جملے کے لیے معاف کیجیے گا، ورچھ

کی پشت جیسی بدبو آتی ہے۔

ٹھیک ہے پھر، میں اس کہی سنائی باتوں کو یہیں چھوڑ کر اصل معاملے کی طرف آتا ہوں۔ جیسے ہی میں نے دیکھا کہ میں کس قدر خوب صورت تھا، میں مزید کسی غلام کی طرح کپڑے اور برتن دھوتا اور گلیوں میں گھومتا نہ چاہتا تھا۔ غربت، آنسو، رنج، غم و مایوسی کے آئینے سے اداسی سے جھانکتیں بہت سی اداس اور بدصورت عورتیں تھیں۔ مجھے ضرور ایسا شوہر تلاش کرنا ہوگا جو مجھے عرش پر بٹھا دے لیکن وہ کون ہو سکتا تھا؟

یہی وجہ تھی کہ میں نے جھروکوں اور روزنوں سے پاشاؤں اور معززین کے بیٹوں کی جاسوسی شروع کی جنہیں میرے (مرحوم) والد کئی عذر اور حیلوں سے گھر مدعو کیا کرتے تھے۔ میں ایسی صورت حال چاہتا تھا کہ جس میں میں اس دو بچوں کی حسین ماں سے مشابہ ہوتا جس کو تمام منی ایچر فنکار بے حد پسند کرتے تھے۔ شاید میرے لیے یہی بہترین ہوگا کہ میں بے چاری شکورے کی کہانی بیان کروں۔ لیکن ایک منٹ ذرا ٹھہریے، میں نے آج رات درج ذیل کہانی سنانے کا وعدہ کیا تھا:

شیطان کے جال میں پھنسی عورت کی سنائی داستانِ محبت

"یہ در حقیقت کافی سادہ ہے۔ پرانی استنبول کے غریب ترین علاقوں میں سے ایک علاقے کیمر ستہ (Kemeriasta) کی ہے۔ علاقے کا ایک [illegible] باشی، چلبی احمت، واصف پاشا کا معتمد، شادی شدہ آدمی اور دو بچوں کا باپ تھا اور الگ تھلگ رہتا تھا۔ ایک [illegible] کھل کھڑکی سے اس نے ایک سیاہ بالوں، سیاہ آنکھوں، نقرئی جلد والی دراز قامت نازک بوسنیائی حسینہ کو دیکھا اور اس کا گرویدہ ہو گیا۔ لیکن عورت چوں کہ شادی شدہ تھی اس لیے اسے چلبی میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ اپنے [illegible] شوہر کی وفادار تھی۔ بدقسمت چلبی نے کسی کو بھی اپنا محرم راز بنانے سے انکار کر دیا اور گھٹے گھٹے عشق میں ڈوب گیا۔ وہ اس مے سرخ کا شکار ہو گیا جو وہ ایک یونانی سے خریدتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ آس پڑوس کے لوگوں سے اپنی محبت چھپا نہ پایا۔ پہلے پہل چوں کہ آس پڑوس کے لوگ محبت کی کہانیوں کو پسند کرتے تھے اور انہیں چلبی سے محبت تھی اور وہ اس کا احترام کرتے تھے، انہوں نے اس کی محبت کا احترام کیا، وہ یہاں وہاں اس پر ایک دو لطیفے سناتے اور اپنی زندگی میں مگن ہو جاتے۔ لیکن چلبی جو اپنے ناقابل علاج کرب پر قابو نہ پا سکا، ہر شب شراب نوشی کرنے لگتا ہے اور گھنٹوں کسی بچے کی طرح روتا، آہ و زاری کرتا ہوا اس گھر کی دہلیز پر جا بیٹھتا ہے جہاں چاندی سی جلد والی حسینہ اپنے شوہر کے ہمراہ خوشی خوشی رہتی ہے۔ آخر میں ہمسائے اس پر چوکنا ہو جاتے تھے، ہر شب جب عاشق کرب کے عالم میں روتا ہے، وہ اسے مار پیٹ سکتے اور بھگا سکتے ہیں نہ ہی تسلی دے سکتے ہیں۔ چلبی، ایک معزز شخص، کسی دوسرے کو اشتعال یا جوش دلائے بغیر اندر ہی اندر کڑھ کر رونا سیکھ لیتا ہے۔ لیکن بتدریج اس کا ناامید رنج و غم ہمسایوں کے علم میں آنے لگتا ہے، سب کا رنج و غم بن جاتا ہے۔ وہاں بسنے والے اپنی اطمینان کی کیفیت کھو دیتے ہیں اور کسی فوارے کی طرح جو چوک میں ماتمی انداز میں بہتا

ہے، خود چلبلی رنج وغم کا چشمہ بن جاتا ہے۔ ابتدا میں غم و ماتم کی باتیں سارے علاقے میں پھیل جاتی ہیں، بدلے میں بدقسمتی کی افواہ بنتے اور بعد میں تباہی کا یقین بنتے ہوئے۔ کچھ لوگ وہاں سے دور منتقل ہو جاتے ہیں، کچھ بدقسمتی کے سیلاب یا طغیانی کا تجربہ کرتے ہیں اور دیگر اپنے ہنر کی مشق میں ناکام رہتے ہیں کیوں وہ اپنا عزم و ارادہ کھو چکے ہیں۔ آس پڑوس کے خالی ہو جانے کے بعد ایک روز چاندی کی سی جلد والی حسینہ اور اس کے شوہر کو تنہا چھوڑ کر مجبوراً اور غمگین چلبلی بھی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں سے چلا جاتا ہے۔ یہ بدقسمتی، جس کا مرکز وہ حسینہ اور اس کا شوہر ہی ہیں، ان کی محبت کے شعلوں کو بجھا دیتی ہے اور اس باعث ان میں دوری آجاتی ہے۔ اگرچہ وہ اپنی باقی زندگی اکٹھے ہی رہتے ہیں مگر وہ دوبارہ کبھی خوش و خرم نہیں رہ پاتے۔"

میں یہ کہنے کو ہی تھا کہ مجھے یہ کہانی کس قدر پسند تھی کیوں کہ یہ محبت اور عورتوں کے غیر متوقع خطروں کو دکھاتی ہے، جب خدا کے واسطے، میں بھول چکا ہوں کہ میں اپنی بحث کی صلاحیت کھو چکا ہوں۔ چوں کہ میں اب ایک عورت ہوں، لہٰذا میں اب کچھ بالکل مختلف بات کہنے والا ہوں۔ ٹھیک ہے پھر، یہ کچھ یوں ہے:

اوہ، محبت کس قدر حیرت انگیز اور شان دار ہے!

اب پھر، دروازے سے اندر گھستے وہ کون ہیں؟"

مجھے ’’قتلی‘‘ کہتے ہیں

میں نے ہجوم کو دیکھا اور جان لیا کہ ارض روم والے ہم مقتی ایجیر فنکاروں کو ذبح کرنا شروع ہو چکے تھے۔

قرہ بھی ہجوم میں شامل یہ حملہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے عجیب سے آدمیوں کے ہمراہ ہاتھ میں خنجر تھامے دیکھا، جانی پہچانی کنیز افروش اور گٹھریاں اُٹھائے دوسری عورتیں بھی ساتھ تھیں۔ میرا جی چاہا کہ جا کر دیکھوں کہ کیسے انتظامیہ کو بے رحمی سے تباہ و برباد کیا گیا اور کافی خانے جانے والوں نے جب باہر نکلنے کی کوشش کی تو انہیں سفاکی سے زدوکوب کیا گیا۔ بعد میں ایک دوسرا ہجوم نالا پیٹی چیخی آن پہنچا۔ ارض روم والوں نے اپنی مشعلیں بجھائیں اور فرار ہو گئے۔

کافی خانے کی تاریک گزرگاہ پر کوئی نہ تھا اور کوئی نہیں جل رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا۔ سب کچھ بکھرا پڑا تھا۔ میرے قدموں تلے وہاں بکھرے برتنوں، گلاسوں، اور پیالوں کی کرچیاں آ گئیں۔ دیوار پر بلندی پر کیل سے لٹکا تیل کا لیمپ اس سارے ہنگامے اور افراتفری میں بجھا نہیں تھا بلکہ اس نے چھت پر کالک کے داغوں کو زیادہ روشن اور واضح کر دیا تھا۔ فرش کو تاریکی میں چھوڑتے ہوئے جہاں لکڑی کے ٹوٹے ہوئے بنچوں، ٹوٹی میزوں کے تختے اور دیگر ملبہ بکھرا پڑا تھا۔

بڑے کشن ایک دوسرے کے اُوپر رکھتے ہوئے میں اوپر پہنچا اور تیل کا لیمپ اتار لیا۔ اس کی روشنی کے دائرے میں مجھے فرش پر پڑی لاشیں دکھائی دیں۔ جب مجھے خون میں ڈوبا ایک چہرہ دکھائی دیا تو میں نے رُخ موڑ لیا۔ دوسرے کی طرف دیکھا۔ دوسرا بدن کراہ رہا تھا اور میرا لیمپ دیکھنے پر اس نے بچوں کی طرح شور کیا۔

کوئی اور بھی اندر داخل ہوا۔ پہلے میں چوکنا ہو گیا اگرچہ میں محسوس کر سکتا تھا کہ وہ قرہ تھا۔ ہم دونوں فرش پر پڑے تیسرے جسم پر جھک گئے۔ جب میں نے اس کے سر کی طرف لیمپ جھکایا، ہم نے وہی دیکھا جس کا ہمیں شبہ تھا: وہ داستان گو کو ہلاک کر چکے تھے۔

اس کے چہرے پر خون کا کوئی نشان نہ تھا، جو کہ عورت کے بھیس میں تھا لیکن اس کی ٹھوڑی،

پیشانی اور غازے سے لپے چہرے پر ضربیں لگائی گئی تھیں اور اس کی خراشوں بھری گردن دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ دونوں اطراف سے اس کے سر کے پیچھے تھے۔ یہ جاننا دشوار نہ تھا کہ ان میں سے ایک شخص نے بوڑھے کے بازو پیچھے سے جکڑ رکھے تھے جب کہ دوسرے نے اس کا گلا دبانے سے پہلے اس کے چہرے پر ضربیں لگائی تھیں۔ مجھے خیال ہوا، آیا انہوں نے کہا تھا: ''اس کی زبان کاٹ ڈالو تا کہ یہ آئندہ اعلیٰ حضرت مبلغ خوجا آفندی پر بہتان طرازی نہ کر پائے۔'' اور پھر یہی کرنے لگے تھے؟

''لیمپ ادھر لاؤ۔'' قرہ نے کہا۔ چولہے کے قریب لیمپ کی روشنی کافی پینے، چکھنے، تولنے، چھلنے والوں اور گری ہوئی کافی کے کیچڑ میں پڑے کافی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں پر پڑی۔ گوشے میں جہاں داستان گو ہر شب اپنی تصویریں آویزاں کرتا تھا، قرہ سوانگ بھرنے کے سامان، پٹی، جادوگر کے رومال اور چھڑی کو تلاش کر رہا تھا۔ قرہ نے بتایا کہ وہ تصویروں کی تلاش میں تھا اور لیمپ کو میرے چہرے سے پرے لے گیا: ہاں، یقیناً میں نے بھائی چارے کے احساس کے تحت ان میں سے دو لے لی تھیں۔ ہم ایک ایرانی ٹوپی کے سوا کچھ تلاش نہ کر پائے جو ایک مرنے والا اپنے بالکل گنجے سر پر پہنے ہوئے تھا۔

کسی اور کو نہ پا کر ہم ایک تنگ گزرگاہ سے رات کی تاریکی میں باہر نکل آئے جس کا رستہ عقبی دروازے میں کھلتا تھا۔ حملے کے دوران بہت سے ہجوم اور اندر موجود لوگ شاید اسی دروازے سے فرار ہوئے تھے لیکن بکھرے سامان اور ہر طرف پھیلے کافی کے داغ اس جانب اشارہ کرتے تھے کہ یہاں بھی خاصا جھگڑا ہوا تھا۔

یہ حقیقت کہ کافی خانے پر حملہ کیا گیا اور داستان گو کو ہلاک کر دیا گیا، رات کی دہشت خیز تاریکی کے ہمراہ اس نے مجھے اور قرہ کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ ہم دو اور گلیوں سے گزرے۔ قرہ نے لیمپ مجھے واپس پکڑا دیا پھر اس نے اپنا خنجر نکال کر میری گردن پر رکھ دیا۔

''ہم تمہارے ہی گھر جا رہے ہیں۔'' وہ بولا، ''میں اس کی تلاشی لینا چاہتا ہوں تا کہ اپنی تسلی کر سکوں۔''

''اس کی پہلے ہی تلاشی لی جا چکی ہے۔''

اس پر مشتعل ہونے کی بجائے میرا دل اسے تنگ کرنے کو چاہا۔ کیا قرہ کا میرے بارے میں رسوا کن افواہوں پر یقین کرنا اس بات کا ثبوت نہ تھا کہ وہ بھی مجھ سے حسد کرتا تھا؟ اس نے زیادہ اعتماد کے بغیر خنجر تھامے رکھا۔

میرا گھر اس سے مخالف سمت میں تھا جس پر ہم کافی خانے سے دور جا رہے تھے۔ ہم دائیں بائیں کی گلیوں میں گھسے اور خالی باغات سے گزرے جہاں نمی کی بوجھل خوشبو تھی اور تنہا درختوں میں سے گزرے جب ہم نے میرے گھر کی راہ میں آنے والی بڑی محراب کو پہچان لیا۔ ہم آدھے سے زیادہ راستہ

لے کر بیچے تھے جب قرہ رکا اور کہنے لگا: ''دو روز تک خزانے میں، استاد عثمان اور میں نے داستانوی استادوں کے شہ پاروں کا جائزہ لیا۔''

کافی دیر بعد تقریباً ہنستے ہوئے میں بولا، ''ایک خاص عمر کے بعد چاہے مصور، بہزاد کے ساتھ ایک ہی میز پر کام کرتا ہو، جو وہ دیکھتا ہے وہ اس کی نگاہوں کو خوش کر سکتا اور اس کی روح میں طمانیت اور جوش بھر سکتا ہے لیکن یہ اس کی صلاحیت کو نہیں بڑھاتا کیوں کہ کوئی شخص تصویر کشی اپنے ہاتھ سے کرتا ہے، آنکھوں سے نہیں۔ اور میری عمر میں کیا کہ استاد عثمان کی عمر، ہاتھ آسانی سے نئی چیزیں نہیں سیکھتے۔''

اس بات پر پریقین کہ میری خوب صورت بیوی میری منتظر تھی، میں باآواز بلند بولا تھا تا کہ وہ جان لے کہ میں اکیلا نہ تھا اور خود کو قرہ سے چھپا لے ـــــ اس لیے نہیں کہ میں اس تجر بردار احمق کو سنجیدگی سے لے رہا تھا۔

ہم صحن کے دروازے سے گزرے اور مجھے خیال ہوا کہ میں نے گھر میں لیمپ کی حرکت کرتی روشنی دیکھی تھی لیکن خدا کا شکر کہ اب سب کچھ تاریکی میں تھا۔ یہ اس چاقو بردار ورغے کے ہاتھوں میری خلوت کی ایسی سفاک عصمت دری تھی کہ میرے جنت جیسے گھر میں زبردستی گھس آیا تھا، جہاں میں اپنے شب و روز، بلاشبہ اپنا سارا وقت، اپنی نگاہوں کے تھک جانے تک جستجو کرتا اور مصوری کیا کرتا تھا ـــــ جس کے بعد میں اپنی محبوبہ دنیا کی سب سے حسین عورت قربت کرتا ـــــ یہ کہ میں نے قسم کھائی کہ قرہ سے انتقام لوں گا۔

لیمپ نیچے جھکاتے ہوئے اس نے میرے اوراق کا جائزہ لیا۔ ایک صفحہ جسے میں مکمل کرنے کے قریب تھا ـــــ ملامت زدہ قیدی، سلطان سے اپنے قرضوں کی زنجیروں سے رہائی اور اس کی فیاضی کے حصول کی درخواست کرتے ہوئے ـــــ میرے رنگ، میرے کام کی میز، میرے چاقو، میرے قلم تراشنے والے تختے، میرے موقلم، میری لکھنے کی میز کے گرد موجود ہر شے، دوبارہ میرے اوراق، صیقل کرنے والے پتھر، میرے قلم تراش اور میرے قلم اور کاغذ کے ڈبوں کے درمیان خالی جگہیں۔ اس نے الماریوں، صندوقوں، گدیوں کے نیچے، میری کاغذ کاٹنے والی قینچیوں کو دیکھا اور جانے سے پہلے نرم سرخ مسند اور قالین کے نیچے جھانکا، لیمپ کو ہر شے کے قریب لا لا کر اور ایک ہی جگہ کا بار بار جائزہ لے کر۔ اپنا ہتھیار پہلی بار نکالتے ہوئے اس نے جیسا کہ کہا تھا، وہ میرے پورے گھر کی تلاشی نہیں لے گا بلکہ صرف کارگاہ کی۔ بلاشبہ، کیا میں اپنی بیوی کو چھپا سکتا تھا ـــــ واحد شے جو میں چھپانا چاہتا تھا ـــــ اس کمرے میں جہاں سے وہ اب چھپ کر ہمیں دیکھ رہی تھی؟

''ایک آخری تصویر ہے جو اس کتاب سے متعلق ہے جو میرے انشتے بنوا رہے تھے۔'' وہ بولا، ''جس کسی نے انہیں قتل کیا وہ تصویر بھی چرا لے گیا۔''

''یہ دوسروں سے مختلف تھا،'' میں نے فوراً ہی کہا، ''تمہارے انشتے نے، خدا انہیں جنت نصیب

کرے، مجھ سے ایک ورق کے کونے میں درخت بنوایا تھا۔ پس منظر میں کہیں —— اور صفحے کے درمیان میں پیش منظر میں کسی اور کی تصویر تھی، شاید ہمارے سلطان کی شبیہ۔ وہ خالی جگہ جو کہ خاصی تھی، اپنی تصویر کی منتظر تھی۔ کیوں کہ پس منظری اشیا چھوٹی ہوتا تھیں، جیسا کہ فرنگی انداز میں ہوتی ہیں، وہ مجھ سے چھوٹے چھوٹے درخت بنوانا چاہتے تھے۔ جب تصویر مکمل ہوئی تو وہ کھڑکی سے دکھائی دیتی اس دنیا کا تاثر دیتی، جو بالکل بھی تصویر کشی جیسا نہ تھا۔ تبھی مجھے یہ سمجھ آئی کہ تصویر فرنگیوں کے تناظری انداز میں بنائی گئی تھی، حاشیوں اور طلا کاری نے کھڑکی کے فریم کی جگہ لے لی تھی۔"

"حاشیوں اور طلا کاری کا ذمہ دار نفیس آفندی تھا۔"

"اگر تم بھی پوچھ رہے ہو تو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اسے میں نے قتل نہیں کیا۔"

"کوئی قاتل بھی اپنا جرم قبول نہیں کرتا۔" اس نے تیزی سے کہا اور پھر مجھ سے پوچھا کہ کافی خانے پر حملے کے دوران میں کیا کر رہا تھا۔

اس نے تیل کا لیمپ مسند کے بالکل ساتھ رکھ دیا جس پر میں بیٹھا تھا، اس طرح سے کہ اس کی روشنی میرے کاغذات اور ان اوراق کے علاوہ میرے چہرے پر بھی پڑ رہی تھی جن پر میں تصویر کشی کر رہا تھا۔ وہ تاریکی میں کسی سائے کی طرح کمرے میں حرکت کر رہا تھا۔

اسے یہ سب بتانے کے علاوہ جو میں اسے بتا چکا ہوں کہ میں دراصل کافی خانے بھی کبھار جایا کرتا تھا اور اب بھی وہاں سے بس گزر رہا تھا، میں نے اسے بھی دہرا کر بتایا کہ وہاں دیوار پر آویزاں تصویروں میں سے دو میں نے بنائی تھیں —— اگرچہ میں دراصل کافی خانے آنے جانے کو ناپسند کرتا تھا۔ میں نے مزید کہا، "کیوں کہ مصوری کے فن کا انجام خود کو سزا دینے اور اپنی مذمت کرنے پر ہوتا ہے جب یہ اپنی طاقت، خود مصور کے ہنر اور مہارت، فن کے لیے اس کی محبت اور اللہ کے قرب سے اخذ کرنے کی بجائے زندگی کی برائیوں یا بدی کی ملامت کرنے اور سزا دینے کی خواہش سے اخذ کرتا ہے...... چاہے وہ ارض روم کا مبلغ ہو یا خود شیطان جو کہ ملعون ہے۔ زیادہ اہم طور پر اگر اس کافی خانے والے ہجوم نے ارض روم والوں کو ہدف نہ بنایا ہوتا تو اس پر آج شب حملہ نہ ہوتا۔"

"پھر بھی تم وہاں جاتے۔" وہ بدبخت بولا۔

"ہاں کیوں کہ میں وہاں محظوظ ہوتا تھا۔" کیا اسے شبہ تھا کہ میں کتنا مخلص تھا؟ میں نے مزید کہا، "یہ جاننے کے باوجود کہ کچھ کس قدر بدصورت اور غلط ہے، ہم آدم کی اولاد پھر بھی اس سے قابل غور حد تک لطف اُٹھاتے ہیں اور میں یہ کہتے ہوئے شرمندہ ہوں کہ میں بھی ان سستی گھٹیا تصویروں سے لطف اُٹھاتا تھا، نقالی اور شیطان کے بارے میں وہ کہانیاں، ہونے کا سکہ اور کتا، جو داستان گو کسی پیمائش اور قاعدے کے بغیر بے ڈھنگے پن سے سناتا تھا۔"

"تب بھی تم نے ان کافروں کے اڈے میں قدم بھی کیوں رکھا؟"

''اچھا پھر۔'' میں نے خود کو ایک اندرونی آواز کے سامنے دستبردار کرتے ہوئے کہا۔ بعض اوقات شک وشبے کا کوئی کیڑا مجھے کترتا ہے: جب سے مجھے کھلے عام کتاب خانے کے استادوں میں سے سب سے باصلاحیت اور سب سے زیادہ قابل مانا جا رہا تھا، نہ صرف استاد عثمان بلکہ ہمارے سلطان کی جانب سے بھی، میں دوسروں کے رشک وحسد سے اس قدر دہشت زدہ ہونے لگا کہ میں نے، چاہے کبھی کبھار ہی سہی، جہاں وہ جاتے وہاں جانے، ان سے دوستی کرنے اور ان کے جیسا بننے کی کوشش کی تاکہ وہ میرے خلاف مخاصم جذبات نہ رکھیں۔ کیا تم سمجھ گئے ہو؟ اور چوں کہ وہ مجھے ''ارض روحی'' کا نام دینے لگے ہیں تو میں ان خبیث کافروں کے اڈے جانے لگا ہوں تاکہ دوسرے اس افواہ کو اہمیت نہ دیں۔''

''استاد عثمان نے کہا کہ تم ہمیشہ یوں ظاہر کرتے ہو کہ جیسے تم اپنی صلاحیت اور قابلیت پر معذرت خواہ ہو۔''

''انہوں نے میرے بارے میں اور کیا کہا؟''

''یہ کہ تم نے چاول کے دانوں اور ہاتھوں کے ناخنوں پر چھوٹی چھوٹی ناقابل فہم تصویریں بنائی ہیں تاکہ دوسرے قائل ہو جائیں کہ تم فن کی خاطر زندگی تج چکے ہو۔ انہوں نے کہا کہ تم ہمیشہ دوسروں کو خوش کرنے کی کوشش میں ہوتے تھے کیوں کہ تم ان تحفوں پر خجل تھے جو خدا نے تمہیں عطا کر رکھا تھا۔''

''استاد عثمان، بہترادی کی سطح پر ہیں۔'' میں نے خلوص سے کہا۔ ''اور کیا کہا؟''

''انہوں نے ذرا سی ہچکچاہٹ کے بھی بغیر تمہاری غلطیوں کی نشان دہی کی۔'' بد بخت بولا۔

''تو آؤ ذرا میری غلطیاں سن لیں۔''

''انہوں نے کہا کہ اپنی غیر معمولی صلاحیت کے باوجود تم نے فن کی محبت میں نہیں بلکہ خود کو خوش کرنے کے لیے مصوری کی۔ تیا سا مصوری کے دوران تمہیں سب سے زیادہ مہمیز اس خوشی کا تصور کر کے ملتی تھی جو دیکھنے والا محسوس کرتا جب کہ تمہیں خود مصوری کرنے کی خوشی کے سبب مصوری کرنا چاہیے تھی۔''

اس بات نے میرے دل کو جھلسا دیا کہ استاد عثمان جو کچھ میرے بارے میں سوچتے تھے، اس پر انہوں نے اس قدر کھل کر میرے بارے میں ایسے گھٹیا آدمی سے بات کی تھی جس نے اپنی زندگی فن کے لیے نہیں بلکہ ایک کاتب کی حیثیت سے خطوط لکھنے اور کھوکھلی خوشامد کے لیے وقف کر دی تھی۔ قرہ نے اپنی بات جاری رکھی:

''استاد عثمان نے دعویٰ کیا کہ پرانے زمانے کے عظیم اساتذہ بھی بھی محض نئے شاہ کی اختیار، نئے شہزادے کے خبط یا نئے زمانے کے ذوق کی خاطر ان انداز اور طریقہ کاروں کو ترک نہ کرتے جو انہوں نے فن کے لیے خود کو ختم کرتے ہوئے پروان چڑھایا یا کاشت کیا تھا، یوں اپنے انداز اور طریقہ کار کو بدلنے پر مجبور ہونے سے بچنے کے لیے وہ بہادری سے خود کو اندھا کر لیتے تھے۔ اس دوران تم نے جوش وخروش اور دھوکہ کن طریقے سے میرے الضعفے کی کتاب کے اوراق کے لیے فرنگی فنکاروں کی نقل کی، اس عذر کے ساتھ کہ

یہ ہمارے سلطان کی رضا تھی۔"

"سربراہ مصور استاد عثمان کی مراد اس سب سے یقیناً بری نہ ہوگی۔" میں نے کہا۔ "میرے عزیز مہمان مجھے اپنے لیے لندن چائے بنانے کی اجازت دو۔"

میں ملحقہ کمرے میں گیا۔ میری محبوب نے چینی ریشم کا شب بسری کا وہ لبادہ جو وہ پہنے ہوئے تھی، میرے سر پر اچھال دیا جسے اس نے کپڑا فروش اسیتھر سے خریدا تھا اور مذاق میں میری نقالی کی: "میرے عزیز مہمان مجھے اپنے لیے لندن چائے بنانے کی اجازت دو۔" اور میرے قریب ہوگئی۔

میں نے ہمارے گدیلے کے قریب جو اس نے کسی امید میں بچھا رکھا تھا، فرش پر رکھے صندوق کی تہ میں گلاب کی خوشبو والی چادروں کے درمیان چھپی عقیق کے دستے والی تلوار لی اور ہتھیار کو اس کی نیام سے نکالا۔ اس کی دھار اس قدر تیز تھی کہ اگر آپ اس پر ریشمی رومال ڈالتے تو تلوار یقیناً اس آسانی سے کاٹ ڈالتی، اگر آپ اس پر سونے کا ورق رکھتے تو ٹکڑوں کے کنارے بالکل کسی مسطر کے ساتھ کٹے کناروں کی طرح سیدھے ہوتے۔

تلوار کو جتنا چھپا سکتا تھا چھپاتے ہوئے میں کتاب خانے میں واپس آیا۔ قرہ آفندی مجھ سے اپنی تفتیش پر اس قدر خوش تھا کہ وہ ابھی تک ہاتھ میں خنجر لیے سرخ مسند کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ میں نے نامکمل تصویر مسند پر رکھ دی۔

"ذرا یہ دیکھو۔" میں نے کہا۔ وہ تصویر کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے تجسس میں گھٹنوں کے بل جھک گیا۔

میں اس کے عقب میں آیا، اپنی تلوار نکالی اور اس پر اپنا تمام بوجھ ڈالتے ہوئے ایک بھرپور جنبش میں اسے زمین پر گرا دیا۔ اس کا خنجر دور جا گرا۔ اس کو بالوں سے پکڑ کر میں نے اس کا سر زمین سے لگایا اور تلوار اس کی گدی پر رکھ دی۔ میں نے قرہ کے دبلے بدن کو سیدھا کیا اور اس کا منہ فرش کی طرف کر کے اپنے بھاری بدن کا بوجھ اس پر ڈال دیا، اس کے سر پر دباؤ ڈالنے کے لیے اپنی ٹھوڑی اور دوسرے آزاد ہاتھ کا استعمال کرتے ہوئے یہاں تک کہ وہ تلوار کے تیز دھار سرے کو چھونے لگا۔ میرے ایک ہاتھ میں اس کے گھروہ بال تھے، دوسرے پر اس کی گردن کی نازک جلد پر رکھی تلوار۔ عقل مندی سے، اس نے بالکل حرکت نہ کی کیوں کہ میں اسے تبھی اور وہیں ختم کر سکتا تھا۔ اس کے گھنگھرالے بالوں سے اتنے قریب اس کی گردن کی گدی سے ...... جو کسی اور وقت ذلت آمیز چھیڑ کو دعوت دیتی ...... اور اس کے بدصورت کانوں سے، اس نے مجھے زیادہ مشتعل کر دیا: "میں اسی لمحے تم سے نجات پانے کی خواہش سے بچنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے اس کے کان میں یوں سرگوشی کی جیسے کوئی راز عیاں کر رہا ہوں۔

یہ کہ اس نے پیچھے دیکھنے کی کوشش کیے بنا کسی فرمانبردار بچے کی طرح میری بات سنی، اس نے مجھے خوش کر دیا: "تم شاہنامہ کی اس داستان کو پہچان لو گے۔" میں نے سرگوشی میں کہا، "فریدون شاہ،

جانتے بوجھتے غلطی کرتے ہوئے، اپنے بہترین علاقے اپنے دو بڑے بیٹوں اور بہترین علاقہ فارس اپنے سب سے چھوٹے بیٹے ایرج کو میراث میں دے رہا ہے۔ تور انتقام لینے کی خاطر اپنے چھوٹے بھائی ایرج کو فریب دیتا ہے جس سے وہ حسد کرتا ہے۔ قتل اس کے کہ وہ ایرج کی گردن کاٹ لے وہ بالکل میری طرح اس کے بال پکڑتا ہے اور اپنے پورے وزن کے ساتھ اس پر چڑھ بیٹھتا ہے۔ کیا تمھیں میرے جسم کا وزن محسوس ہوتا ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا لیکن قربان کی جانے والی بھیڑ کی طرح خالی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ میں بتا سکتا تھا کہ وہ سن رہا تھا اور میں مبہوت تھا: "میں نہ صرف مصوری میں ایرانی انداز اور طریقۂ کار سے وفادار ہوں بلکہ سر قلم کرنے میں بھی اور میں نے اس بے حد پسند کیے جانے والے منظر کی ایک اور نقل بھی بنائی جس میں شاہ سیاوش کی موت کی منظر کشی ہے۔"

میں نے قرہ کو بتایا جو خاموشی سے سنتا رہا کہ کیسے سیاوش نے اپنے بھائیوں سے بدلہ لینے کی تیاریاں کی تھیں، کیسے اس نے اپنا پورا محل جلا ڈالا، اپنے تمام مستحق اثاثے اور جائیداد کیسے وہ از راہ بخشش و معافی اپنی بیوی سے جدا ہو گیا، اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور جنگ پر چلا گیا، کیسے وہ جنگ ہار گیا اور اسے بالوں سے پکڑ کر زمین پر گرانے کے بعد اس کا چہرہ زمین کی طرف کیا گیا" بالکل جیسے تم اب ہو" اور کیسے اس کی گردن پر خنجر رکھا گیا، کیسے اس کے دشمنوں کے شخصوں میں یہ بحث چھڑ پڑی کہ اسے قتل کر دیا جانا چاہیے یا آزاد اور کس طرح شکست خوردہ بادشاہ خاک پر تڑپ رہا، اپنے گرفتار کرنے والوں کو سنتا رہا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا، "کیا تم تصویر کشی پسند کرتے ہو؟ قاتل کے پیچھے سے آتا ہے، جیسا کہ میں تمہارے اس پر چڑھ بیٹھتا ہے، اپنی تلوار اس کی گردن پر رکھتا ہے، اس کے بال پکڑتا اور گردن قلم کر دیتا ہے۔ تھوڑی دیر میں بہنے والا تمہارا سرخ لہو خشک زمین سے سیاہ گرد اڑاتا ہے، جہاں پھر بھی بعد میں ایک پھول کھلے گا۔"

میں خاموش ہو گیا اور دور کی گلیوں میں ہم بھاگتے ہوئے چیختے ارض رومیوں کو سن سکتے تھے۔ باہر کی وحشت نے ہم دونوں کو جو ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے تھے قریب تر کر دیا۔

"لیکن ان تمام تصویروں میں ——" میں نے قرہ کے بال زیادہ دو سختی سے کھینچتے مزید کہا، "کوئی ایسے دو آدمیوں کی عمدگی سے تصویر کشی میں دشواری کو محسوس کر سکتا ہے جو ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہوں لیکن ان کے جسم، ہماری طرح، بالکل ایک ہو گئے ہوں۔ یوں ہے جیسے غداری، بغض و عناد اور جنگ جوئی کا انتشار جو سر قلم کرنے کے جادوئی اور عالیشان لمحے سے بالکل پہلے آتا ہے، پوری طرح ان تصویروں میں نفوذ کر چکا ہے۔ حتیٰ کہ قزوین کے عظیم ترین استاد بھی ایک دوسرے پر چڑھے دو آدمیوں کی تصویر کشی میں دشواری محسوس کرتے، وہ سب کو الجھا دیتے۔ جب کہ تم اور میں، تم خود دیکھ لو ہم کہیں زیادہ خوش وضع اور نفیس ہیں۔"

''تیز دھار کاٹ رہی ہے۔'' وہ بسور کر بولا۔

''میں تمہارے دوستانہ الفاظ کا مقروض ہوں میرے عزیز لیکن یہ ایسا کچھ نہیں کر رہا۔ میں خاصا محتاط ہوں۔ میں تمہارے انداز کے حسن کو برباد کرنے کے لیے کچھ نہ کروں گا۔ محبت، موت اور جنگ کے مناظر میں جن میں پرانے عظیم اساتذہ نے ایک دوسرے سے جڑے اجسام کی ایسے کہ وہ ایک ہی تھے، تصویر کشی کی، وہ صرف ہمارے آنسو ہی نکلوا سکے۔ خود دیکھ لو: میرا سر تمہاری گردن کی گدی پر یوں جما ہے جیسے اسی کا ایک حصہ ہو۔ میں تمہارے بالوں اور تمہاری گردن کی مہک سونگھ سکتا ہوں۔ تمہارے دونوں اطراف پھیلی میری ٹانگیں تمہاری ٹانگوں کے ساتھ ایسی ہم آہنگی میں ہیں کہ دور سے دیکھنے والا ہمیں کوئی چار ٹانگوں والا خوش وضع درندہ سمجھ سکتا ہے۔ کیا تم اپنی پشت اور رانوں پر میرے وزن کا توازن محسوس کر سکتے ہو؟'' ایک بار پھر خاموشی۔ لیکن میں نے اپنی تلوار کا دباؤ نہیں بڑھایا کیوں کہ یہ بلاشبہ اس کی گردن کاٹ دیتی۔

''اگر تم چپ ہوئے تو میں مشتعل ہو کر اپنے دانت تمہارے کان میں گاڑ سکتا ہوں۔'' میں نے اسی کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

جب میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر محسوس کیا کہ وہ بولنے کو تیار تھا تو میں نے وہی سوال دوبارہ کیا: ''کیا تم اپنے جسم پر میرے وزن کا توازن محسوس کر سکتے ہو؟''

''ہاں۔''

''کیا تمہیں یہ اچھا لگا؟'' میں نے کہا، ''کیا ہم خوب صورت ہیں؟'' میں نے پوچھا، ''کیا ہم ان داستانوی سورماؤں کی طرح خوب صورت ہیں جو پرانے اساتذہ کے شہ پاروں میں موجود خوش وضعی سے ایک دوسرے کو کاٹ ڈالتے ہیں؟''

''مجھے معلوم نہیں۔'' قرہ نے کہا، ''میں ہمیں آئینے میں نہیں دیکھ سکتا۔''

جب میں نے تصور کیا کہ تھوڑے سے فاصلے پر فرش پر پڑے کافی خانے کے تیل کے لیمپ کی روشنی میں دوسرے کمرے سے ہماری بیوی ہمیں کیسے دیکھتی ہو گی تو مجھے خیال گزرا کہ میں جوش میں واقعی قرہ کا کان کاٹ کھاؤں گا۔

''قرہ آفندی، تم، جو زبردستی میرے گھر میں گھس آئے اور ہاتھ میں خنجر لیے میری خلوت میں مخل ہوئے تاکہ مجھ سے پوچھ گچھ کر سکو۔'' میں نے کہا، ''کیا تم اب میری طاقت محسوس کر سکتے ہو؟''

''ہاں اور میں یہ بھی سمجھ سکتا ہوں کہ تم بالکل درست ہو۔''

''تو پھر ایک بار پھر آگے بڑھو اور پوچھو مجھ سے جو تم جاننا چاہتے ہو۔''

''واضح کرو کہ استاد عثمان تمہیں کس طرح سہلاتے۔''

''ایک شاگرد کے طور پر میں اب سے زیادہ نرم و نازک اور خوب صورت تھا اور وہ جب مجھ پر

اسی طرح پڑھ رہا تھا جیسے اب میں تم پر۔ وہ میرے بازوؤں کو سہلاتے، بعض اوقات حتیٰ کہ مجھے تکلیف بھی پہنچاتے لیکن چوں کہ میں ان کے علم، ان کی صلاحیت و قابلیت اور طاقت سے متاثر تھا، اس لیے وہ جو بھی کرتے مجھے خوشی ہوتی اور میں نے ان کے لیے کبھی کوئی برے عزائم نہیں پالے کیوں کہ مجھے ان سے محبت تھی۔ استاد عثمان سے محبت کرنے نے مجھے فن، رنگوں، کاغذ، طلاکاری اور مصوری کے حسن اور ہر اس شے سے محبت کے قابل بنایا جس کی مصوری کی جاتی تھی اور اس طرح خود دنیا اور خدا سے محبت کرنے کے۔ استاد عثمان میرے لیے ایک باپ سے بڑھ کر ہیں۔"

"کیا وہ تمھیں اکثر مارتے پیٹتے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"باپ کے کردار میں وہ مجھے انصاف کے مناسب احساس کے ساتھ پیٹتے تھے، استاد کے طور پر، وہ مجھے تکلیف وہ حد تک مارتے تاکہ میں سزا سے سیکھ سکتا۔ درد و تکلیف اور اپنی انگلیوں کے ناخنوں پر لگتے مسطر کے خوف سے میں نے بہت سی چیزیں بہتر طور پر اور تیزی سے سیکھیں حتیٰ کہ میں اس کے بغیر اکیلے سیکھتا۔ تاکہ وہ مجھے بالوں سے پکڑ کر میرا سر دیوار سے نہ ٹکرائیں جب میں شاگرد تھا تو میں کبھی رنگ نہ گراتا، کبھی ان کا سونے کے ملمع کا پانی ضائع نہ کرتا اور ہمیشہ سبق جلدی یاد کر لیتا، مثال کے طور پر گھوڑے کی اگلی ٹانگوں کے خم یا گولائیاں، ماہر مصور کی غلطیوں کو جانچتا؛ اپنے مو قلم پابندی سے صاف کرتا اور اپنی توجہ اور توانائی اپنے سامنے موجود کاغذ پر لگاتا۔ چوں کہ اپنی صلاحیت اور ہنر کے لیے میں اس مار پیٹ کا مقروض ہوں جو مجھے ملی، بدلے میں میں اپنے شاگردوں کو کسی گناہ کا احساس کیے بغیر مارتا ہوں۔" مزید یہ کہ میں جانتا ہوں کہ طالب مار پیٹ بھی، اگر وہ شاگرد کے جوش و جذبے کو توڑ نہ دے، انجام کار اسے فائدہ پہنچاتی ہے۔"

"اس کے باوجود تم سمجھتے ہو کہ ایک وجیہہ حسین چہرے، خوب صورت آنکھوں، فرشتہ خصلت شاگرد کو بھی کبھار مارنے پیٹنے سے آپ لطف و خوشی کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور تم جانتے ہو کہ استاد عثمان نے غالباً تمہارے ساتھ ہی یہی سنسنی خیزی محسوس کی ہو، ہے ناں؟"

"بعض اوقات وہ صیقل کرنے والا پتھر لے کر ایسی قوت سے میرے کان کے پیچھے مارتے کہ میرا کان کئی روز تک بجتا رہتا اور میں نیم مبہوت سا گھومتا رہتا۔ بعض اوقات وہ اتنی سختی سے مجھے تھپڑ مارتے کہ گھنٹوں میرا رخسار دکھتا رہتا کہ مسلسل میری آنکھوں میں آنسو رہتے۔ میں کبھی نہیں بھولوں گا، پھر بھی میں اب بھی اپنے استاد سے محبت کرتا ہوں۔"

"نہیں۔" قرہ نے کہا، "تم ان پر برہم تھے۔ میرے انشتے کی فرنگیوں کی نقالی والی کتاب کے لیے تصویریں بنا کر تم نے اس اشتعال و برہمی کا بدلہ لیا جو آہستہ آہستہ تمہاری گہرائی میں جمع ہوتی رہی تھی۔"

"بچ اس کے برعکس ہے۔ مار پٹائی جو نوعمر منی ایچر فنکار اپنے استاد سے وصول کرتا ہے، وہ اسے اپنی موت تک اپنے استاد سے گہرے احترام میں باندھ دیتی ہے۔"

"سفاکی اور دغابازی سے ایرج اور سیاوش کی گردنیں عقب سے کاٹنے کا اقدام، جیسا کہ تم

میرے ساتھ کر رہے ہو، بھائیوں کی باہمی رقابت سے اُبھرا تھا اور بھائیوں کی رقابت، جیسا کہ "شاہنامہ" میں ہے، ہمیشہ کسی نا انصاف باپ سے اشتعال پاتی ہے۔"

"سچ ہے۔"

"تم استاد مصور فنکاروں کا نا انصاف باپ، وہ جس نے تمھیں ایک دوسرے کی گردنوں پر سوار کیا ہے، اب تمھیں دھوکا دینے کی تیاری میں ہے۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"آہ، میں تم سے بھیک مانگتا ہوں، یہ میری گردن کاٹ رہی ہے۔" وہ آہ و زاری کرتے بولا۔ وہ کچھ دیر کرب و اذیت میں روتا رہا۔ پھر اس نے بات دوبارہ شروع کی۔ "سچ ہے، میری گردن کاٹنا اور قربان کی گئی بھیڑ کی طرح میرا خون بہانا ایک لمحے کا کام ہوگا، لیکن اگر تم وہ سب کچھ سنے بغیر یہ کرو گے جس کی میں وضاحت کرنے والا ہوں — میرا نہیں خیال کہ تم یہ کرو گے، اف، بہت ہو گیا — تم ہمیشہ اسی اُلجھن میں رہو گے کہ میں جانے کیا کہنے والا تھا۔ مہربانی کرو، اس تلوار کو ذرا سا پرے ہٹا لو۔" میں نے پرے ہٹا لی۔ "استاد عثمان جو بچپن سے تمہارے ہر قدم پر اور تمہاری ہر سانس میں ساتھ ہے جو خوشی خوشی اپنی سرپرستی میں تمہاری خداداد قابلیت کو بہار کے کسی پھول کی طرح کھلتے پھولتے فنکاری کی معراج پر پہنچتے دیکھتے رہے ہیں، انھوں نے اب اپنے اس کتاب خانے، اس کے انداز کو بچانے کی خاطر تمہاری طرف پشت موڑ لی ہے، جس کی خاطر انھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔"

"جس روز ہم نے نفیس آفندی کو دفنایا، میں نے تمھیں تین تمثیلیں بیان کی تھیں تا کہ تم جان سکو کہ وہ شے جسے وہ "انداز یا اسلوب" کہتے ہیں، حقیقت میں کس قدر ہیبت انگیز ہے۔"

"وہ کہانیاں کسی مصور فنکار کے انفرادی انداز سے متعلق ہیں۔" قرہ نے محتاط رہتے ہوئے کہا، "جب کہ استاد عثمان پورے کتاب خانے کا ایک ہی انداز یا اسلوب رکھنے کے بارے فکر مند ہیں۔"

اس نے بیان کیا کہ کیسے سلطان نے نفیس آفندی اور اس کے انشیے کے قاتل کی تلاش کی اہمیت پر زور دیا تھا، کیسے انھیں شاہی خزانے تک کی تلاشی کی اجازت دی گئی تھی اور کس طرح استاد عثمان اس موقع کو انشیے کی کتاب کو برباد کرنے اور ان کی سزا دہی کے لیے استعمال کر رہے تھے جنھوں نے فرنگیوں کی نقل کر کے ان سے دغابازی کی تھی۔ قرہ نے مزید بتایا کہ انداز یا اسلوب کی بنیاد پر، استاد عثمان کو شک تھا کہ زیتون ہی کٹے ہوئے نتھنوں والے گھوڑے کا ذمے دار تھا لیکن سربراہ مصور کے طور پر وہ بگلے کے قصوروار ہونے کے قائل تھے اور اسے جلادوں کے حوالے کر دیتے۔ میں جان سکتا تھا کہ میری تلوار کے دباؤ تلے وہ سچ بول رہا تھا اور میرا اسے چومنے کا جی چاہا کیوں کہ وہ جو کچھ کسی بچے کی طرح بتا رہا تھا اس پر دست بردار ہو چکا تھا۔ میں نے جو سنا اس نے مجھے پریشان کیا، بگلے کے رستے سے ہٹنے کا مطلب تھا کہ استاد عثمان کی وفات کے بعد سربراہ مصور میں بن جاتا — خدا انھیں طویل عمر سے نوازے۔

میں اس پر پریشان نہ تھا کہ جو اس نے کہا وہ درست تھا ہو سکتا تھا بلکہ اس امکان نے کہ ایسا نہ ہوتا۔

قرہ کے بیان کی بنیاد کو سمجھنے کی کوشش کرتے میں یہ جاننے میں کامیاب ہوا کہ استاد عثمان نہ صرف بگلے کو قربان کرنے کو تیار تھے بلکہ مجھے بھی۔ اس حیرت انگیز امکان کو زیر غور لاتے ہوئے میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا اور مجھے اس بے حس مکمل تنہائی کی طرف کھینچ لے گیا جس نے اچانک اپنے باپ کو کھو دیا ہو۔ ہر مرتبہ جب یہ میرے دماغ میں آیا مجھے خود کو قرہ کو ذبح کرنے سے روکنا پڑا۔ میں نے قرہ یا خود سے اس نکتے پر بحث کی کوشش نہ کی۔ یہ حقیقت کہ ہم نے فرنگی استادوں سے متاثر ہو کر چند احمقانہ تصویریں بنائی تھیں، اسے ہمیں غداروں کی تیغ تک کیوں لے جانا چاہیے؟ ایک بار پھر میں نے سوچا کہ نفیس کی موت کے پس پردہ بگلا اور زیتون اور ان کے میرے خلاف منصوبے تھے۔ میں نے قرہ کی گردن سے تلوار ہٹائی۔

"چلو اکٹھے زیتون کے گھر چلیں اور اس کی پوری تلاشی لیں۔" میں نے کہا، "اگر آخری تصویر اس کے پاس ہے تو کم سے کم ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ خوف کس سے کرنا ہے۔ اگر نہیں، تو ہم اسے حمایت کے لیے ساتھ لے کر بگلے کے گھر پر دھاوا بولیں گے۔"

میں نے اسے مجھ پر بھروسا کرنے کو کہا اور یہ کہ اس کا خنجر ہم دونوں کے لیے کافی تھا۔ میں نے اسے لذان چائے کا گلاس پیش نہ کر سکنے پر معذرت چاہی۔ جب میں نے تیل کا لیمپ فرش سے اٹھایا تو ہم دونوں نے معنی خیز انداز میں اس کشن کو دیکھا جو میں نے اسے اوڑھا دیا تھا۔ میں ہاتھ میں لیمپ لیے اس کے قریب گیا اور اسے بتایا کہ اس کی گردن پر [illegible] زخم کا نشان کیسے ہماری دوستی کی نشانی ہوگا۔ اس کا ذرا سا ہی خون بہا تھا۔

ارض روم والوں اور ان کا تعاقب کرنے والوں کا شور اب بھی گلیوں میں سنا جا سکتا تھا لیکن کسی نے بھی ہم پر توجہ نہ دی۔ ہم جلد ہی زیتون کے گھر پہنچ گئے۔ ہم نے صحن کے دروازے، گھر کے دروازے اور پھر کواڑوں پر بے صبری سے دستک دی۔ گھر پر کوئی نہ تھا۔ ہم نے اتنا شور مچایا تھا کہ ہمیں یقین تھا کہ وہ یقیناً نہیں رہ رہا تھا۔ قرہ نے ہم دونوں کی سوچ کو الفاظ دیے، "کیا ہمیں اندر جانا چاہیے؟"

میں نے قرہ کے خنجر کی نوک استعمال کرتے ہوئے دروازے کے دھاتی قفل سے چھیڑ چھاڑ کی۔ پھر خنجر کو دروازے اور چوکھٹ کے درمیانی خلا میں پھنسا کر اور اس پر ہمارا سارا بوجھ ڈالتے ہوئے، ہم نے قفل توڑ دیا۔ ہمارا خیر مقدم سیلن، گرد اور تنہائی کی باس نے کیا جو برسوں میں جمع ہو گئی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں ہمیں بے ترتیب بستر، بکھری پٹیاں، رضائیں، پگڑیاں، زیریں قمیصیں، نعمت اللہ آفندی نقشبندی کی فارسی فرہنگ، پگڑیاں رکھنے کا چوبی سٹینڈ، چوڑا سا کپڑا، سوئیاں اور دھاگے، سیب کے چھلکوں سے بھرا تانبے کا چھوٹا سا کپڑا، سوئیاں اور دھاگے، سیب کے چھلکوں سے بھرا تانبے کا چھوٹا سا برتن، چند ایک کشن، مخمل کا ایک پلنگ پوش، اس کے رنگ، موقلم اور اس کی تمام اشیا دکھائی دیں۔ میں اس کے کھینچے کے کاغذات، احتیاط سے تراشے گئے ہندوستانی ورق کی پرتوں کی پرتیں اور اس کی چھوٹی سی میز پر مصوری کے اوراق کا جائزہ لینے کو تھا لیکن میں نے خود پر قابو پا لیا، اس لیے کہ قرہ مجھ سے زیادہ پرجوش تھا اور اس لیے بھی کہ میں تجربی

جانتا تھا کہ اگر کوئی ماہر منی ایچر فنکار اپنے سے کم صلاحیت کے منی ایچر فنکار کے اثاثے یا ملکیتی چیزیں دیکھے تو اسے بدشگونی اور نحس کے سوا اور کچھ نہ ملے گا۔ زیتون اتنا باصلاحیت نہیں ہے جتنا سمجھا جاتا ہے، وہ محض شوقین ہے۔ وہ اپنی قابلیت کی کمی کو بوڑھے استادوں کی عقیدت سے ڈھانپنے کی کوشش کرتا ہے۔

تاہم پرانی داستانیں صرف کسی فنکار کے تخیل کو ابھارتی ہیں، وہ ہاتھ ہے جو مصوری کرتا ہے۔

جب قرہ باریک بینی سے تمام صندوقوں کی تلاشی لے رہا تھا، کسی شے کو چھوئے بغیر میلے کپڑوں کی ٹوکریوں کی تہیں تک کھنگالتے ہوئے، میں نے زیتون کے برصہ کے تولیوں، اس کی آبنوسی کنگھی، اس کے ہاتھ صاف کرنے کے گندے تولیے، عطر گلاب کی بوتلوں، ہندوستانی نمونوں والے ایک مضحکہ خیز فالتو کپڑے، توشک والی صدریوں، ایک بھاری اور گندا سا نسوانی چغہ، تانبے کی ایک نشان زدہ طشتری، گندے قالین اور دوسرا فرنیچر، جتنی رقم وہ کماتا تھا اس حساب سے بے حد سستا اور لاپرواہ سا۔ زیتون بہت کنجوس تھا اور اپنی رقم بچا بچا کر رکھ رہا تھا یا پھر کسی طور اسے فضول برباد کر رہا تھا۔۔۔

"بالکل کسی قاتل کا گھر لگتا ہے۔" میں نے بعد میں کہا۔ "یہاں تو جائے نماز تک نہیں ہے۔"

لیکن میں یہ نہیں سوچ رہا تھا۔ قرہ نے توجہ مرکوز کی۔ "یہ ایسے آدمی کے اثاثے ہیں جسے معلوم نہیں کہ خوش کیسے ہوتا ہے۔۔۔" میں نے کہا۔ تاہم اپنے ذہن کے کسی گوشے میں میں نے افسوس سے سوچا کہ کیسے مصیبت اور بدبختی اور شیطان سے قرب نے مصوری کی [illegible] تھا۔

"یہ جاننے کے باوجود کہ مطمئن رہنے کی قیمت کیا ہے، ایک آدمی پھر بھی ناخوش ہو سکتا ہے۔" قرہ نے کہا۔

اس نے میرے سامنے معمولی سمرقند کاغذ پر بنی تصویروں کا ایک سلسلہ رکھا، جن کے پیچھے بھاری ورق لگے تھے، جو اس نے صندوق کی تہ سے نکالا تھا۔ ہم نے تصویروں کا غور سے معائنہ کیا: خراسان سے آنے والا ایک دلکش شیطان جو زیر زمین سے ظہور میں آیا تھا، ایک درخت، ایک حسین عورت، ایک کتا اور موت کی تصویر جو میں نے خود بنائی تھی۔ یہ وہ تصویریں تھیں جو مقتول داستان گو ہر شب اپنی شرمناک داستانیں سناتے ہوئے آویزاں کرتا تھا۔ قرہ کے سوال پر میں نے موت کی تصویر کی جانب اشارہ کیا جو میں نے بنائی تھی۔

"میرے انشتے کی کتاب میں یہی تصویریں ہیں۔" اس نے کہا۔

"داستان گو اور کافی خانے کے مالک دونوں نے ہر شب منی ایچر فنکاروں کی تصاویر آویزاں کرنے کی حکمت کا ادراک کر لیا۔ داستان گو ہم میں سے کسی سے ان ادنیٰ اوراق پر جلدی سے کوئی تصویر بنوا لیتا، فنی مذاق میں ہم سے تھوڑی بہت کہانی معلوم کرتا اور ہمارے بارے اور پھر کچھ اپنا مواد شامل کر کے وہ شام کے سوانگ یا داستان کا آغاز کر دیتا۔"

"تم نے اس کے لیے موت کی وہی تصویر کیوں بنائی جو تم نے میرے انشتے کی کتاب کے لیے

بنائی تھی۔"

"داستان گو کی درخواست پر ورق پر یہ ایک ہی تصویر بنائی گئی تھی، لیکن میں نے یہ اس توجہ اور محنت سے نہیں بنائی جسے میں نے انشتے کی کتاب کے لیے بنائی تھی۔ میں نے جلدی میں بنائی تھی جیسے میرے ہاتھ نے اسے بناتے محسوس کیا۔ دوسروں نے بھی شاید بذلہ سنج یا چالاک بننے کی کوشش میں انہیں اس سے سادہ تر اور ناپختہ انداز میں بنایا جیسا کہ انہوں نے اس خفیہ کتاب کے لیے بنایا تھا۔"

"کٹے ہوئے نتھنوں والا گھوڑا کس نے بنایا تھا؟" اس نے پوچھا۔

لیمپ نیچے جھکاتے ہوئے ہم نے حیرت کے عالم میں گھوڑے کو دیکھا۔ یہ انشتے کی کتاب کے لیے بنے گھوڑے سے مشابہ تھا لیکن وہ جلدی سے اور بے پرواہی میں بنایا گیا اور سادہ تر ذوق کے لیے تھا، یوں جیسے کسی نے نہ صرف کم اجرت دے کر فنکار سے جلدی میں بلکہ ناپختہ کام کروایا تھا اور میرا خیال میں اسی وجہ سے وہ زیادہ حقیقت پسندانہ گھوڑا بنانے پر مجبور ہوا تھا۔

"بگلا بہتر طور پر جانتا ہوگا کہ یہ گھوڑا کس نے بنایا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ مغرور احمق ہے، جو سبھی اچھے فنکاروں کی گپ شپ سنے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر شب کافی خانے آتا ہے۔ ہاں، یقینی طور پر، بگلے نے ہی یہ گھوڑا بنایا تھا۔"

میں نے اپنے گھر کی پریشان و بے ترتیب حالت پر اپنے فنکار بھائیوں سے معافی چاہی، یہ عذر پیش کرتے ہوئے کہ ہماری ملاقات اچانک ہوئی تھی اور میں نے انہیں بتایا کہ مجھے کس قدر افسوس تھا کہ میں انہیں خوشبو دار کافی پیش کر سکتا تھا نہ ہی میٹھی نارنجیاں کہ میری بیوی ابھی تک اندرونی کمرے میں محو خواب تھی۔ میں نے یہ اس لیے کہا تا کہ وہ زبردستی وہاں نہ جا گھسیں اور مجھے ان سے کوئی تو تو میں میں یا ہنگامہ نہ کرنا پڑے جب انہیں وہ جس کی وہ تلاش میں تھے میرے کیٹوں، کپڑے کے منہ بند تھیلے، ہندوستانی ریشم اور ململ کی تھیلیوں، ٹوکریوں اور جستی صندوق میں پڑے ایرانی نمونوں اور نسوانی کھلے لبادوں میں جنہیں وہ بڑے شوق سے الٹ پلٹ رہے تھے، قالینوں اور گدیلوں کے نیچے، تصویر کشی والے صفحات میں جو میں نے مختلف کتابوں کے لیے تیار کیے تھے اور جلد شدہ کتابوں کے اوراق کے اندر تلاش نہ کر پائیں۔

اس سب کے باوجود مجھے اعتراف کرنا ہو گا کہ مجھے یوں برتاؤ دکھا کر مسرت ملی جیسے میں ان سے خوف زدہ تھا۔ ایک فنکار کی مہارت لمحہ حال کے حسن پر بھرپور توجہ کرنے پر منحصر ہے، چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو بھی سنجیدگی سے لینا جب کہ اسی دوران اس دنیا سے دست بردار ہونا جو خود کو بہت سنجیدگی سے لیتی ہے اور یوں جیسے آئینے میں دیکھتے ہوئے فنی مذاق، دوری اور خوش بیانی کی اجازت دینا۔

چنانچہ ان کے دریافت کرنے پر میں نے بتایا کہ ہاں، جب ارض رومیوں نے اپنا حملہ شروع کیا، بیشتر شاموں کی طرح کافی خانے میں ۱۱۵ لوگوں کا ہجوم تو تھا جس میں میرے ساتھ ازیتون، ناصر مصور، جمال خطاط، دو تو عمر نائب مصور جو اپنے دن رات ان کے ساتھ گزار رہے تھے، بے مثال حسن والا شاگرد رمّی، دیگر وجیہ نو آموز، شاعروں کے حلقے سے وابستہ مجھے یا سات افراد، مے نوش، حشیش کے عادی اور درویش اور دیگر لوگ شامل تھے جو چالاکی سے مالک کو لبھا کر اس خوش گپ بد لمحہ گروہ میں شامل ہونے کی اجازت پا لیتے تھے۔ میں نے بیان کیا کہ حملے کا آغاز ہوتے ہی کیسے الجھن غالب آ گئی تھی۔ جب کسی واہیات تفریح کی آس لگائے مالک کے گرد جمع تماشائیوں کا ہجوم گھبراہٹ میں چھٹنے لگا، کسی نے بھی انتقامیہ یا زنانہ لباس پہنے بے چارے داستان گو کے دفاع کا نہ سوچا۔ کیا مجھے اس تباہی و بربادی کا غم ہوا تھا؟

"ہاں! میں مصطفیٰ مصور نے، جسے لیگلے کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، جو اپنی تمام عمر تصویر کشی کے لیے وقف کر چکا ہے، اسے ضروری سمجھا کہ ہر شب اپنے فنکار بھائیوں کے ساتھ نشست کروں اور گفتگو کروں، فنی مذاق کروں، واد و تحسین دوں، نظمیں پڑھوں اور اشارے کنایے میں فقرے بازی کروں۔" رشک و حسد کے دبیز موٹی موٹی نم آنکھوں کے پردے میں چھپے ہوئے کم عقل تتلی کی آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے میں نے کہا۔ حتیٰ کہ شاگرد کے طور پر بھی ہمارا یہ تتلی جس کی آنکھیں اب بھی کسی بچے کی طرح خوب صورت تھیں، حساس، خوب حسین تھا۔

دوبارہ ان کے مجھ سے پوچھنے پر میں نے بیان کیا کہ کیسے دوسرے روز جب داستان گو خدا اس کو جنت نصیب کرے، شہر اور آس پڑوس میں گھومتے کافی خانے میں اپنا معمول کا کام کرنا شروع ہو گیا

تھا، ایک منی ایچر فنکار نے، شاید کافی کے زیرِ اثر، دل بہلاوے کے لیے ایک تصویر دیوار پر لٹکا دی، جب زبان داستان گو نے یہ دیکھا تو اپنے ہی لطیفے کے طور پر خود کلامی شروع کر دی، جیسے وہ تصویر والا کتا تھا، اسے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ہر شب وہ استاد منی ایچر فنکاروں کی بنائی تصویروں پر داستان سنانے لگا اور مزے دار کہانیاں سناتا جو لوگ اس کے کانوں میں سرگوشی میں کہتے تھے۔ چوں کہ ارضِ روم کے مبلغ پر طعن و تشنیع فوراً ہی فنکاروں کو مسرور کر دیتے تھے جو مبلغ کے غیظ و غضب کی دہشت میں رہتے تھے اور کافی خانے میں مزید گاہک کھنچے لاتے تھے، اور اڈے کا مالک ایسی داستانوں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

انھوں نے مجھ سے ہر شب داستان گو کی طرف سے لٹکائی جانے والی تصویروں کی میری تعبیر پوچھی، وہی جو انھیں زیتون بھائی کے خالی گھر پر چھاپے کے دوران ملیں۔ میں نے بیان کیا کہ تعبیر کی کوئی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ خود زیتون، ایک بھیک مانگنے والا، چوری کرنے والا، وحشی بدبخت قلندری درویش تھا۔ سادہ و نفیس آفندی، جو حوجا آفندی کی تحقیر و فہمائش سے خوف زدہ تھا اور خصوصاً ان کے مجمعے کے آتشیں خطبات سے، ضرور اس نے ہی ارضِ رومیوں سے ان کی شکایت کی ہوگی۔ یا حتیٰ کہ زیادہ امکان اس کا ہے کہ جب نفیس نے انھیں اپنی شرارت سے رنجیدہ کا اشارہ کیا، ایک ہی مزاج کے مالک اور زیتون دونوں نے بدنصیب طلاکار سے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کیا۔ ارضِ رومیوں نے نفیس کے قتل پر مشتعل ہو کر اور شاید چوں کہ نفیس آفندی نے انھیں انشتے کی کتاب کی خبر دی تھی، انھیں قتل کا ذمے دار ٹھہرایا اور جان سے مار ڈالا اور ضرور انھوں نے ہی اپنا انتقام مکمل کرنے کے لیے کافی خانے پر حملہ کیا۔

میں نے جو کچھ کہا، اس پر سوچتی تتلی اور کیمبیر قرہ (وہ کسی بچے جیسا تھا) حتی توجہ دے رہے تھے جب انھوں نے میرے اثاثوں کو چھان مارا، وہ انت گوں کر ہر ڈھکن اٹھاتے اور کوئی پتھر بھی ہٹائے بغیر نہ چھوڑتے ہوئے؟ جب وہ اخروٹ کی لکڑی کے اس منقش صندوق کے قریب آئے جس میں میرے جوتے، زرہ، جنگجوئی کا سازوسامان تھا، تتلی کے بچگانہ چہرے پر رشک و حسد کا تاثر کھل اٹھا اور میں نے ایک بار پھر وہی اعلان کیا جو ہر کوئی پہلے سے بخوبی جانتا تھا۔ میں فوج کے ساتھ مہم پر جانے والا پہلا مسلمان مصور تھا اور پہلا جس نے مختلف فتوحات میں جو مشاہدہ کیا تھا، اس کا احتیاط و باریک بینی سے جائزہ لے کر تصویر کشی کی تھی — توپوں کی بمباری، دشمن کے قلعوں کے مینار، کافر فوجیوں کی وردیوں کے رنگ، بکھری ہوئی لاشیں، دریا کنارے کٹے ہوئے سروں کے ڈھیر اور مسلح گھڑسوار فوج کی ترتیب اور نگرانی!

جب تتلی نے مجھے اپنی زرہ پہن کر دکھانے کا کہا، میں نے فی الفور اور کسی تکلفات کے بغیر اپنی قمیص کے اوپر پہنا لبادہ اتارا، میری سیاہ خرگوش کے سمور والی زیریں قمیص، میرا زیر جامہ اور پاجامہ۔ چولہے کی روشنی میں وہ مجھے یوں دیکھ کر خوش تھے۔ میں نے صاف ستھرا لباس زیر جامہ پہنا، پھر سرد موسم میں زرہ کے نیچے پہنی جانے والی موٹی سرخ قمیص، اونی جرابیں، زرد چمڑے کے جوتے اور ان پر میرے چمڑی موزے، اسے باہر نکالتے ہوئے میں اپنا سینہ بند پہن کر مسرور ہوا، پھر میں نے اپنی پشت تتلی کی طرف کر لی

اور یوں جیسے کسی خدمت گار لڑکے کو حکم دیتے ہوئے اس سے زرہ کے فیتے سختی سے بندھوانے اور اسے میری شانہ پٹیاں باندھنے کا حکم دیا۔ میں نے اپنے آہنی دستانے، ساعد پوش، اونٹ کے بالوں والی تلوار کی کمر بند اور آخر میں سونے کے کام والا خود، جو میں تقریبات کے لیے مخصوص تھا، پہنا اور فخر سے اعلان کیا کہ اب کے بعد جنگی مناظر کی تصویر کشی اس طرح نہ کی جائے گی جیسی کہ پرانے وقتوں میں کی جاتی رہی تھی۔ ''اب مزید دو مخالف گھڑسوار افواج کی ایک ہی انداز اختیار کرتے ہوئے یکساں اور دشمن کی طاقتوں کی تصویر کشی کے لیے اسے صرف الٹ کر دکھا دینے کی تصویر کشی کی اجازت نہ ہو گی۔'' میں نے کہا: ''اب کے بعد سے، عثمانیوں کے کتاب خانوں میں بنائے جانے والے جنگی مناظر اس طور بنائے جائیں گے جیسا میں نے انہیں دیکھا اور بتایا: افواج، گھوڑوں، زرہ بکتر پہنے جنگجوؤں اور خون میں ڈوبے جسموں کا ہنگام!''

رشک و حسد کے حصار میں تتلی بولا: ''مصور وہ نہیں بناتا جو وہ دیکھتا ہے بلکہ وہ جو اللہ دیکھتا ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''اللہ کی ذات بلاشبہ وہ سب کچھ دیکھتی ہے جو ہم دیکھتے ہیں۔''

''یقیناً اللہ دیکھتا ہے جو ہم دیکھتے ہیں لیکن وہ اس طور اس کا ادراک نہیں کرتا جیسے ہم کرتے ہیں۔'' تتلی نے جیسے مجھے تحیر کرتے ہوئے کہا۔ ''ہوا جنگی منظر جیسا کہ دو حریف افواج اپنی صفوں میں ہوتی ہیں، جو ہم اپنے انتشارِ خیال میں تصور کرتے ہیں (تھا) اپنے علمِ غیب سے ادراک کرتا ہے۔''

قدرتی طور پر میرے پاس جواب تھا۔ میں کہہ رہا تھا: ''ہم پر عیاں ہوتا ہے کہ اللہ کا یقین کریں اور صرف اس کی عکاسی کریں جو وہ ہم پر آشکار کرتا ہے اور اس کی نہیں جسے وہ چھپاتا ہے۔'' لیکن میں خاموش رہا اور میں اس لیے خاموش نہ رہا تھا کہ تتلی مجھ پر اس صورت فرشتوں کی قتل کا الزام لگائے گا یا اس لیے کہ وہ اپنے خنجر کی نوک مسلسل شقاوت سے میرے خود اور پشت پر بجا رہا تھا، مبینہ طور پر میرے زرہ بکتر کو پرکھنے کے لیے بلکہ اس لیے کہ میں نے حساب کتاب لگایا تھا کہ اگر میں نے خود پر قابو پا لیا اور قرہ اور اس خوب صورت آنکھوں والے کاؤدی کو جیت لیا تو ہم مل کر زیتون کے منصوبوں سے خود کو بچا سکتے تھے۔

ایک مرتبہ جب انہیں معلوم ہو گیا کہ انہیں یہاں وہ نہیں ملے گا جس کی انہیں تلاش تھی تو انہوں نے مجھے بتا دیا کہ انہیں کس شے کی تلاش تھی۔ ایک تصویر تھی جسے نامعلوم قاتل لے کر روپوش ہو گیا تھا میں نے کہا کہ میرے گھر کی پہلے ہی اسی وجہ سے تلاشی لی جا چکی ہے، نتیجے کے طور پر عقل مند قاتل نے یقیناً وہ تصویر ایسی جگہ چھپائی ہو گی جہاں اسے کوئی تلاش نہ کر سکے (میں زیتون کا سوچ رہا تھا)۔ لیکن کیا انہوں نے میرے الفاظ پر کان دھرے؟ قرہ نے کٹے ہوئے نتھنوں والے گھوڑے کی وضاحت کی اور کیسے ہمارے سلطان نے استاد عثمان کو تین روز کا وقت دیا تھا اور اپنا قرب بھی۔ جب میں نے کٹے ہوئے نتھنوں کی اہمیت کے بارے میں مزید پوچھ گچھ کی، قرہ نے سیدھے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مجھے بتایا کہ کیسے استاد عثمان نے سراغ کے طور پر ان کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کا تعلق زیتون سے جوڑا تھا۔ اگرچہ انہیں مجھ پر زیادہ

شبہ تھا کہ وہ میرے عزائم سے ناواقف نہ تھے۔

پہلے یوں لگا جیسے وہ یہاں یقین کر کے کہ میں ہی قاتل تھا اور اس کا ثبوت تلاش کرنے آئے تھے لیکن میری رائے میں ان کی آمد کی واحد وجہ یہی نہ تھی۔ وہ اکیلے پن اور مایوسی کے عالم میں بھی میرا دروازہ بجانے آئے تھے۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو خنجر جو تتلی نے مجھ پر تان لیا تھا، اس کے ہاتھ میں لرزتا رہ گیا۔ نہ صرف یہ کہ وہ وحشت زدہ تھے، یہ سوچتے ہوئے کہ وہ ذلیل قاتل جس کی شناخت بے نقاب کرنے کے لیے وہ اس قدر تکلیف میں تھے، تاریکی میں انہیں کسی کونے میں لگا سکتا تھا، کسی پرانے دوست کی طرح مسکراتے ہوئے اور تیزی سے ان کی گردنیں کاٹ سکتا تھا، ان کی نیندیں اس خوف سے بھی اڑ رہی تھیں کہ استاد عثمان، ہمارے سلطان اور سربراہ خزانچی سے ساز باز کر کے انہیں تشدد کرنے والے کے خلاف کر سکتے تھے ــــ اس کا تو ذکر ہی نہیں کہ ارض روميوں کا ہجوم گلیوں میں گھوم رہا تھا، جس نے ان کا حوصلہ پست کر دیا۔ مختصر یہ کہ وہ میری دوستی چاہتے تھے، لیکن استاد عثمان نے ان کے ذہنوں میں اس کے برعکس خیال پختہ کر کے بٹھایا تھا۔ ان کو بتانا میرا فرض تھا کہ استاد عثمان غلطی پر تھے اور انہیں اپنے اندر گہرائی میں بہرحال اسی کی امید تھی۔

بس سیدھے سبھاؤ یہ اعلان کر دینا کہ عظیم استاد عثمان غلطی پر تھے اور یہ کہ وہ سٹھیا گئے تھے، یقیناً تتلی کی حماقت کو ہوا دیتا۔ چوں کہ وجیہہ مصوری کی آنکھوں میں جس کی چمکیں اسی حشرات الارض کی طرح ہی پھڑ پھڑاتی تھیں جس پر اسے عرف نام دیا گیا تھا، جب اس نے میری ذرہ پر خنجر رکھا، میں اب بھی اس محبت کی بجھی ہوئی آگ کو محسوس کر سکتا تھا جو وہ استاد عثمان کے لیے محسوس کرتا تھا، جن کا وہ محبوب رہا تھا۔ میری نوجوانی میں ان دونوں کی استاد اور شاگردی کی قربت کا دوسرے مذاق اڑاتے تھے، لیکن خود یہ دونوں پرواہ بھی نہ کرتے۔ وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے کی نگاہوں کی جھانکتے رہتے اور سب کے سامنے ایک دوسرے سے پیار کا اظہار کرتے۔ بعد میں بھی استاد عثمان بے تکے پن سے اعلان کیا کرتے کہ تتلی کے پاس سب سے بہترین قلم اور سب سے پختہ کار موقلم تھا۔ یہ اعلان ــــ اکثر جگہ قلم، موقلم، قلم دان اور دوات استعمال کرنے والے حاسد مگر احمق فنکاروں کے لیے بیہودہ اشاروں کنایوں، شیطانی موازنوں اور غیر مہذب استعاروں میں نہ ختم ہونے والے ذومعنی فقروں کا ذریعہ بن گیا۔ اس وجہ سے میں ایسا واحد شخص نہیں ہوں جو خیال کرتا ہے کہ استاد عثمان چاہتے ہیں کہ ان کے بعد کتاب خانے کے سربراہ کے طور پر ان کی جگہ تتلی لے۔ وہ جس طریقے سے دوسروں سے میری جنگ پسندی، نااہلیت اور نکھٹو پن کے بارے میں بات کرتے، اس سے میں عرصہ پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ عظیم استاد اپنے دماغ کے گوشے میں یہی چھپائے ہوئے تھے۔ وہ ناجائز طور پر سوچتے ہیں کہ میں تتلی اور زیتون کی نسبت فرنگی طریقوں کی طرف زیادہ رجحان رکھتا ہوں اور یہ کہتے ہوئے کبھی بھی ہمارے سلطان کی خواہشوں سے مزاحمت نہیں کر سکتا کہ "پرانے زمانے کے عظیم استاد کبھی بھی اس طرح سے مصوری نہ کرتے۔"

میں جانتا تھا کہ میں قرہ سے زیادہ قریب سے تعاون کر پاؤں گا کیوں کہ ہمارا یہ نیا مشتاق سادلوحا اپنے مرحوم انشتے کی کتاب کو مکمل کرنا چاہتا تھا، نہ صرف حسین شکورے کا دل جیتنے اور اسے یہ دکھانے کے لیے کہ وہ اس کے باپ کے جوتوں میں کھڑا ہو سکتا تھا بلکہ غالباً اس لیے بھی کہ جس طرح جلدی ممکن ہو سکے، خود ہمارے سلطان کے دل میں جگہ بنالے۔

اس لیے میں نے غیر متوقع طور پر یہ کہتے ہوئے معاملے کا تعارف کروایا کہ انشتے کی کتاب ایک مبارک معجزہ تھی جس کی دنیا میں نظیر نہیں۔ ہمارے سلطان کے فرمان اور مرحوم انشتے کی خواہش کے مطابق، جب یہ شہ پارہ مکمل ہوتا، پورا جہان نہ صرف عثمانی سلطان کی طاقت و دولت بلکہ اس کے ساتھ ہماری قابلیت، نفاست اور ہنر مندی پر حیرت زدہ ہوتا، آقا کے ماہر حتی اینچر فنکار۔ وہ نہ صرف ہماری طاقت اور ہماری بے دردی سے خوف کھاتے بلکہ وہ یہ دیکھ کر مبہوت ہی ہو جاتے کہ ہم کیسے ہنستے اور روتے تھے، کیسے ہم نے فرنگی فنکاروں سے نمونے چرائے، کیسے ہم شوخ زندہ دل رنگ اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی دیکھ لیتے تھے اور حتمی طور پر، وحشت سے وہ کچھ تسلیم کرتے جو انتہائی ذہین سلطان ہی سمجھتے تھے: یعنی یہ کہ ہم مصوری کے فن پاروں کی اندر کی دنیا اور پرانے استاد فنکاروں کی صحبت دونوں میں رہتے تھے۔

تتلی اس تمام وقت میں مجھے گھور رہا تھا، پہلے تو اس بچے کی طرح جو یہ جاننے کا مشتاق ہو کہ میری زرہ اصلی تھی یا نہیں، پھر ایک دوست کی طرح جو زرہ کی مضبوطی آزمانا چاہتا ہو اور آخر کار کسی ناقابل اصلاح اور حاسد دشمن کی طرح جو مجھے نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ اصل میں وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس سے زیادہ باصلاحیت تھا، حتیٰ کہ اس سے بدتر، وہ شاید محسوس کرنے لگا تھا کہ استاد عثمان بھی یہ جان گئے تھے۔ اپنی خداداد قابلیت کے ساتھ تتلی ایک اعلیٰ فنکار تھا اور اس کے رشک وحسد نے مجھے متفاخر کر دیا: اس کے برعکس میں اپنے "سرکنڈے" کے بل پر استاد بنا تھا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اسے میری برتری قبول کرنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

اپنی آواز بلند کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کس قدر افسوس ناک بات تھی کہ کچھ آدمی، ہمارے سلطان اور مرحوم انشتے کی معجزاتی کتاب کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ استاد عثمان ہم سب کے لیے باپ کی طرح تھے۔ وہ ہر کسی سے برتر تھے، ہم نے سب کچھ انہی سے سیکھا تھا! تاہم، ہمارے سلطان کے خزانے میں سراغ ملنے کے بعد، کسی نامعلوم وجہ سے، استاد عثمان نے اپنے اس ادراک کو چھپانے کی کوشش کی کہ زیتون ایک ملعون قاتل تھا، میں نے کہا کہ مجھے یقین تھا کہ زیتون، جو گھر پر نہ مل پایا تھا، قادر دروازے کے قریب کسی ویران قلندری خانقاہ میں چھپا ہوا تھا۔ اس خانقاہ کو ہمارے سلطان کے دادا کے زمانے میں بند کر دیا گیا تھا، اس لیے نہیں کہ وہ بد اخلاقی اور ذلت کا گڑھ تھی بلکہ ایرانیوں سے نہ ختم ہونے والی جنگوں کے نتیجے میں۔ اور میں نے مزید کہا کہ ایک وقت تھا جب زیتون نے شیخی بگھاری کہ وہ ممنوعہ خانقاہ کی حفاظت کر رہا تھا۔ میرے الفاظ کے پیچھے کسی چال کا شبہ میں اگر انہیں میرا اعتبار نہ تھا، تو خنجر انہی کے ہاتھ میں تھا، وہ

وہاں اور اسی وقت مجھے سزا دینے کو آزاد تھے۔

تتلی نے خنجر سے دو مزید مرتبہ اتنی زور سے زرہ کو مارا کہ بیشتر زرہ بکتر اسے برداشت نہ کر پاتیں۔ وہ قرہ کی طرح مڑا، جو میری بات کا یقین کر چکا تھا اور اس پر بچوں کی طرح چلایا۔ میں پیچھے سے آیا، اپنا زرہ بکتر والا بازو تتلی کی گردن میں ڈالا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اپنے آزاد ہاتھ سے اس کا دوسرا بازو پیچھے موڑتے ہوئے میں نے خنجر اس کے ہاتھ سے گرا دیا۔ ہم گتھم گتھا تھے نہ ہی ہم کھیل رہے تھے۔ مجھے ''شاہنامہ'' کا ایسا ہی ایک غیر معروف منظر یاد آ گیا۔

''زرہ بکتر اور ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح اور کوہ جماران کے دامن میں صف آرا ایرانی اور تورانی افواج کے درمیان تصادم کے تیسرے روز تورانیوں نے اس پر اسرار ایرانی کی شناخت جاننے کے لیے جو گزشتہ دونوں روز عظیم تورانی جنگجوؤں کو ہلاک کر چکا تھا، مکار و عیار شنگل کو بھیجا۔'' میں نے بات شروع کی، ''شنگل نے پر اسرار جنگجو کو موت مبارزت دی اور اس نے وہ قبول کر لی۔ سہ پہر کی دھوپ میں چمکتے زرہ بکتر والی افواج نے سانسیں روک کر دیکھا۔ دونوں جنگجوؤں کے زرہ بکتر سے مسلح گھوڑے اس قدر تیزی سے ایک دوسرے سے ٹکرائے کہ دھات کے تصادم سے اڑنے والی چنگاریوں نے دھول اڑاتے گھوڑوں کو چھپا لیا۔ لڑائی طویل تھی۔ تورانی نے تیر چلائے، ایرانی اپنے گھوڑے اور تلوار کے ساتھ مہارت سے لڑا اور انجام کار پر اسرار ایرانی نے تورانی کے گھوڑے کی دم پکڑ کر اسے گرا دیا۔ پھر اس نے فرار ہوتے شنگل کا پیچھا کیا اور اس کے عقب سے اس کی زرہ بکتر گردن سے پکڑ لیا۔ تورانی نے اپنی شکست تسلیم کر لی لیکن وہ ابھی تک پر اسرار ایرانی کی شناخت کے بارے میں متجسس تھا۔ اس نے کسی امید کے بغیر وہی سوال کیا جس پر ہر کوئی دونوں سے حیران تھا، 'تم کون ہو؟' پر اسرار ایرانی جنگجو نے جواب دیا، 'تمہارے لیے میرا نام موت ہے۔' تو پھر مجھے بتاؤ میرے دوستو، وہ کون تھا؟''

''داستانوی رستم۔'' تتلی نے بچوں کی سی مسرت سے جواب دیا۔

میں نے اس کی گردن پر بوسہ دیا۔ ''ہم سب نے استاد عثمان کو فریب دیا ہے۔'' میں نے کہا، ''قبل اس کے کہ وہ اپنی سزا سنائیں، ہمیں زیتون کو تلاش کرنا، اس زہر اور بیر سے چھٹکارا پانا اور کسی تصفیے پر پہنچنا ہوگا تا کہ ہم فن کے ابدی دشمنوں کے سامنے مضبوطی سے کھڑے ہوں اور ان کے سامنے جو ہمیں سیدھے عقوبت خانوں میں بھیجنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ شاید جب ہم زیتون کی ویران خانقاہ پہنچیں تو ہم جان لیں گے کہ ظالم قاتل ہم میں سے کون ہے۔''

بے چارے تتلی نے ایک لفظ تک نہ کہا۔ اتنا ہنرمند، پر اعتماد اور حمایتی رکھنے والا ہونے کے باوجود وہ باقی سب مصوروں کی طرح تھا جو باہمی نفرت و حسد کے باوجود ایک دوسرے کی محبت کے جویا ہوتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں اکیلے رہ جانے یا جہنم میں جانے سے موت کی حد تک خوف زدہ تھا۔

فادر دروازے کے رستے پر، ہمارے اوپر ایک عجیب و غریب سبزی مائل زرد روشنی تھی لیکن وہ

چاندنی نہ تھی۔ اس روشنی میں استنبول کے سرو کے درختوں، سیسے کے گنبدوں، پتھریلی دیواروں، لکڑی کے گھروں اور آگ سے تباہ شدہ قطعوں کا پرانا، قدیم، وفادار رات کے وقت کا منظر جس پر ایک ایسی عدم مانوسیت طاری تھی، جیسا کہ کسی دشمن کے قلعے کے سبب سے ہو سکتی تھی۔ جب ہم پہاڑی پر چڑھے تو دور ہمیں آگ دکھائی دی جو بایزید مسجد سے آگے کہیں روشن تھی۔

بوجھل تاریکی میں ہم ایک بیل گاڑی کے قریب سے گزرے جس پر آٹے کے تھیلے لدے تھے اور جو فصیل کی طرف جا رہی تھی اور دو نقرئی سکوں کے عوض ہم اس پر سوار ہو گئے۔ قرہ کے پاس تصویریں تھیں اور وہ احتیاط سے بیٹھ گیا۔ جب میں نے ٹیک لگائی اور کم بلندی پر بادلوں کو برق سے چمکتے دیکھا، بارش کے دو قطرے میرے خود پر گرے۔

طویل سفر کے بعد، جب ہم اجاڑ خانقاہ کی تلاش میں تھے، ہم نے آس پڑوس، جو عین شب کے بیچ بالکل سنسان علاقہ تھا، کے سارے کتوں کو جگا دیا۔ اگرچہ ہم نے دیکھا کہ ہمارے شور و غل کے جواب میں اب پتھر کے کچھ گھروں میں لیمپ روشن ہو گئے تھے، یہ صرف چوتھا دروازہ تھا جو ہمارے دستک دینے پر کھلا، ٹوپی پہنے ایک آدمی نے ہمیں اپنے لیمپ کی روشنی میں جھانک کر دیکھا اور برستی بارش میں اپنی ناک تک باہر نکالے بغیر ہمیں اجاڑ خانقاہ کی طرف جانے کا راستہ بتایا — خوشی خوشی یہ اضافہ کرتے ہوئے کہ وہاں پہنچ کر ہمیں جنوں اور بھوتوں، آسیبوں کی شرارتوں کے باعث آرام و سکون نہ ملے گا۔

خانقاہ کے باغ میں ہمارا خیر مقدم بارش سے بے پرواہ مغرور سرو و صنوبر اور گلے سڑے پتوں کی سڑاند نے کیا۔ میں نے خانقاہ کے لکڑی کے تختوں کے درمیان موجود درز پر اپنی ایک آنکھ جما دی اور بعد میں چھوٹی سی کھڑکی کے کواڑے، جہاں سے تیل کے لیمپ کی روشنی میں، میں نے عبادت میں مشغول ایک آدمی کا دھمکی آمیز سایہ دیکھا — یا شاید وہ آدمی ہماری خاطر نماز پڑھنے کا دکھاوا کر رہا تھا۔

مجھے "زیتون" کہتے ہیں

کیا یہ میرے لیے زیادہ موزوں تھا کہ میں نماز ترک کرتا، اُٹھتا اور ان کے لیے دروازے کھول دیتا یا میرے فارغ ہونے تک انہیں بارش میں منتظر کھڑا رکھتا؟ جب مجھے ادراک ہوا کہ وہ مجھے دیکھ رہے ہیں تو میں نے منتشر خیالی کے ساتھ نماز مکمل کی۔ میں نے دروازہ کھولا اور وہاں وہ تھے — تتلی، لقلق اور قرہ۔ میں خوشی سے چیخ اٹھا اور تتلی کو گلے لگا لیا۔

"افسوس، ہمیں مرحوم کی وجہ سے کیا کچھ برداشت کرنا پڑا!" میں نے اپنا سر اس کے کندھے سے لگا افسوس کا اظہار کیا۔ "وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ وہ ہمیں کیوں قتل کر رہے ہیں؟"

ان میں سے ہر کسی نے ریوڑ سے بچھڑنے جیسی گھبراہٹ ظاہر کی جو میں نے اپنے دورِ حیات میں وقتاً فوقتاً ہر استاد مصور میں دیکھی تھی۔ حتیٰ کہ یہاں خانقاہ میں وہ ایک دوسرے سے الگ ہونا ناپسند کرتے تھے۔

"ہم یہاں کئی روز تک حفاظت سے پناہ گیر ہو سکتے ہیں۔"

"ہم پریشان ہیں۔" قرہ نے کہا: "یہ کہ وہ آدمی جس سے ہمیں خوف ہونا چاہیے، ہمارے درمیان ہی ہے۔"

"میں بھی فکرمند ہو گیا ہوں کیوں کہ میں نے بھی افواہیں سنی ہیں۔" میں نے کہا۔

شاہی محافظ دستے کے افسروں سے حتیٰ اچھے فنکاروں تک یہی افواہیں پھیل رہی تھیں کہ جن میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ نفیس آفندی اور مرحوم انشتے کے قتل کا معمہ حل ہو چکا تھا: وہ ہم ہی میں سے ایک تھا جنہوں نے کتاب پر کام کیا تھا۔

قرہ نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے انشتے کی کتاب کے لیے کتنی تصویریں بنائی تھیں۔

"پہلی جو میں نے بنائی وہ شیطان کی تھی۔ وہ زیرِ زمین بدروحوں کی قسم تھی جو بیاز کویون (Beyaz koyun) یا Whitesheep کے کتاب خانوں کے پرانے ماہروں میں مشترک ہے۔ داستان گو اور میرا تعلق ایک ہی صوفی فرقے سے تھا، اس لیے میں نے دو درویش بنائے۔ میں ہی تھا جس نے انشتے کو مشورہ

دیا کہ وہ انھیں اپنی کتاب میں شامل کریں، انھیں یہ کہہ کر قائل کرتے ہوئے کہ عثمانیوں کی سرزمینوں میں ان درویشوں کا خاص مقام تھا۔"

"کیا بس یہی؟" قرہ نے پوچھا۔

جب میں نے اسے بتایا کہ ہاں، میں نے بس یہی کچھ بنایا تھا، وہ کسی ایسے استاد کے سے انداز میں جس نے کسی شاگرد کو چوری کرتے پکڑ لیا ہو، دروازے کی جانب گیا۔ وہ اوراق کا ایک لپٹا ہوا پلندہ اندر لایا جسے بارش نے چھوا تک نہ تھا اور اسے ہم تینوں فنکاروں کے سامنے یوں رکھ دیا جیسے کوئی بلی اپنے بچوں کے سامنے زخمی پرندہ لارکھتی ہے۔

اوراق ابھی اس کی بغل میں ہی تھے جب میں انھیں پہچان گیا تھا۔ وہ تصویریں میں کافی خانے پر حملے کے دوران انھیں بچانے میں کامیاب رہا تھا۔ مجھے یہ پوچھنے کا خیال نہ آیا کہ یہ لوگ میرے گھر میں گھس کر انھیں کیسے ڈھونڈ لائے تھے۔ اس کے باوجود تتلی، لکلک اور میں، ہر کسی نے داستان گو کے لیے بنائی جانے والی اپنی تصویروں کو نرمی سے تسلیم کیا تھا، خدا اسے جنت نصیب کرے۔ اس کے بعد صرف گھوڑا، ایک غیر معمولی گھوڑا، باقی تھا جس کے بنانے کا کسی نے دعویٰ نہ کیا تھا، اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ میرا یقین کریں، مجھے توبہ اور اک تمک ہوا تھا کہ گھوڑے کی تصویر ... کی گئی تھی۔

"تم یہ گھوڑا بنانے والے نہیں ہو۔" قرہ نے کچھ تھانے کسی استاد کی طرح پوچھا۔

"میں نے نہیں بنایا۔" میں نے کہا۔

"اور میرے انشتے کی کتاب والا؟"

"میں نے وہ بھی نہیں بنایا۔"

"تاہم گھوڑے کے انداز کی بنیاد پر یہ طے کیا جا چکا ہے کہ وہ تم تھے جس نے اسے بنایا۔" وہ بولا، "مزید یہ کہ وہ استاد عثمان ہیں جو اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔"

"میرا تو کوئی بھی مخصوص انداز نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں یہ تازہ ترین ذوق کے جواب میں غرور کے باعث نہیں کہہ رہا۔ نہ ہی میں یہ اپنی بے گناہی کے ثبوت کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میرے نزدیک مخصوص انداز رکھنے سے مراد ہے قاتل سے بھی بدتر ہونا۔"

"تمھاری ایک جداگانہ خصوصیت ہے جو تمھیں پرانے استادوں اور دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔" قرہ نے کہا۔

میں اسے دیکھ کر مسکرایا۔ وہ ان چیزوں کو بیان کرنے لگا تھا جو مجھے یقین ہے کہ اب تک آپ سب جانتے ہوں گے۔ میں نے بغور سنا کہ کیسے ہمارے سلطان نے سربراہ خزانچی کی مشاورت سے دونوں قتل کے حل کی تلاش کی، استاد عثمان کے تین دنوں کی گھوڑوں کے نتھنوں کی انوکھی خاصیت اور ان اعلیٰ ترین کتابوں کا در حقیقت جائزہ لینے کی خاطر قرہ کا شاہی حرم میں معجزاتی داخلہ۔ ہم سب کی زندگیوں میں ایسے

لمحات آتے ہیں جب ہم ادراک کرتے ہیں، حتیٰ کہ جب ہم تجربہ کرتے ہیں، کہ ہم پر ایسے واقعات گزر رہے ہیں جو ہم کبھی نہیں بھلائیں گے حتیٰ کہ بہت دیر بعد بھی۔ پرملال بارش برس رہی تھی۔ یوں جیسے بارش سے مضطرب تھی نے اور اسی سے اپنے خنجر پر گرفت مضبوط کر لی۔ ذیتون جس کی زرہ کی پشت آنے سے سفید ہو چکی تھی، ہاتھ میں لیمپ لیے بڑی حوصلہ مندی سے خانقاہ میں گھوم رہا تھا۔ یہ استاد فنکار، جن کے سائے دیواروں پر بھوتوں کی طرح سرگرداں تھے، میرے بھائی تھے اور مجھے ان سے کس قدر محبت تھی! میں تنہا فنکار ہونے پر مسرور رہوں؟

''جب استاد عثمان کے ہمراہ تم پرانے استادوں کے عظیم فن پاروں کو کئی روز تک دیکھتے رہے تو کیا تمہیں اپنی خوش بختی پر ناز ہوا تھا؟'' میں نے قرہ سے پوچھا۔ ''کیا انہوں نے تمہیں بوسہ دیا؟ کیا انہوں نے تمہارا دوشیزہ جیسا چہرہ سہلایا؟ کیا انہوں نے تمہارا ہاتھ تھاما؟ کیا تم ان کی قابلیت اور علم سے مرعوب ہوئے؟''

''وہیں پرانے استادوں کے عظیم فن پاروں کے درمیان انہوں نے مجھے دکھایا کہ کیسے تمہارا ایک الگ انداز تھا۔ انہوں نے مجھے سکھایا کہ کیسے ''انداز'' کی تہہاں غلطی ایسی شے نہیں ہے جس کا انتخاب کوئی فنکار اپنی مرضی سے کرتا ہے بلکہ فنکار کے ماضی اور اس کی فراموش کردہ یادوں سے ملتے ہے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی دکھایا کہ کیسے یہ خفیہ غلطیاں، کمزوریاں اور خامیاں جو ایک وقت اتنی باعث شرم ہوتی ہیں کہ چھپائی جاتی ہیں تا کہ ہم پرانے استادوں سے بیگانہ طور دکھائی نہ دیں، آئندہ ان کی ''انفرادی خصوصیات'' یا ''انداز'' کے طور پر تعریف کی جائے گی کیوں کہ فرنگیوں نے انہیں دنیا بھر میں پھیلا دیا ہے۔ آئندہ ان احمقوں کے باعث جو اپنی خامیوں پر فخر کرتے ہیں، دنیا زیادہ رنگین اور زیادہ احمق ہو جائے گی اور یقیناً کہیں زیادہ غیر کامل۔''

اس حقیقت کے سبب کہ قرہ پورے اعتماد سے اس پر یقین رکھتا تھا جو اس نے کہا، اس نے ثابت کیا کہ وہ احمقوں کی نئی نسل میں سے تھا۔

''کیا استاد عثمان یہ وضاحت کر پائے کہ برسوں تک میں نے کیوں ہمارے سلطان کی کتاب میں عام نقلوں والے سینکڑوں گھوڑے بنائے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ سب اس محبت اور مار پیٹ کے باعث تھا جو انہوں نے تم سب کو تمہارے بچپن میں دی۔ چوں کہ وہ تم سب کے باپ اور محبوب دونوں تھے، وہ نہیں چاہتے کہ تم سب کو اپنا اور تمہیں آپس میں ایک دوسرے کا رفیق جانتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ تم میں سے ہر کسی کا انداز جدا ہو، وہ مجموعی طور پر شاہی کتاب خانے کے لیے چاہتے تھے کہ اس کا اپنا الگ انداز یا اسلوب ہو۔ ان کے تم سب پر مرعوب کن سائے کے باعث تم بھول گئے کہ خود تمہارے اندر سے کیا آیا تھا، عدم کاملیت، عناصر اور اختلافات یا فرق جو معیاری طریقوں حدوں سے باہر نکل گئے۔ بس جب تم نے دوسری کتابوں اور دوسرے صفحات کے لیے مصوری کی، جنہیں استاد عثمان کی نگاہ کبھی نہیں دیکھ سکتی تھی، تبھی تم نے اس گھوڑے کی تصویر بنائی جو ان تمام

برسوں میں تمہارے اندر موجود رہا تھا۔"

"میری ماں، خدا انہیں جنت نصیب کرے، میرے والد سے زیادہ ذہین تھیں۔" میں نے کہا۔ "ایک شب میں گھر پر تھا اور رو رہا تھا، اس ارادے میں پکا کہ میں دوبارہ کتاب خانے کبھی نہیں جاؤں گا کیوں کہ میں نہ صرف استاد عثمان کی مار پیٹ بلکہ دوسرے سخت اور تنگ مزاج استادوں سے بھی بیدل ہو چکا تھا اور شعبے کے سربراہ سے جو ہمیشہ مسطر لے کر ہمیں دھمکاتا تھا۔ تسلی دیتے ہوئے میری پیاری مرحومہ ماں نے مجھے نصیحت کی کہ دنیا میں دو طرح کے لوگ تھے: وہ جو بچپن کی مار پیٹ کے سبب بزدل اور شکست بن جاتے تھے، ہمیشہ پٹے ہوئے، پامال، انہوں نے کہا کیوں کہ مار پیٹ کا مطلب اندر کے شیطان کو مارنا ہوتا تھا اور وہ خوش بخت تھے جن کے لیے مار پیٹ اسے ہلاک کیے بغیر اندر کے شیطان کو خوف زدہ کرتی اور سدھا لیتی تھی۔ اگرچہ موخر الذکر گروہ بچپن کی یہ تکلیف بھری یادیں کبھی نہیں بھلا پاتا —— انہوں نے مجھے یہ کسی کونے بتانے کا احتیاط کیا تھا —— یہی مار پیٹ وقت کے ساتھ انہیں ہوشیار، نامعلوم کی گہرائی ناپنے کے قابل، دوست بنانے کے قابل اور دشمنوں کو پہچاننے کے قابل بناتی ہے، یہ محسوس کرنے کے قابل کہ ان کی پیٹھ پیچھے منصوبے بنائے جا رہے ہیں اور مجھے جلدی میں یہ اضافہ بھی کرنے دیں کہ دوسروں سے بہتر مصوری کے قابل بناتی ہے۔ چوں کہ میں درخت کی شاخیں ہم آہنگی سے بنانے کے قابل نہ ہو پایا تھا تو استاد عثمان نے مجھے اس قدر زور سے تھپڑ رسید کیا کہ بہتے آنسوؤں کے درمیان، میرے سامنے جنگل پھلنے پھولنے لگے۔ غصے سے میرے سر پر ضرب لگانے کے بعد کیوں کہ میں اوراق کے نچلے حصوں کی غلطیاں نہ دیکھ سکا تھا، انہوں نے محبت سے آئینہ اٹھایا اور اسے صفحے پر رکھ دیا تاکہ میں کام کو دیکھ سکتا یوں جیسے پہلی مرتبہ۔ پھر اپنا رخسار میرے رخسار سے ملاتے ہوئے انہوں نے اتنی محبت سے ان غلطیوں کی نشان دہی کی جو تصویر کے عکس میں جادوئی طور پر دکھائی دینے لگی تھیں کہ میں کبھی اس محبت کو بھلا پایا نہ ہی آداب کو۔ رات بھر بستر میں روتے ہوئے شب گزارنے کے بعد صبح، میرا وقار مجروح ہوا تھا کہ انہوں نے سب کے سامنے مسطر سے میری پٹائی کی تھی، وہ آئے اور انہوں نے اس قدر نرمی سے میرے بازوؤں پر بوسہ دیا کہ مجھے پوری شدت سے علم ہو گیا کہ ایک روز میں ایک داستانوی حد تک اچھا فنکار بنوں گا۔ نہیں، وہ میں نہیں تھا جس نے وہ گھوڑا بنایا۔"

قرہ یہ کہتے ہوئے اپنا اور بگلے کا حوالہ دے رہا تھا۔ "ہم آخری تصویر کے لیے خانقاہ کی تلاشی لیں گے جو میرے انشتے کو قتل کرنے والے ملعون آدمی نے چرائی تھی۔ کیا تم نے بھی آخری تصویر دیکھی؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے جسے ہمارے سلطان، ہم جیسے پرانے استادوں کے پابند مصور یا اپنے عقیدے کے پابند مسلمان قبول کر سکیں۔" میں نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

میرے بیان نے اسے زیادہ بے قرار کر دیا۔ بگلے اور اس نے تلاشی لینی شروع کی اور ساری جگہ کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ چند ایک بار صرف ان کا کام آسان کرنے کو میں ان کے قریب گیا۔ رستی چھت والی درویشوں کی ایک کوٹھری میں، میں نے فرش میں ایک گڑھے کی طرف اشارہ کیا تاکہ وہ گرتے

جائیں اور اس کی جیبیں چابیاں تلاشی لے سکیں۔ میں نے انہیں اس چھوٹے کمرے کی بڑی چابی دی جہاں تیس برس قبل شیخ رہتے تھے۔ اس سے قبل کہ اس خانقاہ سے وابستہ لوگ بکتاشیوں سے مل گئے اور بکھر گئے۔ وہ جوش سے اندر داخل ہوئے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اس کی پوری ایک دیوار غائب تھی اور کمرا بارش کے لیے کھلا تھا، انہوں نے اس کی تلاشی کی پروا نہ کی۔

مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ تتلی ان کے ہمراہ نہیں تھا لیکن اگر مجھے قصوروار ٹھہراتے ثبوت مل جاتے تو وہ بھی ان کی صفوں میں شامل ہو جاتا۔ بگلے کا دماغ قرہ جیسا ہی تھا جسے خدشہ تھا کہ استاد عثمان ہمیں اذیت رساں کے حوالے کر دیں گے اور موقف اختیار کریں گے کہ ہمیں ایک دوسرے کی حمایت کرنی ہوگی اور سربراہ خزانچی کے مقابلے کے لیے متحد ہونا ہوگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ قرہ نہ صرف اس خواہش کے زیر اثر تھا کہ اپنے انشتے کے قاتل کو تلاش کر کے شکورے کو شادی کا حقیقی تحفہ دے گا بلکہ وہ اپنے انشتے کی کتاب فرنگیوں کی نقل میں مصوری کر کے مکمل کروانے کے لیے سلطان کی رقم سے ادائیگی کر کے، عثمانی منی ایچر فنکاروں کو فرنگی ماہروں کی راہ دکھانے کا ارادہ بھی رکھتا تھا (جو کہ نہ صرف توہین آمیز بلکہ مضحکہ خیز بھی تھا)۔ میں کسی قدر یقین سے یہ بھی سمجھ گیا کہ اس منصوبے کی تہ میں بگلے کی استاد عثمان اور ہم سے چھٹکارا پانے کی خواہش تھی کیوں کہ وہ سربراہ مصور بننے کا خواب دیکھتا تھا (چوں کہ ہر کسی کا اندازہ تھا کہ استاد عثمان، تتلی کو ترجیح دیں گے) وہ اپنے امکانات بڑھانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ میں تھوڑی دیر کو الجھن کا شکار ہو گیا۔ برستی بارش کی آواز سنتے ہوئے میں نے دیر تک غور و فکر کیا ایسے آدمی کی طرح جو ہجوم سے الگ ہو جاتا ہے اور گھوڑے پر سوار گزرتے بادشاہ اور وزیر اعظم کو اپنی درخواست پیش کرنے کی تگ و دو میں ہوتا ہے؛ مجھے اچانک بگلے اور قرہ کو عزیز بنانے کا خیال آیا۔ انہیں تاریک راہداری اور بڑے سے پھاٹک سے گزارتے ہوئے میں انہیں اس دہشت خیز کمرے میں لے آیا جو کبھی باورچی خانہ تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آیا وہ ان کھنڈروں میں کچھ تلاش پائے تھے۔ یقیناً انہیں کچھ نہ ملا تھا۔ وہاں پتیلیوں اور برتنوں کے کوئی آثار نہ تھے جو کبھی لاوارث اور غریب غربا کے لیے کھانے کی تیاری کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ میں نے مکڑی کے جالوں، گرد و غبار، کیچڑ، ملبے اور کتوں اور بلیوں کی غلاظت سے اٹے اس بھیانک کمرے کو کبھی صاف کرنے کی بھی کوشش نہ کی تھی۔ ہمیشہ کی طرح جانے کہاں سے آتی تیز ہوا نے ہمارے سایوں کو ابھی گہرا تاریک اور کبھی مدھم کرتے ہوئے لیمپ کی لو مدھم کر دی......

"تم نے جی بھر کر تلاشی لی لیکن تم میرے خفیہ خزانے کو تلاش نہ کر پائے۔" میں نے کہا۔

حسب عادت، میں نے ہاتھ کی پشت کو جھاڑو کی طرح استعمال کرتے ہوئے وہاں سے راکھ ہٹائی جو کبھی آتش دان تھا اور جب بڑا سا چولہا ظاہر ہوا تو میں نے اس کا لوہے کا ڈھکن کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ اٹھایا۔ میں چولہے کے چھوٹے سے منہ کی طرف لیمپ لایا۔ میں کبھی نہ بھولوں گا کہ قرہ کے حرکت کر پانے سے پہلے ہی کیسے بگلا اچھل کر آگے بڑھا اور ندیدے پن سے اس کے اندر موجود چرمی تھیلیوں کو جھپٹ لیا۔

ہم پر کھوکھلا پن اور مایوسی چھا گئی۔ لیمپ کی زرد روشنی میں بگلا اور زیتون میرے تصویری خاکوں کی
پاش میں بنی بیہودہ تصویروں کو گھور رہے تھے۔ وہ بالکل لاتعلق ظاہر ہوتے تھے، در حقیقت وہ کسی ہموار
انداز میں سرور تھے۔ مجھے تصویر دیکھنے کی طاقتور خواہش ہوئی میں ان کو بلی قیافہ لگا سکتا تھا کہ وہ کون سی
تصویر تھی، میں اٹھا اور پھر گھوم کر ان کے عقب میں گیا، خاموشی سے اس غیر اخلاق تصویر کو دیکھتے ہوئے جو
میں نے بنائی تھی۔ سستی تیزی میں کہ میں اب ماضی کی لیکن اب بھی فرحت بخش یاد کو دہرا رہا تھا۔ قرہ ہمارے
ساتھ آن ملا۔ جو بھی وجہ رہی ہو، ہم چاروں کے اس تصویر کو دیکھنے نے مجھے پرسکون کر دیا۔

"کیا اندھے اور دیکھنے والے برابر ہو سکتے ہیں؟" بگلے نے کافی دیر بعد کہا۔ کیا اس کی مراد یہ
تھی کہ جو کچھ ہم نے دیکھا اگرچہ وہ غیر اخلاق تھا، دیکھنے کی مسرت جو اللہ نے ہمیں عطا کی تھی، شان دار
تھی؟ نہیں، بگلے کو ایسے معاملات کا کیا علم ہوگا؟ اس نے کبھی قرآن نہیں پڑھا۔ میں جانتا تھا کہ ہرات کے
بوڑھے اساتذہ اکثر یہ آیۂ مبارک پڑھا کرتے تھے۔ عظیم اساتذۂ مصوری کے ان دشمنوں کو جواب دینے
کے لیے اس آیت کا استعمال کرتے تھے جو اعتراض کرتے تھے کہ ہمارے عقیدے کے مطابق مصوری ممنوع تھی اور
مصور روزِ حساب جہنم میں بھیجے جائیں گے۔ تاہم اس جادوئی لمحے تک میں نے تسلی سے بھی وہ الفاظ نہ سنے
تھے جو اب اس کی زبان سے گویا اپنے آپ ادا ہو گئے تھے:

"میں وضاحت کرنا چاہوں گا کہ اندھے اور دیکھنے والے برابر نہیں!"

"اندھے کون ہیں اور کون ہیں دیکھنے والے؟" قرہ نے سادگی سے پوچھا۔

"اندھے اور دیکھنے والے برابر نہیں ہیں، اللہ کہتا ہے وما یستوی الاعمیٰ والبصیر۔"

زیتون نے یہ کہہ کر بات جاری رکھی:

"نہ ہی تاریکی اور روشنی۔
چھاؤں اور دھوپ برابر نہیں ہیں،
نہ ہی زندہ اور مردہ۔"

ایک لمحے کو میں نحیف آفندی، انشتے اور ہمارے داستان گو بھائی جو آج شب قتل کیا گیا تھا، کے
مقدر کا سوچ کر لرز اٹھا۔ کیا دوسرے بھی میری طرح ہی دہشت زدہ تھے؟ کچھ دیر کوئی نے جنبش تک نہ کی۔
بگلا ابھی تک میری پاش کھولے ہوئے تھا لیکن لگتا تھا کہ وہ میری بنی بیہودہ تصویر کو نہیں دیکھ رہا تھا، اگرچہ ہم
سب ابھی تک اسی تصویر کو گھور رہے تھے!

"میں روز حساب کی تصویر کشی کرنا چاہتا ہوں۔" بگلا بولا، "مردوں کو زندہ کیا جانا اور گناہ
گاروں سے معصوموں کو الگ کیے جانا۔ ایسا کیوں ہے کہ ہم اپنے عقیدے کے مقدس الفاظ کی عکاسی نہیں
کر سکتے؟"

ہماری نوعمری میں ہمارے کتاب خانے کے ایک ہی کمرے میں مل کر کام کرتے ہوئے ہم ہاری

ہادی اپنے بچوں سے اپنی بیویوں اور غلاموں کے قتلوں سے واقف تھے، جیسے کوئی پودے ہوتے ہوئے استاد اپنی آنکھوں کو آرام دینے کے لیے کرتے ہیں اور کبھی کبھی اپنے موضوع پر بات کرتے تھکتے ہوئے ہمارے ذہن میں آ جاتا۔ جب بھی جیسا کہ ہم نے اپنے سامنے کھلی کتاب کو دیکھتے ہوئے کیا، ہم گپ شپ کرتے ہوئے ایک دوسرے کی جانب کنکھیوں سے دیکھتے تھے۔ لیکن کبھی ہماری نگاہیں کھلی کھڑکی سے باہر کی دنیا کے نظارے پر جم جاتیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ میری حالت میری شاگردی کے ایام کی کوئی بے انتہا خوب صورت یادگار یا پھول وغیرہ تھا یا اس کے محسوس کیا جانے والا احساس تھا، کیونکہ میں نے ایک عرصے سے قرآن کھول کر پڑھا تھا یا اس ڈر کی وحشت تھی جو میں نے اس شب کتب خانے میں دیکھا تھا لیکن جب میرے بولنے کی باری آئی، میں آنکھیں دو ہو گیا، میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا یوں جیسے میں کسی خطرے کا سامنا کر رہا تھا اور جب میرے دماغ میں کچھ نہ آیا تو میں نے بس یہ کہہ دیا:

''مجھے سورۃ البقرۃ کی وہ آخری آیات یاد ہیں۔ میں سب سے پہلے ان کی تلاوت کرنا چاہوں گا: 'اے خدا، اگر ہم سے بھول یا چوک ہو گئی ہو تو ہم سے مواخذہ نہ کرنا۔ اے خدا ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے خدا جتنا بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا بوجھ ہم پر نہ ڈالنا اور اے خدا ہمارے گناہوں سے درگزر کر اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا مددگار ہے۔''

میری آواز ٹوٹ گئی اور میں ان آنسوؤں پر بھی قابو نہ پا سکا جو غیر متوقع طور پر بہنے لگے تھے — شاید میں اس قدیم منظر کے باعث جذباتی تھا جو اپنی شاگردی کے دنوں میں سب اپنی حفاظت اور اپنی حمایت کے اظہار کرنے سے گریز کے لیے استعمال کرتے تھے۔

میرا خیال تھا کہ میرے آنسو جلد ہی خشک ہو جائیں گے لیکن خود پر قابو پانے میں ناکام ہو کر میں سسکیاں بھرنے لگا۔ روتے ہوئے میں محسوس کر سکتا تھا کہ باقی تینوں پر بھی خاموشی طاری ہے۔ ہم بادی، پامالی اور غم کے احساسات غالب تھے۔ اب کے ہم سے سلطان کے کتب خانے میں فرنگی انداز ہی افضل ہوتا۔ وہ انداز اور کتابیں جن کے لیے ہم نے اپنی تمام زندگیاں وقف کر دی تھیں، آہستہ آہستہ فراموش کر دیا جاتا — ہاں، در حقیقت یہ ہی پوری قسمت آزمائی کا انجام کو پہنچ جاتی اور اگر دشمن روم والے ہمیں ذبح نہ کرتے یا ہمیں ختم نہ کرتے تو سلطان کے لاڈلے رسالے ہمیں لولا لنگڑا کر دیتے — لیکن جب میں رو دیا، سسکیاں اور آہیں بھرے — اگرچہ میں بارش کی اداس کرنے والی آواز سن رہا — میرے ذہن کے ایک حصے نے محسوس کر لیا کہ میں دراصل ان چیزوں کے لیے نہیں رو رہا تھا۔ دوسرے اس بات سے کس حد تک آگاہ تھے؟ مجھے اپنے آنسوؤں پر مبہم سا احساس جرم ہوا جو ایک ہی وقت میں اصلی اور جھوٹے تھے۔

تتلی میرے قریب آیا، اپنا بازو میرے شانے پر پھیلایا، میرے بال سہلائے، میرے رخسار پر بوسہ دیا اور خوشگوار انداز سے مجھے تسلی دی۔ دوستی کے اس اظہار نے مجھے زیادہ خلوص اور زیادہ احساس

جرم سے رلا دیا۔ میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا لیکن کسی وجہ سے غلط طور پر میں نے سوچا کہ وہ بھی رو رہا تھا۔
ہم بیٹھ گئے۔

ہم نے یاد کیا کہ کیسے ہم نے ایک ہی سال کتاب خانے میں شاگردی اختیار کی تھی، اپنی ماؤں سے الگ ہونے کی اجنبی اداسی سے نئی زندگی کے اچانک آغاز تک، پہلے روز سے ملنے والی مار پیٹ کی تکلیف، سربراہ خزانچی سے ملنے والے پہلے تحفے کی خوشی اور وہ دن جب ہم بھاگتے ہوئے واپس گھر گئے۔ پہلے تو صرف وہی بولتا اور میں اداسی سے سنتا رہا لیکن پھر بعد میں جب لگا اور کچھ دیر بعد قرہ —— جو ہماری شاگردی کے ابتدائی برسوں میں کتاب خانے تھوڑی دیر کے لیے آیا اور چلا گیا تھا —— بھی ہماری غم زدہ گفتگو میں شامل ہو گئے، میں بھول گیا کہ میں ابھی رو رہا تھا اور ان کے ساتھ باتیں کرنے اور آزادی سے ہنسنے لگا۔

ہم نے سرما کی صبحوں کو یاد کیا جب ہم جلدی بیدار ہوتے، کتاب خانے کے بڑے کمرے میں موجود چولہا جلاتے اور گرم پانی سے فرش صاف کرتے۔ ہم نے ایک بوڑھے ''استاد'' کو یاد کیا، خدا اسے جنت نصیب کرے، جو اس قدر بے صبر اور محتاط تھا کہ ایک روز میں ایک درخت کا ایک ہی پتا بنا سکتا تھا اور جس نے جب یہ دیکھا کہ ہم اس کا بنایا پتا نہیں بلکہ کھلی کھڑکی سے موسم بہار کے سرسبز پتے دیکھ رہے تھے، ہمیں مارے پیٹے بغیر کوئی سوویں مرتبہ ہمیں تنبیہ کی: ''ادھر نہیں، ادھر دیکھو!'' ہمیں بستہ یا جزدان ہاتھ میں لیے اس دبلے پتلے شاگرد کی دروازے سے باہر نکلتے آہ و زاری یاد آئی جو پورے کتاب خانے میں سنی جا سکتی تھی، جسے گھر واپس بھیج دیا گیا تھا کیوں کہ کام کی باریکی اور شدت سے اس کی ایک آنکھ پھر گئی تھی۔ پھر ہم نے تصور کیا کیسے ہم نے دیکھا تھا (خوشی سے کیوں کہ وہ ہماری غلطی نہ تھی) کہ کسی کی دوات سے پھیلتا ہوا جھلک سرخ رنگ جو اس صفحے پر لوٹ گئی تھی جس پر تین تزئین کاروں نے تین مہینے محنت کی تھی (اس میں شیروان کے راستے میں دریا کناروں پر عثمانی فوج کی منظر کشی کی گئی تھی، جو فاقہ زدگی کے خطرے سے بچنے کے لیے ارش (Eresh) پر قبضہ کر رہے تھے اور اپنے پیٹ بھر رہے تھے)۔ ایک مہذب اور محترم انداز میں ہم تینوں نے اس سرکیشیائی خاتون کے بارے میں بات کی جس سے ہم تینوں نے قربت کی تھی اور ایک ساتھ محبت میں گرفتار ہوئے تھے، وہ ایک ستر سالہ پاشا کی حسین ترین بیوی تھی جو...... اپنی فتوحات، طاقت و دولت کو زیر غور لاتے ہوئے...... ہمارے سلطان کی شکار سرائے کی طرز تعمیر کی نقل میں بنائے گئے اپنے گھر کی دیوار کی آرائش و زیبائش چاہتا تھا۔ پھر ہم نے بڑے شوق سے یاد کیا کہ کیسے سرما کی صبحوں کو ہم نیم وا دروازے کی دہلیز پر بیٹھ کر مسور کی دال کا شوربہ پیا کرتے تھے تاکہ اس کی بھاپ کاغذوں کو نرم نہ کر دے۔

ہم نے کتاب خانے کے دوستوں اور استادوں سے جدائی پر بھی اظہار افسوس کیا جب موخر الذکر نے ہمیں اجرتی ہنرمندوں کے طور پر دور افتادہ جگہوں سفر کے لیے مجبور کیا تھا۔ ذرا دیر کو اپنی عمر کے سولہویں برس میں تخلی کی دلآویزی میری نگاہوں کے سامنے آ گئی: وہ نرم چیچی سے کاغذ کو تیزی سے رگڑتے ہوئے اس میں چمک لا رہا تھا جب کہ گرما کے اس روز کھلی کھڑکی سے آتی دھوپ اس کے شہد رنگ عریاں بازوؤں پر پڑ رہی

تھی۔ وہ جو کچھ غیر حاضر دماغی سے کر رہا تھا، لمحے بھر کو رک گیا اور احتیاط سے اپنا چہرہ جھکائے ہوئے کاغذ پر داغ دھبے یا خامی کا جائزہ لیا۔ مختلف زاویے سے جنبش یا حرکت استعمال کرتے ہوئے ناگوار جگہ کو چند ایک بار ربڑ سے رگڑا، اس کے بعد وہ اپنے پچھلے انداز میں واپس چلا گیا، اپنے ہاتھ کو آگے پیچھے حرکت دیتے ہوئے اور اس دوران، دن کے کھلی آنکھوں کے خوابوں میں کھوئے ہوئے، وہ کھڑکی سے باہر دور دیکھ رہا تھا۔ میں کبھی نہ بھولوں گا کہ کیسے دوبارہ باہر دیکھنے سے قبل اس نے لمحے بھر کو میری آنکھوں میں جھانکا تھا — جیسا میں بعد میں دوسروں کے ساتھ کرتا۔ اس رنجیدہ نگاہ کا صرف ایک ہی معنی ہوتا ہے جو تمام شاگرد بخوبی جانتے ہیں: اگر تم خواب نہ دیکھو تو وقت آگے رواں نہیں ہوتا۔

مجھے قاتل کہا جائے گا

آپ میرے بارے میں بھول چکے تھے، ہے ناں؟ اب مجھے اپنی موجودگی آپ سے مزید کیوں چھپانی چاہیے؟ خود کو اس آواز میں بولنے سے روکنا جو طاقت ور سے طاقت ور تر ہوتی جا رہی ہے، میرے بس سے باہر ہو چکا ہے۔ بعض اوقات میں خود کو بڑی کوشش سے روکتا ہوں اور مجھے ڈر ہے کہ میری آواز کا تناؤ مجھے آشکار کر دے گا۔ بعض اوقات، میں خود کو پوری طرح آزاد چھوڑ دیتا ہوں اور سمجھتی ہے کہ جب وہ الفاظ، جو میرے دوسرے جنم کی نشانیاں ہیں، جنہیں آپ پہچان سکتے ہیں، میرے لبوں سے پھسل جاتے ہیں، میرے ہاتھ کپکپانے لگتے ہیں، میری پیشانی پر پسینے کے قطرے جمع ہو جاتے ہیں اور مجھے فوراً ادراک ہوتا ہے کہ میرے بدن کی یہ چھوٹی چھوٹی نشانیاں آپ کو اشاروں اور سراغ میں مدد دیں گی۔

البتہ میں یہاں بے حد مطمئن ہوں! جب ہم کو 25 برسوں کی یادوں سے دلاسا دیتے ہیں، ہمیں ہماری عداوتیں نہیں بلکہ خوب صورتیاں اور مصوری کی خوبیاں یاد آتی ہیں۔ دنیا کے قریب الوقوع خاتمے کے ساتھ ہمارے یہاں بیٹھنے، ایک دوسرے کو آنسو بھری آنکھوں سے سہلانے اور تسلی دینے میں بھی کچھ ہے، جب ہم گزرے دنوں کی خوب صورتی کو یاد کرتے ہیں جو حرم کی عورتوں کی یاد دلاتی ہے۔

میں نے یہ موازنہ کرمان کے ابوسعید سے لیا تھا جس نے امیر تیمور کے بیٹوں کی اپنی "تاریخ" میں شیراز اور ہرات کے بوڑھے استادوں کی کہانیاں بھی شامل کی تھیں۔ تیس برس پہلے قرہ قویونلو کا حکمران جہان شاہ، مشرق آیا جہاں اس نے چھوٹی چھوٹی افواج اکٹھی کر کے تیموری خانوں اور شاہوں کی زمینوں کو تاراج کیا جو آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ اپنے فاتح ترکمان جتھوں کے ساتھ، وہ پورے ایران کو عبور کر کے مشرق اور آخر کار استر آباد آیا جہاں اس نے امیر تیمور کے بیٹے شاہ رخ کے پوتے ابراہیم کو شکست دی، پھر اس نے گورگان پر قبضہ کیا اور اپنی افواج کو ہرات کے قلعے کی طرف بھیجا۔ کرمان کے مورخین کے مطابق نہ صرف ایران کی تباہی و بربادی بلکہ تیمور کے گھرانے کی اب تک ناقابلِ شکست طاقت جس نے نصف صدی تک ہندوستان سے بازنطین تک نصف جہان پر حکومت کی تھی، تباہی کے ایسے طوفان کا سبب بنی کہ ہرات کے محاصرہ شدہ قلعے میں عورتوں اور مردوں پر افراتفری کا عالم طاری تھا۔ مورخ ابوسعید، قاری کو بدخواہ

مسرت کے ساتھ یاد دلاتا ہے کہ قرہ قویونلو کے جہان شاہ نے اپنے مفتوحہ قلعوں میں اپنے ہر شخص کو بے رحمی سے ہلاک کر دیا جو امیر تیمور کی اولاد سے تھا، کیسے اس نے شاہوں اور شہزادوں کے حرم سے عورتوں کا انتخاب کیا اور انہیں اپنے حرم میں شامل کر لیا اور کیسے سنگ دلی سے اس نے منی ایچر فنکاروں کو منی ایچر فنکاروں سے الگ کیا اور ان میں سے بیشتر کو خود اپنے استاد تزئین کاروں کے ماتحت شاگردی پر مجبور کیا۔ اس کی ''تاریخ'' میں اس مقام پر وہ اپنی توجہ شاہ اور اس کے جنگجوؤں سے جنہوں نے قلعے کی برجوں کے کنگروں سے دشمن کو پرے دھکیلنے کی کوشش کی، ان منی ایچر فنکاروں کی طرف مبذول کر لیتا ہے جو قلم اور موقلم لیے کتاب خانوں میں محاصرے کے دہشت خیز عروج کے منتظر تھے جس کا نتیجہ دیر گزری آشکار ہو چکا تھا۔ وہ فنکاروں کے ناموں کی فہرست بناتا ہے، ایک کے بعد ایک، اعلان کرتے ہوئے کہ کیسے وہ مشہور عالم تھے اور کبھی نہ بھلائے جائیں گے اور یہ مصور جو سب کے سب شاہ کے حرم کی خواتین کی طرح کب کے بھلائے جا چکے ہیں، تب سے فراموش کیے جا چکے ہیں، انہوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور روئے، مسرت بھرے گزشتہ ایام کو یاد کرنے کے سوا کچھ اور کرنے کے نا قابل۔

ہم نے بھی حرم کی افسردہ عورتوں کی طرح سوگ منانے والے کاتبوں کے تختوں، رقم سے بھرے جزدانوں کو یاد کیا جو سلطان کسی ان کے ہاتھوں منقش ڈبوں، آئینوں، جلد کشتریوں، شتر مرغ کے مزین انڈوں، کاغذ کی تراش سے تخلیق، ایک ورقی تصویروں، خوش نویسی کی کتابوں، تاش کے پتوں اور کتابوں کے بدلے دیا، جو ہم اسے پیش کرتے۔ ماضی کے وہ محنتی، مطالعہ کرتے فنکار، ضعیف فنکار کہاں تھے جو تھوڑے پر بھی راضی اور مطمئن ہو جاتے تھے؟ انہوں نے بھی خود کو اپنے ...... سے کنارہ کش کیا تھا نہ ہی حسد سے اپنے طریقوں اور طرز کو دوسروں سے چھپایا تھا، اس خوف میں کہ ان کی روز تلاش کر لی جائے گی، بلکہ وہ روزانہ کتاب خانے آیا کرتے تھے۔ وہ پرانے منی ایچر فنکار کہاں تھے جنہوں نے اپنی زندگیاں عاجزی سے قلعے کی دیواروں پر نازک و باریک نمونے بنانے کے لیے وقف کر دی تھیں، صنوبر کے پتے جن کی انفرادیت صرف قریب سے مشاہدے پر بھی دیکھی جا سکتی تھی اور خالی جگہوں کو بھرنے کے لیے سات پتی گھاس؟ کبھی حاسد نہ ہونے والے بے کیف استاد فنکار کہاں تھے، جو کچھ فنکاروں کی خداداد قابلیت اور صلاحیت کو انصاف اور حکمت کے طور پر تسلیم کرتے تھے اور دوسروں پر قناعت و توکل اور صبر؟ ہم نے ان باپ جیسے استادوں کو یاد کیا، جن میں سے بعض کی پشت خمیدہ تھی اور وہ ہمیشہ خنداں رہتے، دوسرے خیالوں میں محو اور مے نوش اور پھر بھی کئی دوسرے کنواری بیٹی کو فروخت کرنے کا ارادہ رکھنے والے اور جیسا ہم نے یاد کیا، ہم نے کتاب خانے کی فراموش شدہ یادوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی جیسا کہ وہ ہماری شاگردی کے ایام اور ہماری استادی کے ابتدائی برسوں میں رہا تھا۔

کیا تمہیں وہ تزئین کار یاد ہے جو سطروں پر لکیریں کھینچتے ہوئے اپنی زبان ایک رخسار کی طرف سے باہر نکال لیتا تھا...... دائیں طرف لکیر لگاتے ہوئے بائیں طرف زبان اور بائیں طرف لکیر لگاتے ہوئے

کے لیے بنائی گئی تصویروں میں محل کے اوپری نصف حصے کا آسمان ہونے کی گرد سے منور کیا گیا تھا، دنیا کے انجام کا پیش خیمہ، خود ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ میناروں، گنبدوں اور سرو و صنوبر کے درمیان رنگوں کے باعث — جیسے سونے کو کسی شائستہ اور مہذب تصویر کشی میں استعمال کیا جاتا تھا۔

ان میں معراج کی تصویر کشی کی گئی تھی، وہ تصویر ایسے گمبھیر رنگوں سے بنائی گئی تھی کہ بچے بھی اس مقدس پاکیزہ منظر کو دیکھ کر بڑے پارسا سے رعب سے گھر جاتے اور پھر احترام کے عالم میں ہنس دیتے یوں جیسے خود انہیں گدگدی کی گئی ہو۔ میں نے وضاحت کی کہ کیسے ایک صفحے کے کونے میں جو میں نے گزشتہ وزیر اعظم کے ان باغیوں کو کچلنے کی یاد میں بنایا تھا جو پہاڑوں پر چلے گئے تھے، نزاکت و احترام سے کٹے ہوئے سروں کو ترتیب دے کر بڑے ذوق سے ہر ایک کی تصویر کشی کی۔ عام لاشوں کے سروں کی طرح نہیں بلکہ ایک انفرادی اور منفرد چہرے کے طور پر فرنگی شبیہ ساز فنکاروں کے انداز میں، ان کی بھنویں موت سے قبل اچکاتے ہوئے، ان کی گردنوں پر سرخ رنگ چکاتے، ان کے غم زدہ ہونٹوں کو موت کے معنی دریافت کرتے دکھاتے ہوئے، ایک آخری نفس لینے کو ان کے نتھنے کھولتے ہوئے، مایوس کن سانس اور اس دنیا کے لیے ان کی آنکھیں بند کرتے ہوئے اور یوں میں نے تصویر کو اسرار کے دہشت خیز ہالے میں الجھو دیا۔

یوں جیسے وہ خود ہماری نا قابل فراموش اور نا قابل حصول یادیں تھیں، ہم نے حسرت سے محبت اور جنگ کے اپنے پسندیدہ مناظر پر بات کی، ان کی شان دار حیرت انگیزیوں اور آنسو بھر لانے والی باریکیوں کی۔ الگ تھلگ اور پر اسرار باغات جہاں محبوب ہمیں آنکھوں کے سامنے تاروں بھری راتوں میں ملتے تھے: بہار کے درخت، الو کے پرندے، منجمد وقت — نے ہمارے ڈراؤنے خوابوں جیسی بھیانک اور فوری خونیں جنگوں کا تصور کیا: بریدہ جسم؛ خون آلود زرہ والے جنگی گھوڑے؛ چھوٹے دہانوں، چھوٹے ہاتھوں، ترچھی آنکھوں والے، ایک دوسرے کو خنجر گاڑتے خوب صورت آدمی؛ کھڑکیوں سے جھانکتی ذرا سی جھکی ہوئی عورتیں — ہم نے ان حسین لڑکوں کو یاد کیا جو متکبر اور خود پسند تھے، وجیہہ شاہ اور خان، ان کی حماقت اور محلات جو تاریخ کا حصہ بن گئے۔ بالکل ان عورتوں کی طرح جو ان شاہوں کے حرم میں مل کر گریہ کناں تھیں، ہم اب جانتے تھے کہ ہم زندگی کی بجائے یاد کا حصہ بن رہے تھے۔ لیکن کیا ہم انہی کی طرح تاریخ سے داستان بن رہے تھے؟ فراموش کر دیے جانے کے خوف کے بڑھتے سایوں کے باعث دہشت کی سلطنت میں مزید آگے جانے سے گریز کے لیے — موت کے خوف سے زیادہ دہشت خیز — ہم نے ایک دوسرے سے موت کے اپنے اپنے پسندیدہ مناظر بتانے کا کہا۔

پہلی بات جو دماغ میں آئی، یہ تھی کہ کیسے شیطان نے ضحاک کو اپنے باپ کے قتل پر ورغلایا تھا۔ اس داستان کے وقت جو "شاہنامہ" کی ابتدا میں درج ہے، دنیا کی نئی نئی تخلیق ہوئی تھی اور سب کچھ اتنا بنیادی تھا کہ کسی چیز کی وضاحت کی ضرورت نہ تھی۔ اگر آپ کو دودھ چاہیے تھا تو آپ بکری کا دودھ دوہتے اور پی لیتے، آپ کہتے "گھوڑا" اور پھر اس پر سوار ہو کر چل دیتے، آپ "بدی" پر غور کرتے اور شیطان ظاہر

ہو جاتا اور آپ کو اپنے باپ کے قتل کی اچھائی پر قائل کر لیتا۔ ضحاک کے ہاتھوں اپنے عرب افضل باپ مرداس (Merdas) کا قتل، خوب صورت تھا، اس لیے کہ وہ بغیر کسی ترغیب کے تھا اور اس لیے بھی کہ وہ عالی شان محل کے باغ میں رات کو ہوا جب سنہری ستاروں نے صنوبر کے درختوں اور بہار کے خوب صورت پھولوں کو منور کر رکھا تھا۔

پھر ہمیں داستانوی رستم یاد آیا، جس نے بے خبری میں اپنے بیٹے سہراب کو قتل کر ڈالا جو اس دشمن فوج کا کمان دار تھا، جس سے رستم تین روز تک لڑتا رہا تھا۔ کچھ ایسا تھا جس نے ہم سب کو جذباتی کر دیا، جس طرح رستم نے آنسو بھرے کرب کے ساتھ سینہ کوبی کی جب اس نے سہراب کا وہ بازو بند دیکھا جو اس نے بیٹے کی ماں کو برسوں پہلے دیا تھا اور اپنے بیٹے کے طور پر اس دشمن کو پہچان لیا جس کا سینہ خود اس نے اپنی تلوار کی ضربوں سے چھلنی کر ڈالا تھا۔

وہ کیا تھا؟

خانقاہ کی چھت پر بارش برس رہی اور میں ادھر اُدھر چہل قدمی کرتا رہا۔ اچانک میں نے کہا: ''ہمارے باپ استاد عثمان ہمیں فریب دے کر ہلاک کر ڈالیں گے یا پھر ہم انہیں دھوکا دیں گے اور ہلاک کر دیں گے۔''

ہم وحشت زدہ تھے کیوں کہ جو کچھ میں نے کہا وہ بالکل سچ تھا۔ ہم خاموش ہو گئے۔ ابھی تک آگے پیچھے گھومتے ہوئے اور اس سوچ سے گھبراہٹ زدہ کہ جب کچھ اپنی سابقہ حالت میں آ جائے گا، میں نے خود کو درج ذیل بات بتائی: ''موضوع بدلنے کے لیے افراسیاب کے ہاتھوں سیاوش کے قتل کی کہانی سناؤ۔ لیکن یہ ایسی قریب وہی ہے جو مجھے وحشت زدہ کرنے میں ناکام رہی۔ خسرو کی موت کا واقعہ بیان کرو۔'' ٹھیک ہے پھر، لیکن کیا یہ وہ کہانی ہونی چاہیے جو فردوسی نے ''شاہنامہ'' میں بیان کی تھی یا وہ جو نظامی نے خسرو اور شیریں میں؟ ''شاہنامہ'' میں اس سرگزشت کا سوز و گداز خسرو کے اپنی خواب گاہ میں چپکے سے گھس آنے والے شخص کو بصد رنج پہچاننے پر ہے! آخری تدبیر کے طور پر یہ کہتے ہوئے کہ وہ عبادت کرنا چاہتا ہے، خسرو نے اپنے خادم لڑکے کو پانی، صابن، صاف کپڑے اور اپنی جائے نماز لانے کا کہہ دیا، احمق لڑکا یہ سمجھے بغیر کہ اس کے آقا نے اسے مدد کے لیے بھیجا ہے، مطلوبہ چیزیں اکٹھی کرنے چلا جاتا ہے۔ خسرو کے ساتھ تنہا رہ جانے پر قاتل کا پہلا کام یہ تھا کہ دروازہ اندر سے بند کر لے۔ ''شاہنامہ'' کے آخر میں اس منظر میں وہ آدمی جو سازشیوں کو قتل کے لیے ملا، اس کا ذکر فردوسی نے حقارت سے کیا ہے: وہ بدبودار، بالوں بھرا اور توند والا آدمی تھا۔

میں چہل قدمی کرتا رہا، میرے دماغ میں الفاظ کی بھرمار تھی لیکن جیسے کسی خواب میں، میری زبان پر الفاظ آ رہے تھے۔

تبھی میں نے محسوس کیا کہ دوسرے سرگوشیوں میں میرے خلاف باتیں کر رہے تھے۔

وہ میری ٹانگیں کھینچنے میں اتنی عجلت میں تھے کہ ہم چاروں فرش پر گر گئے۔ فرش پر ہم گتھم گتھا ہوئے اور لڑائی ہوئی، لیکن وہ مختصر تھی۔ میں ان تینوں کے نیچے اوپر کی طرف منہ کیے پڑا تھا۔

ان میں سے ایک میرے گھٹنوں پر بیٹھ گیا۔ دوسرا میرے دائیں بازو پر۔

قرہ نے میرے دونوں شانوں پر اپنے گھٹنے جما دیے۔ اس نے سختی سے اپنا وزن میرے معدے اور سینے پر ڈال دیا اور مجھ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ میں پوری طرح بے حرکت تھا۔ ہم سب ہکا بکا تھے اور تیز سانسیں لے رہے تھے۔ یہی مجھے یاد ہے:

میرے (مرحوم) چچا کا مجھ سے عمر میں دو برس بڑا ایک بدمعاش بیٹا تھا ——— مجھے امید ہے کہ وہ کارواں پر حملوں کے اقدام میں عرصہ پکڑا گیا ہو اور عرصہ پہلے اس کا سر قلم کیا جا چکا ہو۔ یہ حاسد درندہ، یہ جانتے ہوئے کہ میں اس سے زیادہ باعلم تھا اور زیادہ ذہین اور مہذب تھا، لڑائی کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتا یا پھر وہ اصرار کرتا کہ ہم کشتی لڑیں اور مجھے گرا کر وہ اپنے گھٹنے بالکل اسی طرح میرے کندھوں پر رکھ کر مجھے قابو کر لیتا تھا، وہ میری آنکھوں میں جھانکتا، جیسے قرہ کر رہا تھا اور اس کا تھوک آہستہ آہستہ میری آنکھوں پر ٹپکنے لگتا اور اسے بہت لطف آتا جب میں اپنا سر دائیں بائیں موڑ کر اس سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔

قرہ نے مجھے کچھ نہ چھپانے کو کہا۔ آخری تصویر کہاں تھی؟ اعتراف!!

مجھے دم گھونٹنے والے پچھتاوے اور غصے کا احساس دو وجوہات کے باعث ہوا: پہلا میں نے سب کچھ فضول بیکار میں کہا تھا، اس علم کہ وہ پہلے ہی کسی سمجھوتے پر پہنچ چکے تھے، دوسرے میں فرار نہ ہوا تھا، یہ تصور کرنے کے ناقابل رہا تھا کہ ان کا رشک و حسد اس سطح تک پہنچ جائے گا۔

قرہ نے دھمکی دی کہ اگر میں نے آخری تصویر نہ دی تو وہ مجھے ذبح کر دے گا۔

کس قدر مضحکہ خیز۔ میں نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ کر لیے یوں جیسے اگر میں نے منہ کھولا تو سچ میرے لبوں سے نکل جائے گا۔ میرے ایک حصے نے یہ بھی سوچا کہ میرے کرنے کو کچھ باقی نہ رہا تھا۔ اگر وہ آپس میں سمجھوتہ کر لیتے اور مجھے قاتل کے طور پر سربراہ خزانچی کے حوالے کر دیتے تو وہ اپنی اپنی کھال بچا لیتے۔ میری واحد امید استاد عثمان تھے جو کسی اور مشتبہ یا کسی اور سراغ کی طرف اشارہ کر سکتے تھے۔ لیکن پھر کیا میں یقین ہو سکتا تھا کہ جو کچھ قرہ نے اس کے بارے میں کہا وہ درست تھا؟ وہ مجھے ابھی اور یہیں قتل کر سکتا تھا اور بعد میں ذمے داری مجھ پر ڈال سکتا تھا، ہے ناں؟

انہوں نے خنجر میری گردن پر رکھ دیا اور میں نے فوراً دیکھ لیا کہ کیسے اس سے قرہ کو ایک خوشی ملی جو وہ چھپا نہ سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے تھپڑ جڑ دیا۔ کیا خنجر میری جلد کاٹ رہا تھا؟ انہوں نے دوبارہ مجھے تھپڑ لگایا۔

میں درج ذیل منطق پر کام کرنے میں کامیاب رہا: اگر میں پرسکون رہوں تو کچھ نہ ہو گا! اس

سے مجھے نفرت تھی۔ وہ اس حقیقت کو نہ چھپا سکے کہ شاگردی کے دنوں سے وہ مجھ سے حسد کرتے تھے، میں نے جو ظاہر ہے کہ بہترین انداز میں مصوری کرتا تھا، سب سے سیدھی لکیریں کھینچتا اور سب سے بہترین تزئین کاری کرتا تھا۔ مجھے ان کے انتہائی رشک وحسد پر پیار آیا۔ میں اپنے محبوب بھائیوں پر مسکرا دیا۔

ان میں سے ایک، میں نہیں چاہتا کہ آپ کو علم ہو کہ ان میں سے کون اس باعث ذلت کام کا ذمے دار تھا لیکن اس نے مجھے پرشوق طریقے سے بوسہ دیا جیسے کسی ایسے محبوب کو جسے وہ عرصے سے چاہتا ہو۔ دوسرے محل کے اس لیمپ کی روشنی میں دیکھتے رہے جو وہ ہمارے قریب لے آئے تھے۔ میں اپنے پیارے بھائی کے اس بوسے پر مہربان ردعمل دینے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اگر ہم ہر شے کے انجام کے قریب ہیں تو سب جان لیں کہ میں بہترین تزئین کاری کرتا ہوں۔ میرے اوراق تلاش کر کے خود دیکھ لیں۔

وہ مجھے غصے سے پیٹنے لگا، یوں جیسے اس کے بوسے کا جواب بوسے دینے پر مجھ پر برہم ہو لیکن دوسروں نے اسے روک دیا۔ مجھے پھر کوئی نہیں تذبذب ہوا۔ قرہ پریشان تھا کہ ان کے مابین ہاتھاپائی ہو رہی تھی۔ یوں تھا جیسے وہ مجھ پر نہیں اس سمت پر برہم تھے جس کا رخ ان کی زندگیاں کر چکی تھیں، وہ پورے جہان سے اپنا انتقام لینا چاہتے تھے۔

قرہ نے اپنی پٹی سے ایک [illegible] نوک دار سوئی۔

لمحے بھر میں وہ میرے چہرے کے [illegible] آیا اور یوں ظاہر کیا کہ جیسے وہ اسے میری آنکھوں میں گھونپنے والا تھا۔

"اسی برس قبل، استادوں کے استاد عظیم بہزاد [illegible] ہرات کے سقوط کے ساتھ سب کچھ ختم ہونے جا رہا تھا اور وقار سے خود کو نابینا کر لیا تاکہ کوئی اسے [illegible] طریقے سے مصوری پر مجبور نہ کر پائے۔" اس نے کہا۔ "اپنی ہی آنکھ میں سوئی گاڑنے اور نکالنے سے ذرا دیر بعد خدا کی غیر معمولی تاریکی اس کے اس پیارے بندے پر چھا گئی، معجزاتی ہاتھ والا وہ فنکار۔ یہ سوئی جو ہرات سے تبریز اب اس منحوس اور نابینا بہزاد کے ساتھ آئی تھی، اسے شاہ طہماسپ نے داستانوی "شاہنامہ" کے ہمراہ ہمارے سلطان کے والد کو تحفے میں بھیجا۔ پہلے استاد عثمان یہ طے کرنے میں ناکام رہے کہ یہ شے کیوں بھیجی گئی تھی، لیکن آج وہ ظالمانہ تحفے کو بھیجنے کا ارادہ اور منصفانہ منطق جان گئے تھے۔ جب استاد عثمان کو یہ معلوم ہوا کہ ہمارے سلطان اپنی شبیہ فرنگی استادوں کی طرز پر بنوانا چاہتے ہیں کہ یہ کہ تم سب نے، جنھیں وہ اپنے بچوں سے بڑھ کر چاہتے تھے، انھیں دھوکا دیا، انھوں نے گزشتہ شب خزانے میں اپنی دونوں آنکھیں سوئی سے پھوڑ لیں ـــــ بہزاد کی تقلید میں۔ اب اگر میں تمھیں اندھا کر دوں، اس ملعون آدمی کو، جو اس کتاب خانے کی تباہی کا ذمے دار ہے جسے استاد عثمان نے اپنی پوری زندگی کی قیمت پر قائم کیا تھا تو کیا ہو؟"

"چاہے تم مجھے اندھا کر دو یا نہیں، آخر میں ہمیں یہاں اپنے لیے کوئی جگہ نہ ملے گی۔" سب نے کہا۔ "اگر استاد عثمان، واقعی نابینا ہو جاتے ہیں یا دنیا سے گزر جاتے ہیں اور ہم جیسا چاہیں مصوری کرتے ہیں،

فرنگیوں کے زیر اثر اپنی انفرادیت برقرار رکھتے اور اپنی غلطیوں کو گلے لگاتے ہوئے تاکہ ہمارا ایک الگ انداز ہو، ہم خود سے مشابہ ہو سکیں، لیکن ہم، ہم نہیں ہوں گے۔ نہیں، چاہے ہم پرانے استادوں کی طرح مصوری پر راضی ہوں، یہ جواز دیتے ہوئے کہ صرف اس طور ہم، ہم رہ سکیں گے، ہمارے سلطان جو حتیٰ کہ استاد عثمان کی طرف بھی پشت موڑ چکے ہیں، ہماری جگہ لینے کے لیے متبادل کے طور پر دوسروں کو تلاش کر لیں گے۔ کوئی بھی ہماری جانب نہ دیکھے گا، ہم صرف ترس و ترحم کے متحمل ہوں گے۔ کاتب خانے پر حملہ صرف ہماری زخموں پر نمک ہی چھڑکتا ہے کیوں کہ اس حملے کا آدھا الزام ہم مِنی ایچر فنکاروں پر ہی آئے گا جنہوں نے محترم مبلغ کو قتل کر دیا ہے۔"

اگرچہ میں نے کافی دیر انہیں اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ ہمارا آپس میں جھگڑنا ہمارے خلاف جائے گا، اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ ان کا میری بات سننے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ سراسیمہ تھے۔ اگر وہ تیزی سے فیصلہ کر سکتے، صبح سے پہلے، صحیح یا غلط، ان میں سے کون قصوروار تھا، وہ قائل تھے کہ وہ خود کو بچا سکتے تھے، تشدد سے بچ سکتے تھے اور یہ کہ کتاب خانے سے متعلق سب کچھ آنے والے برسوں میں اسی طرح قائم و دائم رہتا، جیسا کہ ہمیشہ رہا تھا۔

اس کے باوجود قرہ نے جو کچھ کرنے کی دھمکی دی، اس سے باقی دو کو کوئی خوشی نہ ہوئی۔ کیا ہوتا اگر یہ ظاہر ہو جاتا کہ کوئی اور قصوروار تھا اور ہمارے سلطان کو علم ہو جاتا کہ انہوں نے مجھے بے وجہ اندھا کیا تھا؟ وہ قرہ کے استاد عثمان سے قرب اور اس کی ان سے گستاخی پر رنجیدہ تھے۔ انہوں نے وہ سوئی پرے ہٹانے کی کوشش کی جو وہ میری آنکھوں پر رکھے ہوئے تھا۔

قرہ گھبرا گیا، یوں جیسے وہ سوئی اس سے چھین رہے تھے، یوں جیسے ہم اس کے مخالف کھڑے تھے۔ دوبارہ ہاتھا پائی ہوئی۔ میں بس یہی کر سکتا تھا کہ سوئی پر اس ہاتھا پائی سے بچنے کو اپنا سر جھکائے رکھوں، جو عین میری آنکھوں سے قریب ہو رہی تھی۔

سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ پہلے کیا ہوا تھا۔ میں نے اپنی دائیں آنکھ میں تیز مگر تھوڑا سا درد محسوس کیا، میری پیشانی کچھ دیر کو سُن ہو گئی۔ پھر سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے وہ پہلے رہا تھا، تاہم ایک خوف پہلے ہی مجھ میں جڑیں پکڑ چکا تھا۔ تیل کا لیمپ بجھ چکا تھا لیکن میں اب بھی اپنے سامنے موجود شے کو فیصلہ کن طور پر سوئی کا دستہ دیکھ سکتا تھا، اس بار میری بائیں آنکھ میں۔ اس نے صرف چند لمحے قبل قرہ سے سوئی لی تھی اور اب زیادہ محتاط اور باریک بین تھا۔ جب مجھے سمجھ آئی کہ سوئی آسانی سے میری آنکھ میں گڑ گئی تھی، میں ساکت لیٹ رہا۔ اگرچہ مجھے اسی جلن کا سا احساس ہوا تھا۔ میری پیشانی کا سُن ہونا لگتا تھا میرے پورے سر میں پھیل گیا تھا لیکن جب سوئی نکالی گئی تو وہ رک گیا۔ وہ باری باری سوئی اور پھر میری آنکھوں کو دیکھ رہے تھے۔ یوں تھا جیسے انہیں یقین نہ تھا کہ کیا ظاہر ہوا تھا۔ جب ہر کوئی پوری طرح سمجھ گیا کہ بدقسمتی مجھ پر طاری ہو چکی تھی تو شور و غل تھم گیا اور میرے بازوؤں پر موجود بوجھ پیچھے ہٹ گیا۔

میں چیخنے لگا، تقریباً بین کرتے ہوئے۔ تکلیف کی وجہ سے نہیں بلکہ پوری طرح وہ جان لینے کی وحشت کے باعث جو میرے ساتھ ہو چکا تھا۔

پہلے پہل مجھے محسوس ہوا کہ میری آہ وزاری نے نہ صرف مجھے سکون دیا تھا بلکہ انہیں بھی۔ میرے شور نے ہمیں ایک ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔

تب بھی جب میرا چیخنا چلانا جاری رہا تو ان کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔ میں اب مزید اپنی تکلیف محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ میں بس یہی سوچ سکتا تھا کہ میری آنکھوں میں سوئی گاڑی جا چکی تھی۔

میں ابھی اندھا نہیں ہوا تھا۔ شکر خدا کا کہ میں انہیں ابھی تک خود کو وحشت و افسوس کے عالم میں دیکھتے دیکھ سکتا تھا۔ میں اب بھی خانقاہ کی دیواروں پر ان کے سایوں کی بے مقصد حرکت دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ایک ہی وقت میں مجھے خوش اور چوکنا کر دیا۔ "میرے ہاتھ کھولو۔" میں چیخا، "میرے ہاتھ کھولو تا کہ میں ایک بار پھر سب کچھ دیکھ سکوں، میں تم سے التجا کرتا ہوں۔"

"جلدی بتاؤ ہمیں" قرہ بولا "اس رات تم نفیس آفندی سے کیسے ملے تھے؟ تب ہم تمہارے ہاتھ کھول دیں گے۔"

"میں کافی خانے سے واپس آ رہا تھا۔ بے چارے نفیس آفندی نے مجھے راستے میں مخاطب کیا۔ وہ جنونی ہو رہا تھا اور بے حد مشتعل تھا۔ پہلے مجھے اس پر ترس آیا۔ لیکن ابھی مجھے چھوڑ دو اور میں تمہیں سب کچھ بعد میں بتا دوں گا۔ میری آنکھیں دھندلا رہی ہیں۔"

"وہ ابھی نہیں دھندلائیں گی۔" قرہ نے عزم سے "میرا یقین کرو، استاد عثمان ابھی بھی اپنی آنکھوں کو پھوڑ لینے کے بعد بھی، رنگے ہوئے نقشوں والے گھوڑوں کو الگ پہچان سکتے ہیں۔"

"بے بس نفیس آفندی نے کہا کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے اور یہ کہ میں واحد شخص تھا جس پر وہ اعتبار کر سکتا تھا۔"

تاہم اس پر نہیں، مجھے اب خود پر ترس آیا تھا۔

"اگر تم اپنی آنکھوں پر خون جمنے سے پہلے ہمیں بتا دو، تو ممکن ہے کہ تم ایک آخری بار اس دنیا کو جی بھر کر دیکھ سکو گے۔" قرہ نے کہا، "دیکھو بارش تھم گئی ہے۔"

"میں نے نفیس سے کہا کہ چلو کافی خانے واپس چلیں لیکن فوراً ہی محسوس کر لیا کہ اسے وہاں جانا پسند نہ تھا اور حتیٰ کہ اس بات نے اسے دہشت زدہ کر دیا۔ یوں مجھے پہلے پہل معلوم ہوا کہ نفیس آفندی مکمل طور پر ہم سے الگ ہو چکا تھا اور 25 سال تک ہمارے ساتھ مصوری کرنے کے بعد الگ ہو چکا تھا۔ پچھلے آٹھ یا دس برسوں میں، اس کی شادی کے بعد، میں نے اسے کتاب خانے میں دیکھا تو تھا لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ اس کی سوچوں پر کیا سوار تھا ___ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے آخری تصویر دیکھی، کیسے وہ اس قدر گمبھیر گناہ رکھتی تھی کہ ہم کبھی اس کا کفارہ نہ ادا کر پائیں گے۔ اس کا کہنا تھا کہ نتیجے کے طور پر ہم سب جہنم میں جلیں

گے۔ وہ مشتعل تھا اور اس پر خوف غالب تھا، ایک ایسی تباہی و بربادی کے احساس کے تحت جو وہ شخص محسوس کرتا ہے جس سے نادانستہ طور پر کفر سرزد ہو گیا ہو۔"

"کیا؟ کیا کفر؟"

"جب میں نے اس سے یہی سوال پوچھا تو اس نے حیرت سے اپنی آنکھیں کھول لیں، جیسے کہہ رہا ہو کہ تمہارا مطلب ہے تمہیں نہیں معلوم؟ تبھی مجھے خیال ہوا کہ کیسے ہمارا دوست بوڑھا ہو چکا تھا، جیسا کہ ہم سب۔ اس نے کہا کہ بدقسمت انشٹے نے آخری تصویر میں بے حیائی سے تناظری طریقہ اختیار کیا تھا۔ اس تصویر میں اشیا کی عکاسی اللہ کی نگاہ میں ان کی اہمیت کے حوالے سے نہیں بلکہ اس طور کی گئی تھی جیسے وہ آنکھ پر ظاہر ہوتی ہیں — جیسے فرنگی مصوری کرتے تھے۔ یہ پہلا گناہ یا انحراف تھا۔ دوسرا، ہمارے سلطان، خلیفہ الاسلام کی تصویر کشی تھی، کتے کے برابر حجم کی۔ تیسرے گناہ میں، اس جسامت میں اور منظور خاطر روشنی میں شیطان کی عکاسی تھی۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر — ہماری مصوری میں فرنگی انداز متعارف کروانے کا ایک فطری نتیجہ — ہمارے سلطان کی تصویر کو اصل جسامت اور ان کے چہرے کو تمام تفصیلات کے ساتھ بنانا تھا، بالکل جیسا کہ بت تراشی کرتے ہیں، بالکل ان "تصویروں" کی، جو خود کو اپنے وراثتی بت پرستانہ رجحانات سے بچا نہ پائے تھے، اپنے گرجا گھروں کی دیواروں پر تصویریں بنائیں اور عبادت کی تھی۔ نفیس آفندی جس نے تمہارے انشٹے سے تصویروں کا معلوم کیا تھا بخوبی جانتا تھا اور درست طور پر یقین رکھتا تھا کہ تصویر کشی عظیم ترین گناہ تھی اور یہ مسلمانوں کی مصوری کا خاتمہ ہو گی۔ جیسا کہ ہم اس کافی خانے میں نہ گئے تھے جہاں، اس کا دعویٰ تھا کہ ہمارے اعلیٰ حضرت مبلغ آفندی اور ہمارے مذہب کو بدنام کیا جاتا تھا، گلی میں چلتے ہوئے اس نے اس سب کی وضاحت مجھ سے کی۔ کبھی کبھی وہ رکتا، یوں جیسے کسی مدد کی تلاش میں ہو، مجھ سے پوچھتا کہ آیا یہ سب بلاشبہ درست تھا، کیا واقعی کوئی توبہ کا موقع یا رجوع نہ تھا اور کیا ہم واقعی جہنم میں جلیں گے۔ اس کو ندامت و پچھتاوے کے دورے پڑے اور پچھتاوے میں بیہودگی کرتا لیکن میں قائل نہ تھا۔ وہ ایک دغاباز بہروپیا تھا، جو پچھتاوے کا دکھاوا کرتا تھا۔"

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"ہم نفیس آفندی کو بچپن سے جانتے تھے۔ وہ اپنی تزئین کاری کی طرح نفیس، خاموش، معمولی اور بے رنگ تھا۔ یوں تھا جیسے میرے سامنے کھڑا شخص پہلے سے زیادہ احمق، زیادہ بے وقوف، زیادہ ذہین وار، تاہم زیادہ مصنوعی تھا، اس نفیس سے جسے ہم جانتے تھے۔"

"میں نے سنا ہے کہ وہ ارض رومیوں سے بھی قریب ہو گیا تھا۔" قرہ نے کہا۔

"کوئی بھی مسلمان غفلت میں گناہ کرنے پر اس قدر کرب و اذیت اور پچھتاوا محسوس نہ کرے گا۔" میں نے کہا۔ "ایک اچھا مسلمان جانتا ہے کہ خدا منصف و عادل ہے اور اتنا معقول ضرور ہے کہ اپنے بندوں کی نیتوں کو زیر غور لائے۔ صرف چھوٹے ذہن کے نادان شخص ہی یقین رکھتے ہیں کہ وہ بے خبری میں

سؤر کھانے پر جہنم میں جائیں گے۔ بہر حال ایک حقیقی مسلمان جانتا ہے کہ دوزخ کے عذاب کا خوف اس کے لیے نہیں دوسروں کے لیے ہوتا ہے۔ یہی نفیس آفندی کر رہا تھا تم جانتے ہو، وہ مجھے خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ تمہارے انشتے تھے جنہوں نے اسے ایسا کرنا سکھایا تھا اور تبھی مجھے معلوم ہو کہ بلاشبہ یہی معاملہ تھا۔ اب پوری ایمان داری سے مجھے بتاؤ میرے پیارے منی ایچر فنکار بھائیو، کیا خون میری آنکھوں میں جمنے لگا ہے، کیا میری آنکھیں اپنا رنگ کھو چکی ہیں؟"

وہ لیمپ میرے چہرے کے قریب لائے اور جراحوں کی سی دیکھ بھال اور دردمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معائنہ کیا۔

"کچھ پتا دکھائی نہیں دیتا۔"

کیا ان تینوں کے اپنی آنکھوں میں جھانکنے کا یہ منظر آخری تھا جو میں اس دنیا میں دیکھوں گا؟ میں جانتا تھا کہ میں اپنی تمام عمر ان لمحات کو نہیں بھولوں گا اور میں نے بعد کی ردوبدل بیان کی کیوں کہ پچھتاوے کے باوجود مجھے [illegible] بھی محسوس ہوئی:

"تمہارے انشتے نے نفیس آفندی کو آخری تصویر کو چھپاتے ہوئے، صرف اس خاص جگہ کو ہم سب پر ظاہر کرتے اور ہم سے وہاں چھوڑتے ہوئے ——— بتایا کہ وہ کسی ممنوعہ منصوبے میں ملوث تھا۔ تصویر کو پراسرار اور خفیہ رکھنے کا تاثر دیتے ہوئے یہ [illegible] انشتے تھا جس نے کفر کا خوف ذہن میں بٹھایا تھا۔ وہ ارض روم والے نہیں جنہوں نے اپنی زندگیوں میں [illegible] مینا کاری والی کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ وہی گناہ سے متعلق اس گھبراہٹ اور اضطراب کو پھیلانے کا ذمے دار [illegible] نے ہمیں متاثر کیا۔ اس دوران صاف شفاف ضمیر والے کسی فنکار کو کس کا خوف ہوتا؟"

"ہمارے زمانے میں ایسا بہت کچھ ہے جس سے شفاف ضمیر والے کسی فنکار کو خوف کھانا ہوتا ہے۔" قرہ نے خود پسندی سے کہا، "بلاشبہ کسی کو تزئین سے متعلق کچھ نہیں کہا لیکن ہمارے عقیدے میں تصویریں ممنوع ہیں۔ چوں کہ ایرانی استادوں کی تصویریں اور حتیٰ کہ ہرات کے عظیم استادوں کے شہکار بھی محض طور پر حاشیوں کی آرائش کی توسیع کے طور پر دیکھے جاتے ہیں، کوئی بھی ان کو مسئلہ نہ بناتا، اس باعث کہ وہ تحریر کا حسن اور خطاطی کی شان و شوکت بڑھاتے اور ہماری مصوری بہر حال دیکھتا کون ہے؟ تاہم جب ہم فرنگیوں کے طریقے استعمال کرتے ہیں، تو ہماری مصوری آرائش و زیبائش اور باریک و نازک نمونوں پر توجہ کم مرکوز کر رہی ہے اور سیدھے سبھاؤ اظہار پر زیادہ۔ اسی سے عظیم الشان خان منع کرتا ہے اور یہی ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ناخوش کرتا ہے۔ ہمارے سلطان اور انشتے دونوں اس سے بخوبی واقف تھے۔ یہی میرے انشتے کے قتل کا سبب تھا۔"

"تمہارے انشتے کا قتل اس لیے ہوا کیوں کہ وہ خوف زدہ تھا۔" میں نے کہا، "بالکل تمہاری طرح، وہ دعویٰ کرنے لگا تھا کہ تصویر کشی یا مصوری جو کہ وہ خود کر رہا تھا، مذہب یا مقدس کتاب کے خلاف نہ

تھی — یہی وہ عذر تھا جو ارض رومیوں کو دیا گیا جو مذہب کے متصادم ایک پہلو پا کر پریشان تھے۔ نفیس آفندی اور تمہارے انشتے بالکل ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔"

"اور تم ہی ہو جس نے ان دونوں کو قتل کر دیا، ایسا ہی ہے ناں؟" قرہ نے پوچھا۔

میں نے لمحے بھر کو خیال کیا کہ وہ مجھے مارے گا اور اسی لمحے میں یہ بھی جانتا تھا کہ حسین وجمیل شکورے کے نئے شوہر کو حقیقتاً اپنے انشتے کے قتل کے بارے میں کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ مجھے زد و کوب نہیں کرے گا اور اگر اس نے کیا بھی تو مجھے اس سے اب کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

"حقیقت میں ہمارے سلطان جس قدر چاہتے تھے کہ فرنگی فنکاروں کے زیر اثر کتاب تیار کی جائے — "میں نے ڈھٹائی سے بات جاری رکھی۔ "تمہارے انشتے اتنا ہی ایک اشتعال انگیز کتاب تیار کرنا چاہتے تھے جس کے غیر شرعی پن کا داغ یا فساد ان کے غرور کو سہارا دے۔ وہ فرنگی استادوں کی تصویروں کے لیے ایک غلامانہ رعب محسوس کرتے تھے جو انہوں نے اپنے سفروں کے دوران دیکھی تھیں اور وہ مکمل طور پر اس فنکارانہ صلاحیت کی محبت میں گرفتار تھے جس نے ہمیں دونوں مسرت بخشی — تم نے بھی تناظر اور صورت گری کے بارے میں ان احمقانہ باتوں کو سنا ہوگا۔ اگر تم مجھ سے پوچھتے ہو تو جو کتاب ہم تیار کر رہے تھے اس میں کچھ بھی نقصان دہ یا گستاخانہ نہیں تھا۔ چوں کہ وہ اس سے بخوبی واقف تھا، اس نے یوں دکھاوا کیا جیسے وہ کوئی ممنوعہ کتاب تیار کر رہا تھا اور اسے اس سے بڑا اطمینان ملا — سلطان کی ذاتی اجازت سے ایک خطرناک مہم میں شریک ہونا اس کے لیے انتہائی اہم تھا۔ [illegible] فرنگی استادوں کی تصاویر کا۔ سچ ہے، اگر ہم نے نوازش کی نیت سے تصویر بنائی تھی تو وہ ضرور گستاخی ہوگی۔ تاہم [illegible] میں سے کسی میں بھی مجھے کچھ بھی خلاف مذہب، کوئی بے ایمانی، گناہ گاری، کفر یا حتیٰ کہ ذرا سا بھی غیر شرعی پن نہ ہو سکا تھا۔ کیا تمہیں ایسا کچھ محسوس ہوا تھا؟"

"تم پر یقین نہیں ہو سکتے، ہے ناں؟" میں نے دانت کچکچا کر کہا۔ "چاہے تم خفیہ طور پر یہ یقین رکھو کہ توہین کا عیب یا گستاخی کا سایہ ان تصویروں میں وجود رکھتا ہے جو ہم نے بنائی ہیں۔ تم اس عقیدے کو بھی قبول نہیں کر سکتے تھے، نہ اس کا اظہار کر سکتے تھے کیوں کہ یہ ان کٹر جوشیلوں اور ارض رومیوں کو اعتبار دینے کے مترادف ہوتا جو تمہارے خلاف تھے اور تمہیں الزام دیتے تھے۔ دوسری جانب تم یقین سے دعویٰ نہیں کر سکتے کہ تم تازہ گری برف کی طرح معصوم و بے قصور ہو کیوں کہ اس کا مطلب ہوگا کسی خفیہ ڈھکے چھپے، پُراسرار اور ممنوعہ اقدام میں ملوث ہونے پر اپنے خالص خود تحسینی اور سراسیمہ فخر دونوں سے دست بردار ہونا۔ کیا تم جانتے ہو کہ میں کیسے آگاہ ہوا کہ میں اس معاملے میں تصنع بھرا رویہ دکھا رہا تھا؟ آدھی رات کو بے چارے نفیس آفندی کو اس درویش خانقاہ میں لا کر، میں اسے اس بہانے سے یہاں لایا تھا کہ ہم سڑکوں پر اتنی دیر تک چلتے تقریباً جم چکے تھے۔ حقیقت میں، مجھے اسے یہ دکھا کر خوشی ہوئی تھی کہ میں ایک آزاد فکر قلندری خیال تھا یا بدتر کہ میں قلندری بننا چاہتا تھا۔ جب نفیس سمجھ گیا کہ لواطت، حشیش کھانے، آوارہ گردی اور ہر قسم

کی۔ خدا نے مجھے دکھا دیا تھا کہ وہ شخص حقیقت میں کس قدر بد بخت تھا۔ یہ سونے کے ورق میرے دماغ میں آئے لیکن کسی الہامی تحریک کے تحت میں نے جھوٹ بول دیا۔ میں نے کہا کہ سونے کے ورق یہاں خانقاہ میں نہیں تھے بلکہ میں نے انھیں کہیں اور چھپایا تھا۔ ہم باہر نکل گئے۔ میں ان کو لے کر خالی گلیوں میں گھوما اور اس علاقے میں جو راستے میں نہ پڑتا تھا، یہ سوچے بغیر کہ ہم کہاں جا رہے تھے۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میں کیا کرتا اور مختصر یہ کہ میں خوف زدہ تھا۔ ہماری آوارہ گردی کے اختتام پر جب ہم اس گلی میں آئے، جہاں سے ہم پہلے گزرے تھے، ہمارے بھائی نفیس آفندی، جس نے ساری عمر اندازوں اور دہرانے کے لیے وقف کر دی، مشکوک ہو گیا۔ لیکن خدا نے مجھے ایک نذر آتش شدہ خالی جگہ اور قریب ہی ایک خشک کنواں فراہم کر دیا۔''

اس مقام پر میں جانتا تھا کہ میں مزید آگے نہ جا سکتا تھا اور یوں میں نے انھیں بتایا۔ ''اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم اپنے فنکار بھائیوں کے بچاؤ کا سوچتے اور بالکل یہی کرتے۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔

جب میں نے انھیں خود سے اتفاق کرتے سنا تو میرا رو دینے کو جی چاہا۔ میں یہ کہنے کو تھا کیوں کہ ان کی دردمندی جس کا میں حق دار نہ تھا، اس نے میرے دل کو نرم کر دیا، لیکن نہیں۔ میں یہ اس لیے کہنے والا تھا کیوں کہ میں نے ایک بار پھر اس کے جسم کا کنوئیں کی تہ سے ٹکرانا سنا جہاں میں نے اسے قتل کرنے کے بعد پھینک دیا تھا، لیکن نہیں۔ میں یہ اس لیے کہنے والا تھا کیوں کہ مجھے یاد آیا کہ میں قاتل بننے سے پہلے کس قدر خوش تھا، کیسے میں باقی سب [illegible] تھا، لیکن نہیں۔ میرے تخیل میں وہ نابینا ابھرا جو میرے بچپن میں ہمارے علاقے سے گزرا کرتا تھا: وہ غلیظ ترکپڑوں میں سے ایک غلیظ دھاتی برتن برآمد کیا کرتا اور پانی کے فوارے کے قریب ہم دور کھڑے دیکھتے، بچوں کو پکار کر کہتا: ''میرے بچو تم میں سے کون اس اندھے بوڑھے کا برتن پانی سے بھر دے گا؟'' جب کوئی اس کی مدد کو نہ آتا تو وہ کہا کرتا، ''یہ ایک اچھائی ہوگی میرے بچو، ایک نیکی!'' اس کی پتلیوں کا رنگ دھندلا چکا تھا اور وہ تقریباً اس کی آنکھ کی سفیدی کے رنگ کی ہی تھیں۔

اس اندھے بوڑھے سے مشابہ نظر آنے کے خیال پر مضطرب ہو کر میں نے کچھ بھی نہ چھپاتے ہوئے اعتراف کیا کہ کیسے میں نے عجلت میں انشتے آفندی سے چھٹکارا پایا۔ میں ان کے ساتھ زیادہ ایمان دار تھا نہ ہی غیر مخلص: میں نے درمیانی رستہ پا لیا: ایسی کہانی میرے دل کو زیادہ تکلیف نہ دیتی اور انھیں یقین ہو جاتا کہ میں انشتے کے گھر قتل کی نیت سے نہیں گیا تھا۔ میں واضح کرنا چاہتا تھا کہ یہ پہلے سے سوچا سمجھا قتل نہ تھا، جس کے ارادے سے وہ جمع ہوئے تھے، جب میں نے خود کو بری قرار دینے کی کوشش کرتے ہوئے انھیں درج ذیل بات یاد دلائی: ''برے عزائم یا ارادے پروان چڑھائے بغیر کوئی بھی کبھی دوزخ میں نہیں جا سکتا۔''

''نفیس آفندی کو اللہ کے فرشتوں کے حوالے کرنے کے بعد۔'' میں نے پر خیال انداز میں کہا، ''گزشتہ لمحات میں جو کچھ مرحوم نے مجھے کہا تھا، وہ کسی کیڑے کی طرح مجھے کترنے لگا۔ میرے ہاتھوں کو

کنوئیں بنانے کے سبب، آخری تصویر میرے ذہن میں اُبھر کر سامنے آئی اور یوں اسے دیکھنے کا عزم کرنے میں تمہارے انشتے کے پاس گیا، اب جنہوں نے ہم میں سے کسی کو اپنے گھر تک بلایا تھا۔ انہوں نے نہ صرف تصویر دکھانے سے انکار کیا بلکہ یوں ظاہر کیا جیسے کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ انہوں نے ناک چڑھا کر یوں کہا کہ وہاں تصویر تھی نہ ہی کچھ اور پر اسرار، جو قتل کا تقاضا کرتا! مزید بے عزتی سے بچنے کے لیے اور ان کی توجہ حاصل کرنے کے لیے میں نے اعتراف کیا کہ وہ میں ہی تھا جس نے نفیس آفندی کو ہلاک کیا اور اسے کنوئیں میں پھینک دیا۔ ہاں، تب انہوں نے مجھے سنجیدگی سے لیا لیکن وہ مجھے اسی طرح بے عزت کرتے رہے۔ اپنے بیٹے کو بے عزت کرنے والا شخص باپ کیسے ہو سکتا تھا؟ عظیم استاد عثمان ہم پر غضب ناک ہو جاتے تھے، وہ ہمیں مارتے پیٹتے تھے لیکن انہوں نے کبھی ایک بار بھی ہمیں بے عزت نہیں کیا تھا۔ او میرے بھائیو، ہم نے انہیں دھوکا دے کر سنگین غلطی کی ہے۔''

میں اپنے برادران کو دیکھ کر مسکرایا جن کی توجہ میری آنکھوں پر تھی، جو مجھے یوں سن رہے تھے جیسے میں بستر مرگ پر تھا۔ بالکل جیسے کوئی مرتا ہوا آدمی محسوس کرتا میں نے انہیں دھندلے ہوتے اور خود سے دور جاتے دیکھا۔

''میں نے تمہارے انشتے کو دو وجوہات کے باعث قتل کیا۔ پہلا سبب یہ کہ اس نے بے حیائی سے عظیم استاد عثمان کو وینسی فنکار جیسی تیاوتی کی نقل لینے پر مجبور کیا تھا۔ دوسرے اس لیے کہ کمزوری کے لمحات میں میں نے خود کو اس حد تک گراتے پوچھ لیا تھا کہ کیا میرا منفرد انداز تھا۔''

''انہوں نے کیا جواب دیا؟''

''یوں لگتا ہے جیسے میں ایک انداز رکھتا ہوں، لیکن ان کے جواب سے یقیناً یہ کوئی بے عزتی کی بات نہ تھی۔ اپنی شرمساری میں مجھے یاد آیا کہ میں نے سوچا کہ آیا وہ واقعی تعریف تھی۔ میں انداز یا اسلوب کو بے جز ہونے کی ایک قسم سمجھتا ہوں اور بے عزتی لیکن شبہات مجھے کھائے چلے جا رہے تھے۔ میں انداز سے کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن شیطان مجھے ورغلا رہا تھا اور مزید برآں میں متجسس تھا۔''

''ہر کوئی الگ انداز رکھنے کی چوری چھپے خواہش رکھتا ہے۔'' قرہ نے چالاکی سے کہا، ''ہر کوئی اپنی شبیہ بھی بنوانا چاہتا ہے جیسا کہ ہمارے سلطان نے بنوائی۔''

''کیا اس مصیبت سے مزاحمت ناممکن ہے؟'' میں نے کہا، ''جب یہ طاعون پھیلتا ہے، ہم میں سے کوئی بھی فرنگی طریقوں کے خلاف کھڑا نہ ہو پائے گا۔''

تاہم، مجھے کوئی نہیں سن رہا تھا۔ قرہ تفلیس ترکمان سردار کی کہانی سنا رہا تھا جسے 12 برس کے لیے چین جلاوطن کر دیا گیا تھا کیوں کہ اس نے شاہ کی بیٹی کے لیے اپنی محبت کا وقت سے پہلے اظہار کر دیا تھا۔ چوں کہ اس کے پاس اپنی محبوبہ کی تصویر نہ تھی جس کا اس نے 12 برس خواب دیکھا تھا، وہ چینی حسیناؤں میں اس کا چہرہ بھول گیا اور اس کی مجبور محبوبہ کا رنج اللہ کی رضا سے گہری آزمائش میں تبدیل ہو گیا۔

”تمہارے انشے کی بدولت ہم سب کو ”شبیہ“ (پورٹریٹ) کے معنی معلوم ہوئے۔“

میں نے کہا: ”خدا نے چاہا تو ایک روز ہم بے خوفی سے اپنی زندگیوں کی کہانیاں اس طرح بیان کریں گے جیسا کہ ہم نے وہ حقیقت میں گزاری تھیں۔“

”تمام داستانیں ہر کسی کی داستانیں ہوتی ہیں۔“ قرہ بولا۔

”ایک مصوری، خدا کی مصوری بھی ہے۔“ میں نے ہرات کے شاعر ہاتفی کا شعر نقل کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن جب فرنگیوں کی تکنیک پھیلے گی، ہر کوئی اسے دوسرے آدمیوں کی کہانیاں بیان کرنے کی خصوصی صلاحیت خیال کرے گا، یوں جیسے وہ خود انہی کی تھیں۔“

”یہ شیطان کی مرضی کے سوا اور کچھ نہیں۔“

”اب میرے ہاتھ کھول دو۔“ میں چیخا: ”مجھے آخری بار دنیا کو دیکھ لینے دو۔“

وہ خوف زدہ تھے اور مجھ میں ایک نیا اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔

”کیا تم آخری تصویر دکھاؤ گے؟“ قرہ نے کہا۔

میں نے قرہ کو ایسی نگاہ سے دیکھا کہ وہ فوراً سمجھ گیا کہ میں ایسا ہی کروں گا اور اس نے مجھے آزاد کر دیا۔ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کو دیر گزری میری شناخت معلوم ہو چکی ہوگی جو میں چھپانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ پھر بھی حیرت زدہ نہ ہوں کہ میں ہرات کے پرانے استادوں کی طرح رویہ برت رہا ہوں کیونکہ وہ اپنی شناخت چھپانے کے لیے اپنے دستخط نہیں چھپاتے تھے بلکہ ان استادوں کے اصول اور احترام کے سبب ایسا تھا۔ ہاتھ میں تیل کا لیمپ لیے اپنے مدھم سائے کے لیے خود راستہ بناتے ہوئے جوش و خروش سے میں خانقاہ کے گھور تاریک کمروں میں گھومنے لگا۔ کیا میری آنکھوں پر تاریکی کا پردہ گرنے لگا تھا یا وہ کمرے اور گزرگاہیں واقعی تاریک تھیں؟ کتنے روز اور ہفتے، میرے نابینا ہونے میں کتنا وقت باقی تھا؟ باورچی خانے کے بھوتوں میں میں اور میرا سایہ رک گئے اور تیزی سے واپس پلٹنے سے پہلے گرد آلود الماری کے صاف گوشے سے اوراق اٹھا لیے۔ قرہ احتیاط کے طور پر میرا پیچھا کرتا رہا تھا لیکن اپنا خنجر اٹھانا نظر انداز کر گیا۔ کیا مجھے موقع جانچتے ہوئے خنجر اٹھانے اور اسے اندھا کرنے کا سوچنا چاہیے تھا، اس سے قبل کہ میں خود اندھا ہو جاتا؟

”مجھے خوشی ہے کہ میں اندھا ہونے سے قبل اسے ایک بار پھر دیکھ سکوں گا۔“ میں نے فخر سے کہا: ”میں تم سب کو بھی یہ دکھانا چاہتا ہوں، دیکھو یہاں۔“

تیل کے لیمپ کی روشنی میں میں نے انہیں مکمل آخری تصویر دکھائی جو میں نے اس روز انشے کے گھر سے لی تھی، جب انہیں قتل کیا تھا۔ پہلے میں ان کے تجسس اور خائف تاثرات دیکھتا رہا جب انہوں نے دہرے ورق والی تصویر کو دیکھا۔ میں چکر کاٹ کر ان کے ساتھ شامل ہو گیا اور میں اسے دیکھتے ہلکا سا کپکپا رہا تھا۔ میری آنکھوں پھوٹنے کے باعث مجھے بخار سا ہو گیا تھا۔

تصویریں پچھلے برس کے دوران جو ہم نے دو صفحوں کے مختلف حصوں پر بنائی تھیں ـــــ درخت، گھوڑا، شیطان، موت، کتا اور عورت ـــــ انشٹے کے تئے لیکن نا اہل طریقے کے مطابق، بڑی اور چھوٹی، ترتیب میں تھیں، اس طرح سے کہ (مرحوم) ایلیس آفندی کے تزئین شدہ کام اور حاشیے سے ہمیں محسوس ہوا کہ ہم کسی کتاب کے ورق کو نہیں بلکہ کھڑکی سے جھانک کر ایک دنیا کو دیکھ رہے تھے۔ اس دنیا کے مرکز میں جہاں سلطان کو ہونا چاہیے تھا، خود میری تصویر تھی، جسے میں نے ذرا دیر کو فخر سے دیکھا، میں اس سے کسی قدر غیر مطمئن تھا کیوں کہ بعد بھی میں اچھی مشابہت کے حصول میں ناکام رہا تھا۔ پھر بھی میں نے بے لگام سرخوشی محسوس کی کیوں کہ تصویر نے مجھے نہ صرف وسیع و عریض جہان کے مرکز میں لا رکھا تھا بلکہ کسی ناقابل توجیہ اور ابلیسی سبب سے مجھے حقیقت سے زیادہ عمیق، پیچیدہ اور پُر اسرار بنا دیا تھا۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ میرے فنکار بھائی میری پُر جوش کیفیت کو پہچان اور سمجھ سکیں اور اس میں شریک ہوں۔ میں کسی سلطان یا بادشاہ کی طرح ہر شے کا مرکز بھی تھا اور اسی دوران خود اپنی ذات بھی۔ صورتِ حال نے میرے فخر و غرور میں اضافہ کیا اور مجھے خجل بھی انتہائی کیا۔ آخر کار دونوں احساسات ایک دوسرے کے ساتھ توازن میں آ گئے اور میں پُر سکون ہونے اور تصویر سے ایک چکرا دینے والی مسرت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن اس خوشی کی تکمیل کے لیے میں جانتا تھا کہ میرے چہرے اور [illegible] کا ہر نشان، تمام جھریاں، سائے، میری مونچھوں سے میرے لباس کی سلائی تک ہر تفصیل اور ان کے تمام رنگ، تمام عکس مکمل ہونے چاہئیں تھے، باریک تر تفصیلات میں بھی، اتنی جتنا کہ فرنگی مصوروں کی مہارت اجازت دیتی۔

میں نے اپنے پرانے ساتھیوں کے تاثرات میں خوف، اضطراب اور ہم سب کو نگل جانے کا ناقابل گریز احساس دیکھا: حسد۔ برہم حقارت و تنفر کے ساتھ جو وہ گناہ میں بے بسی سے غرق نا امید شخص کے لیے محسوس کرتے تھے، وہ رشک زدہ بھی تھے۔

"ان راتوں میں، جب میں یہاں تیل کے لیمپ کی روشنی میں اس تصویر کو تکتا رہتا تھا، میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ خدا مجھے چھوڑ چکا ہے اور میری تنہائی میں صرف شیطان مجھ سے دوستی کرے گا۔" میں نے کہا: "میں جانتا ہوں کہ اگر میں واقعی دنیا کا مرکز ہوتا ـــــ اور ہر مرتبہ جب میں تصویر کو دیکھتا میں بالکل یہی چاہتا تھا ـــــ تصویر پر غالب سرخ رنگ کی شان و شوکت کے باوجود، باوجود ان تمام چیزوں میں گھرے ہونے کے، جن سے مجھے محبت تھی، میرے درویش ساتھیوں سمیت اور وہ عورتیں جو حسین گھوڑے سے مشابہت رکھتی تھیں، میں پھر بھی تنہا و اداس ہوتا۔ میں کردار اور انفرادیت رکھنے سے خائف ہوں نہ ہی مجھے دوسروں کے خود کو جھک کر پوجنے کا ڈر ہے، اس کے برعکس میری خواہش ہی یہی ہے۔"

"تم کہنا چاہتے ہو کہ تمہیں کوئی پچھتاوا محسوس نہیں ہوتا؟" بگلے نے ایک ایسے آدمی کی طرح کہا جو ابھی جمعہ کا خطبہ سن کر نکلا ہو۔

"میں شیطان کی طرح محسوس کرتا ہوں، اس لیے نہیں کہ میں نے دو آدمیوں کا قتل کیا ہے بلکہ

اس لیے کہ میری شبیہ اس طور بنائی گئی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ میں نے ان کے ساتھ یہ اسی لیے کیا کہ میں یہ تصویر بنا سکتا۔ لیکن اب جو تنہائی میں محسوس کرتا ہوں وہ مجھے خوف زدہ کر دیتی ہے۔ فرنگی استادوں کی سی مہارت حاصل کیے بغیر ان کی نقل منی ایچر فنکار کو مزید غلام بنا دیتی ہے۔ اب میں اس پھندے سے نکلنے کے لیے مضطرب ہوں۔ یقیناً تم سب جانتے ہو: جب سب کہا اور کیا جا چکا، میں نے ان دونوں کو قتل کر ڈالا تاکہ کتاب خانہ ویسا ہی رہے جیسا ہمیشہ سے تھا اور اللہ بھی یقیناً یہ جانتا ہے۔"

"لیکن اس سے ہم پر زیادہ بڑی مصیبت آن پڑے گی۔" میرے محبوب تجلی نے کہا۔

میں نے اچانک اس احمق قرہ کی کلائی پکڑ لی جو ابھی تک تصویر دیکھ رہا تھا اور اپنی پوری قوت سے اپنے ناخن اس کے گوشت میں گاڑتے ہوئے میں نے اسے غصے سے دبایا اور مروڑ دیا۔ خنجر جو وہ بے پروائی سے تھامے ہوئے تھا، اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ میں نے اسے زمین سے اٹھا لیا۔

"لیکن اب تم مجھے اذیت رساں کے حوالے کر کے اپنے مسئلے حل نہیں کر پاؤ گے۔" میں نے کہا۔ یوں جیسے اس کی آنکھ باہر نکالنے کو، میں خنجر کی نوک قرہ کے چہرے کے قریب لے گیا۔ "وہ سوئی مجھے دے دو۔"

اس نے وہ نکالی اور اپنے دوسرے ہاتھ سے مجھے تھما دی اور میں نے وہ اپنی پیٹی میں اڑس لی۔ میں نے اس کی بھیڑی آنکھوں پر اپنی نگاہ جما دی۔

"مجھے خوب صورت شکورے پر ترس آتا ہے کہ اس کے پاس تم سے شادی کے سوا کوئی متبادل نہ تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر میں تم سب کو بربادی سے بچانے کے لیے انشتے آفندی کو قتل کرنے پر مجبور نہ ہوتا تو وہ مجھ سے شادی کرتی اور خوش رہتی۔ بلاشبہ وہ میں ہی تھا جو فرنگیوں کی ان کہانیوں اور صلاحیتوں کو پوری طرح سمجھتا تھا جنھیں اس کا باپ ہمیں سنایا کرتا تھا۔ سو غور سے وہ آخری بات سنو جو میں تمھیں بتاؤں گا: استنبول میں اب ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں ہم استاد منی ایچر فنکار اپنی مہارت اور وقار کے ساتھ بچا رہ سکیں۔ ہاں، یقیناً میں سمجھ چکا ہوں۔ اگر ہم فرنگی استادوں کی نقل کرنے تک گر چکے ہیں، جیسا کہ (مرحوم) انشتے اور ہمارے سلطان کی خواہش تھی، ہمیں روکا جائے گا، اگر ارض رومیوں اور نصرت آفندی جیسے لوگوں کی طرف سے نہ سہی تو پھر ہمارے اندر کی باجواز بزدلی سے اور اس سب کو دھوکا دیتے ہوئے جو پہلے فرنگی خصوصیت اور انداز کے حصول کی بے حاصل کوشش میں آیا تھا تو بھی ہم ناکام رہیں گے...... بالکل جیسے، میں اپنی تمام لیاقت اور علم کے باوجود خود اپنی تصویر بنانے میں ناکام رہا تھا۔ یہ قدیم طرح کی تصویر جو میں نے بنائی، خود اپنی مشابہت حاصل کیے بغیر بھی، اس نے مجھ پر وہ سب آشکار کیا جو ہم سب تسلیم کیے بغیر کرتے رہے تھے۔ فرنگیوں کی سی مہارت اور لیاقت کے حصول میں صدیاں لگیں گی۔ اگر انشتے آفندی کی کتاب مکمل کی اور انھیں بھیجی جا بھی ہوتی تو وینسی استاد دل نشین انداز میں مسکراتے اور ان کا مسخرہ وینس کے ڈیوک تک پہنچ جاتا..... بس۔ وہ ضرور یہ طنز آمیزی کرتے کہ عثمانی اب عثمانی نہیں رہے اور ہم سے مزید خائف نہ

ہوتے۔ کس قدر شان دار ہوتا اگر ہم پرانے استادوں کے راستے پر قائم رہتے! لیکن کوئی ایسا نہیں چاہتا۔ نہ ہمارے سلطان عالی مقام نہ ہی قرہ آفندی — جو افسردہ ہے کیوں کہ اس کے پاس اپنی عزیز شکورے کی کوئی تصویر نہیں۔ اس صورت میں بیٹھو اور کچھ نہ کرو، ماسوائے صدی بہ صدی فرنگیوں کی نقالی کے اپنی نقل شدہ تصویروں پر فخر و غرور سے اپنے دستخط کرو۔ ہرات کے پرانے استادوں نے دنیا کی اس طرح عکاسی کی کوشش کی جس طرح خدا نے اسے دیکھا تھا اور اپنی انفرادیت چھپانے کو انہوں نے کبھی اس پر اپنے ناموں کے دستخط نہ کیے۔ تاہم تم اپنی انفرادیت کی کمی کو چھپانے کے لیے ان پر اپنے دستخط کرنے کے سزاوار ہو۔ لیکن ایک متبادل ہے۔ تم میں سے ہر کسی کو شاید بلایا گیا ہے، اور اگر ایسا ہے، تم یہ مجھ سے چھپا رہے ہو: اپنے دربار میں دنیا کے قابل ترین فنکار جمع کرنے کی کوشش میں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ اسلام کے ظہور کے ایک ہزار سال مکمل ہونے پر جو کتاب مکمل کی جائے گی وہ یہاں استنبول میں نہیں، بلکہ آگرہ کے مصور خانے میں تیار ہو گی۔"

"تم جیسا زورآور شخص کے لیے کسی فنکار کا پہلے قاتل بننا ضروری ہے؟" بگلے نے پوچھا۔

"تمہیں انتہائی حسد اور قابلیت اور انتہائی صلاحیت کا حامل ہونا کافی ہے۔" میں نے بے توجہی سے جواب دیا۔

دور کہیں کسی مرغ نے دوبار اذان دی۔ میں نے اپنی گٹھڑی، سونے کے ورق، میری تصویروں والی بیاض اکٹھی کی اور اپنی تصویروں کو اپنے [illegible] میں ڈالا۔ میں نے غور کیا کہ کیسے ان میں سے ایک ایک کو اس خنجر سے قتل کر سکتا تھا جس کی نوک میں قرہ کی گردن پر رکھے ہوئے تھا لیکن میں نے اپنے لڑکپن کے دوستوں کے لیے محبت و انس کے سوا کچھ محسوس نہ کیا — حتیٰ کہ بگلے کے جس نے میری آنکھوں میں سوئی گاڑی تھی۔

میں تتلی پر چلایا جو اٹھ کھڑا ہوا تھا اور یوں اسے ڈرا کر دوبارہ بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اب، پر اعتماد کہ میں خانقاہ سے بہ حفاظت فرار ہو سکوں گا، میں جلدی سے دروازے کی طرف مڑا اور دہلیز پر میں نے بے صبری سے وہ یادگاری الفاظ ادا کیے جو میں کہنے کا سوچ رہا تھا:

"استنبول سے میرا فرار منگول قبضے کے دوران بغداد سے ابن شاکر کے فرار جیسا ہو گا۔"

"اس صورت میں تمہیں مشرق کی بجائے مغرب کا رخ کرنا چاہیے۔" حاسد بگلے نے کہا۔

"مشرق و مغرب خدا ہی کے ہیں۔" میں نے مرحوم انشتے کی طرح عربی میں کہا۔

"لیکن مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔" قرہ نے کہا۔

"کسی فنکار کو کسی قسم کے زعم سے مغلوب کبھی نہیں ہونا چاہیے۔" تتلی نے کہا، "اسے مشرق اور مغرب کے جھگڑے میں پڑنے کی بجائے، جیسے وہ دیکھتا ہے ویسے مصوری کرنی چاہیے۔"

"بالکل بجا ہے۔" میں نے محبوب تتلی سے کہا، "میرا بوسہ قبول کرو۔"

میں نے اس کی جانب بمشکل دو قدم کی بڑھائے ہوں گے جب قرہ فرض شناسی سے مجھ پر جھپٹ پڑا۔ ایک ہاتھ میں اٹلس وابستہ تھامے ہوئے تھا جس میں میرے کپڑے اور سونا تھے اور دوسری بغل میں تصویروں سے بھرا اجزدان۔ اپنی اشیا کی حفاظت کی پرواہ میں میں خود اپنا تحفظ کرنے میں ناکام رہا۔ میں اسے اپنی کلائی کھینچنے سے روک نہ پایا جس میں خنجر تھا۔ لیکن قسمت نے اس کا بھی ساتھ نہ دیا، وہ ایک نیچی میز سے ٹکرا کر لڑکھڑایا اور کچھ دیر کو اپنا توازن کھو بیٹھا۔ میرے بازو کو قابو کرنے کی بجائے وہ اس سے لٹک کر رہ گیا۔ اپنی پوری قوت سے اسے لات مارتے اور اس کی انگلیوں پر اپنے دانت گاڑتے ہوئے میں نے خود کو آزاد کروا لیا۔ وہ اپنی زندگی کے خوف میں چیخا۔ پھر میں نے اس کے اس ہاتھ پر پیر رکھ دیا جس پر وہ شدید تکلیف سے کراہا۔ باقی دونوں پر اپنا خنجر تان کر میں چیخا: ''رک جاؤ!''

وہ جہاں تھے، وہیں بیٹھے رہے۔ میں نے خنجر کی نوک قرہ کے ایک نتھنے پر رکھی، بالکل ویسے جیسے داستان میں کیکاؤس نے کیا تھا۔ جب خون بہنے لگا تو اس کی ننھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اب مجھے بتاؤ،'' میں نے کہا، ''کیا میں اندھا ہو جاؤں گا؟''

''روایت کے مطابق کچھ لوگوں کی آنکھوں میں خون جم جاتا ہے اور کسی کی نہیں۔ اگر اللہ تمہاری فنکاری سے خوش ہے تو وہ تم پر اپنی عالی شان تاریکی نازل کرے گا اور تمہیں اپنی پناہ میں لے لے گا۔ اس صورت میں تم اس مصیبت زدہ دنیا سے نکل کر ان غیر معمولی مناظر کو دیکھو گے جو وہ دیکھتا ہے۔ اگر وہ ناخوش ہے تو تم اس دنیا کو ویسے ہی دیکھتے رہو گے جیسے اب دیکھتے ہو۔''

''میں ہندوستان میں اصلی و حقیقی فنکاری کی تلاش کروں گا۔'' میں نے کہا، مجھے ابھی وہ تصویر بنانی ہے جس پر اللہ میرا فیصلہ کرے گا۔''

''اس فریب خیال کو زیادہ نہ پالو کہ تم فرنگیوں کے طریقہ کار سے فرار حاصل کر پاؤ گے۔'' قرہ نے کہا، ''کیا تمہیں علم نہیں کہ اکبر خان اپنے تمام فنکاروں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ اپنی تصویروں پر دستخط کریں؟ پرتگال کے رومن کیتھولک پادری عرصہ پہلے وہاں فرنگی مصوری اور طریقے متعارف کروا چکے ہیں۔ وہ اب ہر جگہ ہیں۔''

''ایسے فنکار کے لیے کام ہمیشہ موجود رہتا ہے جو خالص رہنا چاہتا ہے، پناہ کے حصول کے لیے ہمیشہ کوئی جگہ موجود ہوتی ہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''بجا ہے۔'' بگلے نے کہا: ''اندھے ہونا اور غیر موجود معدوم ملکوں کو فرار۔''

''کیوں ہے کہ تم خالص رہنا چاہتے ہو؟'' قرہ بولا، ''ہمارے ساتھ یہیں رہو۔''

''اپنی بیشتر زندگیاں تم فرنگیوں کی تقلید کے سوا کچھ نہ کرو گے، ایک انفرادی انداز کی خاطر۔''

میں نے کہا، ''لیکن واقعی چوں کہ تم فرنگیوں کی تقلید کرتے ہو تم کبھی انفرادی انداز حاصل نہ کر پاؤ گے۔''

''کرنے کو کچھ نہیں بچا ہے۔'' قرہ نے ذلیل کرتے ہوئے کہا۔

یقیناً فنکارانہ صلاحیت نہیں، وہ شورے تھی جو اس کی خوشی کا واحد ذریعہ تھی۔ میں نے خون سے داغ دار خنجر قرہ کے تختے سے ہٹایا اور اسے تلوار کی طرح اس کے سر کے اوپر یوں تان لیا جیسے جلاد کسی قصوروار مجرم کا سر قلم کرتے ہوئے کرتا ہے۔

''اگر میں چاہوں تو ابھی تمہارا سر کاٹ سکتا تھا۔'' میں نے اس کا اعلان کرتے ہوئے کہا جو پہلے ہی واضح تھا۔ ''لیکن میں تمہیں شکورے کے بچوں اور اس کی خوشی کے لیے تمہیں چھوڑنے کو تیار ہوں۔ اس کے ساتھ اچھے رہنا اور اس سے پیار اور جانثار برداشت کرنا۔ مجھ سے وعدہ کرو!''

''میں اپنی زبان دیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''میں اس پر تمہیں شکورے بخشتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

تاہم میرے بازو نے میرے الفاظ کی پرواہ کیے بغیر اپنی مرضی سے کام کیا۔ میں اپنی پوری قوت کے ساتھ خنجر قرہ کی طرف لایا۔

آخری لمحے، اس لیے کہ قرہ ہٹ گیا تھا اور اس لیے بھی کہ میں نے اپنی ضرب کا راستہ بدل دیا تھا، خنجر اس کی گردن پر نہیں اس کے چہرے پر لگا۔ میں نے دہشت کے عالم میں دیکھا، صرف میرے بازو کا کیا گیا اقدام۔ میں نے قرہ کے گوشت میں سے کھینچ کر خنجر نکالا، وہ جگہ بالکل سرخ ہو گئی۔ میں نے جو کیا تھا اس نے مجھے دہشت زدہ کیا اور شرمندہ بھی۔ صرف اگر میں بحری جہاز میں نابینا ہو جاتا، یا شاید جزیرہ عرب میں وہیں جانتا تھا کہ تب میں اپنے مثنی ایجر فنکار بھائیوں کی طرح کسی سے انتقام نہ لے سکتا تھا۔

بگلا خوف زدہ کہ اس کی باری آ چکی تھی اور درست آ چکی تھی، اندر کے تاریک کمروں میں فرار ہو گیا۔ لیمپ کو اوپر اٹھائے میں اس کے تعاقب میں گیا لیکن جلد ہی دہشت زدہ ہو کر واپس مڑ آیا۔ میرا آخری کام تجلی کو بوسہ دینا اور الوداع کہنا تھا، اس سے رخصت ہونا۔ چوں کہ ہمارے درمیان خون کی جھنکار آ چکی تھی، میں اسے جی کے اطمینان کو بوسہ نہ دے پایا۔ لیکن اس نے دیکھ لیا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

میں نے موت کی سی خاموشی میں خانقاہ چھوڑ دی۔ جس میں کبھی کبھی قرہ کی آہ و زاری چھید ڈال رہی تھی۔ تقریباً بھاگتے ہوئے میں گیلے اور کیچڑ زدہ باغ، آس پڑوس کے تاریک علاقے سے نکل آیا۔ بحری جہاز نے مجھے اکبر خان کے کتاب خانے لے جانا تھا، فجر کی اذان کے بعد روانہ ہونا۔ اس گزرگاہ کیلیوپن بندرگاہ پر بحری جہاز تک لے جانے کے لیے آخری کشتی روانہ ہوتی تھی۔ بھاگتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

جب میں کسی چور کی طرح ایک سرائے سے گزرا، میں افق پر دن کی روشنی کی ہلکی سی کرن دیکھ سکتا تھا۔ علاقے کے پہلے فوارے کے قریب سے گزرتے اطرافی گلیوں، تنگ گزرگاہوں اور دیواروں میں میرا سامنا پتھر کے ایک گھر سے ہوا جس میں پچیس سال قبل میں نے استنبول میں اپنی پہلی شب گزاری تھی۔

انداز میں لڑکھڑا گئے۔

اس کیچڑ زدہ زمین سے جس پر میرا سر گر پڑا تھا، میں قاتل کو دیکھ سکتا تھا نہ ہی سونے اور تصویروں سے بھرے اپنے تھیلے کو جسے میں اب بھی سختی سے اپنے ساتھ چمٹانا چاہتا تھا۔ یہ چیزیں میرے عقب میں تھیں، پہاڑی کے رخ میں جو سمندر اور گیلیون بندرگاہ کو جاتی تھی جہاں میں کبھی نہ پہنچ پاؤں گا۔ میرا سراب بھی دوبارہ مڑ کر انہیں یا باقی دنیا کو نہیں دیکھے گا۔ میں انہیں بھول گیا اور اپنی سوچوں کو مجھے لے جانے دیا۔

سر قلم کیے جانے سے لمحہ بھر پہلے، میرے ساتھ یہ کچھ ہوا تھا: بحری جہاز بندرگاہ سے رخصت ہوگا، یہ میرے ذہن میں عجلت کے غم کے ساتھ جڑا تھا، یہ اسی طرح تھا جیسے جب میں بچہ تھا، میری ماں کہا کرتی تھی: "جلدی کرو۔"

ماں، میری گردن میں تکلیف ہے اور سب کچھ ساکت ہے۔

یہ ہے جسے لوگ [illegible] کہتے ہیں۔

لیکن میں جانتا تھا کہ میں ابھی مردہ نہیں تھا۔ میری چھیدی گئی پتلیاں ساکت تھیں۔ لیکن میں اب بھی اپنی کھلی آنکھوں سے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

زمین کی سطح سے میں نے جو کچھ دیکھا اس نے میرے خیالوں کو بھر دیا: آہستگی سے اوپر چڑھتی سڑک، دیوار، محراب، کتاب خانے کی چھت، آسمان — یہ اسی طرح پیچھے کو گئی ہے۔

یوں لگتا تھا جیسے مشاہدے کا یہ لمحہ جاری و ساری رہے گا اور میں نے ادراک کیا کہ بصارت یادداشت کی ایک صورت یا قسم بن چکی تھی۔ مجھے یاد دلایا گیا کہ میں نے تب گھنٹوں ایک خوب صورت تصویر کو تکتے کیا سوچا تھا: اگر تم دیر تک تکتے رہو تو تمہارا دماغ اس تصویر کے دور میں داخل ہو جاتا ہے۔

سارے دور اب یہی دور بن چکے تھے۔

یوں لگتا تھا جیسے مجھے اب کوئی نہ دیکھے گا، جب میری سوچیں دھندلا گئیں، میرا کیچڑ میں تھڑا سر اس افسردہ اور طول نشیب، پتھریلی دیوار اور قریبی لیکن پھر بھی ناقابل رسائی شہتوت اور اخروٹ کے درخت کو برسوں تک دیکھتا رہتا۔

اس ناتمام انتظار نے اچانک اس قدر تلخ اور اکتا دینے والا تناسب اختیار کیا کہ میں اس وقت، اس زمانے، اس دور سے کنارہ کش ہونے کے سوا اور کچھ نہ چاہتا تھا۔

میں، شکورے

قرہ نے ہمیں دور پرے کے ایک رشتے دار کے گھر میں چھپا رکھا تھا جہاں میں نے ایک بے خواب رات گزاری۔ بستر میں جہاں میں تیرے اور بچوں کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی، خراٹوں اور کھانسی کی آوازوں میں مجھے کبھی اونگھ سی آجاتی تھی لیکن اپنے بے چین خوابوں میں میں نے عجیب و غریب مخلوق اور عورتیں دیکھیں جن کے بازو اور ٹانگیں کٹے ہوئے تھے اور ادھر ادھر جوڑ دیے گئے تھے، وہ مسلسل میرے تعاقب میں رہے اور میں ہر تھوڑی دیر بعد جاگتی رہی۔ صبح کے قریب مجھے سردی نے جگا دیا اور شوکت اور اورحان کو لحاف اوڑھایا، گلے لگایا، [illegible] بوسے دیے اور اللہ سے خوش گوار خوابوں کی دعا کی، جیسا کہ میں ان خوش گوار دنوں میں دیکھتی تھی جب میں [illegible] مرحوم بابا کی چھت تلے سکون سے سوتی تھی۔

لیکن پھر بھی میں سو نہ سکی۔ فجر کی اذانوں کے بعد چھوٹے سے تاریک کمرے کی کھڑکی کے کواڑوں سے گلی میں جھانکتے ہوئے میں نے وہ دیکھا جو میں [illegible] اپنے خوش گوار خوابوں میں دیکھا کرتی تھی: ایک بھوت جیسا آدمی، جنگ اور ان زخموں سے تھکن زدہ جو اسے لگ چکے تھے، کسی تلوار کی طرح چھڑی تانتے ہوئے، شاہانہ قدموں سے میرے قریب پہنچتا ہے۔ اپنے خواب میں جب بھی میں اس آدمی کو گلے لگانے کے قریب ہوتی، میں آنسوؤں کے ساتھ جاگ جاتی۔ جب میں نے دیکھا کہ گلی میں موجود آدمی قرہ تھا، وہ چیخ جو میرے خوابوں میں بھی میرے حلق سے آزاد نہ ہوئی تھی، سنائی دے گئی۔

میں بھاگ کر گئی اور دروازہ کھولا۔

اس کا چہرہ لڑائی بھڑائی سے سوجا ہوا تھا اور اس پر نیل اور خراشیں تھیں۔ اس کی ناک گیلی اور خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اس کے کندھے سے گردن تک آتا ایک گہرا گھاؤ تھا۔ اس کی قمیص خون سے سرخ ہو چکی تھی۔ میرے خوابوں کے شوہر کی طرح قرہ مجھے دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا کیوں کہ آخر میں وہ کامیابی سے لوٹ آیا تھا۔

''اندر آؤ۔'' میں نے کہا۔

''بچوں کو بلاؤ۔'' اس نے کہا، ''ہم گھر جا رہے ہیں۔''

''تم گھر جانے کی حالت میں نہیں ہو۔''

''اس سے اب مزید ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔'' اس نے کہا، ''قاتل ولی جان آفندی ایرانی ہے۔''

''زیتون ——'' میں نے کہا، ''کیا تم نے اس کم بخت بدمعاش کو مار ڈالا؟''

''وہ گیلیون بندرگاہ سے روانہ ہونے والے بحری جہاز سے ہندوستان فرار ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا اور میری آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کیا، یہ جانتے ہوئے کہ وہ اپنی ذمے داری پوری طرح نہیں نبھا پایا تھا۔

''کیا تم ہمارے گھر تک پیدل چل سکو گے؟'' میں نے کہا، ''کیا ہم گھوڑا منگوا لیں؟''

مجھے محسوس ہوا کہ وہ گھر پہنچتے پر مر جائے گا اور مجھے اس پر ترس آیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ تنہا مرے گا بلکہ اس لیے کہ کبھی حقیقی خوشی سے واقف نہ ہوگا۔ میں اس کی نگاہوں کے دکھ اور عزم سے جان سکتی تھی کہ وہ اس عجیب گھر میں پہنچنا چاہتا تھا، جو کہ وہ دراصل اس وحشت ناک حالت میں کسی کی بھی نگاہوں میں آئے بغیر غائب ہونا چاہتا تھا۔ بچوں نے مشکل سے اس نے اسے گھوڑے پر سوار کروا دیا۔

واپسی کے راستے میں جب ہم انہی چھریاں چمانے بجلی گلیوں سے گزرے، بچے اس قدر خوف زدہ تھے کہ قرہ کے چہرے کو نہ دیکھ رہے تھے۔ لیکن خرام گھوڑے پر سوار قرہ پھر بھی انہیں بتانے کے قابل رہا کہ اس نے اس بدبخت قاتل کے منصوبے خاک میں ملا دیے تھے جس نے ان کے نانا کو قتل کیا تھا اور کیسے اس نے اسے تلوار بازی کا چیلنج کیا۔ میں دیکھ سکتی تھی کہ بچوں نے اسے کس قدر پرجوش کر دیا تھا اور میں نے اللہ سے دعا کی: اسے مرنے نہ دینا!

گھر پہنچنے پر اورحان اتنی خوشی سے چلایا، ''ہم گھر پہنچ گئے ہیں!'' کہ مجھے وجدان ہوا کہ موت کے فرشتے عزرائیل کو ہم پر ترس آ گیا تھا اور اللہ قرہ کو مزید وقت عطا کر دیں گے، لیکن میں تجربے سے جانتی تھی کہ کوئی بھی نہ بتا سکتا تھا کہ کب اللہ کسی کی روح قبض کر لیتے اور میں ضرورت سے زیادہ پر امید نہ تھی۔

ہم نے قرہ کو گھوڑے سے اترنے میں مدد دی۔ ہم اسے اوپر کی منزل پر لائے اور میرے بابا کے کمرے میں بستر پر لٹا دیا، وہی جس کا دروازہ نیلا تھا۔ خیریے پانی ابال کر اوپر لے آئی۔ خیریے اور میں نے کہیں پھاڑتے اور کہیں قینچی سے کاٹتے ہوئے اس کے کپڑے اتارے، بدن سے چپکی خون آلود قمیص اتاری، اس کی پٹی، جوتے اور اس کا زیریں لباس۔ جب ہم نے کھڑکی کے کواڑ کھولے تو باغ کی شاخوں پر کھلتی سرما کی نرم دھوپ نے کمرے کو بھر دیا، دھوپ چمکی، برتنوں، مرہم کے ڈبوں، دوات، شیشے کے ٹکڑوں اور قلم تراش سے منعکس ہوئی اور قرہ کی موت سے زرد جلد اور اس کے ترش چیری کے رنگ کے زخموں کو روشن کر دیا۔

میں نے کپڑے کے ٹکڑے گرم پانی میں بھگوئے اور انہیں صابن پر رگڑا۔ پھر میں نے قرہ کا بدن صاف کیا، احتیاط سے یوں جیسے کسی قیمتی نایاب قالین کو صاف کرتے ہوئے اور اتنی محبت اور توجہ سے

جیسے اپنے بیٹوں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس کے چہرے کی خراشوں کو رگڑے بغیر، اس کے تھنے کے زخم کو کھولے بغیر، میں نے اس کے کندھے کے وحشت ناک زخم کو اس طرح صاف کیا جیسے کوئی طبیب کرتا۔ جیسے کہ میں بچوں کو نہلاتے کرتی تھی جب وہ بالکل چھوٹے تھے، میں نے گنگناتی آواز میں اس کے لیے لوری بھی گائی۔ اس کے سینے اور بازوؤں پر بھی زخم تھے۔ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں دانتوں سے کاٹے جانے کے باعث نیلی تھیں۔ کپڑے کے وہ ٹکڑے جو میں نے اس کا بدن صاف کرنے کے لیے استعمال کیے تھے، وہ بھی خون آلود ہو گئے۔ میں نے اس کے بیٹے کو چھوا، میں نے اپنے ہاتھ سے اس کے پیٹ کی نرمی محسوس کی۔ پیچھے صحن سے بچوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ کچھ شاعر اس شے کو سر کٹڑے کا قلم کیوں کہتے ہیں؟

میں ایستھر کو خوش باش آواز اور اس پر اسرار انداز کے ساتھ باورچی خانے میں داخل ہوتے سن سکتی تھی جو وہ کوئی خبر لاتے ہوئے اختیار کرتی تھی اور میں نیچے اس کے خیر مقدم کے لیے چلی گئی۔

وہ اس قدر پر جوش تھی کہ مجھے گلے لگائے اور بوسہ دیے بغیر ہی شروع ہو گئی: کتاب خانے کے سامنے سے زیتون کا کٹا ہوا سر ملا تھا، اس کے جرائم کو ثابت کرتی تصویریں اور اس کا تھیلا بھی مل گئے تھے۔ وہ ہندوستان فرار ہونا چاہ رہا تھا لیکن ایک آخری بار اس نے کتاب خانے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جسمانی تشدد کے ثبوت بھی ملے تھے: جس نے زیتون کو دیکھتے ہی سرخ تلوار سونت لی اور ایک ہی ضرب میں زیتون کا سر قلم کر دیا تھا۔

اس کے یہ بیان کرنے کے دوران میں سوچتی رہی کہ میرے بدنصیب بابا کہاں تھے۔ یہ جان کر کہ قاتل کو اپنے کیے کی سزا مل چکی تھی، پہلے تو میرے خوف زائل ہو گئے اور انتقام کی جگہ مجھے سکون اور عدل کا احساس ہوا۔ اسی لمحے مجھے شدت سے خیال آیا کہ کیا میرے اب مرحوم بابا کو بھی یہی احساس ہوا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا کہ تمام دنیا لاتعداد کمروں والا محل تھی جن کے دروازے ایک دوسرے میں کھلتے تھے۔ ہم صرف اپنی یادوں اور تصورات کی مشق سے ایک سے دوسرے کمرے میں جا سکتے تھے لیکن ہم میں بیشتر اپنی سستی و کاہلی کے سبب ایسا تجربہ شاذ ہی کرتے اور ہمیشہ ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔

''مت رو میری پیاری۔'' ایستھر نے کہا۔ ''تم نے دیکھا کہ آخر میں سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔''

میں نے اسے سونے کے چار سکے دیے۔ اس نے وہ ایک ایک کر کے اپنے منہ میں رکھے اور شوق اور خواہش سے انہیں کاٹ کر دیکھا۔

''وینس والوں کی کھوٹے سکے ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کے جاتے ساتھ ہی میں نے خیریہ کو متنبہ کیا کہ بچوں کو اوپری منزل پر نہ آنے دے۔ میں اس کمرے میں گئی جہاں قرہ لیٹا تھا، اپنے عقب میں دروازہ بند کیا اور قرہ کے برہنہ بدن کے برابر دراز ہو گئی۔ پھر خواہش سے زیادہ تجسس کے تحت، خوف سے زیادہ فکر و تردد کے باعث میں نے وہی کیا جو قرہ چاہتا تھا کہ میں پھانسی شدہ یہودی کے گھر میں کروں، اس رات جب میرے بے چارے بابا قتل ہوئے تھے۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ میں پوری طرح سمجھ گئی تھی کہ ایرانی شعرا کیوں صدیوں تک اس کا موازنہ سرکنڈے کے قلم اور ہم عورتوں کے منہ کو دوات کیوں قرار دیتے رہے، یا ان موازنوں کے عقب میں کیا تھا جن کی بنیاد اعادے کے باعث فراموش کی جا چکی تھی کیا یہ منہ کا چھوٹا ہونا تھی؟ دوات کی مبہم خاموشی؟ کیا یہ کہ خدا خود مصور تھا؟ تاہم مجھ جیسی عورت کو محبت کو سمجھنا ہوگا، منطق کے ذریعے نہیں جو مسلسل اپنے تحفظ کے لیے اپنے دماغ پر بوجھ ڈالتی ہے، بلکہ اس کی غیر معقولیت یا غیر منطقی پن سے۔

سو آیئے میں آپ کو ایک راز بتاؤں: وہاں اس کمرے میں جہاں سے موت کی باس آتی ہے، وہ میرے منہ میں موجود شے نہ تھی جس نے مجھے مسرت بخشی۔ وہاں لیٹے جس شے نے مجھے مسرت بخشی، جب پورا جہان میرے ہونٹوں پر پھڑ پھڑا رہا تھا، وہ تھی صحن میں میرے بیٹوں کی لڑنے کی خوش باش آوازیں۔

میری آنکھیں قرہ کو اس وقت خود کو بالکل مختلف طور دیکھتا پا رہی تھیں۔ اس نے کہا کہ وہ دوبارہ کبھی میرا چہرہ اور دہن نہ بھلا پائے گا۔

میرے بابا کی پرانی کتابوں کی طرح اس کی جلد سے کائی زدہ بیلے کاغذ کی بو اٹھتی تھی اور خزانے اور کپڑے کی گرد کی خوشبو نے میرے بالوں کو بھگو دیا تھا۔ جب میں نے خود کو آزاد چھوڑ کر اس کے زخموں کو سہلایا، اس کی خراشیں، گھاؤ اور سوجن، وہ کسی بچے کی طرح کراہا، موت سے دور سے دور تر ہوتا ہوا اور جب میں نے سمجھا کہ میں اس سے زیادہ متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ تنہا بحری جہاز کی طرح جس کے بادبان ہوا سے پھڑ پھڑاتے ہیں تو وہ رفتار پکڑ لیتا ہے، ہمارا ارتفاع رفتہ رفتہ قرب ہمیں نامانوس سمندروں میں لے گیا۔

میں ویسے یہ بتا سکتی تھی کہ وہ اپنے بستر مرگ پر بھی پانیوں راہ تلاش کر سکتا تھا کیونکہ قرہ نے سمندر بہت مرتبہ پہلے کون جانے کس انداز میں غیر مہذب عورتوں کے ساتھ عبور کیے تھے۔ جب میں اس الجھن میں تھی کہ وہ بازو یا کلائی جسے میں نے بوسہ دیا وہ میری تھی یا اس کی، کیا میں خود اپنی انگلیاں چوس رہی تھی یا پوری زندگی، اس نے ایک نیم وا آنکھ سے دیکھا اپنے زخموں اور مسرت سے تقریباً مسحور، یہ دیکھنے کہ دنیا اسے کہاں لے جا رہی تھی اور پھر تھوڑی بعد وہ میرا سر نرمی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا اور حیرت کے عالم میں دم بخود میرے چہرے کو دیکھتا، ابھی یوں دیکھتے جیسے کوئی تصویر ہو اور ابھی یوں جیسے کوئی مترین چینی حرف۔

مسرت کے عروج پر وہ ان داستانوی جواں مردوں کی طرح چلایا جنھیں داستانوں سے متعلق تصاویر میں تلوار کی ایک ضرب سے دو ٹکڑے کر دیا جاتا ہے، وہ تصویریں جنھوں نے ایرانی اور تورانی افواج کے تصادم کو لافانی بنا دیا۔ اس حقیقت نے کہ اس کی یہ چیخ آس پاس ہر جگہ سنی گئی ہوگی، مجھے دہشت زدہ کر دیا۔ اعلیٰ ترین فیضان کے لیے حقیقی استاد منی ایچر فنکار کی طرح، اپنا سرکنڈے کا قلم اللہ کی براہ راست رہنمائی میں تھامے، تاہم پھر بھی پورے صفحے کی طرز اور ترتیب پر غور کرنے کے قابل، قرہ اپنے اعلیٰ ترین جوش و خروش میں بھی اپنے دماغ کے ایک گوشے میں دنیا میں ہمارا مقام متعین کرنے میں مصروف رہا۔

"تم انھیں بتا سکتی ہو کہ تم میرے زخموں پر مرہم لگا رہی تھیں۔" اس نے پھولی سانسوں کے

درمیان کیا۔

یہ الفاظ نہ صرف ہماری محبت کے رنگ پر مشتمل تھے — جو زندگی اور موت کے درمیان، ممنوعات اور جنت، ناامیدی یا محرومی اور شرم کے درمیان، دشوار مقام پر تھی — وہ ہماری محبت کا عذر بھی تھے۔ اگلے ۱۵ برس تک یہاں تک کہ میرا محبوب شوہر قرہ ایک مبہم دل کے عارضے کے باعث کنوئیں کے قریب گر کر دنیا سے رخصت ہوا۔ ہر سہ پہر جب دھوپ کواڑوں کی جھریوں سے چھن کر کمرے میں اترتی اور پہلے چند برسوں تک، شوکت اور اورحان کے باہر کھیلنے کی آوازوں میں، ہمیشہ اس کا حوالہ یوں دیتے ہوئے، ''زخموں پر مرہم لگانے کے لیے'' ہم محبت کرتے۔ اس طرح ہی میرے حاسد بیٹے جن کی میں نہیں چاہتی تھی کہ اپنے سخت مزاج اور افسردہ ماں باپ کے ہاتھوں حاسدانہ پٹائی ہو، برسوں ایک ہی بستر میں میرے ساتھ سوتے رہے۔ ساری سمجھدار عورتیں جانتی ہیں کہ اپنے بیٹوں کو لپٹا کر سونا کس قدر بہتر ہے، اس افسردہ دل شوہر کی نسبت جو زندگی سے ہار چکا ہو۔

ہم، میرے بیٹے اور میں خوش تھے لیکن قرہ نہ ہو سکا۔ اس کی سب سے واضح وجہ تو یہ تھی کہ اس کے کندھے اور گردن کے زخم بھی مکمل طور پر بھر سکے، میرا محبوب شوہر ''معذور'' ہو گیا تھا جیسا کہ میں نے اس سے سنا کہ دوسرے اسے کہتے تھے۔ لیکن اس زخم نے اس کی ظاہری حالت کے سوا اس کی زندگی کو منتشر نہ کیا۔ ایسے بھی وقت تھے جب میں نے دوسری عورتوں سے سنا جنہوں نے میرے شوہر کو فاصلے سے دیکھا تھا، کہ وہ اسے وجیہہ کہتی تھیں۔ لیکن قرہ کا دایاں کندھا بائیں کی نسبت جھکا ہوا تھا اور اس کی گردن عجیب طور پر ٹیڑھی رہی۔ میں نے یہ باتیں بھی سنیں کہ مجھ جیسی عورت صرف ایسے مرد سے شادی کر سکتی تھی جسے محسوس کرتی کہ وہ مجھ سے کمتر تھا اور قرہ کا زخم جس قدر اس کے عدم اطمینان کی وجہ تھا، اتنا ہی ہماری مشترکہ مسرت کی۔

ان تمام باتوں میں شاید سچائی کا ایک عنصر بھی تھا۔ تاہم میں خود کو محروم اور مفلس محسوس کرتی کہ میں غلاموں، کنیزوں اور خدمت گاروں کے جھرمٹ میں کسی غیر معمولی حسین گھوڑے پر سوار ہو کر استنبول کی سڑکوں پر نہ نکلتی تھی — جیسا کہ استھر نے ہمیشہ خیال کیا تھا کہ میں حق دار تھی — مجھے بھی کبھی ایک بہادر اور زندہ دل شوہر کی بھی تمنا ہوتی جو اپنا سر اونچا رکھتا اور دنیا کو کسی فاتح کے سے احساس سے دیکھتا۔

وجہ جو بھی رہی ہو۔ قرہ ہمیشہ افسردہ خاطر اور ملول رہا۔ کیوں کہ میں جانتی تھی کہ اس کی اداسی کا اس کا کندھے سے کوئی تعلق نہ تھا، میرا خیال تھا کہ اپنی روح کے کسی پوشیدہ گوشے میں اس پر اداسی کا جن قابض تھا جو ہماری قربت کے انتہائی مسرور لمحات میں بھی اس کے دل کو بجھا دیتا تھا۔ اس جن کو خوش کرنے کو وہ بھی بھار سے نوشی کرتا، کبھی کتابوں میں تصویریں تکتا اور فن میں دلچسپی لیتا، کبھی وہ اپنے دن رات حسین لوگوں کا تعاقب کرتے مخنی ایچ فنکاروں کے ساتھ گزارتا۔ ایسے دور تھے جب وہ مصوروں، خطاطوں اور شاعروں کی پرنشاط ذومعنی باتوں میں، فقروں، اشاروں، کنایوں، استعاروں اور خوشامد میں لطف لیتا اور پھر ایسے دور بھی آتے تھے جب وہ سب کچھ بھول جاتا اور خود کو اس کر خیدہ سلیمان پاشا کے تحت معتمد کے

فرائض اور حکومتی منشی گیری میں محو کر لیتا، جس کی خدمت میں داخل ہونے میں وہ کامیاب رہا تھا۔ چار برس بعد جب ہمارے سلطان کی وفات ہوئی اور سلطان احمد کے تخت پر بیٹھنے کے ساتھ، جنہوں نے تمام طرح کی فنکارانہ صلاحیتوں سے منہ موڑ لیا، قرہ کا تزئین کاری اور مصوری کا جوش وخروش کھلے عام خوشی سے کسی ایسے ذاتی راز میں تبدیل ہو گیا جو بند دروازوں کے عقب میں ہوتا تھا۔ ایسے وقت تھے جب وہ میرے بابا کی چھوڑی ہوئی کتابوں میں سے کوئی ایک کھولتا اور دیکھتا، احساس جرم کا شکار اور وہ اس تصویر کو جو ہرات میں امیر تیمور کے بیٹوں کے زمانے میں بنائی گئی تھی —— یوں نہیں جیسے وہ قابلیت وصلاحیت کا کوئی مسرت بھرا کھیل تھا جو اب بھی محل کے حلقوں میں کھیلا جاتا تھا بلکہ یوں جیسے وہ ایسے میٹھے راز میں سکونت پذیر تھا جو عرصہ ہوا کسی یاد کا حصہ بن چکا تھا۔

ہمارے سلطان کی حکومت کی تیسرے سال، ملکہ برطانیہ نے عزت مآب کو ایک معجزاتی کلاک بھیجا جس میں گونج دار آل موسیقی تھا۔ ایک انگریز وفد نے اس بڑی سی دیواری گھڑی کو مختلف ٹکڑوں، پرزوں، دندانوں، تصویروں اور مجسموں کو جوڑ کر ہفتوں کی محنت سے بنایا جو وہ اپنے ہمراہ انگلستان سے لائے تھے اور اسے شاہی محل کے رخ پر شاہی باغ کی ڈھلان پر نصب کر دیا۔ شاخ زریں کی ڈھلانوں پر جمع ہونے والا ہجوم اور وہ جو اس گھڑیال کو دیکھنے آئے تھے، مبہوت اور مرعوب تھے، انہوں نے دیکھا کہ جب گھڑیال اپنی پر شور دہشت ناک موسیقی بجاتا تو کیسے اس کے بڑے بڑے مجسمے اور آرائش ایک دوسرے کے گرد گھومتے تھے، کیسے وہ خوب صورت اور بامعنی انداز میں رقص کرتے، دن بجنے کے وقت یوں جیسے وہ خدا کے بندوں کی بجائے خود خدا کی تخلیق تھے اور کیسے گھڑیال ایسی جھنکار کے ساتھ جو گھنٹی کی آواز سے مشابہ تھی، پورے استنبول میں وقت کا اعلان کرتا تھا۔

قرہ اور استر نے مجھے مختلف مواقع پر بتایا کہ گھڑیال، استنبول کے بدنام اور بے وقوف ہجوموں کی حیرت کی وجہ ہونے کے ساتھ ساتھ قابل فہم طور پر پرہیزگاروں اور ہمارے سلطان کے عدم اطمینان کا بھی ذریعہ تھا کیوں کہ یہ کافروں کی طاقت کی علامت تھا۔ وقت کے ساتھ جب اس قسم کی افواہیں بکثرت پھیل گئیں، سلطان احمد، بعد میں آنے والے سلطان، اللہ کی تحریک پر نصف شب کو بیدار ہوئے، اپنا گرز اٹھایا اور حرم سے شاہی باغ میں آ گئے جہاں انہوں نے گھڑیال اور اس کے مجسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ وہ جو ہمارے پاس خبریں اور افواہیں لائے، انہوں نے بیان کیا کہ جیسے ہی ہمارے سلطان سوئے، انہیں ایک مقدس روشنی میں ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور کیسے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں متنبہ کیا کہ اگر ہمارے سلطان نے اپنی رعایا کو تصویروں سے مرعوب ہونے کی اجازت دی اور اس سے بدتر ایسی چیزوں سے جو نسل انسانی کی نقالی تھیں اور یوں اللہ کی تخلیق سے مقابلہ کرتی تھیں، تو وہ رضائے الٰہی سے ہٹ جائے گا۔ انہوں نے مزید یہ بھی بتایا کہ سلطان نے خواب ہی کے عالم میں اپنا گرز اٹھا لیا تھا۔ کم وبیش اسی طرح ہمارے سلطان نے یہ واقعہ اپنے وفادار مورخ کو بیان کیا تھا۔ ان کی کتاب "خلاصۃ التواریخ"

خطاطوں نے تیار کی تھی، جس پر انہوں نے سونا نچھاور کیا تھا، اگرچہ انہوں نے منی ایچر فنکاروں کی تصویر کشی سے منع کیا تھا۔

یوں مصوری اور تزئین کاری کی مسرت کا سرخ گلاب مرجھا گیا جو استنبول میں ایک صدی تک بہار دکھاتا رہا، ایران کی سرزمین سے فیضان لے کر پروان چڑھا تھا۔ ہرات کے پرانے استادوں اور فرنگی فنکاروں کے طریقوں میں تنازع جس نے فنکاروں کے درمیان تکرار اور جھگڑوں کی راہ ہموار کی اور لاتعداد معمے بھی حل نہ ہو پائے۔ خود مصوری کو ترک کر دیا گیا، فنکار مشرقیوں کی طرح مصوری کرتے نہ ہی مغربیوں کی طرح۔ منی ایچر فنکار برہم ہوئے نہ بغاوت کی بلکہ ان بوڑھوں کی طرح جو اپنی بیماری کے سامنے ہار مان لیتے ہیں، انہوں نے رفتہ رفتہ صورت حال کو عاجزانہ رنج اور دست برداری اور صبر و توکل سے قبول کر لیا۔

رشک اور نفرت کے درمیان تذبذب میں پھنسے ہوئے وہ ہرات اور تبریز کے عظیم استادوں کے کام کے متعلق متجسس تھے نہ ہی خواب دیکھتے تھے جن کی انہوں نے کبھی مرعوبیت کے ساتھ پیروی کی تھی یا فرنگی استادوں کی جن کے جدت پسند طریقوں کی انہیں آرزو تھی۔ بالکل جیسے شام کے وقت گھر کے دروازے بند ہوتے ہیں اور شہر تاریکی کی گود میں چلا جاتا ہے مصوری کو بھی ترک کر دیا گیا۔ بے رحمی سے فراموش کر دیا گیا کہ ہم نے بھی ہمارے جہان کو مختلف طور پر دیکھا تھا۔

افسوس ناک طور پر میرے والد کی کتاب نامکمل ہی رہی۔ حسن نے مکمل اوراق فرش پر بکھیر دیے تھے، وہ خزانے کو منتقل کر دیے گئے۔ ایک مستعد اور جدت پسند منتظم کتاب خانہ نے ان کی جلد سازی کتاب خانے کی دیگر غیر متعلقہ تصویروں کے ساتھ کروا دی اور یوں وہ مختلف مجلد کتابوں میں بکھر گئیں۔ حسن، استنبول سے فرار اور ایسا غائب ہوا کہ پھر اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ شوکت اور اورحان کبھی نہ بھولے کہ وہ قرہ نہیں بلکہ ان کا چچا حسن تھا جس نے میرے بابا کے قاتل کو ہلاک کیا تھا۔

استاد عثمان نابینا ہونے کے دو برس میں فوت ہو گئے تھے، ان کی جگہ سربراہ مصور لگا بن گیا۔ تتلی جو میرے مرحوم والد کی صلاحیتوں سے خاصا مرعوب تھا، اس نے اپنی تمام زندگی قالینوں، کپڑوں اور خیموں کے لیے آرائشی نمونے بنانے کے لیے وقف کر دی۔ کتاب خانے کے نوجوان معاون اور استادوں نے بھی یہی کام شروع کر دیا۔ کسی نے بھی یوں ظاہر نہ کیا جیسے مصوری چھوڑنا کوئی بڑا نقصان تھا۔ شاید اس لیے کہ کسی نے بھی ورق پر اپنے خود چہرے سے انصاف کرتے یا ہوتے نہ دیکھا تھا۔

اپنی پوری زندگی میں چوری چھپے اپنے دل میں دو تصویریں خواہ چاہتی تھی، جن کا میں نے کبھی کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔

۱۔ خود میری اپنی تصویر۔ لیکن میں جانتی تھی کہ سلطان کے منی ایچر فنکار چاہے کتنی ہی کوشش کرتے وہ ناکام رہتے، کیوں کہ اگر وہ میرا حسن و جمال دیکھ سکتے، افسردگی سے، ان میں سے کوئی بھی یقین نہ رکھتا کہ کسی عورت کا چہرہ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کو چینی عورتوں کی طرح دکھائے بغیر حسین و جمیل ہو سکتا

تھا۔ اگر وہ مجھے بھی حسن کے طور پر پیش کرتے (جس طرح ہرات کے پرانے استاد کرتے) تو شاید جو اسے دیکھتے اور مجھے پہچان لیتے، وہ بھی حسن کے عقب میں میرے چہرے کو معلوم کر لیتے۔ لیکن بعد کی نسلیں، چاہے وہ ادراک کر بھی لیتیں کہ میری آنکھیں حقیقت میں ترچھی نہ تھیں، کبھی تعین نہ کر پاتیں کہ میرا چہرہ حقیقت میں کیسا دکھائی دیتا تھا۔ آج اس بڑھاپے میں، میں کس قدر خوش ہوتی — جو میں اپنے بچوں کے ساتھ آرام وسکون سے گزارتی ہوں — اگر میرے پاس میری جوانی کی تصویر ہوتی!

:: روحانی مسرت کی تصویر۔ ران (Ran) کے شاعر ناظم نے جیسا کہ اپنی ایک نظم میں خیال ظاہر کیا تھا۔ میں بہ خوبی جانتی ہوں کہ یہ مصوری کیسے کی جانی چاہیے۔ ایک ماں کی اپنے دو بچوں کے ہمراہ تصویر کا تصور کریں، چھوٹا جسے وہ اپنی بانہوں میں لیے ہوئے ہے اور اسے دودھ پلاتے مسکرا رہی ہے، وہ بھی مسکراتے ہوئے خوشی خوشی دودھ پی رہا ہے۔ بڑے بھائی کی کس قدر حاسد نگاہیں اور ماں کی نگاہیں ملی ہونی چاہئیں۔ میں اس تصویر والی ماں بننا چاہوں گی۔ میں آسمان کا وہ پرندہ بننا چاہوں گی جس کی پرواز کرتے عکاسی کی گئی ہو اور اسی دوران خوشی سے اور ابدی طور پر وہیں معلق۔ ہرات کے پرانے استادوں کے انداز میں جو وقت روکنے پر قادر تھے۔ میں جانتی ہوں یہ آسان نہیں ہے۔

میرا بیٹا اورحان، جو اس قدر ... ہے کہ تمام معاملوں میں منطقی ہے، ایک جانب مجھے یاد دلاتا ہے کہ ہرات کے وقت کو روک دینے والے ... بھی میری عکاسی ویسے نہ کر سکتے جیسی میں ہوں اور دوسری جانب فرنگی مصور جو ہمیشہ مسلسل ماں اور بچے کی تصویریں بناتے تھے، وقت بھی کو روک نہ سکتے تھے۔ وہ برسوں سے اصرار کرتا چلا آیا ہے کہ میری روحانی مسرت کی تصویر بہرصورت کبھی نہیں بنائی جا سکتی تھی۔ شاید وہ ٹھیک کہتا ہے، حقیقت میں ہم روحانی مسرت کی تصویروں میں انہیں تلاش نہیں کرتے بلکہ اس کی بجائے خود زندگی میں خوشی کو تلاش کرتے ہیں۔ مصور یہ جانتے ہیں لیکن بالکل یہی ہے جس کی وہ تصویر کشی نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے وہ بصارت یا دیکھنے کی خوشی کو زندگی کی خوشی کا متبادل بنا دیتے ہیں۔

اس امید میں کہ وہ شاید اس کہانی کو قلم بند کر سکے جو کہ تصویر کشی کی حد سے باہر ہے، میں نے یہ اپنے بیٹے اورحان کو سنائی ہے۔ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر میں نے اسے وہ خطوط دے دیے جو حسن اور قرہ نے مجھے لکھے تھے، اس کے ساتھ روشنائی کے دھبوں والی گھوڑے کی بھدی تصویریں جو بے چارے نفیس آفندی کی لاش کے ساتھ ملی تھیں۔ سب سے بڑھ کر، اورحان کے فریب میں مت آیئے گا، اگر وہ قرہ کو اصل سے زیادہ غیر حاضر دماغ پیش کرے، ہماری زندگیوں کو اصل سے زیادہ دشوار بنا دے، شوکت کو بدتر اور مجھے اس سے حسین تر اور زیادہ درشت دکھائے جتنی کہ میں حقیقت میں ہوں۔ ایک خوش آئند اور اطمینان بخش کہانی کی خاطر، ایسا کوئی جھوٹ نہیں، جو اورحان کہنے پر مائل نہ ہوگا۔

۱۹۹۰-۹۲ء ۱۹۹۴-۹۸ء

336-330 قبل مسیح: فارس پر دارا نے حکومت کی۔ ہخامنشی خاندان (Achaemenids) کا آخری بادشاہ جو اپنی سلطنت سکندر اعظم کے ہاتھ ہار گیا۔

323-336 قبل مسیح: سکندر اعظم نے اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس نے ایران فتح کیا اور ہندوستان پر حملہ کیا۔ جدید دور تک پوری اسلامی دنیا میں ہیرو اور شہنشاہ کے طور پر اس کے کارنامے داستانوی تھے۔

622ء: ہجرت، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے مدینہ ہجرت اور اسلامی ہجری کیلنڈر کا آغاز۔

1010ء: فردوسی کی کتاب "شاہنامہ"۔ ایرانی شاعر فردوسی (935ء۔1020ء) نے اپنی کتاب "شاہنامہ" سلطان محمود غزنوی کو پیش کی۔ ایرانی اساطیر اور تاریخ بشمول سکندر کا حملہ، رستم کی داستانیں اور ایران اور توران کے مابین تنازع کے واقعات نے چودھویں صدی سے منی ایچر فنکاروں کو متاثر کیا۔

1227-1206ء: منگول حکمران چنگیز خان کا دور۔ اس نے ایران، روس اور چین پر حملہ کیا اور اپنی سلطنت کو منگولیا سے یورپ تک وسعت دی۔

1209-1141ء: ایرانی شاعر نظامی کا دور حیات۔ اس نے رومانوی رزمیہ "خمسہ" لکھیں جس میں درج ذیل کہانیاں شامل تھیں جنہوں نے منی ایچر فنکاروں کو متاثر کیا: مخزن الاسرار، خسرو و شیریں، لیلیٰ و مجنوں، سکندر نامہ اور ہفت پیکر۔

1258ء: محاصرۂ بغداد: چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان (دور حکومت 1265-1251ء) نے بغداد فتح کیا۔

1922-1300ء: سلطنت عثمانیہ، ایک سنی مسلمان طاقت جس نے جنوب مشرقی یورپ، مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ پر حکومت کی۔ اپنی عظیم ترین توسیع میں یہ سلطنت ویانا اور ایران کے دروازوں تک پہنچ گئی۔

1370-1405ء: امیر تیمور کا دور۔ ایران میں قرہ قویونلو کے زیرِ حکمرانی علاقے فتح کیے۔ امیر تیمور نے منگولیا سے بحیرۂ روم تک کے علاقے فتح کیے، بشمول روس، ہندوستان، افغانستان، ایران، عراق اور اناطولیہ کے علاقوں کے (جہاں اس نے 1402ء میں عثمانی سلطان بایزید اول کو شکست دی)۔

1370-1506ء: خاندانِ تیموریہ۔ امیر تیمور نے جس کی بنیاد رکھی، فنکاروں اور دانشوروں نے ثقافت کے شاندار احیا کو فروغ دیا اور ایران، وسطی ایشیا اور ماوراء النہر پر حکومت کی۔ تیموریوں کی زیرِ سرپرستی شیراز، تبریز اور ہرات میں کئی منی ایچر فنکاروں کے فن پھلے پھولے۔ پندرھویں صدی کی ابتدا میں ہرات اسلامی دنیا میں مصوری کا مرکز اور استاد بہزاد کا وطن تھا۔

1375-1467ء: قرہ قویونلو (The Black Sheep) ایک ترکمان قبائلی وفاق جس نے عراق، مشرقی اناطولیہ اور ایران کے علاقوں پر حکومت کی۔ جہان شاہ (دورِ حکومت 1438-67ء) آخری قرہ قویونلو حکمران تھا جسے آق قویونلو کے اوزون حسن نے 1467ء میں شکست دی۔

1378-1502ء: آق قویونلو (The White Sheep) شمالی عراق، آذربائیجان اور مشرقی اناطولیہ پر حکمران ترکمان قبائل کا وفاق۔ آق قویونلو حکمران اوزون حسن (دورِ حکمرانی 1452-78ء) عثمانیوں کی مشرق کی جانب توسیع کو روکنے میں ناکام رہا، لیکن اس نے قرہ قویونلو کے جہان شاہ کو 1467ء میں شکست دی اور 1468ء میں تیموری ابو سعید کو ہرا کر اپنی سلطنت بغداد اور خلیج فارس تک پھیلا لیا۔

1453ء: عثمانی سلطان محمد فاتح نے استنبول فتح کیا (بازنطینی سلطنت کا خاتمہ)۔ سلطان محمد فاتح نے بعد میں Bellini سے اپنی شبیہ بنوائی۔

1501-1736ء: صفوی سلطنت نے ایران پر حکمرانی کی۔ سرکاری مذہب کے طور پر شیعہ اسلام کے نفاذ نے سلطنت کے اتحاد میں مدد دی۔ سلطنت کا مرکز پہلے تبریز تھا، پھر قزوین لے جایا گیا اور بعد میں اصفہان۔ پہلے صفوی حکمران شاہ اسماعیل (دورِ حکمرانی 1501-24ء) نے وہ علاقے زیر کیے جن پر آذربائیجان اور ایران میں آق قویونلو کی حکومت تھی۔ شاہ طہماسپ کے دور (دورِ حکمرانی 1524-76ء) میں ایران بے حد کمزور ہو گیا۔

1512ء: بہزاد کا فرار۔ عظیم منی ایچر فنکار بہزاد نے ہرات سے تبریز ہجرت کی۔

1514ء: ہشت آسمان محل کی غارت گری: عثمانی سلطان سلیم یاوز نے چالدران میں صفوی فوج کو شکست دینے کے بعد تبریز کے ہشت آسمان محل کو غارت کیا۔ وہ ایرانی منی ایچر تصاویر اور کتابوں کے نادر ذخیرے کے ساتھ استنبول واپس پہنچا۔

1520-66ء: سلطان سلیمان عالی شان اور عثمانی ثقافت کا سنہرا دور۔ عثمانی سلطان سلیمان عالی شان کا دورِ حکومت، جس نے اہم فتوحات سے سلطنت کو مشرق اور مغرب میں پھیلا دیا، بشمول ویانا کے پہلے محاصرے (1529ء) اور بغداد کا قبضہ صفویوں سے لینے کے (1535ء)۔

1556-1605ء: امیر تیمور اور چنگیز خان کے ایک جانشین شہنشاہ ہندوستان اکبر کا دور حکومت۔ اس نے آگرہ میں منی ایچر فنکاروں کا کتاب خانہ قائم کیا تھا۔

1566-74ء: عثمانی سلطان سلیم دوم کا دور حکومت۔ آسٹریا اور ایران سے امن معاہدے ہوئے۔

1571ء: قبرص پر عثمانی حملے (1570ء) کے بعد جنگ لپانتو متحدہ عیسائی طاقتوں اور عثمانیوں کے مابین چار گھنٹے پر مشتمل بحری جنگ۔ اگرچہ اس میں عثمانیوں کو شکست ہوئی لیکن 1573ء میں وینس نے قبرص، عثمانیوں کے حوالے کر دیا۔ فرنگی حوصلے پر اس جنگ کا بے حد اثر ہوا اور یہ Titian، Tintoretto اور Veronese کی مصوری کا موضوع بنی۔

1574-95ء: عثمانی سلطان مراد سوم کا دور حکومت (جس دوران ہمارے ناول کے واقعات رونما ہوئے)۔ اس کے دور حکمرانی میں 1578-90ء کے درمیان عثمانی صفوی جنگیں لڑی گئیں۔ یہ عثمانی سلطان سب سے بڑھ کر منی ایچر تصاویر والی کتابوں میں دلچسپی رکھتا تھا اور اسی نے استنبول میں "سرنامہ ہمایوں"، "کتاب حرفت" اور "کتاب فتوحات" تیار کروائی تھیں۔ ان کتابوں کی تیاری میں انتہائی ممتاز عثمانی منی ایچر فنکاروں بشمول عثمان منی ایچر فنکار (استاد عثمان) نے حصہ لیا تھا۔

1576ء: شاہ طہماسپ کی عثمانیوں کے ساتھ چپقلش و عداوت کے کئی عشروں کے بعد صفوی شاہ طہماسپ نے عثمانی سلطان سلیم دوم کو سلطان سلیمان کی وفات کے موقع پر مستقبل میں امن کو فروغ دینے کی خاطر تحائف بھیجے۔ ایران سے بھیجے گئے ان تحائف میں "شاہنامہ" کی ایک غیر معمولی جلد بھی شامل تھی جو 25 برس قبل تیار کی گئی تھی۔ وہ کتاب بعد از ان توپ کاپی محل کے خزانے میں منتقل کر دی گئی۔

1583ء: ایرانی منی ایچر فنکار ولی جان (از تبریز) نے استنبول آنے کے تقریباً دس برس بعد عثمانی دربار کے لیے کام کا آغاز کیا۔

1587-1629ء: صفوی ایرانی حکمران شاہ عباس اول کا دور حکومت جس کا آغاز اس کے والد محمد خدابندہ کی تخت سے معزولی سے ہوا۔ شاہ عباس نے دارالحکومت کو قزوین سے اصفہان منتقل کر کے ایران میں ترکمان طاقت کو محدود کر دیا۔ اس نے 1590ء میں عثمانیوں سے امن معاہدہ کیا۔

1591ء: قرہ اور عثمانی دربار کے مصوروں کی کہانی، ہجری کیلنڈر کے ایک ہزار سال مکمل ہونے سے ایک سال قبل قرہ مشرق سے استنبول واپس آیا اور ناول میں درج واقعات کا آغاز ہوا۔

1603-17ء: عثمانی سلطان احمد اول کا دور حکومت، جس نے ملکہ الزبتھ اول کا سلطان کو تحفے کے طور پر بھیجا گیا بڑا گھڑیال تباہ کیا تھا۔

- اورحان پاموک ترکی کے ممتاز ترین ناول نگاروں میں سے ہیں جن کے ناول "سرخ میرا نام" کا موضوع مشرقی اور مغربی تہذیب کا تصادم ہے۔

- موجودہ زمانے کے سرکردہ ادیبوں میں سے ایک اورحان پاموک کا یہ ناول سولہویں صدی کے استنبول میں مذہبی شدت پسندی کی کہانی سناتا ہے۔ یہ بیک وقت پُراسرار داستان ہے اور ایک فلسفیانہ پہیلی... فن مصوری، مذہب، محبت اور طاقت و اختیار کی پیچیدہ و مہلک کہانی... (نیویارک ٹائمز)

- پاموک کی ناول نگاری کے فن کی ایک کامل مثال.... ادب نگاری کی اعلیٰ قسم... "سرخ میرا نام" نزاکت اور باریکی سے بُنی گئی داستان ہے۔ ہم اہل مغرب مشکور ہیں کہ اورحان پاموک جیسا ناول نگار اس دنیا میں موجود ہے جو ہماری ثقافت اور ہماری عقلی ہی زرخیز ایک وراثت کے درمیان پُل تعمیر کر رہا ہے۔ (ڈیلی ٹیلی گراف)

- اس شاندار نئے ناول میں اورحان پاموک اپنے قاری کو اسلامی فن مصوری کے خوب صورت جہان کی سیر کرواتے ہیں۔ پاموک کا یہ ناول اس نایاب ادب کا حصہ ہے جسے صدیوں یاد رکھا جائے گا۔ (دی آبزرور)